زیر نظر حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

۱۲

ترجمہ

سید صفدر حسین نجفی

از نگارش

اہل علم کی ایک جماعت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور، پاکستان

زیرِ نظر: اُستادِ محقق آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

۱۲

ترجمہ
سید صفدر حسین نجفی
پرنسپل جامعۃ المنتظر لاہور

اثرِ نگارش
اہلِ قلم کی ایک جماعت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور، پاکستان

Marfat.com

پیشکش: حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب	تفسیر نمونہ جلد ۱۲
زیر نظر	استاد محقق آقائے ناصر مکارم شیرازی
مترجم	سید صفدر حسین نجفی پرنسپل جامعۃ المنتظر لاہور
تصحیح و تجدید	ثاقب نقوی
کتابت	حافظ منظور احمد سندھو آف بارموسیٰ تحصیل پھالیہ ضلع گجرات
ناشر	مصباح القرآن ٹرسٹ ۔ ۱۰ گنگا رام مینشن شاہراہ قائد اعظم لاہور
مطبع	زاہد بشیر پرنٹرز ۔ لاہور
تاریخ اشاعت	جمادی الاول ۱۴۰۹ھ
ایڈیشن	اوّل
ہدیہ	۶۵ روپے

ملنے کا پتہ

قرآن سنٹر

۲۴ - الفضل مارکیٹ، اُردو بازار ۔ لاہور

Marfat.com

بسم الله الرحمن الرحيم

Marfat.com

اللهم صل على محمد وآل محمد وعجل فرجهم

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین محترم!

سلام و رحمت

قرآن وہ سرچشمۂ ہدایت و نور ہے کہ جو ہر دَور کے تشنگانِ حق کو ان کے ظرف کے مطابق سیراب کرتا ہے۔ انسانیت کو اپنے سفر کے ہر قدم اور ہر موڑ پر اسرارِ الٰہی اور ہدایت کی ضرورت ہے بلکہ ہر گام اس کی احتیاج کا احساس بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس کی راہنمائی ایسی جامع، ہمہ گیر اور مکمل ہے کہ اگر اس کا آبِ زلال اس کے حقیقی سرچشمہ سے حاصل کیا جائے تو پھر کسی اور قطرۂ آب کی ہرگز احتیاج باقی نہیں رہتی۔

قرآن ہر دَور کے انسان کی راہنمائی اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق کرتا ہے اور اس کی طرف رجوع کرنے والوں کو اس کے اسی مزاج کو پیشِ نظر رکھ کر رجوع کرنا چاہیئے اور اس کی تفسیر کرنے والوں کو اس کے اسی آہنگ کے مطابق اس کی تفسیر کرنا چاہیئے اور اگر یہ تقاضے پورے ہو جائیں تو قرآن کی عظمت ایک قوت کے ساتھ کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ تفسیرِ نمونہ دَورِ حاضر میں اس ادعا کی ایک روشن دلیل ہے۔

اس تفسیر نے جس طرح سے ہر علاقے اور ہر مکتب کے روشن فکر اور بیدار مغز افراد کو اپنی طرف کھینچا ہے وہ قرآن شناسی کی تڑپ کی غماز بھی ہے اور قرآنی رفعتوں اور ہمہ گیری کی بُرہان بھی ہے۔

اس وقت دنیا کی مختلف زندہ زبانوں میں اس دَور کی اس عظیم تفسیر کے تراجم ہو رہے ہیں — اُردو زبان میں تفسیرِ نمونہ کی بارہویں جلد کا ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

آپ نے جس طرح سے اس تفسیر سے وارفتگی کا اظہار کیا ہے وہ آپ کے عشقِ قرآن کا بھی آئینہ دار ہے اور ہمارے لیے بھی نئے حوصلوں اور تازہ ولولوں کا ذریعہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کے مطالعے اور اس کی ترویج کے لیے آپ اپنی عمدہ مساعی کو جاری رکھیں گے۔

زیرِ نظر جلد کی اشاعت میں جناب حاجی شیخ ظہیر علی ساعتی مرحوم کے پسماندگان نے ان کے ایصالِ ثواب کی غرض سے تعاون کیا ہے۔ پروردگار بتصدقِ قرآن و حاملانِ قرآن، مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کے پسماندگان کو اس حُسنِ عمل پر اجرِ بے کراں سے نوازے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ ہمیشہ کی طرح آئندہ بھی اپنی آراء اور نقد و نظر سے ضرور نوازیں گے اور ہم ہمیشہ کی طرح آئندہ بھی آپ کے ممنون رہیں گے۔ انشاء اللہ

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ

اراکین
مصباح القرآن ٹرسٹ

Marfat.com

اِھداء

"مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش

تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا

چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم

Marfat.com

یہ تفسیر

حسبِ ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے عبدالرسول حسنی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبداللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

Marfat.com

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

① تفسیر مجمع البیان	از	مشہور مفسر علامہ طبرسی
② تفسیر تبیان	از	دانشمند فقید بزرگ شیخ طوسی
③ تفسیر المیزان	از	علامہ طباطبائی
④ تفسیر صافی	از	علامہ محسن فیض کاشانی
⑤ تفسیر نور الثقلین	از	مرحوم عبد علی بن جمعۃ الحویزی
⑥ تفسیر برہان	از	مرحوم سید ہاشم بحرینی
⑦ تفسیر روح المعانی	از	علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
⑧ تفسیر المنار	از	محمد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہ
⑨ تفسیر فی ظلال القرآن	از	سید قطب مصری
⑩ تفسیر قرطبی	از	محمد بن احمد انصاری قرطبی
⑪ اسباب النزول	از	واحدی ، ابوالحسن علی بن متویہ نیشاپوری ،
⑫ تفسیر مراغی	از	احمد مصطفےٰ مراغی
⑬ تفسیر مفاتیح الغیب	از	فخر رازی
⑭ تفسیر روح الجنان	از	ابوالفتوح رازی

Marfat.com

اس تفسیر میں مدِّنظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان یہی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک "ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دُنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

باالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمۂ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علماً میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققینِ اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کرکے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر...؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوئے یا جان بُوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسّرین اور عالی قدر محققینِ اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پَر تو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیھم)۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

Marfat.com

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتبِ فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریاتِ زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہوگا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناقابلِ ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کرسکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیشِ نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کرسکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا میں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہوسکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شاملِ حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی گیارہ جلدیں جو اس وقت تک منظرِ عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی بارہویں جلد ہے) بارہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیقِ الٰہی کا میں از حد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی[1]

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرض خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلاوطنی[2] کے مقام پر، حتیٰ کہ بستر بیماری پر بھی میں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیئے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

---

[1] بعد ازاں تعداد ۲۷ تک جا پہنچی۔ (مترجم)
[2] سابق شاہ ایران معدوم کے دور میں مؤلف کو جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

Marfat.com

اس میں ہم آہنگی نہیں ہو گی ۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا ۔ لیکن پھر اس صورتِ حال کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں ۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں ۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث ، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو ۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں ۔

(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے) ۔

خداوندا !

ہماری آنکھوں کو بینا ، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب ، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں ۔

خداوندا !

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنانِ اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے ، اس امتِ اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کر دے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگا لیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں ۔

بار الٰہا !

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں ۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں ۔

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے) ۔

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ قم ۔ ایران

Marfat.com

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین
۶۳	جلد بازی ایک مصیبت	۲۹	سورہ بنی اسرائیل
۶۷	آیت ۱۳ تا ۱۵	۳۱	نام اور مقام نزول
۶۷	چار اہم اسلامی اصول	۳۱	فضیلت
۷۱	چند اہم نکات	۳۲	مضامین ایک نگاہ میں
۷۱	اچھی اور بُری فال	۳۴	آیت ۱
۷۲	انسان کا عجیب اعمال نامہ	۳۴	معراج رسول
۷۴	برأت کا اصول اور آیت	۳۷	مسئلہ معراج
۷۶	آیت ۱۶ - ۱۷	۳۷	معراج قرآن و حدیث کی نظر میں
۷۶	عذابِ الٰہی کے چار مرحلے	۴۰	معراج جسمانی تھی یا روحانی
۷۹	آیت ۱۸ تا ۲۱	۴۱	معراج کا مقصد
۸۰	طالبانِ دنیا اور طالبانِ آخرت	۴۲	معراج، دَورِ حاضر کا علم اور سائنس
۸۳	چند اہم نکات	۴۵	آیت ۲ تا ۸
۸۳	۱۔ کیا دنیا و آخرت میں تضاد ہے؟	۴۷	دو عظیم طوفانی واقعات
۸۵	۲۔ کامیابی میں کوشش کا دخل	۵۰	چند اہم نکات
۸۵	۳۔ امدادِ الٰہی	۵۰	بنی اسرائیل کے دو تاریخی واقعات
۸۶	آیت ۲۲ تا ۲۵	۵۵	آیات کی تطبیق اسلامی تاریخ پر
۸۷	اہم اسلامی احکام کا سلسلہ	۵۶	آیت ۹ تا ۱۲
۸۹	ماں باپ کا انتہائی احترام	۵۷	سعادت کا بالکل سیدھا راستہ
۹۱	چند اہم نکات	۶۳	چند اہم نکات
۹۱	۱۔ منطقِ اسلام میں والدین کا احترام	۶۳	کیا انسان ذاتی طور پر جلد باز ہے

Marfat.com

مضامین	صفحہ نمبر
۲۔ "قضاء" کے معنی کے بارے میں تحقیق	۹۴
۳۔ "اُف" کے معنی کی تحقیق	۹۶
آیت ۲۶ تا ۳۰	۹۷
انفاق وبخشش میں اعتدال	۹۸
چند اہم نکات	۱۰۴
۱۔ "ذی القربیٰ" سے یہاں کون لوگ مراد ہیں	۱۰۴
۲۔ اسراف کے بُرے اثرات	۱۰۵
۳۔ "اسراف" اور "تبذیر" میں فرق	۱۰۷
۴۔ کیا میانہ روی ایثار کے منافی ہے	۱۰۸
آیت ۳۱ تا ۳۵	۱۰۹
چھ اہم احکام	۱۱۰
حرمتِ زنا کا فلسفہ	۱۱۲
چند اہم نکات	۱۱۹
۱۔ کم فروشی کا نقصان	۱۱۹
۲۔ کم تولنے کے مفہوم کی وسعت	۱۲۰
۳۔ "قسطاس" کا مفہوم	۱۲۰
آیت ۳۶ تا ۴۰	۱۲۱
صرف علم کی پیروی کرو	۱۲۲
نظمِ معاشرہ کے لیے ایک اہم درس	۱۲۳
گمان کی طرف میلان کا سدِ باب	۱۲۶
متکبّر نہ بنو!	۱۲۶
مشرک نہ بنو!	۱۲۹
آیت ۴۱ تا ۴۴	۱۳۱
وہ حق سے کیونکر فرار کرتے ہیں؟	۱۳۲
دلیل تمانع	۱۳۳
موجوداتِ عالم کی عمومی تسبیح	۱۳۵

مضامین	صفحہ نمبر
ایک سوال کا جواب	۱۳۸
اہل بیتؑ سے چند روایات	۱۳۹
آیت ۴۵ تا ۴۸	۱۴۲
شانِ نزول	۱۴۳
جاہل مغرور	۱۴۴
چند اہم نکات	۱۴۵
۱۔ ان آیات کا مجموعی جائزہ	۱۴۵
۲۔ خدا کی طرف نسبت کا مفہوم	۱۴۶
۳۔ حجابِ مستور کیا ہے؟	۱۴۶
۴۔ "اکنۃ" اور "وقرا" کیا چیز ہے؟	۱۴۷
۵۔ "مایسمعون بہ" کی تفسیر	۱۴۷
۶۔ وہ پیغمبر اکرمؐ کو مسحور کیوں کہتے ہیں؟	۱۴۸
۷۔ توحید کی آواز پر مشرکین کا خوف	۱۴۸
آیت ۴۹ تا ۵۲	۱۴۹
قیامت یقینی ہے	۱۵۰
آیت ۵۳ تا ۵۷	۱۵۳
تمام مخالفین سے منطقی طرزِ عمل	۱۵۴
وسیلہ کیا ہے؟	۱۶۰
آیت ۵۸ تا ۶۰	۱۶۲
بہانہ سازوں کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرو	۱۶۳
چند اہم نکات	۱۶۵
۱۔ رسول اللہؐ کا خواب اور شجرِ ملعونہ	۱۶۵
۲۔ منکرینِ اعجاز کی عذر تراشیاں	۱۶۸
۳۔ گزشتہ لوگوں کے انکار کا آئندہ لوگوں سے تعلق؟	۱۶۹
آیت ۶۱ تا ۶۵	۱۷۰

Marfat.com

مضامین	صفحہ نمبر
شیطان کے جال	١٧١
چند اہم نکات	١٧٤
١۔ چند الفاظ کا مفہوم	١٧٤
٢۔ وسوسے کے لیے شیطانی ذرائع	١٧٥
٣۔ خدا نے شیطان کو کیوں پیدا کیا	١٧٧
آیت ٦٦ تا ٦٩	١٧٨
نعمتوں کے باوجود کفران کیوں؟	١٧٩
چند اہم نکات	١٨١
١۔ کم ظرف انسان	١٨١
٢۔ خدا کی حدود حکومت سے فرار ممکن نہیں	١٨٢
٣۔ چند الفاظ کا مفہوم	١٨٣
آیت ٧٠ تا ٧٢	١٨٤
انسان گلشن حیات کا بہترین پھول	١٨٤
چند اہم نکات	١٨٥
١۔ سواری انسان کے لیے اولین نعمت	١٨٥
٢۔ خدا کی طرف سے انسان کی عزت وتکریم	١٨٥
٣۔ "کرمنا" اور "فضّلنا" میں فرق	١٨٦
٤۔ آیت میں "کثیر" کا مفہوم	١٨٦
٥۔ انسان کیوں افضل ہے؟	١٨٧
چند قابل توجہ نکات	١٩٠
١۔ انسانی زندگی پر رہبری کا اثر	١٩٠
٢۔ بنی آدم کا شرف	١٩١
٣۔ رہبری ۔ اسلام کی نظر میں	١٩١
٤۔ دل کے اندھے	١٩٢
آیت ٧٣ تا ٧٥	١٩٥
شان نزول	١٩٥
شرک کے لیے تھوڑے سے جھکاؤ کی سزا	١٩٧
چند اہم نکات	١٩٨
١۔ کیا یہ کشادہ دلی تھی؟	١٩٨
٢۔ دوگنا عذاب کیوں؟	١٩٩
٣۔ "ضعف" کا مفہوم	٢٠٠
٤۔ " اذاً لاتخذوك خليلا " کی تفسیر	٢٠١
٥۔ خدایا! ہمیں ہمارے سپرد نہ کر	٢٠١
آیت ٧٦، ٧٧	٢٠٢
شان نزول	٢٠٢
ایک اور منحوس سازش	٢٠٣
آیت ٧٨ تا ٨١	٢٠٥
باطل کا انجام نابودی ہے	٢٠٦
چند اہم نکات	٢١١
١۔ نماز تہجد ایک عظیم روحانی عبادت ہے	٢١١
٢۔ "مقام محمود" کیا ہے؟	٢١٤
٣۔ کامیابی کے تین عوامل	٢١٥
٤۔ کامیابی حق کے لیے اور نابودی باطل کے لیے	٢١٦
٥۔ آیت "جاء الحق"... اور قیام مہدیؑ	٢١٧
آیت ٨٢	٢١٨
قرآن شفا بخش نسخہ ہے	٢١٨
چند اہم نکات	٢١٨
١۔ "من القرآن" میں لفظ من کا مفہوم	٢١٨
٢۔ "شفاء" اور رحمت میں فرق	٢١٩
٣۔ ظالموں پر الٹا اثر کیوں ہوتا ہے؟	٢١٩
٤۔ معاشرتی اور اخلاقی بیماریوں کے لیے ایک مؤثر دوا	٢٢٠

Marfat.com

مضامین	صفحہ نمبر
آیت ۸۳ - ۸۴	۲۲۴
ہر شخص اپنی فطرت کی راہ لیتا ہے	۲۲۴
چند اہم نکات	۲۲۵
۱۔ تکبر اور مایوسی ۔ دو خطرناک اخلاقی بیماریاں	۲۲۵
۲۔ "شاکلة" سے کیا مراد ہے ؟	۲۲۶
آیت ۸۵	۲۳۰
رُوح کیا ہے ؟	۲۳۰
رُوح کی اصالت و استقلال	۲۳۲
استقلالِ رُوح کے دلائل	۲۳۸
ایک اشتباہ سے اجتناب	۲۴۱
آیت ۸۶ - ۸۷	۲۴۵
تجھے جو کچھ حاصل ہے اس کی رحمت سے ہے	۲۴۵
آیت ۸۸ - ۸۹	۲۴۷
قرآن کی مثل کبھی نہیں لائی جاسکتی	۲۴۷
آیت کے چند قابلِ توجہ نکات	۲۴۸
آیت ۹۰ تا ۹۳	۲۵۱
شانِ نزول	۲۵۲
طرح طرح کے بہانے	۲۵۴
چند اہم نکات	۲۵۶
۱۔ بہانہ تراشیوں کا جواب	۲۵۶
۲۔ کوتاہ فکری اور نامعقول تقاضے	۲۵۶
۳۔ معجزے کے منکرین کی ایک اور دستاویز	۲۵۷
آیت ۹۴ - ۹۵	۲۶۰
پھر وہی بہانے	۲۶۰
چند اہم نکات	۲۶۲
۱۔ "وما منع الناس" کا مفہوم	۲۶۲

مضامین	صفحہ نمبر
۲۔ "ملائکة یمشون مطمئنین" کا مفہوم	۲۶۲
۳۔ لفظ "ارض" سے ایک استفادہ	۲۶۳
آیت ۹۶ - ۹۷	۲۶۴
حقیقی ہدایت یافتہ	۲۶۴
آیت ۹۸ تا ۱۰۰	۲۶۹
معاد کیونکر ممکن ہے	۲۷۰
چند اہم نکات	۲۷۱
۱۔ معادِ جسمانی	۲۷۱
۲۔ آیات سے مراد	۲۷۱
۳۔ "مثلهم" کا مفہوم	۲۷۱
۴۔ اجل کیا ہے ؟	۲۷۲
۵۔ زیر نظر آیات کا باہمی ربط	۲۷۳
۶۔ کیا سب انسان بخیل ہیں ؟	۲۷۳
۷۔ "خشیة الانفاق" کا مفہوم	۲۷۴
آیت ۱۰۱ تا ۱۰۴	۲۷۴
ان نشانیوں کے باوجود وہ ایمان نہ لائے	۲۷۵
چند اہم نکات	۲۷۶
۱۔ حضرت موسیٰؑ کے نو معجزات	۲۷۶
۲۔ کیا سوال کرنے والے پیغمبر اکرمؐ تھے ؟	۲۸۰
۳۔ آیت میں "ارض" سے کیا مراد ہے ؟	۲۸۱
۴۔ "وعد الآخرة" سے کیا مراد ہے ؟	۲۸۱
آیت ۱۰۵ تا ۱۰۹	۲۸۲
عاشقانِ حق	۲۸۳
چند قابلِ توجہ نکات	۲۸۶
۱۔ "آمنوا به اولا تؤمنوا" کا تسلسل	۲۸۶
۲۔ "الذین اوتوا العلم من قبله" سے کون لوگ مراد ہیں ؟	۲۸۷

Marfat.com

مضامین	صفحہ نمبر
۳- یخرون" کا مفہوم	۲۸۷
۴- "اذقان" کا مطلب	۲۸۷
چند اہم نکات	۲۸۸
۱- تعلیمی و تربیتی پروگرام	۲۸۸
۲- علم و ایمان کا ربط	۲۸۹
آیت ۱۱۰ - ۱۱۱	۲۹۰
شانِ نزول	۲۹۰
آخری بہانے	۲۹۱
جہر و اخفات میں اعتدال کے دو پہلو	۲۹۴
چند اہم نکات	۲۹۵
۱- تین صفات کا باہمی ربط	۲۹۵
۲- تکبیر کیا ہے؟	۲۹۶
۳- ایک سوال کا جواب	۲۹۷
سورۂ کہف	۲۹۹
سورۂ کہف کی فضیلت	۳۰۱
سورۂ کہف کے مضامین	۳۰۲
آیت ۱ تا ۵	۳۰۴
اللہ اور قرآن کے ذکر سے آغاز	۳۰۵
چند اہم نکات	۳۰۶
۱- حمدِ الٰہی سے سورۃ کی ابتداء	۳۰۶
۲- مستحکم، مستقیم اور نگہبان - کتاب	۳۰۶
۳- خدا کے لیے اولاد کے قائل افراد کو خصوصی تنبیہ	۳۰۷
۴- دعویٰ، بلا دلیل	۳۰۸
۵- عمل صالح - ایک مسلسل طرزِ عمل	۳۰۸
۶- جس نے اپنے "بندہ" پر کتاب نازل کی	۳۰۹

مضامین	صفحہ نمبر
آیت ۶ تا ۸	۳۱۰
غم نہ کرو - یہ دنیا آزمائش گاہ ہے	۳۱۰
چند توجہ طلب نکات	۳۱۱
۱- "باخع" کا مفہوم	۳۱۱
۲- "اسفاء" کا مطلب	۳۱۱
۳- "آثار" کا معنی	۳۱۱
۴- قرآن کے لیے لفظ "حدیث"	۳۱۱
۵- غمخوار ہادی	۳۱۱
آیت ۹ تا ۱۲	۳۱۴
شانِ نزول	۳۱۴
اصحابِ کہف کا واقعہ شروع ہوتا ہے	۳۱۶
چند اہم نکات	۳۱۸
"اوی الفتیة" کا مفہوم	۳۱۸
"من لدنك رحمة" کا مفہوم	۳۱۸
"ضربنا علی اٰذانهم" کا مطلب	۳۱۸
"سنین عددا" کا مطلب	۳۱۹
"بعثناهم" کا مفہوم	۳۱۹
"لنعلم" کا مطلب	۳۱۹
"ای الحزبین" کا مفہوم	۳۱۹
آیت ۱۳ تا ۱۶	۳۲۰
داستانِ اصحابِ کہف کی تفصیل	۳۲۱
چند اہم نکات	۳۲۳
۱- ایمان اور جوانمردی کا رشتہ	۳۲۳
۲- ایمان اور امدادِ الٰہی	۳۲۴
۳- غار کے نام کی ایک پناہ گاہ	۳۲۴
آیت ۱۷ - ۱۸	۳۲۶

Marfat.com

مضامین	صفحہ نمبر
اصحاب کہف کا اہم مقام	۳۲۷
چھ نشانیاں اور خصوصیات	۳۲۷
آیت ۱۹-۲۰	۳۳۱
ایک طویل نیند کے بعد بیداری	۳۳۲
چند اہم نکات	۳۳۳
۱۔ پاکیزہ ترین غذا	۳۳۳
۲۔ اصلاح کنندہ تقیہ	۳۳۴
۳۔ قرآن کا مرکز "لطف" ہے	۳۳۴
آیت ۲۱ تا ۲۴	۳۳۶
اصحاب کہف کے واقعے کا اختتام	۳۳۷
چند اہم نکات	۳۴۲
۱۔ "رجما بالغیب" کا مفہوم	۳۴۲
۲۔ "وثامنہم کلبہم" میں واؤ	۳۴۲
۳۔ آرام گاہ کے پاس مسجد	۳۴۴
۴۔ تمام چیزیں مشیت الٰہی کے سہارے پر ہیں	۳۴۴
۵۔ ایک سوال کا جواب	۳۴۵
آیت ۲۵ تا ۲۷	۳۴۷
اصحاب کہف کی نیند	۳۴۸
چند اہم نکات	۳۵۰
۱۔ داستان اصحاب کہف احادیث کی روشنی میں	۳۵۰
۲۔ "غار" کہاں ہے؟	۳۵۴
۳۔ اس واقعے کے تربیتی اور تعمیری پہلو	۳۵۵
اصحاب کہف کا واقعہ علمی اعتبار سے	۳۵۷
ایک اور نمونہ ـ یوگا کے ماہرین	۳۶۱
زندہ انسان کے بدن کو منجمد کر دینا	۳۶۱
آیت ۲۸ تا ۳۱	۳۶۴

مضامین	صفحہ نمبر
شان نزول	۳۶۵
پاک دل غریب لوگ	۳۶۶
چند اہم نکات	۳۷۰
۱۔ طبقاتی تفاوت ـ معاشرے کی عظیم مشکل ہے	۳۷۰
۲۔ دونوں جہانوں کی زندگی کا موازنہ	۳۷۱
۳۔ ہوا پرستی اور خدا سے غفلت	۳۷۲
۴۔ دوسرے جہان میں لباس زینت	۳۷۲
۵۔ سرمائے کی وجہ سے سرمایہ داروں کی قربت	۳۷۳
آیت ۳۲ تا ۳۶	۳۷۴
مستضعفین کے مقابلے میں مستکبرین کا موقف	۳۷۵
آیت ۳۷ تا ۴۱	۳۷۷
مستضعفین کا جواب	۳۷۸
آیت ۴۲ تا ۴۴	۳۸۲
اور ان کا انجام کار...	۳۸۳
چند اہم نکات	۳۸۵
۱۔ دولت کا غرور	۳۸۵
۲۔ اس داستان کے چند سبق	۳۸۶
آیت ۴۵ - ۴۶	۳۸۸
زندگی کی ابتدا و انتہا کے لیے ایک مثال	۳۸۸
چند اہم نکات	۳۹۱
۱۔ دنیا کی ناپائیدار خوشنمائیاں	۳۹۱
۲۔ غرور شکن عوامل	۳۹۲
آیت ۴۷ تا ۴۹	۳۹۳
ہائے ہماری شامت ـ یہ کیسی کتاب ہے؟	۳۹۴
چند اہم نکات	۳۹۶
۱۔ پہاڑ کیوں منہدم ہوتے	۳۹۶

Marfat.com

مضامین	صفحہ نمبر
۲۔ نامۂ اعمال	۳۹۸
۳۔ معاد پر ایمان کا تربیتی نتیجہ	۳۹۹
آیت ۵۰ تا ۵۳	۴۰۱
شیطانوں کو اپنا سرپرست نہ بناؤ	۴۰۲
چند اہم نکات	۴۰۵
۱۔ کیا شیطان فرشتہ تھا؟	۴۰۶
۲۔ گمراہوں کو تعاون کی دعوت نہیں دینا چاہیے	۴۰۷
آیت ۵۴ تا ۵۶	۴۰۹
گویا وہ عذاب کے منتظر ہیں	۴۱۰
آیت ۵۷ تا ۵۹	۴۱۳
عذابِ الٰہی میں جلدی نہیں ہوسکتی	۴۱۴
آیت ۶۰ تا ۶۴	۴۱۷
خضرؑ اور موسیٰؑ کی حیرت انگیز داستان	۴۱۸
آیت ۶۵ تا ۷۰	۴۲۳
عظیم استاد کی زیارت	۴۲۴
آیت ۷۱ تا ۷۸	۴۲۶
خدائی معلّم اور یہ ناپسندیدہ کام	۴۲۸
آیت ۷۹ تا ۸۲	۴۳۴
ان واقعات کا راز	۴۳۵
چند اہم نکات	۴۳۹
۱۔ خضرؑ کی ماموریت تشریعی تھی یا تکوینی	۴۳۹
۲۔ خضرؑ کون تھے؟	۴۴۲
۳۔ خود ساختہ افسانے	۴۴۴
۴۔ کیا انبیاء کے لیے بھول چوک ممکن ہے؟	۴۴۵
۵۔ موسیٰؑ خضرؑ کی ملاقات کو کیوں گئے؟	۴۴۶
۶۔ وہ خزانہ کیا تھا؟	۴۴۷
۷۔ اس داستان سے حاصل ہونے والے درس	۴۴۸
آیت ۸۳ تا ۹۱	۴۵۳
ذوالقرنین کی عجیب کہانی	۴۵۵
آیت ۹۲ تا ۹۸	۴۵۹
ذوالقرنین نے دیوار کیسے بنائی؟	۴۶۱
چند اہم نکات	۴۶۴
۱۔ اس داستان کے تاریخی اور تربیتی نکات	۴۶۴
۲۔ ذوالقرنین کون تھا؟	۴۶۸
۳۔ دیوارِ ذوالقرنین کہاں ہے؟	۴۷۴
۴۔ یاجوج ماجوج کون ہیں؟	۴۷۴
آیت ۹۹ تا ۱۰۲	۴۷۶
بے ایمانوں کا ٹھکانہ	۴۷۷
آیت ۱۰۳ تا ۱۰۸	۴۸۰
سب سے زیادہ خسارے میں کون لوگ ہیں؟	۴۸۱
چند اہم نکات	۴۸۴
۱۔ "اخسرین اعمالا" کون لوگ ہیں؟	۴۸۴
۲۔ "لقاء اللہ" کیا ہے؟	۴۸۶
۳۔ اعمال کا وزن	۴۸۷
۴۔ "لا یبغون عنها حولا" کی تفسیر	۴۸۸
۵۔ فردوس کن کا مقام ہے؟	۴۸۸
آیت ۱۰۹ - ۱۱۰	۴۹۰
جو لقائے الٰہی کی امید رکھتے ہیں	۴۹۱
لامتناہی کی تصویر کشی	۴۹۳
اخلاص یا عمل صالح کی روح	۴۹۶

Marfat.com

تفسیر نمونہ

جلد ۱۲

کا آغاز

سورۂ بنی اسرائیل سے ہوتا ہے

جس میں

معراج النبیؐ، فال نیک و بد، اسلام کے معاشرتی اور اخلاقی احکام، بنی اسرائیل کے کچھ واقعات اور روح انسانی جیسے مسائل کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے

اور اس کا دوسرا حصّہ

سورہ کہف پر مشتمل ہے

جس میں

اصحاب کہف کا مکمل واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کی ملاقات اور حضرت ذوالقرنین کی عجیب سرگزشت بھی مذکور ہے

یہ تفسیر ــــ قرآن پاک کی ایک تازہ تحقیق ہے
جس میں عصرِ حاضر کی ضروریات، تقاضوں، سوالات
اور مختلف مکاتبِ خیال کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

Marfat.com

سورۂ بنی اسرائیل

• مکہ میں نازل ہوئی

• اس میں ۔ ۱۱۱ آیتیں ہیں

Marfat.com

نام اور مقام نزول

اس کا مشہور نام "سورۂ بنی اسرائیل" ہے البتہ دیگر چند نام بھی ہیں۔ مثلاً :

"سورۂ اسراء"

"سورۂ سبحان" وغیرہ[1]

ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر نام اس سورت میں موجود مطالب کے حوالے سے ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل اسے اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس سورت کی ابتداء اور اختتام کا ایک اچھا خاصا حصّہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہے۔

"اسراء" اسے اس کی پہلی آیت کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسراء (یعنی معراج) کے بارے میں گفتگو کرتی ہے اور سورہ سبحان اسے اس کے پہلے لفظ کی وجہ سے کہتے ہیں۔

البتہ جن روایات میں اس سورہ کی فضیلت بیان کی گئی ہے ان میں اسے صرف "بنی اسرائیل" کہا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مفسرین نے اس سورہ کے لیے یہی نام انتخاب کیا ہے۔

بہرحال مشہور یہ ہے کہ اس سورہ کی تمام آیتیں مکہ میں نازل ہوئی ہیں اور اس کے مفاہیم و مضامین بھی مکی سورتوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ تاہم بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس کی کچھ آیتیں مدینہ میں نازل ہوئی ہیں لیکن پہلے والا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

فضیلت

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام صادق علیہ السلام سے اس سورت کی تلاوت کرنے والے کے لیے بہت زیادہ اجر و ثواب منقول ہے۔ ان روایات میں سے ایک کہ جو امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے اس میں آپؑ فرماتے ہیں :

من قرء سورة بنی اسرائیل فی کل لیلة جمعه لم یمت حتّٰی یدرك القائم ویکون من اصحابه

جو شخص ہر شب جمعہ سورہ بنی اسرائیل کی تلاوت کرے گا وہ اس وقت تک دنیا سے

---

[1] تفسیر آلوسی ج ۱۵ ص ۲۔

Marfat.com

نہ جائے گا جب تک "قائم" کو نہ دیکھ لے اور وہ آپ کے یار و انصار میں سے ہوگا۔

ہم نے بارہا اس امر کا تکرار کیا ہے کہ قرآن پاک کی سورتوں کا جو اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے وہ ہرگز صرف زبانی پڑھ لینے کے لیے نہیں ہے بلکہ ان روایات میں پڑھنے سے مراد ایسا پڑھنا ہے کہ جس میں غور و فکر اور سوچ بچار شامل ہو اور اس کے نتیجے میں انسان اس قرأت اور فکر کے تقاضوں کے مطابق عمل بھی کرے۔

خصوصاً اسی سورہ کی فضیلت سے مربوط ایک روایت میں ہے:

فرق قلبه عند ذكر الوالدين

اس سورہ کا قاری جب اس میں موجود ماں باپ کے بارے میں اللہ کی نصیحتوں تک پہنچتا ہے تو اس کے احساسات میں تحریک پیدا ہوتی ہے اور ماں باپ سے محبت کا جذبہ اس میں فزوں تر ہو جاتا ہے۔

لہٰذا وہ شخص ایسے اجر کا حامل ٹھہرتا ہے۔

اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ قرآنی الفاظ محترم اور اہم ہیں لیکن ۔ یہ الفاظ تمہید ہیں معانی و مفاہیم کے لیے اور معانی مقدمہ ہیں عمل کے لیے۔

مضامین ایک نگاہ میں

ہم کہہ چکے ہیں، جیسا کہ مشہور ہے یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی، لہٰذا فطری امر ہے کہ اس میں مکی سورتوں کی خصوصیات موجود ہیں۔ ان میں دعوتِ توحید بھی ہے، معاد کی جانب بھی توجہ دلائی گئی ہے مفید نصیحتیں بھی ہیں اور شرک، ظلم، انحراف اور کج روی کے خلاف بھی اس میں بہت سارا مواد ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مجموعی طور پر اس سورت کی آیتیں ان امور پر مشتمل ہیں:

(۱) نبوت کے دلائل ۔ بالخصوص قرآن اور معراج کے حوالے سے۔

(۲) معاد سے مربوط بحثیں ۔ انجام کار، اجر و ثواب، نامہ اعمال اور اس کے نتائج۔

(۳) سورہ کے آغاز اور اختتام پر بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک حصہ۔

(۴) ارادہ و اختیار کی آزادی ۔ اور یہ کہ ہر قسم کے اچھے برے عمل کا نتیجہ خود انسان کو بھگتنا پڑتا ہے۔

(۵) اس جہان کی زندگی کا حساب کتاب دوسرے جہان کے لیے نمونہ ہے۔

(۶) ہر سطح پر حق شناسی ۔ خصوصاً اعزاء و اقرباء کے بارے میں اور ان میں سے بھی خاص طور پر ماں باپ کے بارے میں

Marfat.com

(۷) فضول خرچی، کنجوسی، اولاد کشی، زنا، مالِ یتیم کھانا، کم فروشی، تکبر اور خونریزی سب حرام ہیں۔
(۸) توحید اور خدا شناسی سے متعلق مباحث۔
(۹) پیشِ حق تسلیم کی ہٹ دھرمی کے خلاف مقابلہ اور یہ کہ گناہ انسان اور چہرۂ حق کے درمیان پردہ ڈال دیتے ہیں۔
(۱۰) انسان کا مقام اور دوسری مخلوقات پر اس کی فضیلت۔
(۱۱) ہر قسم کی اخلاقی اور اجتماعی بیماری کے علاج کے لیے تاثیرِ قرآن۔
(۱۲) اعجازِ قرآن اور اس کے مقابلے کی عدم توانائی۔
(۱۳) شیطانی وسوسے اور ان کے خلاف مومنین کو تنبیہ۔
(۱۴) مختلف اخلاقی تعلیمات۔
(۱۵) تاریخ انبیاء کے بعض نشیب و فراز — تمام انسان کے لیے عبرت کے درس۔

بہرحال مجموعی طور پر عقائد، اخلاق اور معاشرت کے حوالے سے راہنمائی پر مبنی یہ ایک جامع اور کامل سورت ہے اور یہ مختلف میدانوں میں انسان کے ارتقاء و کمال کا زینہ بن سکتی ہے۔

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ یہ سورت تسبیح خدا سے شروع ہوتی ہے اس کی حمد و تکبیر پر تمام ہوتی ہے تسبیح نشانی ہے ہر قسم کے عیب و نقص سے دوری اور پاک رہنے کی اور حمد و ثنا نشانی ہے صفات فضیلت سے آراستہ ہونے کے لیے اور تکبیر کمال و عظمت کی طرف بڑھنے کے لیے علامت ہے۔

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۱) سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ○

ترجمہ

بخشنے والے مہربان اللہ کے نام سے۔

(۱) پاک ومنزہ ہے وہ اللہ کہ جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد اقصٰی کی طرف لے گیا کہ جس کا ماحول پُر برکت ہے، تاکہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں۔ یقیناً وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

تفسیر

معراجِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اس سورت کی پہلی آیت میں "اسراء" کا ذکر ہے۔ راتوں رات جو رسول اللہؐ نے مسجد الحرم سے مسجد اقصٰی (بیت المقدس) کا سفر کیا تھا اس میں اس کا ذکر ہے۔ یہ سفر معراج کا مقدمہ بنا۔ یہ سفر جو رات کے بہت کم وقت میں مکمل ہو گیا کم از کم اس زمانے کے حالات، راستوں اور معمولات کے لحاظ سے کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ یہ بالکل اعجاز آمیز اور غیر معمولی تھا۔

پہلے فرمایا گیا ہے: منزہ ہے وہ خدا کہ جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد الاقصٰی کی طرف لے گیا (سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ)۔

رات کی یہ غیر معمولی سیر اس لیے تھی تاکہ ہم اسے اپنی عظمت کی نشانیاں دکھائیں (لنریہ من اٰیاتنا)۔

آخر آیت میں فرمایا گیا ہے: اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے (انہ ھو السمیع البصیر)۔

Marfat.com

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر اللہ نے اپنے پیغمبر کو اس افتخار کے لیے چنا ہے تو یہ بلا وجہ نہیں ہے کیونکہ رسولؐ کی گفتار اور ان کا کردار اس قابل تھا کہ یہ لباس اُن کے بدن کے لیے بالکل زیبا تھا۔ اللہ نے اپنے رسولؐ کی گفتار سنی، اس کا کردار دیکھا اور اس مقام کے لیے اس کی لیاقت مان لی۔

اس جملے کے بارے میں بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس اعجاز کے منکرین کو تہدید کی جائے کہ اللہ ان کی باتیں سنتا ہے، ان کے اعمال دیکھتا ہے اور ان کی سازش سے آگاہ ہے۔

یہ آیت نہایت مختصر اور جچے تلے الفاظ پر مشتمل ہے تاہم اس رات کے معجز نما سفر کے بہت سے پہلو اس آیت سے واضح ہو جاتے ہیں:

(۱) لفظ "اسریٰ" نشاندہی کرتا ہے کہ یہ سفر رات کے وقت ہوا کیونکہ "اسراء" عربی زبان میں رات کے سفر کے معنی میں ہے جبکہ لفظ "سیر" دن کے سفر کے لیے بولا جاتا ہے۔

(۲) لفظ "لیلاً" ایک تو "اسرا" کے مفہوم کی تاکید ہے اور دوسرے اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ یہ سارے کا سارا سفر ایک ہی رات میں ہوا اور اہم بات بھی یہی ہے کہ مسجد الحرام اور مسجد الاقصیٰ کے درمیان ایک سو فرسخ سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ اس زمانے میں یہ فاصلہ کئی دنوں بلکہ کئی ہفتوں میں طے کیا جاتا تھا جبکہ شبِ اسرا تھوڑے سے وقت میں یہ سفر مکمل ہو گیا۔

(۳) لفظ "عبد" نشاندہی کرتا ہے کہ یہ افتخار و اکرام رسول اللہؐ کے مقام عبودیت کی وجہ سے تھا کیونکہ انسان کے لیے سب سے بلند منزل یہی ہے کہ وہ اللہ کا سچا اور صحیح بندہ ہو جائے۔ اس کی بارگاہ کے سوا کہیں ماتھا نہ جھکائے، اس کے فرمان کے علاوہ کسی کے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرے، جو بھی کام کرے فقط خدا کے لیے ہو اور جو بھی قدم اٹھائے اُسی کی رضا مطلوب ہو۔

(۴) "عبد" کی تعبیر یہ واضح کرتی ہے کہ سفر عالمِ بیداری میں تھا اور یہ جسمانی سیر تھی نہ کہ روحانی کیونکہ سیر روحانی کا کوئی معقول معنی خواب یا خواب کی مانند حالت کے سوا نہیں ہے لیکن لفظ "عبد" نشاندہی کرتا ہے کہ جسم و روح پیغمبرؐ اس سفر میں شریک تھے۔ یہ اعجاز جن کی سمجھ میں نہیں آتا انہوں نے جو زیادہ سے زیادہ بات کی ہے یہ ہے کہ انہوں نے آیت کی توجیہ کے نام پر اسے روحانی کہہ دیا ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کہے کہ میں فلاں شخص کو فلاں جگہ سے لے گیا تو اس کا یہ مفہوم نہیں ہو گا کہ عالمِ خواب میں یا عالمِ خیال میں یا فکری طور پر لے گیا۔

(۵) اس سفر کا آغاز مکہ کی مسجد الحرام سے ہوا وہاں سے بیت المقدس میں موجود مسجد الاقصیٰ پہنچے (اور یہ سفر معراج آسمانی کا مقدمہ تھا کہ جس کے بارے میں ہم بعد میں دلائل پیش کریں گے)۔

البتہ تمام مکہ کو بھی چونکہ احترام کی وجہ سے مسجد الحرام کہا جاتا ہے لہٰذا مفسرین میں اس بات پر اختلاف

Marfat.com

ہے کہ رسول اللہؐ کا یہ سفر خانہ کعبہ کے قریب سے شروع ہوا تھا یا کسی عزیز رشتہ دار کے گھر سے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ یہ سیر خانہ کعبہ سے شروع ہوئی۔

(۶) اس سیر کا مقصد یہ تھا کہ رسول اللہؐ عظمتِ الٰہی کی نشانیوں کا مشاہدہ کریں۔ آسمانوں کی سیر بھی اسی مقصد سے تھی کہ پیغمبر اکرمؐ کی باعظمت روح ان آیاتِ بینات کا مشاہدہ کر کے اور بھی عظمت و بزرگی پالے اور انسانوں کی ہدایت کے لیے آپؐ خوب تیار ہو جائیں۔ یہ سفر معراج بعض کوتاہ فکر لوگوں کے خیال کے برعکس اس لیے نہ تھا کہ آپ خدا کو دیکھیں۔ ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ خدا آسمانوں میں رہتا ہے۔

بہرحال اگرچہ رسول اللہؐ عظمتِ الٰہی کو پہچانتے تھے اور اس کی خلقت کی عظمت سے بھی آگاہ تھے لیکن بقولے : ولی

شنیدن کی بود مانند دیدن

سورہ نجم کی آیات میں بھی اس سفر کے آخری حصے یعنی معراج آسمانی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی

اس سفر میں اس نے اپنے رب کی عظیم آیات دیکھیں۔

(۷) " بارکنا حولہ " یہ مطلب واضح کرتا ہے کہ مسجدِ اقصیٰ علاوہ اس کے کہ خود مقدس ہے اس کے اطراف کی سرزمین بھی مبارک اور بابرکت ہے۔ ممکن ہے یہ اس کی ظاہری برکات کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ سرسبز و شاداب سرزمین ہے۔ درخت اس زمین پر سایہ فگن ہیں۔ پانی وہاں جاری رہتا ہے اور یہ ایک آباد علاقہ ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی روحانی برکات کی طرف اشارہ ہو کیونکہ یہ سرزمین ایک طویل عرصہ اللہ کے عظیم نبیوں اور نورِ توحید و خدا پرستی کا مرکز رہی ہے۔

(۸) جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں " انہ ھو السمیع البصیر " کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ رسول اللہؐ کو اس نعمت کی عطا بلا وجہ نہ تھی بلکہ اس اہلیت و لیاقت کے باعث تھی کہ جو آپ کی گفتار و کردار سے ہویدا تھی اور اللہ اس سے خوب آگاہ تھا۔

(۹) ضمنی طور پر لفظ " سبحان " اس بات کی دلیل ہے اور رسول اللہؐ کا یہ سفر بذاتِ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ ہر عیب و نقص سے پاک و منزہ ہے۔

(۱۰) " من اٰیاتنا " میں لفظ " من " نشاندہی کرتا ہے کہ آیاتِ عظمتِ الٰہی اس قدر زیادہ ہیں کہ اپنی تمام تر عظمت کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس باعظمت سفر میں صرف بعض کا ہی مشاہدہ کیا۔

Marfat.com

مسئلہ معراج

علماء اسلام کے درمیان مشہور یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس وقت مکّہ میں تھے تو ایک ہی رات میں آپؐ قدرتِ الٰہی سے مسجد الحرام سے مسجدِ اقصیٰ پہنچے کہ جو بیت المقدس میں ہے۔ وہاں سے آپؐ آسمانوں کی طرف گئے آسمانی وسعتوں میں عظمتِ الٰہی کے آثار مشاہدہ کیے اور اسی رات مکّہ واپس آ گئے۔

نیز یہ بھی مشہور ہے کہ یہ زمینی اور آسمانی سیر جسم اور روح کے ساتھ تھی البتہ یہ سیر چونکہ بہت عجیب و غریب اور بے نظیر تھی لہٰذا بعض حضرات نے اس کی توجیہ کی اور اسے معراجِ روحانی قرار دیا اور کہا کہ یہ ایک طرح کا خواب تھا یا مکاشفہ روحی تھا لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ بات آیات کے ظاہری مفہوم کے بالکل خلاف ہے کیونکہ ظاہر آیات اس معراج کے جسمانی ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

بہرحال اس بحث سے بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں مثلاً:

۱۔ قرآن، حدیث اور تاریخ کی نظر سے معراج کی کیفیت کیا تھی؟

۲۔ شیعہ اور سنی علماء اسلام کا اس سلسلے میں کیا عقیدہ ہے؟

۳۔ معراج کا مقصد کیا تھا؟

۴۔ دورِ حاضر کے علم اور سائنس کی رُو سے معراج کا کیا امکان ہے؟

ان تمام مسائل کا کما حقہٗ جائزہ پیش کرنا اگرچہ تفسیر کی حدود سے باہر ہے تاہم ہم کوشش کریں گے کہ مختصراً ان تمام مسائل کو قارئین محترم کے سامنے ذکر کریں۔

۱۔ **معراج ـ قرآن و حدیث کی نظر میں:** قرآنِ حکیم کی دو سورتوں میں اس مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پہلی سورت ـ یہی سورۂ بنی اسرائیل ہے۔ اس میں اس سفر کے ابتدائی حصے کا تذکرہ ہے ـــ یعنی مکہ کی مسجد الحرام سے بیت المقدس کی مسجد الاقصیٰ تک کا سفر۔

اس سلسلے کی دوسری سورت ـ سورۂ نجم ہے۔ اس کی آیت ۱۳ تا ۱۸ میں معراج کا دوسرا حصہ بیان کیا گیا ہے اور یہ آسمانی سیر کے متعلق ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی ۙ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی ؕ اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی ۙ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ۝ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ۝

ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ ـــ

رسول اللہ نے فرشتۂ وحی جبرئیل کو اس کی اصلی صورت میں دوسری مرتبہ دیکھا (پہلے

Marfat.com

آپ اسے نزولِ وحی کے آغاز میں کوہِ حرا میں دیکھ چکے تھے) یہ ملاقات بہشت جاوداں کے پاس ہوئی۔ یہ منظر دیکھتے ہوئے رسول اللہؐ کسی اشتباہ کا شکار نہ تھے۔ آپؐ نے عظمتِ الٰہی کی عظیم نشانیاں مشاہدہ کیں۔

یہ آیات کہ جو اکثر مفسرین کے بقول واقعۂ معراج سے متعلق ہیں یہ بھی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ واقعہ عالمِ بیداری میں پیش آیا خصوصاً "مازاغ البصر وما طغٰی" اس امر کا شاہد ہے کہ رسول اللہؐ کی آنکھ کسی خطا، اشتباہ اور انحراف سے دوچار نہیں ہوئی۔

اس واقعے کے سلسلے میں مشہور اسلامی کتابوں میں بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں۔

علماء اسلام نے ان روایات کے تواتر اور شہرت کی گواہی دی ہے۔ ہم نمونے کے طور پر چند روایات ذکر کرتے ہیں:

۱۔ عظیم فقیہ و مفسر شیخ طوسی تفسیر تبیان میں زیرِ بحث آیت کے ذیل میں کہتے ہیں:

شیعہ علماء کا موقف ہے کہ جس رات اللہ اپنے رسولؐ کو مکہ سے بیت المقدس لے گیا اسی رات اس نے آپؐ کو آسمانوں کی طرف بلند کیا اور آپؐ کو اپنی عظمت کی نشانیاں دکھائیں اور یہ سب کچھ عالمِ بیداری میں تھا خواب میں نہ تھا۔

۲۔ بلند مرتبہ مفسر مرحوم طبرسی اپنی تفسیر مجمع البیان میں سورۂ نجم کی آیات کے ذیل میں کہتے ہیں:

ہماری روایات میں مشہور یہ ہے کہ اللہ اپنے رسولؐ کو اسی جسم کے ساتھ عالمِ بیداری و حیات میں آسمانوں پر لے گیا اور اکثر مفسرین کا یہی عقیدہ ہے۔

۳۔ مشہور محدث علامہ مجلسی بحار الانوار میں کہتے ہیں:

مسجد الحرام سے بیت المقدس کی طرف اور وہاں سے آسمانوں کی طرف رسولِ اسلامؐ کی سیر ایسی بات ہے جس پر آیاتِ قرآن اور شیعہ و سُنی متواتر احادیث دلالت کرتی ہیں۔ اس کا انکار یا اسے روحانی معراج کہنا یا عالمِ خواب کی بات قرار دینا۔ آئمہ ہدیٰ کی احادیث سے عدمِ اطلاع یا یقین کی کمزوری کے باعث ہے۔

اس کے بعد علامہ مجلسی مزید کہتے ہیں:

اگر ہم اس واقعے سے متعلقہ احادیث جمع کرنا چاہیں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی۔[1]

۴۔ اہلِ سنت کے معاصر علماء میں سے الازہر کے منصور علی ناصف مشہور کتاب "التاج" کے مصنف ہیں۔ انہوں نے اس میں احادیثِ معراج کو جمع کیا ہے۔

---

[1] بحار الانوار، ج ۶ طبع قدیم ص ۳۶۸۔

Marfat.com

۵۔ مشہور مفسر فخرالدین رازی نے زیر بحث آیت کے ذیل میں واقعہ معراج کے امکان پر بہت سی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں۔ دلائل ذکر کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں:

حدیث کے لحاظ سے احادیثِ معراج مشہور روایات میں سے ہیں کہ جو اہلِ سنت کی کتبِ صحاح میں نقل ہوئی ہیں اور ان کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ سے بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں کی سیر کی۔

۶۔ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز ادارہ "بحوث علمیہ وافتاء، ودعوة وارشاد" کے سربراہ ہیں وہ دورِ حاضر کے متعصب وہابی علماء میں سے ہیں۔ وہ اپنی کتاب "التحذیر من البدع" میں کہتے ہیں:

اس میں شک نہیں ہے کہ معراج ان عظیم نشانیوں میں سے ہے جو رسولؐ کی صداقت اور بلند منزلت پر دلالت کرتی ہیں۔

یہاں تک کہ وہ کہتے ہیں:

رسول اللہؐ سے اخبار متواتر نقل ہوئی ہیں کہ اللہ انہیں آسمانوں پر لے گیا اور آپؐ پر آسمانوں کے دروازے کھول دیئے[1]

اس نکتے کا ذکر کرنا بھی انتہائی ضروری ہے کہ احادیثِ معراج میں بعض جعلی یا ضعیف ہیں کہ جو کسی طرح سے بھی قابلِ قبول نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عظیم مفسر طبرسی مرحوم نے اسی زیرِ بحث آیت کے ذیل میں احادیثِ معراج کو ان چار قسموں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) وہ روایات جو متواتر ہونے کی وجہ سے قطعی ہیں مثلاً اصل واقعہ معراج۔

(۲) وہ احادیث کہ عقلی لحاظ سے جنہیں قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں اور روایات میں اس امر کی تصریح کی گئی ہے۔ مثلاً صحن آسمان میں عظمتِ الٰہی کی بہت سی نشانیوں کا مشاہدہ کرنا۔

(۳) وہ روایات جو ہمارے ہاں موجود اصول و ضوابط پر تو پوری نہیں اترتیں البتہ ان کی توجیہ کی جاسکتی ہے۔ مثلاً وہ احادیث جو کہتی ہیں کہ رسول اللہؐ نے آسمانوں میں ایک گروہ کو جنت میں اور ایک گروہ کو دوزخ میں دیکھا۔ کہنا چاہیئے کہ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کی صفات دیکھیں (یا برزخ کی جنت اور دوزخ کی)۔

(۴) وہ روایات جو نامعقول اور باطل امور پر مشتمل ہیں اور ان کی کیفیت ان کے جعلی ہونے پر گواہ ہے۔ مثلاً وہ روایات جو کہتی ہیں کہ رسول اللہؐ نے خدا کو واضح طور پر دیکھا، اس کے ساتھ باتیں کیں اور اس کے پاس بیٹھے۔ ایسی احادیث کسی دلیل و منطق کے لحاظ سے درست نہیں ہیں اور بلاشبہ اس قسم کی روایات من گھڑت اور جعلی ہیں۔

---

[1] التحذیر ص۸۔

Marfat.com

واقعۂ معراج کی تاریخ کے سلسلے میں اسلامی مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے بعض کا خیال ہے کہ یہ واقعہ بعثت کے دسویں سال ۲۷ رجب کی شب پیش آیا بعض کہتے ہیں کہ یہ بعثت کے بارہویں سال ۱۷ رمضان المبارک کی رات وقوع پذیر ہوا جبکہ بعض اسے اوائلِ بعثت میں ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اس کے وقوع پذیر ہونے کی تاریخ میں اختلاف اصلِ واقعہ پر اختلاف میں حائل نہیں ہوتا۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ صرف مسلمان ہی معراج کا عقیدہ نہیں رکھتے، دیگر ادیان کے پیروکاروں میں بھی یہ عقیدہ کم و بیش موجود ہے۔ ان میں سے حضرت عیسیٰ کے بارے میں یہ عقیدہ عجیب تر صورت میں نظر آتا ہے۔ جیسا کہ انجیل مرقس کے باب ۶، لوقا کے باب ۲۴ اور یوحنا کے باب ۲۱ میں ہے کہ:

عیسیٰ مصلوب ہونے کے بعد دفن ہو گئے تو مُردوں میں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور چالیس روز تک لوگوں میں موجود رہے پھر آسمان کی طرف چڑھ گئے (اور ہمیشہ کے لیے معراج پر چلے گئے)۔

ضمناً یہ وضاحت بھی ہو جائے کہ بعض اسلامی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض گزشتہ انبیاء کو بھی معراج نصیب ہوئی تھی۔

معراج جسمانی تھی یا روحانی؟

شیعہ اور سُنی علمائے اسلام کے درمیان مشہور یہ ہے کہ یہ واقعہ عالمِ بیداری میں صورت پذیر ہوا۔ سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت اور سورہ نجم کی مذکورہ آیات کا ظاہری مفہوم بھی اس امر کا شاہد ہے کہ یہ واقعہ بیداری کی حالت میں پیش آیا۔

تواریخِ اسلامی بھی اس امر پر شاہدِ صادق ہیں۔ تاریخ کہتی ہے:

جس وقت رسول اللہؐ نے واقعۂ معراج کا ذکر کیا تو مشرکین نے شدت سے اس کا انکار کر دیا اور اسے آپؐ کے خلاف ایک بات بنا لیا۔

یہ بات گواہی دیتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز خواب یا مکاشفۂ روحانی کے مدعی نہ تھے ورنہ مخالفین اس قدر شور و غوغا نہ کرتے۔

یہ جو حسن بصری سے روایت ہے کہ:

کان فی المنام رؤیا راٰھا

یہ واقعہ خواب میں پیش آیا۔

اور اسی طرح جو حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ:

واللّٰہ مافقد جسد رسول اللّٰہ ولکن عرج بروحہ

خدا کی قسم بدن رسول اللہؐ ہم سے جدا نہیں ہوا صرف آپؐ کی روح آسمانوں پر گئی۔

Marfat.com

ایسی روایات ظاہراً سیاسی پہلو رکھتی ہیں [1]

معراج کا مقصد

گزشتہ مباحث پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معراج کا مقصد یہ نہیں کہ رسولِ اکرمؐ دیدارِ خدا کے لیے آسمانوں پر جائیں، جیسا کہ سادہ لوح افراد خیال کرتے ہیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض مغربی دانشور بھی ناآگاہی کی بناء پر دوسروں کے سامنے اسلام کا چہرہ بگاڑ کر پیش کرنے کے لیے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک مسٹر "گیور گیو" بھی ہیں۔ وہ اپنی کتاب "محمدؐ وہ پیغمبر ہیں جنہیں پھر سے پہچاننا چاہیئے" [2] میں کہتے ہیں:

> محمدؐ (ص) اپنے سفرِ معراج میں ایسی جگہ پہنچے کہ انہیں خدا کے قلم کی آواز سنائی دی انہوں نے سمجھا کہ اللہ اپنے بندوں کے حساب کتاب میں مشغول ہے البتہ وہ اللہ کے قلم کی آواز تو سنتے تھے مگر انہیں اللہ دکھائی نہ دیتا تھا کیونکہ کوئی شخص خدا کو نہیں دیکھ سکتا خواہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔

یہ عبارت نشاندہی کرتی ہے کہ قلم لکڑی کا تھا، ایسا کہ کاغذ پر لکھتے وقت لرزتا تھا اور آواز پیدا کرتا تھا۔ اسی طرح کی اور بہت ساری خرافات اس میں موجود ہیں۔

جبکہ مقصدِ معراج یہ تھا کہ اللہ کے عظیم پیغمبر کائنات میں بالخصوص عالمِ بالا میں موجود عظمتِ الٰہی کی نشانیوں کا مشاہدہ کریں اور انسانوں کی ہدایت و رہبری کے لیے ایک نیا ادراک اور نئی بصیرت حاصل کریں۔

امام صادق علیہ السلام سے مقصدِ معراج پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

> أن الله لا یوصف بمکان، ولا یجری علیه زمان، ولکنه عز وجل اراد أن یشرف به ملائکته وسکان سماواته، ویکرمهم بمشاهدته، ویریه من عجائب عظمته ما یخبر به بعد هبوطه۔

> خدا ہرگز کوئی مکان نہیں رکھتا اور نہ اس پر کوئی زمانہ گزرتا ہے لیکن وہ چاہتا تھا کہ فرشتوں اور آسمان کے باسیوں کو اپنے پیغمبر کی تشریف آوری سے عزت بخشے اور انہیں آپ کی زیارت کا شرف عطا کرے نیز آپ کو اپنی عظمت کے عجائبات دکھائے تاکہ واپس آکر آپ انہیں لوگوں سے بیان کریں [3]

---

[1] حسن بصری اور حضرت عائشہ سے مروی روایات بذاتِ خود محلِ اشکال ہیں کیونکہ واقعۂ معراج مکہ مکرمہ میں پیش آیا تھا۔ (ثاقب)

[2] مذکورہ کتاب کے فارسی ترجمے کا نام ہے "محمدؐ پیغمبری کہ از نو باید شناخت" ص ۱۲۵ دیکھیے۔

[3] تفسیر برہان، ج ۲ ص ۴۰۰۔

Marfat.com

معراج اور دورِ حاضر کا علم اور سائنس

گزشتہ زمانے میں بعض فلاسفہ بطلیموس کی طرح یہ نظریہ رکھتے تھے کہ نو آسمان پیاز کے چھلکے کی طرح ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔ واقعہ معراج کو قبول کرنے میں ان کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ان کا یہی نظریہ تھا۔ ان کے خیال میں اس طرح تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ آسمان شگافتہ ہو گئے تھے اور پھر آپس میں مل گئے تھے[۱]

لیکن بطلیموسی نظریہ ختم ہوگیا تو آسمانوں کے شگافتہ ہونے کا مسئلہ ہی ختم ہوگیا البتہ علم ہیئت میں جو ترقی ہوئی ہے اس سے معراج کے سلسلے میں نئے سوالات ابھرے ہیں مثلاً :

(۱) ایسے فضائی سفر میں پہلی رکاوٹ کشش ثقل ہے کہ جس پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے غیر معمولی وسائل و ذرائع کی ضرورت ہے کیونکہ زمین کے مدار اور مرکز ثقل سے نکلنے کے لیے کم از کم چالیس ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ رفتار کی ضرورت ہے۔

(۲) دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ زمین کے باہر خلا میں ہوا نہیں ہے جبکہ ہوا کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔

(۳) تیسری رکاوٹ ایسے سفر میں اُس حصے میں سورج کی جلا دینے والی تپش ہے کہ جس حصے پر سورج کی مستقیماً روشنی پڑ رہی ہے اور اسی طرح اس حصے میں مار ڈالنے والی سردی ہے کہ جس میں سورج کی روشنی نہیں پڑ رہی۔

(۴) اس سفر میں چوتھی رکاوٹ وہ خطرناک شعاعیں ہیں کہ جو فضائے زمین سے اوپر موجود ہیں مثلاً کاسمک ریز Cosmic Rays الٹراوائلٹ ریز Ultra Violet Rays اور ایکس ریز X-Rays۔ یہ شعاعیں اگر تھوڑی مقدار میں انسانی بدن پر پڑیں تو بدن کے آرگانزم Organism کے لیے نقصان دہ نہیں ہیں لیکن فضائے زمین کے باہر یہ شعاعیں بہت تباہ کن ہوتی ہیں۔ (زمین پر رہنے والوں کے لیے زمین کے اوپر موجود فضا کی وجہ سے ان کی تابش ختم ہو جاتی ہے)۔

(۵) ایک اور مشکل اس سلسلے میں یہ ہے کہ خلا میں انسان بے وزنی کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے اگرچہ تدریجاً بے وزنی کی عادت پیدا کی جا سکتی ہے لیکن اگر زمین کے باسی بغیر کسی تیاری اور تمہید کے خلا میں جا پہنچیں تو بے وزنی سے نمٹنا بہت ہی مشکل یا ناممکن ہے۔

(۶) آخری مشکل اس سلسلے میں زمانے کی مشکل ہے اور یہ نہایت اہم رکاوٹ ہے کیونکہ دَورِ حاضر کے

---

[۱] بعض قدیم فلاسفہ کا نظریہ تھا کہ آسمانوں میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اصطلاح میں وہ کہتے تھے کہ افلاک میں "خرق" (پھٹنا) اور "التیام" (ملنا) ممکن نہیں۔

Marfat.com

سائنسی علوم کے مطابق روشنی کی رفتار ہر چیز سے زیادہ ہے اور اگر کوئی شخص آسمانوں کی سیر کرنا چاہے تو ضروری ہے کہ اس کی رفتار روشنی کی رفتار سے زیادہ ہو۔

ان امور کے جواب میں ان نکات کی طرف توجہ ضروری ہے:

(i) ہم جانتے ہیں کہ فضائی سفر کی تمام تر مشکلات کے باوجود آخرکار انسان علم کی قوت سے اس پر دسترس حاصل کر چکا ہے اور سوائے زمانے کی مشکل کے باقی تمام مشکلات حل ہو چکی ہیں اور زمانے والی مشکل بھی بہت دور کے سفر سے مربوط ہے۔

(ii) اس میں شک نہیں کہ مسئلہ معراج عمومی اور معمول کا پہلو نہیں رکھتا بلکہ یہ اللہ کی لامتناہی قدرت و طاقت کے ذریعے صورت پذیر ہوا اور انبیاء کے تمام معجزات اسی قسم کے تھے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ معجزہ عقلاً محال نہیں ہونا چاہیئے اور یہ معجزہ بھی عقلاً ممکن ہے۔ باقی معاملات اللہ کی قدرت سے حل ہو جاتے ہیں۔

جب انسان یہ طاقت رکھتا ہے کہ سائنسی ترقی کی بنیاد پر ایسی چیزیں بنا لے کہ جو زمینی مرکز ثقل سے باہر نکل سکتی ہیں، ایسی چیزیں تیار کرلے کہ فضائے زمین سے باہر کی ہولناک شعاعیں ان پر اثر نہ کرسکیں اور ایسے لباس تیار کرلے کہ جو اسے انتہائی زیادہ گرمی اور سردی سے محفوظ رکھ سکیں اور مشق کے ذریعے بےوزنی کی کیفیت میں رہنے کی عادت پیدا کرلے۔ یعنی جب انسان اپنی محدود قوت کے ذریعے یہ کام کرسکتا ہے تو پھر کیا اللہ اپنی لامحدود طاقت کے ذریعے یہ کام نہیں کرسکتا؟

ہمیں یقین ہے کہ اللہ نے اپنے رسولؐ کو اس سفر کے لیے انتہائی تیز رفتار سواری دی تھی اور اس سفر میں درپیش خطرات سے محفوظ رہنے کے لیے انہیں اپنی مدد کا لباس پہنایا تھا۔ ہاں یہ سواری کس قسم کی تھی اور اس کا نام کیا تھا۔ براق؟ رفرف؟ یا کوئی اور ...؟ یہ مسئلہ قدرت کا راز ہے ہمیں اس کا علم نہیں۔

ان تمام چیزوں سے قطع نظر تیز ترین رفتار کے بارے میں مذکورہ نظریہ آج کے سائنسدانوں کے درمیان متزلزل ہو چکا ہے اگرچہ آئن سٹائن اپنے مشہور نظریے پر پختہ یقین رکھتا ہے۔

آج کے سائنسدان کہتے ہیں کہ امواج جاذبہ Rays of Attraction زمانے کی احتیاج کے بغیر آن واحد میں دنیا کی ایک طرف سے دوسری طرف منتقل ہو جاتی ہیں اور اپنا اثر چھوڑتی ہیں یہاں تک کہ یہ احتمال بھی ہے کہ عالم کے پھیلاؤ سے مربوط حرکات میں ایسے منظومے موجود ہیں کہ جو روشنی کی رفتار سے زیادہ تیزی سے مرکزِ جہان سے دور ہو جاتے ہیں (ہم جانتے ہیں کہ کائنات پھیل رہی ہے اور ستارے اور نظام ہائے شمسی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں) (غور کیجئے گا)۔

Marfat.com

مختصر یہ کہ اس سفر کے لیے جو بھی مشکلات بیان کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی عقلی طور پر اس راہ میں حائل نہیں ہے اور ایسی کوئی بنیاد نہیں کہ واقعۂ معراج کو محالِ عقلی سمجھا جائے۔ اس راستے میں درپیش مسائل کو حل کرنے کے لیے جو وسائل درکار ہیں وہ موجود ہوں تو ایسا ہو سکتا ہے۔

بہرحال واقعۂ معراج نہ تو عقلی دلائل کے حوالے سے ناممکن ہے اور نہ دَورِ حاضر کے سائنسی معیاروں کے لحاظ سے، البتہ اس کے غیر معمولی اور معجزہ ہونے کو سب قبول کرتے ہیں لہٰذا جب قطعی اور یقینی نقلی دلیل سے ثابت ہو جائے تو اسے قبول کر لینا چاہیئے[1]

واقعۂ معراج کے سلسلے میں کچھ اور پہلو بھی ہیں جن پر انشاء اللہ سورہ نجم کی تفسیر میں گفتگو ہوگی۔

* * *

[1] مزید وضاحت کے لیے کتاب "ہمہ می خواہند بدانند" کی طرف رجوع فرمائیں۔ اس میں ہم نے معراج، شق القمر اور قطبین میں عبادت کے سلسلے میں بحث کی ہے۔

Marfat.com

۲ وَاٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنٰہُ ھُدًی لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ
اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا ○
۳ ذُرِّیَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ط اِنَّہٗ کَانَ عَبْدًا
شَکُوْرًا ○
۴ وَقَضَیْنَآ اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْکِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ
مَرَّتَیْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا کَبِیْرًا ○
۵ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰھُمَا بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ
بَاْسٍ شَدِیْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ ط وَکَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ○
۶ ثُمَّ رَدَدْنَا لَکُمُ الْکَرَّةَ عَلَیْھِمْ وَاَمْدَدْنٰکُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ
بَنِیْنَ وَجَعَلْنٰکُمْ اَکْثَرَ نَفِیْرًا ○
۷ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ قف وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَھَا ط
فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْھَکُمْ وَلِیَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ
کَمَا دَخَلُوْہُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِیُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِیْرًا ○
۸ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ ج وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا م وَ
جَعَلْنَا جَھَنَّمَ لِلْکٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا ○

ترجمہ

۲ ہم نے موسیٰ کو (آسمانی) کتاب عطا کی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے

Marfat.com

ہدایت کا ذریعہ قرار دیا اور ہم نے کہا کہ ہمارے غیر کو سہارا نہ بناؤ۔

(۳) اے ان لوگوں کی اولاد کہ جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی پر) سوار کیا تھا! وہ ایک شکرگزار بندہ تھا۔

(۴) ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب (تورات) میں بتا دیا تھا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد برپا کرو گے اور بڑی سرکشی کرو گے۔

(۵) جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقع آیا تو ہم تمہارے اوپر نہایت زورآور لوگ بھیجیں گے (تاکہ وہ تم سے سختی سے نمٹیں یہاں تک کہ مجرموں کو پکڑنے کے لیے) گھروں کی تلاشی لیں گے اور یہ وعدہ قطعی ہے۔

(۶) اس کے بعد ہم تمہیں ان پر غلبہ دیں گے اور تمہارا مال اور اولاد بڑھا دیں گے اور تمہاری تعداد (دشمن سے) زیادہ کر دیں گے۔

(۷) اگر نیکی کرو گے تو اپنے آپ سے بھلائی کرو گے اور اگر بدی کرو گے تو بھی خود سے کرو گے اور جب دوسرے وعدے کا وقت آپہنچا (تو دشمن تمہارا یہ حال کرے گا کہ) تمہارے چہرے غمزدہ ہو جائیں گے اور وہ مسجد (اقصیٰ) میں یوں داخل ہوں گے جیسے پہلے دشمن داخل ہوئے تھے اور جو چیز بھی ان کے ہاتھ پڑے گی اسے درہم برہم کر دیں گے۔

(۸) ہو سکتا ہے تمہارا رب تم پر رحم کرے۔ جب تم پلٹ آؤ گے تو ہم بھی پلٹ آئیں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے سخت قید خانہ بنا رکھا ہے۔

Marfat.com

تفسیر

دو عظیم طوفانی واقعات

اس سورت کی پہلی آیت میں رسول اللہؐ کے مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک کے اعجاز آمیز سفر کا ذکر تھا۔ ایسے واقعات کا عموماً مشرکین اور مخالفین انکار کر دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہمارے درمیان میں سے ایک پیغمبر مبعوث ہو اور پھر اسے یہ سب اعزاز و اکرام حاصل ہو۔ لہٰذا زیر بحث آیات میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی کتاب کی طرف دعوت دی تھی تاکہ واضح ہو جائے کہ رسالت کا پروگرام کوئی نئی چیز نہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ بنی اسرائیل نے بھی ایسی مخالفت اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تھا جیسی اب یہ مشرکین کر رہے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب عطا کی (و اٰتینا موسی الکتاب)۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کے لیے وسیلۂ ہدایت قرار دیا (وجعلناه هدی لبنی اسرائیل)۔

اس میں شک نہیں کہ کتاب سے یہاں مراد "تورات" ہے کہ جو بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ پر نازل فرمائی تھی۔ اس کے بعد بعثتِ انبیاء کا بنیادی مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا: ان سے ہم نے کہا کہ میرے غیر کو سہارا نہ بناؤ (الا تتخذوا من دونی وکیلا)[1]

"عمل میں توحید" "عقیدے میں توحید" کی علامت ہے اور یہ امر توحید کی بنیادی باتوں میں سے ہے جو شخص عالم کائنات میں مؤثر حقیقی صرف اللہ کو جانتا ہے وہ اس کے غیر پر تکیہ نہیں کرے گا اور جو کسی اور کو سہارا بناتے ہیں یہ ان کے اعتقادِ توحید کی کمزوری کی دلیل ہے۔

آسمانی کتب کی عالی تجلیاتِ ہدایت دلوں کو نورِ توحید سے روشن کر دیتی ہے اور اس کے سبب انسان ہر غیر اللہ سے کٹ کر خدا سے وابستہ ہو جاتا ہے اور اسی پر تکیہ کرتا ہے۔

بنی اسرائیل کو جن نعماتِ الٰہی سے نوازا گیا بالخصوص کتابِ آسمانی کی صورت میں روحانی نعمت، اگلی آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاکہ ان کے احساساتِ تشکر کو ابھارا جائے۔ ارشاد ہوتا ہے: اے ان لوگوں کی اولاد کہ جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا (ذریة من حملنا مع نوح)[2]

---

[1] ترکیب نحوی کے اعتبار سے بعض مفسرین نے "الا تتخذوا من دونی وکیلا" کو تقدیر میں لئلا تتخذوا... سمجھا ہے اور بعض نے "ان" کو زائد اور "وقلنا لهم" کو مقدر سمجھا ہے کہ جو مجموعی طور پر یوں ہوگا:

وقلنا لهم لا تتخذوا من دونی وکیلا

اور ہم نے ان سے کہا کہ میرے سوا کسی کو پناہ گاہ نہ بناؤ۔

[2] "ذریة من حملنا مع نوح" جملہ ندائیہ ہے اور تقدیر میں "یا ذریة من حملنا مع نوح" تھا۔ رہا یہ احتمال کہ "ذریة" "وکیلا"

(باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

یہ بات مت بھولو کہ "نوح ایک شکرگزار بندہ تھا" (انہ کان عبدًا شکورًا) ۔
تم کہ جو اصحاب نوح کی اولاد ہو اپنے باایمان بزرگوں کی پیروی کیوں نہیں کرتے ہو؟ کیوں کفران نعمت کی راہ اپناتے ہو؟
"شکور" مبالغے کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے "زیادہ شکرگزار"۔
بنی اسرائیل کو اصحاب نوح کی اولاد شاید اس لیے کہا گیا ہے کہ مشہور تواریخ کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے۔ ان کے نام "سام" "حام" اور "یافث" تھے۔ طوفان نوح کے بعد بنی نوع انسان انہی کی اولاد میں سے ہیں اور بنی اسرائیل بھی اس لحاظ سے انہی کی اولاد سے ہیں۔
اس میں شک نہیں کہ تمام انبیاء اللہ کے شکرگزار بندے تھے لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی کچھ ایسی خصوصیات احادیث میں مذکور ہیں کہ جن کے باعث انہیں خاص طور پر "عبدًا شکورًا" کے لفظ سے نوازا گیا ہے۔ ان کے بارے میں روایات میں ہے کہ جب وہ لباس پہنتے، پانی پیتے، کھانا کھاتے یا انہیں کوئی بھی نعمت نصیب ہوتی تو فوراً ذکرِ خدا کرتے اور شکرِ الٰہی بجالاتے۔
ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:
حضرت نوح ہر روز صبح اور عصر کے وقت یہ دعا پڑھتے تھے:
اللهم انی اشهدک ان ما اصبح او امسی بی من نعمة فی دین او دنیا فمنک، وحدك لا شريك لک، لك الحمد ولك الشكر بها علی حتّٰی ترضی، وبعد الرضا۔
خداوندا! میں تجھے گواہ بناتا ہوں کہ جو بھی نعمت مجھے صبح و شام پہنچتی ہے وہ نعمتِ دین ہو یا نعمتِ دنیا، وہ نعمتِ روحانی ہو یا نعمتِ مادی — سب تیری طرف سے ہے تُو ایک اکیلا ہے، تیرا کوئی شریک نہیں، حمد و ثنا تیرے لیے مخصوص ہے اور شکر بھی تیرے ہی لیے ہے — میں تیرا اس قدر شکر کرتا ہوں کہ تُو مجھ سے راضی ہو جا اور تیری رضا کے بعد بھی میں تیرا شکر کرتا ہوں۔
اس کے بعد امام نے مزید فرمایا کہ: ....
ایسا تھا نوح کا شکر[1]

(بقیہ گزشتہ حاشیہ) کا بدل ہے یا "تتخذوا" کا مفعولِ ثانی ہے — یہ بہت بعید معلوم ہوتا ہے اور "انہ کان عبدًا شکورًا" سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ (غور کیجئے گا)

[1] مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

اس کے بعد بنی اسرائیل کی داستان انگیز تاریخ کے ایک گوشے کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:
ہم نے تورات میں بنی اسرائیل کو بتا دیا تھا کہ تم زمین میں دو دفعہ فساد کرو گے اور بڑی سرکشی کا ارتکاب کرو گے (وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتاب لتفسدن فی الارض مرتین ولتعلن علواً کبیرًا)۔
"قضاء" کے اگرچہ بہت سے معانی ہیں لیکن یہاں یہ لفظ "بتانے" کے معنی میں آیا ہے۔
نیز بعد کی آیت کے قرینے سے لفظ "الارض" سے یہاں مراد فلسطین کی مقدس زمین ہے کہ جس میں مسجد الاقصیٰ واقع ہے۔
آئندہ آیات میں ان دو عظیم حوادث کا ذکر ہے جو اللہ کی طرف سے سزا کے طور پر رونما ہوئے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب پہلے وعدے کا مرحلہ آ پہنچا اور تم فساد، خونریزی اور ظلم کے مرتکب ہوئے تو ہم اپنے بندوں میں سے ایک جنگ آزما گروہ تمہاری طرف بھیجیں گے تاکہ وہ تمہارے اعمال کی سزا کے طور پر تمہاری سرکوبی کرے (فاذا جاء وعد اولٰھما بعثنا علیکم عباداً لنا اولی بأس شدید)۔
یہ زور آور لوگ اس طرح سے تم پر حملہ کریں گے کہ تمہارے افراد کو پکڑنے کے لیے گھر گھر کی تلاشی لیں گے (فجاسوا خلال الدیار)۔
اور یہ ایک قطعی اور ناقابلِ تغیّر وعدہ ہے (وکان وعداً مفعولًا)۔
اس کے بعد ایک مرتبہ پھر اللہ کا لطف و کرم تمہارے شاملِ حال ہوا اور ہم نے تمہیں اس حملہ آور قوم پر غلبہ عطا کیا (ثم رددنا لکم الکرۃ علیھم)۔
اور ہم نے تمہیں بہت مال و ثروت سے نوازا اور کثرتِ اولاد سے تمہیں تقویت بخشی (وامددناکم باموال وبنین)۔ اس قدر کہ تمہاری تعداد دشمن سے زیادہ ہوگئی (وجعلناکم اکثر نفیرًا) [1]
یہ الطافِ الٰہی تمہارے لیے اس لیے ہے کہ شاید تم ہوش میں آؤ، اپنی اصلاح کرو، برائیوں کو ترک کر دو اور نیکیوں کا راستہ اختیار کرو کیونکہ "اگر نیکی کرو گے تو اپنے آپ ہی سے بھلائی کرو گے اور اگر بدی کرو گے تو اپنے آپ ہی سے کرو گے (ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اسأتم فلھا)۔
یہ ایک دائمی اصول ہے کہ نیکیاں اور برائیاں آخر کار خود انسان کی طرف لوٹتی ہیں۔ اگر کوئی ضرب لگاتا ہے تو دراصل وہ اپنے جسم پر لگاتا ہے اور اگر کوئی کسی کی خدمت کرتا ہے تو درحقیقت اپنی ہی خدمت کرتا ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ نہ اس سزا نے تمہیں بیدار کیا اور نہ بار دیگر نعماتِ الٰہی حاصل ہونے نے ۔

---

[1] "نفیر" اسم جمع ہے۔ اس کا معنی ہے "لوگوں کا ایک گروہ"۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ "نفر" کی جمع ہے اور دراصل یہ "نفر" (بروزن "عفو") کے مادہ سے کوچ کرنے اور کسی چیز کو سامنے لانے کے معنی میں ہے، اسی وجہ سے اس گروہ کو "نفیر" کہتے ہیں کہ جو کسی چیز کی طرف حرکت کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔

Marfat.com

تم پھر بھی سرکشی کرتے رہے اور راہ ظلم و تجاوز اختیار کیے رہے۔ تم نے زمین پر بہت فساد پیدا کر دیا اور غرور و تکبر میں حد سے گزر گئے۔

پھر اللہ کے دوسرے وعدے کی تکمیل کا مرحلہ آ پہنچا تو ایک اور زبردست جنگجو گروہ تم پر مسلط ہو جائے گا اور وہ تمہارا یہ حال کرے گا کہ تمہارے چہرے غمزدہ ہو جائیں گے (فاذا جاء وعد الاٰخرة ليسوئوا وجوهكم)۔

یہاں تک کہ وہ تمہاری عظیم عبادت گاہ بیت المقدس کو تمہارے ہاتھ سے چھین لیں گے" اور اس مسجد میں داخل ہو جائیں گے جیسے پہلی مرتبہ دشمن اس میں داخل ہوئے تھے" (وليدخلوا المسجد كما دخلوه اول مرة)۔

وہ اسی پر بس نہیں کریں گے بلکہ "ان کے سارے آباد شہر اور زمینیں اجاڑ کے رکھ دیں گے" (و ليتبروا ما علوا تتبيرًا)۔

اس کے باوجود توبہ اور خدا کی طرف بازگشت کے دروازے تم پر بند نہیں ہوئے پھر بھی "ممکن ہے اللہ تم پر رحم کرے" (عسى ربكم ان يرحمكم)۔

اور اگر ہماری طرف لوٹ آؤ تو ہم بھی اپنے لطف و کرم کا رُخ پھر تمہاری جانب کر دیں گے اور اگر تم نے فساد اور اکڑپن کو نہ چھوڑا تو پھر تمہیں ہم شدید عذاب میں مبتلا کر دیں گے (وان عدتم عدنا)۔

اور پھر یہ تو دنیا کی سزا ہے جبکہ "جہنم کو ہم نے کافروں کے لیے سخت قید خانہ قرار دیا ہے" (وجعلنا جهنم للكافرين حصيرًا)[1]

چند اہم نکات

۱۔ بنی اسرائیل کے دو تاریخی فسادات: زیرِ نظر آیات میں بنی اسرائیل کے دو اجتماعی انحرافات کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ یہ انحرافات فساد اور سرکشی پر منتج ہوتے۔ ان میں سے ہر ایک کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر سخت زور آور لوگوں کو مسلط کر دیا تاکہ وہ انہیں سخت سزا دیں اور کیفرِ کردار تک پہنچائیں۔

بنی اسرائیل کی تاریخ بہت داستان انگیز ہے۔ وہ تاریخ کے بہت سے نشیب و فراز سے گزرے ہیں کبھی انہیں کامیابی نصیب ہوئی اور کبھی وہ شکست سے دوچار ہوئے لیکن قرآن یہاں کن حوادث کی

---

[1] "حصیر" "حصر" کے مادہ سے "قید" کے معنی میں ہے اور ہر وہ جگہ جس سے نکلنے کی راہ نہ ہو اسے "حصیر" کہتے ہیں۔ چٹائی کو بھی حصیر اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے مختلف حصے باہم بُنے ہوئے اور محصور ہوتے ہیں۔

Marfat.com

طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں ہم بطور نمونہ چند ایک کا ذکر کرتے ہیں:

(۱) بنی اسرائیل کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا شخص جس نے ان پر حملہ کیا اور بیت المقدس کو تباہ کر دیا وہ بخت النصر تھا۔ یہ بابل کا حکمران تھا۔ اس حملے کے بعد بیت المقدس ستر برس تک اسی طرح برباد رہا یہاں تک کہ پھر یہودی اٹھے اور انہوں نے اس کی تعمیر نو کی۔

دوسرا شخص جس نے ان پر حملہ کیا وہ قیصر روم "اسپیانوس" تھا۔ اس نے اپنے وزیر "طرطوز" کو اس کام پر مامور کیا۔ اس نے بیت المقدس کو تباہ کرنے اور بنی اسرائیل کو کمزور اور قتل کرنے میں پوری قوت صرف کر دی۔ یہ واقعہ تقریباً سو سال قبل مسیح پیش آیا۔

لہٰذا ممکن ہے کہ وہ دو واقعات جن کی طرف قرآن حکیم میں اشارہ کیا گیا ہے یہی ہوں کہ جو بنی اسرائیل کی تاریخ میں بھی آئے ہیں کیونکہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں پیش آنے والے دوسرے واقعات اس قدر سنگین اور شدید نہیں تھے کہ ان کی حکومت بالکل ملیا میٹ ہو گئی ہو۔ بخت النصر کے حملے نے ان کی طاقت و شوکت کو بالکل تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ "کورش" کے زمانے تک ان کی صورتِ حال اسی طرح رہی۔ اس کے بعد پھر بنی اسرائیل برسرِ اقتدار آئے۔ ان کی حکومت اسی طرح برقرار رہی یہاں تک کہ پھر قیصرِ روم نے ان پر حملہ کیا اور ان کی حکومت کو ختم کر دیا۔ پھر ایک طویل مدت وہ در بدر رہے (اور اب پھر کچھ عرصہ پیشتر ان لوگوں نے انسانیت کُش سامراجی قوتوں کی مدد سے ایک حکومت قائم کی ہے اور اب وہ اس کی توسیع کے لیے کوشاں ہیں) [1]

(۲) طبرسیؒ اپنی تفسیر میں نقل کرتے ہیں کہ پیغمبرِ اکرمؐ نے فرمایا:

> پہلے فساد سے مراد زکریا اور بہت سے انبیاء کا قتل ہے اور پہلے وعدے سے مراد بخت النصر کے ذریعے اللہ کی طرف سے ان سے انتقام لینے کا وعدہ ہے اور دوسرے فساد سے مراد وہ شورش ہے جو انہوں نے "آزادی" کے بعد ایران کے ایک بادشاہ کی سرکردگی میں برپا کی اور یہ لوگ فساد اور خرابی کے مرتکب ہوئے جبکہ دوسرے وعدے سے مراد بادشاہِ روم "انطیاخوس" کا حملہ ہے۔

ایک حد تک تو یہ تفسیر پہلی تفسیر پر منطبق کی جا سکتی ہے لیکن اس کا راوی قابلِ اعتماد نہیں ہے نیز حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحیٰی علیہ السلام کی تاریخ کو بخت النصر اور اسپیانوس یا انطیاخوس کے زمانے پر منطبق نہیں کیا جا سکتا بلکہ بعض کے بقول بخت النصر "ارمیا" یا دانیال پیغمبر کا ہم عصر تھا اور یہ زمانہ حضرت

---

[1] تفسیر المیزان، ج ۱۳ ص ۴۶۔

Marfat.com

یحییٰؑ کے دور سے تقریباً چھ سو برس پہلے کا ہے لہٰذا کیونکر ممکن ہے کہ بخت النصر نے حضرت یحییٰ کے خون کے انتقام کے لیے قیام کیا ہو؟

(۳) بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں ایک مرتبہ بیت المقدس تعمیر ہوا اور بخت النصر نے اسے تباہ و برباد کر دیا۔ یہی وہ پہلا وعدہ ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد بیت المقدس ہخامنشی بادشاہوں کے زمانے میں تعمیر ہوا۔ پھر اسے طیطوس رومی نے برباد کیا (توجہ رہے کہ ہو سکتا ہے یہ "طیطوس" وہی "طرطوز" ہو جس کا سطور بالا میں ذکر آچکا ہے)۔ اس شہر کی یہی حالت رہی، یہاں تک کہ خلیفۂ ثانی کے زمانے میں اسے مسلمانوں نے فتح کیا۔[۱]

یہ تفسیر بھی مندرجہ بالا دو تفسیروں سے کوئی زیادہ اختلاف نہیں رکھتی۔

(۴) مندرجہ بالا تفاسیر اور دیگر تفاسیر کہ جو کم و بیش ان سے ہم آہنگ ہیں، کے مقابلے میں ایک اور تفسیر بھی ہے۔ اس کا احتمال سید قطب نے اپنی تفسیر فی ظلال میں ذکر کیا ہے۔ یہ تفسیر مذکورہ تفسیروں سے بالکل مختلف ہے۔ اس تفسیر کے مطابق یہ واقعات گزشتہ زمانے میں اور نزولِ قرآن کے زمانے میں پیش نہیں آئے بلکہ ان کا تعلق نزولِ قرآن سے بعد کے زمانے سے ہے۔ احتمالاً ان کا پہلا فساد آغازِ اسلام میں تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مسلمانوں کو ان کے خلاف قیام کا حکم دیا اور ان کا دوسرا فساد ہٹلر کے زمانے سے مربوط ہے کہ جب ہٹلر کی قیادت میں جرمن کے نازیوں نے یہودیوں کے خلاف قیام کیا۔[۲]

لیکن ــ اس تفسیر میں یہ اشکال ہے کہ ان واقعات میں سے کسی واقعے میں بھی فتح مندقوم بیت المقدس میں داخل بھی نہیں ہوئی چہ جائیکہ بیت المقدس برباد ہوتا۔

(۵) ایک احتمال اور بھی بعض حضرات کی طرف سے ذکر ہوا ہے اور وہ یہ کہ یہ دونوں واقعات دوسری جنگِ عظیم کے بعد کے ہیں جبکہ صیہونزم کی بنیاد پڑی اور اسلامی ممالک کے قلب میں اسرائیل نامی حکومت تشکیل دی گئی۔ بنی اسرائیل کے پہلے فساد اور سرکشی سے یہی مراد ہے اور پہلے انتقام سے مراد یہ ہے کہ جب ابتداء میں اسلامی ممالک اس سازش سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے اس کے مقابلے کے لیے قیام کیا۔ نتیجتاً انہوں نے بیت المقدس اور فلسطین کے کچھ شہر اور قصبے یہودیوں کے چنگل سے آزاد کروا لیے اور مسجدِ اقصیٰ سے یہودی اثر و نفوذ بالکل ختم ہو گیا۔

دوسرے فساد سے مراد درندہ صفت سامراجی طاقتوں کے سہارے بنی اسرائیل کا وہ حملہ ہے جس

۱۔ تفسیر ابوالفتوح رازی، ج، حاشیہ ص ۲۰۹ از قلم عالم معظم شعرانی مرحوم۔

۲۔ تفسیر فی ظلال، ج ۵ ص ۳۰۵

Marfat.com

کے نتیجے میں انہوں نے بہت سے اسلامی علاقوں پر قبضہ جما لیا اور بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کو اپنے زیرِ نگیں کر لیا۔

اس بناء پر مسلمانوں کو بنی اسرائیل پر دوسری کامیابی کا انتظار کرنا چاہیئے، مسجد اقصیٰ کو ان کے چنگل سے آزاد کروانا چاہیئے اور اسلامی سرزمین سے ان کے اثر و نفوذ کا پوری طرح خاتمہ کر دینا چاہیئے۔ ساری دنیا کے مسلمان اسی روز کے منتظر ہیں اور اللہ نے اسی کے لیے مسلمانوں سے فتح و نصرت کا وعدہ کیا ہے۔[1]

ان کے علاوہ بھی کچھ تفاسیر ہیں کہ جن کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں۔

چوتھی اور پانچویں تفسیر کے مطابق آیات میں جو ماضی کے صیغے استعمال ہوئے ہیں ان سب کو مضارع کی حالت میں ہونا چاہیئے تھا البتہ عربی ادب کے لحاظ سے جہاں فعل حروفِ شرط کے بعد آئے وہاں یہ معنی بعید نہیں ہے۔ لیکن یہ آیت:

ثم رددنا لکم الکرۃ علیھم وامددناکم باموال و بنین وجعلناکم اکثر نفیرًا

ظاہری اعتبار سے اس بات کی غماز ہے کہ کم از کم بنی اسرائیل کا پہلا فساد اور اس کا انتقام گزشتہ زمانے میں وقوع پذیر ہوا ہے۔

ان تمام چیزوں سے قطع نظر ایک اہم مسئلہ اس مقام پر لائق توجہ ہے۔ اس آیت پر غور کیجئے:

بعثنا علیکم عبادًا لنا اولی بأس شدید

ہم اپنے بندوں میں سے ایک زور آور گروہ تم پر مسلط کریں گے۔

ظاہراً یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ انتقام لینے والے افراد باایمان بہادر تھے کہ جو "عباد" "لنا" اور "بعثنا" کے اہل تھے۔ یہ وہ بات ہے کہ جس کا ذکر بہت سی مذکورہ تفاسیر میں نہیں آیا۔

البتہ اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لفظ بعث (اٹھانا، ابھارنا) ہمیشہ انبیاء اور مومنین ہی کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ قرآن حکیم میں یہ لفظ ان کے علاوہ بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ہابیل اور قابیل کے واقعے میں ہے:

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ

اللہ نے ایک کوا بھیجا کہ جو زمین کو کرید تا تھا۔ (مائدہ - ۳۱)

نیز یہی لفظ زمین و آسمان کے عذاب کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ (انعام - ۶۵)

اسی طرح لفظ "عباد" اور "عبد" قابلِ مذمت افراد کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ

[1] مجلہ مکتب اسلام شمارہ ۱۲ سال ۱۲ و یک سال ۱۳ بحث تفسیر آقائی ابراہیم انصاری۔

Marfat.com

فرقان کی آیت ۵۸ میں یہ لفظ گنہگاروں کے لیے استعمال ہوا ہے:

وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا

نیز سورہ شوریٰ کی آیت ۲۷ میں سرکشوں کے لیے یہ لفظ اس پیرائے میں استعمال ہوا ہے:

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِى الْاَرْضِ

اسی طرح سورہ مائدہ کی آیت ۱۱۸ میں خطا کاروں اور منکرینِ توحید کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ

لیکن ــ ان تمام چیزوں کے باوجود اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر یقینی قرینہ موجود نہ ہو تو زیر بحث آیات کا ظاہری اسلوب یہی کہتا ہے کہ انتقام لینے والے اہل ایمان ہیں۔

بہرحال مندرجہ بالا آیات اجمالاً ہم سے کہتی ہیں کہ بنی اسرائیل نے دو مرتبہ فساد برپا کیا اور سرکشی اختیار کی اور اللہ نے ان سے سخت انتقام لیا۔ اس بات کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بنی اسرائیل، ہم اور تمام انسان اس سے عبرت حاصل کریں اور یہ جان لیں کہ ظلم و ستم اور فساد انگیزی خدا کی بارگاہ میں سزا کے بغیر نہیں رہ سکتی اور جب ہمیں اقتدار یا قوت حاصل ہو تو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ دردناک حوادث ہمارے انتظار میں ہیں لہٰذا گزشتہ لوگوں کی تاریخ سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

۲۔ جو کام بھی کرو گے اپنے ساتھ ہی کرو گے: زیر بحث آیات میں اس بنیادی اصول کی نشاندہی کی گئی ہے کہ تمہاری اچھائیاں اور برائیاں خود تمہاری طرف لوٹتی ہیں۔ اگرچہ ظاہراً اس جملے کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں لیکن واضح ہے کہ اس مسئلے میں بنی اسرائیل کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے۔ یہ تو پوری تاریخِ انسانی کے لیے ایک دائمی قانون ہے اور خود تاریخ اس کی شاہد ہے[1]

بہت سے ایسے لوگ تھے جنہوں نے غلط اور بُرے کاموں کی بنیاد رکھی، ظالمانہ قوانین بنائے اور غیر انسانی بدعتوں کو رواج دیا اور آخرکار ان کا نتیجہ خود ان کے لیے اور ان کے ہواخواہوں کے حق میں برا نکلا اور وہ کنواں جو انہوں نے دوسروں کے لیے کھودا تھا خود اس میں جا گرے۔

خاص طور پر زمین پر فتنہ و فساد برپا کرنا، برتری جتانا اور اپنے تئیں بڑا سمجھنا (علوًا کبیرًا) ایسے

---

[1] زیر بحث آیات میں ہم نے پڑھا ہے:

ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اسأتم فلھا

جبکہ قاعدتاً "علیھا" کہا جانا چاہیئے کیونکہ برائی کرنا انسان کے فائدے میں نہیں ہے بلکہ اس کے نقصان میں ہے۔ یہ تعبیر یا تو جملے کے دونوں حصوں میں ہم آہنگی کی بنا پر ہے اور یا اس لیے ہے کہ لام یہاں اختصاص کے لیے ہے نہ کہ فائدے کے معنی میں۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ لام یہاں "الیٰ" کے معنی میں ہے یعنی برائی اس کی طرف لوٹتی ہے۔

Marfat.com

امور ہیں کہ جن کا اثر اسی جہان میں انسان کا دامن آپکڑتا ہے ۔ اسی بنا پر بنی اسرائیل بارہا سخت شکست سے دوچار ہوئے ، پراگندہ ہوئے اور انہیں رسوا کن انجام کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ انہوں نے زمین پر فتنہ و فساد برپا کیا ۔

اس وقت بھی صیہونی یہودیوں نے دوسروں کی زمین غصب کرنے ، دوسروں کو در بدر آوارۂ وطن کرنے اور ان کی اولاد کو قتل و برباد کرنے کا عمل شروع کر رکھا ہے ۔ یہاں تک کہ انہوں نے اللہ کے گھر بیت المقدس کی حرمت کا بھی پاس نہیں کیا ۔ عالمی سطح پر ان کا طرز عمل یہ ہے کہ وہ کسی قانون اور اصول کی پرواہ نہیں کرتے ۔ اگر کوئی ایک فلسطینی مجاہد ان کی طرف رائفل کی ایک گولی چلاتا ہے تو اس کے بدلے وہ مہاجر کیمپوں ، بچوں کے اسکولوں اور ہسپتالوں پر وحشیانہ بمباری کرتے ہیں اور اپنے ایک شخص کے بدلے بعض اوقات سینکڑوں بے گناہوں کو خاک و خون میں تڑپا دیتے ہیں اور بہت سے گھروں کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں ۔

وہ اپنے آپ کو کسی بین الاقوامی قانون کا پابند نہیں سمجھتے اور اعلانیہ سب کو پاؤں تلے روند دیتے ہیں ۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تمام تر قانون شکنی ، بے انصافی اور خلافِ انسانیت کردار اس لیے ہے کہ اسرائیل کو انسان کُش عالمی طاقت امریکہ کی سرپرستی حاصل ہے لیکن یہ امر بھی قابل تردید و شک نہیں کہ خود یہ قوم سراپا ظلم و بربریت ہے اور تمام تر انسانی اقدار کو پامال کرنے پر اپنی مثال آپ ہے ۔ ان کا یہ طرز عمل بذاتِ خود زمین پر فساد برپا کرنے ، بڑا بننے کی خواہش اور ظلم و استکبار کا مصداق ہے ۔ انہیں اب انتظار کرنا چاہیئے کہ پھر " عبادا لنا اولی بأس شدید " کے مصداق لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے اور ان پر غلبہ پائیں گے اور ان کے بارے میں اللہ کا قطعی وعدہ عملی شکل اختیار کرے گا ۔

۳۔ آیات کی تطبیق اسلامی تاریخ پر : متعدد روایات میں زیرِ نظر آیات کو مسلمانوں کی تاریخ میں پیش آنے والے حوادث پر منطبق کیا گیا ہے ۔ ان کے مطابق پہلا فساد اور ظلم حضرت علی علیہ السلام کی شہادت ہے اور دوسرا امام حسن علیہ السلام کی شہادت جبکہ " بعثنا علیکم عبادًا لنا اولی بأس شدید " کے مصداق حضرت مہدی قائم علیہ السلام اور ان کے انصار ہیں ۔

بعض دوسری روایات کے مطابق یہ ایک ایسی قوم کی طرف اشارہ ہے جو حضرت مہدی علیہ السلام سے پہلے قیام کرے گی[1]

یہ واضح ہے کہ ان احادیث کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ زیر بحث آیات کی تفسیر اپنے لفظی مفہوم کے مطابق نہیں ہے کیونکہ یہ آیات پوری صراحت کے ساتھ بنی اسرائیل کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں بلکہ ان روایات سے مراد یہ ہے کہ اس امت میں بھی ایسے فسادات اور مظالم کی ایسی ہی سزا ہوگی ۔

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مذکورہ بالا طرز عمل اگرچہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہے لیکن یہ ایک عمومی قانون ہے جو تمام اقوام و ملل کیلئے ہے اور ساری تاریخِ انسانی پر جاری و ساری ایک عمومی سنت ہے ۔

---

[1] نور الثقلین ج ۳ ص ۱۳۸ ۔

Marfat.com

(۹) اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَ یُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ
یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِیْرًا ۟ۙ

(۱۰) وَّ اَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا
اَلِیْمًا ۟۠

(۱۱) وَ یَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَیْرِ ؕ وَ كَانَ
الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۟

(۱۲) وَ جَعَلْنَا الَّیْلَ وَ النَّهَارَ اٰیَتَیْنِ فَمَحَوْنَاۤ اٰیَةَ الَّیْلِ وَ جَعَلْنَاۤ
اٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ
السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ وَ كُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا ۟

ترجمہ

(۹) یہ قرآن بالکل سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے اور اعمالِ صالح انجام دینے
والے مومنین کو بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔

(۱۰) اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب
تیار کر رکھا ہے۔

(۱۱) اور انسان (جلد بازی کی وجہ سے) ایسے برائی طلب کرنے لگتا ہے جیسے بھلائی
طلب کرنی چاہیے اور انسان ہمیشہ سے جلد باز ہے۔

(۱۲) اور ہم نے رات اور دن کو (توحید اور اپنی عظمت کی) دو نشانیاں قرار دیا

Marfat.com

ہے پھر ہم نے رات کی نشانی کو محو کر دیا اور دن کی نشانی کو ضیا بخش بنایا تاکہ (اس روشنی میں) تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو (اور زندگی کی تگ و دو کیلئے اٹھ کھڑے ہو) اور سالوں کی گنتی اور حساب جان لو اور ہم نے ہر چیز کو مشخص کر کے (اور واضح طور پر) بیان کیا ہے۔

تفسیر

سعادت کا بالکل سیدھا راستہ

گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل، ان کی آسمانی کتاب تورات، ان کی طرف سے احکام الٰہی کی خلاف ورزی اور اس سلسلے میں ان کی سزاؤں سے متعلق گفتگو تھی۔ اب مسلمانوں کی آسمانی کتاب قرآن مجید کی طرف بات کا رخ موڑا گیا ہے کہ جو کتب آسمانی کی آخری کڑی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ قرآن لوگوں کو مستقیم ترین اور بالکل سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے (ان ھٰذا القراٰن یھدی للتی ھی اقوم)۔

"اقوم" "قیام" کے مادہ سے ہے اور چونکہ انسان جب کسی اہم کام کو انجام دینا چاہتا ہے تو قیام کرتا ہے اور کام شروع کر دیتا ہے اسی لحاظ سے حسن طریقے اور تندہی سے کام انجام دینے کے لیے "قیام" بطور کنایہ استعمال ہوا ہے۔

ضمناً یہ بھی کہہ دیا جائے کہ لفظ "استقامت" بھی اسی مادے سے ہے اور "قیم" بھی اسی مادے سے ہے جس کا معنی ہے صاف و شفاف، مستقیم، ثابت اور ٹھوس۔

"اقوم" چونکہ افعل التفضیل کا صیغہ ہے لہٰذا صاف تر، مستقیم تر اور بالکل سیدھا کے معنی میں ہے۔ اس لحاظ سے زیر بحث آیت کا مفہوم یہ ہوگا:

قرآن ایسے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے جو زیادہ مستقیم، زیادہ صاف اور زیادہ محفوظ و مضبوط ہے۔

قرآن کے پیش کردہ عقائد صاف اور مستقیم ہیں، روشن و واضح ہیں، قابل ادراک ہیں، ہر قسم کے اوہام اور خرافات سے پاک ہیں۔ وہ عقائد کہ جو عمل کی دعوت دیتے ہیں انسانی صلاحیتوں کو مجتمع کرتے ہیں اور انسان اور عالم فطرت کے قوانین میں ہم آہنگی برقرار رکھتے ہیں۔

یہ قرآن زیادہ صاف اور زیادہ مستقیم ہے۔ اس لحاظ سے کہ ظاہر و باطن، عقیدہ و عمل، فکر و نظر اور طرز حیات کے درمیان یکجہتی پیدا کر کے سب کو اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔

Marfat.com

یہ قرآن صاف تر اور مستقیم تر ہے۔ سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظام اور قوانین کے اعتبار سے۔ اس کا نظام تمام روحانی پہلوؤں کی بھی پرورش کرتا ہے اور مادی لحاظ سے بھی کمال و ارتقاء آفرین ہے۔

یہ قرآن عبادت میں بھی افراط و تفریط سے بچاتا ہے۔

اسی طرح قرآن کا اخلاقی نظام بھی ہر طرح کے افراط و تفریط سے محفوظ رکھتا ہے۔ حرص و طمع سے بھی بچاتا ہے، اسراف اور فضول خرچی سے بھی نجات دلاتا ہے، بخل اور کنجوسی سے بھی محفوظ رکھتا ہے، حسد سے بھی روکتا ہے کمزور بن جانے اور دوسروں کو کمزور کر کے خود بڑا بن بیٹھنے سے بھی بچاتا ہے۔

یہ قرآن صاف تر اور مستقیم تر ہے۔ اپنے پیش کردہ نظام حکومت کے لحاظ سے کہ جو عدل و انصاف پر مبنی ہے اور ظلم اور ظالموں کی سرکوبی کرتا ہے۔

جی ہاں! قرآن ایسے راستے کی ہدایت کرتا ہے جو ہر لحاظ سے زیادہ صاف، زیادہ مستقیم، زیادہ محفوظ اور زیادہ مضبوط ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ "افعل التفضیل" کا صیغہ یہ معنی دیتا ہے کہ دوسری اقوام کے مذاہب میں بھی استقامت اور عدالت کی خوبیاں موجود تھیں جبکہ قرآن میں ان کی نسبت زیادہ ہیں لیکن چند پہلوؤں کی طرف توجہ کرنے سے یہ مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ:

اولاً اگر موازنہ دوسرے آسمانی ادیان کے ساتھ ہو تو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنے زمانے میں صاف، مستقیم اور مضبوط دین تھا لیکن تکامل و ارتقاء کے مطابق جب ہم آخری مرحلے یعنی مرحلۂ خاتمیت تک پہنچیں گے تو ایسا دین موجود ہوگا کہ جو صاف تر، مستقیم تر اور مضبوط تر ہوگا۔

ثانیاً اگر موازنہ دیگر آسمانی مذاہب کی بجائے دیگر مذاہب سے ہو تو بھی "افعل التفضیل" بامعنی ہوگا کیونکہ ہر مکتب و مذہب کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کم از کم ان خوبیوں کا لحاظ رکھیں لیکن ان میں موجود کوتاہیوں، خرابیوں اور انحرافوں کو مجموعی طور پر دیکھا جائے اور پھر قرآن سے ان کا موازنہ کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ یہ دین زیادہ مستقیم، زیادہ صاف اور انسان کی روحانی و مادی ضروریات سے زیادہ ہم آہنگ ہے لہٰذا یہ زیادہ مضبوط اور زیادہ محفوظ ہے۔

ثالثاً جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ "افعل التفضیل" کا صیغہ ہمیشہ اس بات کی دلیل نہیں ہوتا کہ لازماً کسی چیز سے موازنہ کیا جا رہا ہے اور لازماً دوسری طرف بھی کوئی چیز اس کے کچھ مفہوم کی حامل ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

اَفَمَنْ یَّهْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْٓ اِلَّآ اَنْ یُّهْدٰی

جو شخص حق کی طرف دعوت دیتا ہے کیا رہبری کا وہ زیادہ حق رکھتا ہے اور زیادہ اہل

Marfat.com

ہے یا وہ شخص جو حق کے راستے کا راہی ہی نہیں۔ (یونس - ۳۵)

ضمنی طور پر اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ " اقوم " کا ایک معنی زیادہ ثابت اور زیادہ محفوظ و مضبوط ہے نیز آیت کی عبارت میں موازنے کے طور پر کسی دوسری چیز کا ذکر نہیں ہے جبکہ اصطلاح کے مطابق " متعلق کا حذف ہونا عمومیت و شمولیت کی دلیل ہے " ان امور کی طرف توجہ کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو اسلام اور رسول اسلامؐ کی خاتمیت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں کیونکہ اس آیت کے مطابق یہ دین زیادہ ثابت، زیادہ باقی، زیادہ ٹھوس، زیادہ مضبوط اور زیادہ محفوظ ہے۔ (غور کیجئے گا)۔

اس مستقیم الٰہی پروگرام سے لوگوں کا تعلق چونکہ دو طرح ہے لہٰذا اس کے بعد اس رابطے اور تعلق کے نتیجے کا انہی دو حوالوں سے ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جن با ایمان لوگوں نے نیک عمل انجام دیئے ہیں قرآن انہیں خوشخبری دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے (و یبشر المؤمنین الذین یعملون الصالحات ان لهم اجرًا کبیرًا)۔

اور وہ کہ جو آخرت اور اس کی عظیم عدالت پر ایمان نہیں رکھتے (اور اس لیے انہوں نے اعمال صالح انجام نہیں دیئے) انہیں آگاہ کر دیتا ہے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہم نے تیار کر رکھا ہے (و ان الذین لا یؤمنون بالاٰخرة اعتدنا لهم عذابًا الیمًا)۔

مومنین کے لیے بشارت کی تعبیر تو واضح ہے لیکن بے ایمان اور سرکش افراد کے لیے درحقیقت یہ ایک قسم کا استہزاء ہے یا پھر مومنین کے لیے بشارت ہے کہ ان کے دشمنوں کا یہ انجام ہو گا [1]

اس طرف بھی نظر جاتی ہے کہ مومنین کے لیے اجمالاً " اجرًا کبیرًا " فرمایا گیا ہے جبکہ بے ایمان افراد کی سزا کے لیے صراحتاً " عذابًا الیمًا " فرمایا گیا ہے۔ ان دونوں تعبیرات کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ معنویٰ مادی اور روحانی و جسمانی تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔

رہی یہ بات کہ دوزخیوں کی صفات میں سے صرف " آخرت پر ایمان نہ لانے " کی نشاندہی کی گئی ہے جبکہ ان کے اعمال کے بارے میں کوئی بات نہیں کی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس بناء پر ہو کہ اگر انسان اس عظیم عدالت پر ایمان رکھتا ہو تو گناہوں سے بچانے کے لیے یہ ایمان سب سے زیادہ مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس سے قطع نظر انکارِ قیامت کا مطلب انکارِ خدا بھی ہے کیونکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ عادل و حکیم خدا اس جہان کے لوگوں کو ان حالات میں کہ جو ہم دیکھ رہے ہیں، ان کی حالت پر چھوڑ دے اور کوئی دوسرا

---

[1] سورہ نساء کی آیت ۱۳۸ کے ذیل میں ہم کہہ چکے ہیں کہ لفظ " بشارت " دراصل " بشرة " سے لیا گیا ہے اور " بشرة " کا معنی ہے " چہرہ " اور ہر وہ چیز جو انسان کے چہرے پر اثر انداز ہو، اسے مسرور یا مغموم کر دے اسے " بشارت " کہتے ہیں۔

Marfat.com

جہاں موجود نہ ہو۔ یہ امر نہ اس کی حکمت سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ اس کی عدالت سے۔ علاوہ ازیں آیت میں موجود جزا، سزا کے بارے میں گفتگو جاری ہے اور یہ گفتگو آخرت اور عدالت الٰہی کے مسئلے سے مناسبت رکھتی ہے اس لیے یہاں آخرت پر ان کے ایمان نہ لانے کا ذکر کیا گیا ہے۔

اگلی آیت میں گزشتہ بحث کی مناسبت سے بے ایمانی کی ایک اہم علت بیان کی گئی ہے اور وہ مختلف امور کے بارے میں درکار آگاہی کا نہ ہونا۔ ارشاد ہوتا ہے: جیسے انسان بھلائی کا خواہشمند ہوتا ہے اسی طرح جلد بازی کرتے ہوئے اور درکار آگاہی نہ ہونے کی وجہ سے برائی طلب کرنے لگتا ہے (و یدع الانسان بالشر دعاءہٗ بالخیر)۔

کیونکہ انسان ذاتی طور پر جلد باز ہے (وکان الانسان عجولاً)۔

اس مقام پر "دعا" کا ایک وسیع مفہوم ہے اور اس میں ہر قسم کی خواہش و طلب شامل ہے چاہے زبان سے ہو یا عمل سے۔

درحقیقت زیادہ سے زیادہ اور جلد از جلد منافع کے حصول کی تڑپ اس امر کا سبب بنتی ہے کہ مسائل کے تمام پہلوؤں کے بارے میں غور و فکر اور تحقیق و مطالعہ نہیں کرتا اور بسا ایسا ہوتا ہے کہ اس جلد بازی کے باعث انسان حقیقی فائدے اور منافع کی تمیز نہیں کر پاتا بلکہ خواہشات کی سرکشی اور بے تابی حقیقت کا چہرہ چھپا دیتی ہے اور انسان اپنی بھلائی کی بجائے برائی کے پیچھے چل نکلتا ہے۔ اس حالت میں جس طرح انسان اللہ سے بھلائی کا تقاضا کرتا ہے عدم معرفت اور غلط پہچان کے باعث برائیوں کا بھی تقاضا کرنے لگتا ہے اور جس طرح بھلائی کے لیے کوشش کرتا ہے برائی کے بھی پیچھے چل پڑتا ہے۔ یہ نوع انسانی کیلئے ایک بہت بڑی مصیبت ہے اور سعادت کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

کتنے ہی ایسے لوگ ہیں کہ جو جلد بازی کی وجہ سے خطرناک گڑھوں میں جا گرتے ہیں۔ اپنے تئیں وہ امن و خوشحالی کے راستے پر جا رہے ہوتے ہیں لیکن بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ منزلِ سعادت کے تصور میں برائیوں اور بدبختیوں میں جا پڑتے ہیں افتخار و عزت کی بجائے ذلت و رسوائی کے پانیوں میں جا گرتے ہیں۔ یہ برا نتیجہ عجلت پسندی اور جلد بازی کا ہے۔

جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آیت کا مفہوم نہ لفظی دعا میں منحصر ہے اور نہ عملی طلب میں۔ بلکہ یہ سب کچھ ایک جامع مفہوم میں موجود ہے۔ لہٰذا اگر بعض مفسرین نے اسے کسی ایک حصے میں محدود کیا ہے تو اس کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ نیز اگر بعض روایات میں صرف لفظی دعا کا ذکر ہے تو وہ در اصل ایک مصداق کی نشاندہی ہے نہ کہ پورے مفہوم کا ذکر ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں حضرت امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

واعرف طریق نجاتک وھلاکک، کی لا تدعوا اللہ بشیء عسی فیہ

Marfat.com

هلاكك ، وانت تظن ان فيه نجاتك ، قال الله تعالیٰ ويدع الانسان بالشر دعاءه بالخير وكان الانسان عجولاً ۔

اپنی نجات اور اپنی ہلاکت کے راستے کو خوب پہچان لے تاکہ تو اللہ سے کسی ایسی چیز کا مطالبہ نہ کر بیٹھے کہ جس میں تیری ہلاکت ہے جبکہ تیرا یہ گمان ہو کہ اسی میں تیری نجات ہے ۔

اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ انسان جس طرح سے بھلائی کی دعا کرتا ہے اسی طرح برائی کی طلب کرنے لگتا ہے کیونکہ انسان جلد باز ہے[1]

لہٰذا خیر و سعادت تک پہنچنے کے لیے واحد راستہ یہ ہے کہ انسان جو بھی کام کرنا چاہے بڑے غور و خوض سمجھداری اور جلد بازی سے بچتے ہوئے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر کرے اور اس سلسلے میں بے سوچے سمجھے فیصلوں سے بچے اور خواہشات نفسانی کی آلودگیوں سے اپنی رائے کو پاک رکھے پھر اللہ سے اس کام کیلئے مدد طلب کرے تاکہ منزل سعادت سے ہمکنار ہو سکے اور ہلاکت کے گڑھے میں نہ جا گرے ۔

اگلی آیت میں خلقت شب و روز ، ان کی برکات اور عالم میں ایک نظم و حساب کی موجودگی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے تاکہ توحید و معرفت الٰہی کی دلیل بھی بنے اور گزشتہ سے پیوستہ بحث قیامت کی بھی تکمیل ہو جائے اور اس کے علاوہ کاموں میں غور و خوض کرنے اور عجلت سے کام نہ لینے کے ضروری ہونے کے لیے بھی شاہد بن سکے ۔ ارشاد ہوتا ہے : رات اور دن کو ہم نے اپنی نشانیوں میں سے دو نشانیاں قرار دیا ہے (وجعلنا الليل والنهار اٰيتين) ۔

پھر ہم نے رات کی نشانی کو محو کر دیا اور اس کی جگہ دن کی نشانی لے آئے کہ جو ضیا بخش ہے (فمحونا اٰية الليل وجعلنا اٰية النهار مبصرة) ۔

اس سے ہمارے دو مقصد تھے ۔ پہلا یہ کہ "تم اپنے رب کے فضل سے بہرہ ور ہو جاؤ" (لتبتغوا فضلاً من ربكم) ۔ رات کو آرام کرو اور دن میں کام کاج اور بھاگ دوڑ کرو اور اس کے نتیجے میں نعمات الٰہی سے فائدہ اٹھاؤ ۔

دوسرا یہ کہ اپنے کاموں کے نظم و حساب کے لیے سالوں کی تعداد اور مدت معین کرو اور وقت کا حساب کتاب اور تقسیم طے کر لو (ولتعلموا عدد السنين والحساب) ۔

اور ہم نے سب کچھ مفصل اور واضح کر دیا ہے (وكل شیء فصلناه تفصيلاً) ۔ تاکہ کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہے ۔

" اٰية الليل " اور " اٰية النهار " سے مراد خود رات دن ہیں اور ان میں سے ہر ایک پروردگار

---

[1] نور الثقلین ، ج ۳ ص ۱۴۱ ۔

Marfat.com

کی ایک نشانی ہے یا "آیۃ اللیل" سے مراد چاند اور "آیۃ النہار" سے مراد سورج ہے ۔ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے[۱] لیکن آیت پر ہی غور وخوض کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ پہلی تفسیر ہی صحیح ہے ۔

"وجعلنا اللیل والنہار اٰیتین" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں سے ہر ایک اثباتِ وجودِ خدا کے لیے دلیل ایک نشانی ہے اور آیتِ شب محو ہونے سے مراد یہ ہے کہ رات کے تاریک پردے دن کے اجالے کی وجہ سے چھٹ جاتے ہیں اور رات کے وقت جو کچھ چھپ جاتا ہے دن کی روشنی میں آشکار ہو جاتا ہے ۔

قرآن نے جو بعض دوسری آیات (یونس ۔ ۵) میں سال اور مہینے کے حساب کے لیے سورج اور چاند کو پیمانہ اور ذریعہ قرار دیا ہے وہ ہمارے مذکورہ بیان کے منافی نہیں ہے کیونکہ انسانی زندگی میں نظم و حساب کے پیدا ہونے کو رات دن کی طرف بھی نسبت دی جاسکتی ہے اور چاند سورج کی طرف بھی چونکہ یہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں ۔ نہج البلاغہ کے خطبۂ اشباح میں عظمتِ الٰہی کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے امیرالمؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

وجعل شمسها اٰیة مبصرة لنهارها، وقمرها، اٰیة ممحوة من لیلها، واجراهما فی مناقل مجراهما، وقدر سیرهما فی مدارج درجهما، لیمیز بین اللیل والنهار بهما، ولیعلم عدد السنین والحساب بمقادیرهما۔

سورج کو دن کی ضیاء بخش نشانی قرار دیا اور چاند کو رات کی محو کرنے والی نشانی بنایا اور ان دونوں کو رواں دواں کر دیا ۔ ان کی حرکت کے مراحل مقرر کیے تاکہ رات اور دن کے درمیان فرق پیدا کرے اور دونوں سے حاصل کیے گئے حساب کتاب سے سالوں کا اندازہ لگایا جاسکے[۲]

یہ تفسیر بھی مذکورہ بالا پہلی تفسیر کے منافی نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں سال کے حساب کتاب کو رات دن سے بھی منسوب کیا جاسکتا ہے اور چاند سورج سے بھی کیونکہ دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں ۔

---

[۱] پہلی صورت میں "اضافت بیانیہ" اور دوسری صورت میں "اضافت اختصاصیہ" ہوگی ۔

[۲] نہج البلاغہ، خطبہ اشباح، خطبہ نمبر ۹۱ ۔

Marfat.com

چند اہم نکات

۱۔ کیا انسان ذاتی طور پر جلد باز ہے؟ زیر بحث آیت میں تو انسان کو جلد باز کہا گیا ہے لیکن ایسی آیات بھی ہیں جن میں انسان کو "ظلوم"، "جھول"، "کفور"، سرکش، کم ظرف اور مغرور وغیرہ کہا گیا ہے۔

ان تعبیروں سے بعض اوقات یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف یہ کہا گیا ہے اور دوسری طرف انسان کے پاک فطرت اور الٰہی روح کے حامل ہونے کا ذکر ہے ۔ ان دونوں کو کس طرح ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے؟

دوسرے لفظوں میں اسلامی تصور کائنات کے مطابق انسان ایک عالی مرتبہ موجود ہے، خلیفۃ اللہ اور زمین میں اللہ کی نمائندگی کے لائق ہے۔ انسان فرشتوں کا استاد اور ان سے برتر ہے ۔ یہ بات مذکورہ مذمت آمیز تعبیرات سے کیونکر ہم آہنگ ہے؟

اس سوال کا جواب ایک ہی جملے میں دیا جا سکتا ہے کہ انسان کا یہ تمام تر مقام، اہمیت اور قیمت مشروط ہے اور وہ شرط ہے "ہادیان الٰہی کے زیر نظر تربیت"۔ اس صورت کے علاوہ انسان خود رو گھاس پھونس کی طرح پرورش پاتا ہے اور خواہشات و شہوات میں غوطے کھاتا رہتا ہے اور اپنی عظیم صلاحیتیں کھو دیتا ہے اور اس میں منفی پہلو آشکار ہو جاتے ہیں۔

اس بنا پر ۔ اگر مذکورہ شرط پوری ہو جائے تو وہ تمام مثبت صفات جو قرآن حکیم میں انسان کے بارے میں آئی ہیں وہ صورت پذیر ہو جائیں گی اور اگر یہ شرط پوری نہ ہوئی تو مذکورہ منفی صفات نمایاں ہو جائیں گی اسی لیے سورہ معارج کی آیہ ۱۹ تا ۲۳ میں ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۙ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۙ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۙ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۙ

انسان بہت کم ظرف پیدا ہوا ہے۔ جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بے تاب ہو جاتا ہے اور جب اسے کوئی اچھائی میسر آتی ہے تو بخل کرتا ہے سوائے ان نماز گزاروں کے کہ جو ہمیشہ اس طرز عمل پر باقی رہتے ہیں۔

اس سلسلے میں مزید تفصیل تفسیر نمونہ کی آٹھویں جلد میں سورہ یونس کی آیت ۱۲ کے ذیل میں بیان کی جا چکی ہے۔

۲۔ جلد بازی ۔ ایک مصیبت: کسی چیز کو زیادہ پسند کرنا، سطحی اور محدود فکر، خواہشات کا انسان پر غلبہ اور کسی چیز کے بارے میں حد سے زیادہ اچھا گمان ۔ یہ سب جلد بازی کے عوامل ہیں۔ عام طو

Marfat.com

پر سطحی مطالعہ اور ابتدائی آگاہی کسی امر کی حقیقت اور اس کے نفع و نقصان کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہوتے لہٰذا عموماً جلد بازی ندامت، نقصان اور پشیمانی کا موجب بنتی ہے۔ یہاں تک کہ زیر بحث آیات کے مطابق بعض اوقات عجلت کے باعث انسان غلط کاموں کے پیچھے ایسی تیزی سے چل پڑتا ہے جس تیزی سے اچھے کاموں کے پیچھے جاتا ہے۔

پوری تاریخ انسانی میں انسان کو جن تلخ کامیوں، شکستوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ان کا شمار ممکن نہیں اور خود ہم نے اپنی زندگی میں اس کے کئی نمونے دیکھے ہیں اور اس کے تلخ ثمرات چکھے ہیں۔

"عجلت" کے مقابل "تثبت" اور "تأنی" یعنی توقف کرنا، تفکر و تأمل کرنا اور کسی کام کے انجام دینے کے لیے اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

انما اهلك الناس العجلة ولو ان الناس تثبتوا لم يهلك احد

لوگوں کو ان کی جلد بازی نے مار ڈالا اگر لوگ تأمل اور سوچ بچار سے کام انجام دیتے تو کوئی شخص ہلاک نہ ہوتا[۱]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

مع التثبت تكون السلامة، ومع العجلة تكون الندامة

توقف و تأمل کرنے میں سلامتی ہے اور جلد بازی میں ندامت ہے[۲]

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

ان الاناة من الله والعجلة من الشيطان

سوچ سمجھ کر کام کرنا اللہ کی طرف سے ہے اور عجلت شیطان کی جانب سے ہے[۳]

البتہ اسلامی روایات میں "نیک کام جلدی کرنے کا باب" بھی موجود ہے۔ ان میں سے ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے، آپؐ فرماتے ہیں:

ان الله يحب من الخير ما يعجل

اللہ کو پسند ہے کہ نیک کام میں جلدی کی جائے[۴]

اس سلسلے میں بہت سی روایات ہیں۔ یہاں بے جا تاخیر، تساہل اور آج کل کرنے کے مقابل عجلت کا حکم ہے کیونکہ یہ طرز عمل عام طور پر کاموں میں مشکلیں اور رکاوٹیں پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے۔

---

[۱] و [۲] و [۳] سفینۃ البحار، ج ۱ ص ۱۲۹۔

[۴] اصول کافی، ج ۱، کتاب ایمان و کفر، باب "تعجیل فعل الخیر"۔

Marfat.com

اس امر کی شاہد وہ حدیث ہے جو اسی باب میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے' آپؑ فرماتے ہیں :

من ھم بشیء من الخیر فلیعجله فان کل شیء فیه تأخیر فان للشیطان فیه نظرة

جو شخص کسی کارِ خیر کا ارادہ کرلے اسے چاہیئے کہ اس میں جلدی کرے کیونکہ جس کام میں تاخیر کروگے شیطان اس میں حیلے بہانے پیدا کردے گا۔[1]

اس بنا پر کہنا چاہیئے کہ کاموں میں سرعت اور مضبوط ارادہ تو ضرور ہونا چاہیئے لیکن جلد بازی نہیں۔

دوسرے لفظوں میں مذموم ایسی جلد بازی ہے کہ جس کے نتیجے میں کام بغیر تمام پہلوؤں کا جائزہ لیے اور بغیر تحقیق و شناخت کے صورت پذیر ہو جائے اور لائقِ تحسین ایسی سرعت ہے جو مصمم ارادہ کرلینے کے بعد تاخیر سے بچنے کے لیے ہو۔

روایات میں ہے کہ "نیک کام میں جلدی کرو" یعنی پہلے یہ جان لو کہ یہ کام۔ کارِ خیر ہے اور جب اس کا اچھا ہونا ثابت ہو جائے تو پھر اس میں تساہل نہ برتو۔

۳۔ کائنات میں نظم و حساب کا انسانی زندگی پر اثر : تمام تر نظامِ کائنات کسی حساب کتاب اور نظم و شمار پر قائم ہے۔ نظامِ عالم کی کوئی چیز بغیر کسی حساب کتاب کے نہیں ہے۔ فطری امر ہے کہ انسان کہ جو اس سارے نظام کا ایک جزو ہے کسی حساب کتاب کے بغیر زندگی بسر نہیں کرسکتا۔

اسی بنا پر قرآن کی مختلف آیات میں یہ فرمایا گیا ہے کہ چاند، سورج یا رات دن کا وجود انسان کے لیے نعماتِ الٰہی میں سے ہے کیونکہ یہ انسانی زندگی میں نظم و حساب پیدا کرنے کا ایک عامل ہے' کیونکہ بے نظم زندگی فنا اور نابودی کا سبب ہے۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ زیرِ مطالعہ آیات میں رات اور دن کی نعمت کے دو فائدے ذکر کیے ہیں :

ایک — "ابتغاء فضل الله" — کہ جو عام طور پر مفید اور تعمیری کام کے معنی میں ہے۔

دوسرا — سالوں کا حساب جاننا۔

---

[1] اصول کافی، ج ۱، کتاب ایمان و کفر، باب "تعجیل فعل الخیر"۔

Marfat.com

ان دونوں کا اکٹھا ذکر شاید اس بات کی دلیل ہے کہ " ابتغاء فضل اللہ" "نظم وحساب" سے استفادہ کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔

گزشتہ زمانے میں شاید یہ بات اتنی واضح نہیں تھی لیکن آج کی دنیا تو اعداد وشمار کی دنیا ہے آج تو ہر اقتصادی، سماجی، سیاسی، فوجی، سائنسی اور ثقافتی ادارے میں شماریات کا شعبہ ہوتا ہے۔ ہر کارخانے میں یہ شعبہ ہوتا ہے۔ دورِ حاضر میں اس قرآنی اشارے کی گہرائی کی طرف توجہ کرنا چاہیئے اور یہ جاننا چاہیئے کہ قرآن نہ صرف یہ کہ زمانہ گزرنے سے پرانا نہیں ہوتا بلکہ جوں جوں وقت گزرتا ہے اس کی تازگی زیادہ نکھر کر سامنے آتی ہے[1]

* * * *

---

[1] اس سلسلے میں ہم نے سورہ یونس کی آیت ۵ کے ذیل میں بھی تفصیلی بات کی ہے۔ اس سلسلے میں تفسیر نمونہ کی آٹھویں جلد میں مذکورہ آیت کی تفسیر کی طرف رجوع کیجئے۔

Marfat.com

(١٣) وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ
الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝
(١٤) اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا ۝ؕ
(١٥) مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا
یَضِلُّ عَلَیْهَا ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ
حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝

ترجمہ

(١٣) اور ہر شخص کے اعمال کو ہم نے اس کے گلے کا ہار بنا دیا ہے اور روزِ قیامت اس کے لیے ہم ایک کتاب نکالیں گے کہ جسے وہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائے گا۔

(١٤) (یہ اس کا نامۂ اعمال ہی ہوگا۔ ہم اس سے کہیں گے) اپنی کتاب پڑھ، آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے۔

(١٥) جو شخص بھی ہدایت پائے اس نے اپنے لیے ہدایت پائی اور جو شخص گمراہ ہو وہ اپنے ہی نقصان میں گمراہ ہوا (اس کا نقصان خود اسی کو پہنچے گا) اور کوئی شخص دوسرے کا بوجھ اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا ہم (لوگوں کو ان کی ذمہ داریاں بتانے کے لیے) پیغمبر مبعوث کیے بغیر کسی (شخص یا قوم) کو عذاب نہیں دیتے۔

تفسیر

چار اہم اسلامی اصول

گزشتہ آیات میں معاد و قیامت اور حساب و کتاب کے بارے میں گفتگو تھی۔ اسی مناسبت سے

Marfat.com

زیر بحث آیات میں انسان کے اعمال کے حساب و کتاب کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ گفتگو قیامت میں اس معاملے کی کیفیت سے شروع ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہر شخص کے اعمال کو ہم نے اس کے گلے کا ہار بنا دیا ہے (وکل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہ)۔

"طائر" پرندے کے معنی میں ہے لیکن عربوں کے درمیان معمول تھا کہ وہ پرندوں کے ذریعے نیک یا بد فال نکالتے تھے اور ان کی حرکت کی کیفیت سے نتیجہ نکالتے تھے۔ یہاں اس چیز کی طرف اشارہ ہے۔ مثلاً اگر ایک پرندہ ان کی دائیں طرف اڑ رہا ہوتا تو اسے نیک فال سمجھتے اور اگر بائیں طرف اڑ رہا ہوتا تو اسے بد فال خیال کرتے۔ اسی لیے یہ لفظ زیادہ تر فالِ بد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے حالانکہ "تفأل" زیادہ تر نیک فال کے لیے بولا جاتا ہے۔

آیاتِ قرآن میں بھی بارہا "تطیر" فالِ بد کے معنی میں آیا ہے۔ مثلاً:

وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوۡا بِمُوۡسٰى وَمَنۡ مَّعَهٗ ؕ

فرعون والوں کو کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو وہ اسے موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست سمجھتے تھے۔ (اعراف - ۱۳۱)

نیز سورہ نمل کی آیت ۴۷ میں ہے:

قَالُوا اطَّيَّرۡنَا بِكَ وَبِمَنۡ مَّعَكَ ؕ

قوم صالحؑ کے مشرکین کہنے لگے: ہم تجھے اور تیرے ساتھیوں کو منحوس اور فالِ بد سمجھتے ہیں۔

اسلامی احادیث میں "تطیر" سے منع کیا گیا ہے اور اس کے مقابلے میں "توکل علی اللہ" کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

بہرحال زیر بحث آیت میں بھی "طائر" اسی معنی کی طرف اشارہ ہے یا پھر یہ قسمت کے معنی میں ہے کہ جو نیک و بد فال کے قریب قریب ہے۔

قرآن درحقیقت کہتا ہے کہ نیک و بد فال اور اچھی بری قسمت کوئی چیز نہیں۔ یہ تو تمہارے اعمال ہیں کہ جنہیں تمہاری گردن میں لٹکایا جائے گا۔

"الزمناہ" (ہم نے لازم قرار دیا ہے اس کو) اور "فی عنقہ" (اس کی گردن میں) کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کے اعمال اور ان کے نتائج دنیا اور آخرت میں اس سے جدا نہیں ہوتے اور ہر حالت میں اسے ان کا مسئول اور ذمہ دار ہونا چاہیئے۔ جو کچھ ہے عمل ہے باقی سب باتیں ہیں۔

بعض مفسرین نے لفظ "طائر" کے انسانی اعمال پر اطلاق سے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ انسان

Marfat.com

کے اچھے بُرے اعمال گویا ایک پرندے کی مانند ہیں کہ جو اس کے وجود سے پرواز کرتا ہے۔ اسی لیے ان پر "طائر" کا اطلاق ہوا ہے۔

زیر بحث آیت میں لفظ "طائر" اچھائی اور برائی سے انسان کے حصے کے معنی میں ہے یا دلیل اور رہنما کے معنی میں ہے یا نامۂ اعمال کے معنی میں ہے یا برکت و نحوست کے معنی میں ہے۔

ان میں سے بعض تفاسیر سے تو وہی مفہوم نکلتا ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں جبکہ بعض تفاسیر آیت کے مفہوم سے بہت دُور ہیں۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: روزِ قیامت ہم اس کے لیے کتاب نکالیں گے کہ جسے وہ اپنے سامنے کُھلا ہُوا پائے گا (و نخرج له یوم القیامة کتابًا یلقاه منشورًا)۔

واضح ہے کہ "کتاب" سے مراد انسان کے نامۂ اعمال کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے۔ وہی نامۂ اعمال کہ جو اس دنیا میں بھی موجود ہے کہ جس میں اس کے اعمال ثبت ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یہاں وہ نامۂ اعمال پوشیدہ اور وہاں کھلا ہُوا سامنے رکھا ہوگا۔ "نخرج" (نکالیں گے) اور "منشور" (کھلا ہُوا) کی تعبیر اسی معنی کی طرف اشارہ ہے کہ جو اس جہان میں مخفی ہے وہاں آشکار اور کھلا ہُوا ہوگا۔

نامۂ اعمال اور اس کی حقیقت کے بارے میں آئندہ صفحات میں ہم مزید گفتگو کریں گے۔

تو اُس وقت اس سے کہا جائے گا: اپنا نامۂ اعمال خود پڑھ لے (اقرأ کتابك)۔ اپنا حساب کتاب کرنے کے لیے آج تُو خود ہی کافی ہے (کفٰی بنفسك الیوم علیك حسیبًا)۔

یعنی مسائل اس قدر واضح ہیں کہ جائے کلام نہیں ہے۔ جو شخص بھی اس نامۂ اعمال کو دیکھے گا خود فیصلہ کر سکے گا، چاہے وہ خود مجرم ہی کیوں نہ ہو کیونکہ یہ نامۂ اعمال خود اس کے اعمال یا اعمال کے آثار کا مجموعہ ہے لہٰذا کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس کا انکار ہو سکے۔

اگر مَیں اپنی ریکارڈ شدہ آواز سنوں یا کوئی اچھا یا بُرا کام کرتے ہوئے کھینچی گئی اپنی تصویر دیکھوں تو کیا اس کا انکار کر سکتا ہوں۔ نامۂ اعمال کی کیفیت روزِ قیامت اس سے بھی زیادہ واضح اور باریک تفصیلات کے ساتھ ہوگی۔

اگلی آیت میں حساب اور جزاء کے بارے میں چار اصولی احکام بیان کیے گئے ہیں:

۱۔ جو شخص ہدایت پالے تو اس نے اپنے ہی فائدے میں ہدایت پائی ہے اور اس کا نتیجہ خود اسی کو حاصل ہوگا (من اهتدٰی فانما یهتدی لنفسه)۔

۲۔ اور جو شخص گمراہی کا راستہ اپنا لے تو وہ اپنے ہی نقصان میں گمراہ ہُوا ہے اور اس کے بُرے نتائج خود اسی کے دامن گیر ہوں گے (و من ضل فانما یضل علیها)۔

ان دو احکام کی نظیر اسی سورت کی ساتویں آیت میں بھی گزر چکی ہے۔

Marfat.com

۳۔ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنے دوش پر نہیں اٹھائے گا اور کسی کو دوسرے کے جرم کی سزا نہیں دی جائے گی (ولا تزر وازرۃ وزر اخرٰی)۔

"وزر" کا معنی ہے "بھاری بوجھ" یہ لفظ مسئولیت اور جوابدہی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ روحانی اعتبار سے یہ بھی انسان کے کندھے پر ایک بھاری بوجھ کی مانند ہی ہے" وزیر" کو بھی اسی لیے "وزیر" کہتے ہیں کہ سربراہِ مملکت یا عوام کی طرف سے اس کے کندھے پر ایک بھاری بوجھ ہوتا ہے۔

یہ ایک عمومی قانون ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا۔

البتہ یہ قانون سورہ نحل کی آیت ۲۵ کے مفہوم کے منافی نہیں ہے کہ جس میں ہے کہ گمراہ کرنے والے افراد سے ان لوگوں کے بارے میں بھی جوابدہی ہوگی جنہیں انہوں نے گمراہ کیا ہے کیونکہ دوسروں کو گمراہ کرنا بھی بذاتِ خود گناہ ہے یا گمراہ کرنے والے مثل فاعل شمار ہوں گے لہٰذا درحقیقت یہ ان کے اپنے گناہوں کا بوجھ ہے دوسرے لفظوں میں یہاں "سبب" کام انجام دینے والے کے حکم میں ہے۔

متعدد روایات کے مطابق جو شخص اچھی یا بُری رسم کی بنیاد رکھے گا وہ جزا اور سزا میں اس رسم کی پیروی کرنے والوں کا شریک ہے۔ جو کچھ ہم نے سطورِ بالا میں کہا ہے یہ روایات اس سے متضاد نہیں ہیں کیونکہ کسی سنت یا رسم کی بنیاد رکھنے والا درحقیقت عمل کے بنیادی اسباب میں سے ہے اور عمل میں شریک ہے۔

۴۔ آخر میں چوتھا حکم یوں بیان کیا گیا ہے: ہم کسی شخص یا قوم کو اس وقت تک سزا نہیں دیتے جب تک ان کے لیے کوئی پیغمبر مبعوث نہ کریں تاکہ وہ پوری طرح انہیں ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرکے ان پر حجت تمام کردے (وما کنا معذبین حتّٰی نبعث رسولاً)۔

مفسرین میں اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ یہاں عذاب سے مراد ہر قسم کا دنیاوی یا اُخروی عذاب ہے یا خصوصیت سے "عذابِ استیصال" ہے (یعنی طوفانِ نوح کی طرح کا ہولناک عذاب)۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ آیت کا ظاہری مفہوم مطلق ہے اور اس میں ہر قسم کا عذاب شامل ہے۔

نیز اس بارے میں بھی مفسرین میں اختلاف ہے کہ یہ حکم شرعی مسائل کہ جنہیں نقلی دلائل سے معلوم کیا جاتا ہے کے لیے مخصوص ہے یا اصولی و فروعی اور عقلی و نقلی تمام مسائل سے مربوط ہے۔ البتہ اگر ہم آیت کے ظاہری مفہوم کو دیکھیں تو مطلق ہے۔ لہٰذا کہنا چاہیئے اصول و فروعِ دین سے مربوط تمام عقلی و نقلی احکام اس میں شامل ہے۔

آیت کے ظاہری مفہوم کے لحاظ سے اس گفتگو کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مسائل بھی جن کے بارے میں عقل مستقلاً اچھا یا بُرا ہونے کا فیصلہ رکھتی ہے (مثلاً عدل کا اچھا ہونا اور ظلم کا بُرا ہونا) اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے ان کے بارے میں بھی کسی کو اس وقت تک سزا نہیں دیتا جب تک خدا کے پیغمبر نہ آئیں اور

Marfat.com

حکمِ نقل کے ذریعے حکمِ عقل کی تائید نہ کریں۔ (غور کیجئے گا)۔

لیکن یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ عقل جن امور کے بارے میں مستقل فیصلہ رکھتی ہے وہ بیانِ شرعی کے محتاج نہیں ہیں اور ایسے امور کے لیے حکمِ عقل اتمامِ حجت کے لیے کافی ہے لہٰذا ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم مستقلاتِ عقلی کو اس آیت سے مستثنیٰ سمجھیں اور اگر ایسا نہ سمجھیں تو پھر عذاب کے اس جملے میں عذابِ استیصال کا معنی لینا ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم کی وجہ سے ظالموں اور منحرفوں کو اس وقت تک نابود نہیں کرے گا جب تک انہیں سعادت کی تمام راہیں بتانے والا پیغمبر ان میں مبعوث نہ کرلے۔ وہ پیغمبران سے مستقلاتِ عقلی کے بارے میں بھی شرعی حکم بیان کرے گا اور عقل و نقل دونوں حوالوں سے اتمامِ حجت کرے گا (غور کیجئے گا)۔

چند اہم نکات

۱۔ اچھی اور بُری فال : کسی چیز یا کام سے نیک و بد فال لینا تمام قوموں میں تھا اور آج بھی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس کا سرچشمہ حقائق تک دسترس نہ ہونا اور واقعات کے اسباب و علل سے لاعلمی ہے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ نیک یا بد فال کا کوئی طبعی اثر نہیں ہے البتہ اس کا نفسیاتی اثر ہوتا ہے۔ نیک فال امید آفریں ہوتی ہے جبکہ بد فال یاس، ناامیدی اور کمزوری کا موجب بنتی ہے۔ اسلام چونکہ ہمیشہ اچھی چیزوں کا خیر مقدم کرتا ہے اس لیے اسلام نے نیک فال سے منع نہیں کیا، البتہ بد فال کی شدید مذمت کی ہے۔ یہاں تک کہ بعض روایات میں اسے سرحدِ شرک میں شمار کیا گیا ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

الطیرة شرک

بُری فال لینا (اور خدا کے مقابلے میں اسے اپنی قسمت میں مؤثر جاننا) ایک قسم کا خدا کی ذات میں شرک کرنا ہے۔

اس سلسلے میں چھٹی جلد میں ہم سورہ اعراف کی آیت ۱۳۱ کے ذیل میں گفتگو کرچکے ہیں۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ صحیح اور اصلاحی پہلوؤں سے اس قسم کے تخیلاتی امور سے اسلام نے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔

مثلاً عموماً کہا جاتا ہے کہ فلاں دلہن خوش قدم تھی یا بدقدم تھی۔ جس دن سے اس نے فلاں شخص کے گھر میں قدم رکھا ہے وہ ایسا ایسا ہوگیا ہے۔ یہ ایک فضول بات سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اسلام نے اسے تعمیری اور اصلاحی شکل دی ہے۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے :

من شوم المرئة غلاء مهرها وشدة مئونتها ....

Marfat.com

عورت کی ایک نحوست یہ ہے کہ اس کا حق مہر زیادہ ہو اور اخراجات بھاری ہوں۔[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

اما الدار فشؤمها ضيقها وخبث جيرانها

منحوس گھر وہ ہے کہ جو تنگ و تاریک ہو اور جس کے ہمسائے بُرے لوگ ہوں۔[2]

خوب غور کریں کہ وہی الفاظ جنہیں لوگ غلط اور بے ہودہ مفاہیم کے لیے استعمال کرتے ہیں انہیں حقیقی اور اصلاحی مفاہیم کے لیے صرف کیا گیا ہے اور بے راہ روی کی طرف جانے والے خیال وافکار کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت کی گئی ہے۔

اس بحث کی مؤید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث پر ہم اپنی اس گفتگو کو ختم کرتے ہیں۔ آپؐ فرماتے ہیں:

اللهم لا خير الا خيرك، ولا طير الا طيرك ولا رب غيرك

بارالہا! خیر وہی ہے جو تیری طرف سے ہو اور کوئی اچھی بُری فال تیرے ارادے کے بغیر کچھ نہیں اور تیرے علاوہ کوئی رب نہیں۔

۲۔ **انسان کا عجیب اعمال نامہ:** قرآن حکیم کی بہت سی آیات اور روایات میں انسانوں کے نامۂ اعمال کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر ان آیات و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے تمام اعمال اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ ایک رجسٹر میں لکھے جاتے ہیں اور اگر انسان نیک ہوا تو روزِ قیامت اس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور اگر بُرا ہوا تو بائیں ہاتھ میں۔

سورۂ حاقہ میں ہے:

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَیَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِیَهْ ۝

جسے اس کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں تھمایا جائے گا فخر سے کہے گا کہ آیئے اور ہمارا نامۂ اعمال پڑھیے۔ (حاقہ - ۱۹)

نیز یہ بھی فرمایا گیا ہے:

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِیَهْ ۝

لیکن جسے اس کا نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں تھمایا جائے گا وہ کہے گا: اے کاش! میرا نامہ اعمال مجھے نہ تھمایا جاتا۔ (حاقہ - ۲۵)

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۳ ص ۱۰۲۔

[2] سفینۃ البحار، ج ۱ ص ۶۹۸۔

Marfat.com

سورہ کہف کی آیت ۴۹ میں ہے :

وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا ۚ وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ۝

بنی آدم کے اعمال نامے کھول دیئے جائیں گے تو تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اس کی تحریر سے خوف کھائیں گے اور کہیں گے ! ہائے ہم پر افسوس ! یہ کیسی کتاب ہے کہ اس میں کوئی چھوٹا بڑا گناہ شمار کیے بغیر نہیں چھوڑا گیا اور جو کچھ انہوں نے انجام دیا تھا اسے موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا ۔

ایک حدیث میں زیر بحث آیت " اقرأ کتابك ۔۔۔۔" کے ذیل میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا :

یذکر العبد جمیع ما عمل ، وما کتب علیه حتی کانه فعله تلك الساعة ، فلذالك قالوا یا ویلتنا مال هٰذا الکتاب لا یغادر صغیرة ولا کبیرة الا احصاها

جو کچھ انسان انجام دے چکا ہے اور جو اس کے نامۂ اعمال میں درج ہے سب کچھ اسے یاد آجائے گا اور اس طرح سے کہ جیسے اس نے ابھی ابھی انجام دیا ہے لہٰذا مجرمین پکاریں گے اور کہیں گے کہ یہ کیسی کتاب ہے کہ جس نے کوئی چھوٹا بڑا گناہ لکھے بنا نہیں چھوڑا ۔[1]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نامۂ اعمال کیا ہے اور کیسا ہے ۔ ظاہر ہے کہ وہ عام کتاب، یا رجسٹر یا فائل کی طرح کا تو نہیں ہوگا ۔ اسی لیے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ نامۂ اعمال "روح انسان" کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے کہ جس میں تمام اعمال کے آثار ثبت ہیں[2] کیونکہ ہم جو بھی عمل انجام دیتے ہیں وہ لازمی طور پر ہماری روح پر اثر مرتب کرتا ہے ۔ یا یہ کہ یہ نامۂ اعمال ہمارے جسم کے اعضا اور گوشت پوست اور اس کے گرد کی زمین ہوا اور فضا ہے کہ جس میں ہم اعمال انجام دیتے ہیں کیونکہ ہمارے اعمال ہمارے جسم پر اثرات مرتب کرنے کے علاوہ ہوا اور زمین پر بھی اثر چھوڑتے ہیں اگرچہ اس دنیا میں ہم ان آثار کو محسوس کر نہیں سکتے لیکن بلاشبہ وہ موجود ہوتے ہیں اور روز قیامت کہ جب ہمیں

۱۔ نور الثقلین ، ج ۳ ص ۱۴۴ ۔

۲۔ تفسیر صافی ۔

Marfat.com

ایک نئی قوتِ ادراک حاصل ہوگی ہم انہیں دیکھ سکیں گے۔

سطور بالا میں جو تفسیر بیان ہوئی ہے اس کے بارے میں لفظ "اقرأ" (پڑھ) سے غلط فہمی پیدا نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ پڑھنے کا بھی ایک وسیع مفہوم ہے اور اس میں ہر قسم کا مشاہدہ شامل ہے۔ مثلاً روزمرہ کی گفتگو میں ہم کبھی کبھی کہتے ہیں: "مَیں نے اس کی آنکھوں سے پڑھ لیا ہے کہ اس کا ارادہ کیا ہے" یا "فلاں آدمی کے فلاں کام سے مَیں نے باقی بات پڑھ لی ہے" اسی طرح بیماروں کے ایکس رے کو دیکھنے کے لیے بھی پڑھنے کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں ہے کہ اس کے نامۂ اعمال کے مندرجات کسی طرح بھی قابلِ انکار نہیں ہیں کیونکہ وہ خود عمل کے حقیقی اور تکوینی آثار ہیں۔ بالکل انسان کی ٹیپ شدہ آواز کی طرح یا اس کی تصویر کی طرح اور یا اس کی انگلی کے نشان کی طرح۔

۳۔ گنہگار کے ساتھ بے گناہ نہیں جلے گا: عوام میں مشہور ہے کہ جب آگ لگتی ہے تو خشک و تر سب کچھ جل جاتا ہے۔ لیکن منطق، عقل اور تعلیماتِ انبیاء کے مطابق کسی بے گناہ کو کسی دوسرے کے گناہ کی وجہ سے سزا نہیں ملے گی۔ قوم لوط کے تمام شہروں میں صرف ایک گھر ایمان والوں کا تھا۔ جب اللہ نے اس منحرف اور غلیظ قوم پر عذاب نازل کیا تو اس ایک گھرانے کو بچا لیا۔

زیر بحث آیات میں بھی صراحت سے فرمایا گیا ہے:

ولا تزر وازرة وزر اخرٰی

کوئی شخص دوسرے کا بوجھ اپنے کندھے پر نہیں اٹھائے گا۔

اس بناء پر اگر کچھ غیر معتبر روایات میں اسلام کے کلی قانون کے خلاف کچھ نظر آئے تو اسے لازمی طور پر ایک طرف پھینک دینا چاہیئے یا اس کی توجیہ کی جانا چاہیئے۔ مثلاً ایک روایت میں ہے:

مر جانے والے کو اس کے پسماندگان کی گریہ و زاری کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے۔

ہوسکتا ہے یہاں عذاب سے عذابِ الٰہی مراد نہ ہو بلکہ اس سے وہ ناراحتی اور دکھ مراد ہو کہ جو اس کی روح کو اپنے عزیزوں کی بے تابی و اضطراب سے آگاہ ہونے پر ہوتا ہے۔

نیز اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ کہ کافروں کی اولاد اپنے ماں باپ کے ساتھ جہنم میں جائے گی، ایک اسلامی عقیدہ نہیں ہے۔ کیونکہ اولاد کو ماں باپ کے گناہ کی سزا نہیں مل سکتی یہی وجہ ہے کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ غیر شرعی طور پر پیدا ہونے والی اولاد کا بھی ذاتی طور پر کوئی گناہ نہیں اور اگر وہ چاہے تو سعادت و نجات کے دروازے اس کے سامنے کھلے ہیں اگرچہ ایسی اولاد کے لیے تربیت کا مسئلہ بہت دشوار ہے۔

۴۔ برأت کا اصول اور آیت "ما کنا معذبین": علم اصول میں "برأت"

Marfat.com

کی بحث میں زیرِ نظر آیت سے استدلال کیا گیا ہے کیونکہ آیت کا کم از کم مفہوم یہ ہے کہ جن مسائل کا عقل ادراک نہیں کر سکتی، انبیاء بھیجے بغیر یعنی احکام اور ذمہ داریاں بیان کیے بغیر خدا کسی کو سزا نہیں دے گا۔ یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ جن امور کے بارے میں کوئی حکم موجود نہیں ہے ان پر کوئی سزا نہ ہوگی۔ اسی کو قانونِ برأت کہتے ہیں یعنی حکم بیان کیے بغیر سزا صحیح نہیں ہے۔

باقی رہا یہ معاملہ کہ بعض نے کہا ہے کہ زیرِ نظر آیت میں عذاب سے مراد صرف عذابِ استیصال ہے جیسا قومِ نوح پر آیا تھا، تو اس کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں آیت مطلق ہے اور اس کے مفہوم میں ہر قسم کا عذاب اور سزا شامل ہے۔

Marfat.com

(۱۶) وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا
فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ○
(۱۷) وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ
بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ○

ترجمہ

(۱۶) اور جب ہم کسی شہر کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اس کے "مترفین" (نفس پرستی میں مست دولت مندوں) سے اپنے اوامر بیان کرتے ہیں۔ پھر جب وہ مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور سزا کے مستحق ہو جاتے ہیں تو ہم شدت سے ان کی سرکوبی کرتے ہیں۔

(۱۷) اور ایسے کتنے ہی لوگ تھے جو نوح کے بعد کی صدیوں میں رہے اور (اسی سنت کے مطابق) ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور کافی ہے تیرا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں سے آگاہ اور ان کے لیے بینا ہے۔

تفسیر

عذاب الٰہی کے چار مرحلے

گزشتہ آیات میں سے آخری میں بیان کیا گیا تھا کہ "ہم کسی فرد یا گروہ کو انبیاء بھیجنے اور اپنے احکام بیان کرنے کے بغیر ہرگز سزا نہیں دیتے"۔ اب زیر بحث پہلی آیت میں یہی بنیادی بات ایک اور پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب ہم کسی قوم کو ہلاک کرنے کا مصمم ارادہ کر لیتے ہیں تو پہلے ہم مترفین اور دولت کے نشے میں غرق لوگوں سے اپنے احکام بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد جب وہ اطاعت نہیں کرتے بلکہ

Marfat.com

مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور عذاب کے مستحق ہوجاتے ہیں تو ہم ان کی شدت سے سرکوبی کرتے ہیں اور انہیں ہلاک کردیتے ہیں (واذا اردنا ان نهلك قرية امرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمرناها تدميرًا)[۱]

اس آیت کے مفہوم کے بارے میں بہت سے مفسرین نے متعدد احتمالات ذکر کیے ہیں لیکن ہماری نظر میں آیت اپنے ظاہری معنی کے اعتبار سے ایک سے زیادہ واضح تفسیر نہیں رکھتی۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اتمام حجت اور اپنے احکام بیان کرنے سے پہلے ہرگز کسی سے مواخذہ نہیں کرتا اور نہ کسی کو عذاب دیتا ہے بلکہ پہلے اپنے احکام بیان کرتا ہے اگر لوگ اطاعت کریں اور ان احکام کو اپنالیں تو خوب، اسی میں ان کی دنیا و آخرت کی سعادت ہے اور اگر وہ فسق و فجور کریں اور مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوں اور احکام کو پاؤں تلے روند ڈالیں تو یہ وہ مقام ہے جہاں وہ عذاب کے مستحق ہوجاتے ہیں اور پھر اس کے بعد ان کے لیے ہلاکت ہے۔

اگر آیت میں صحیح طور پر غور و فکر کریں تو اس کام کے لیے چار مراحل واضح طور پر بیان ہوئے ہیں:

(۱) اوامر (و نواهی) کا مرحلہ
(۲) مخالفت اور فسق و فجور کا مرحلہ
(۳) عذاب کے استحقاق کا مرحلہ
(۴) ہلاکت کا مرحلہ

فاء تفریع کے ساتھ یہ تمام مرحلے ایک دوسرے پر عطف ہوئے ہیں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ صرف "مترفین"[۲] کو حکم کیوں دیا گیا ہے۔

اس سوال کے جواب میں ایک نکتے کی طرف توجہ کی جائے تو معاملہ واضح ہوجاتا ہے اور وہ یہ کہ بہت سے معاشروں (مراد غلط قسم کے معاشرے ہیں) میں معاشرے کی باگ ڈور مترفین ہی کے قبضے میں ہوتی ہے اور دوسرے لوگ ان کے تابع اور پیرو ہوتے ہیں علاوہ ازیں اس میں ایک اور نکتے کی طرف بھی اشارہ ہے وہ یہ کہ معاشرے کی زیادہ تر برائیوں کا سرچشمہ مترفین اور خدا کو بھولے ہوئے دولت مند ہی ہوتے ہیں جو ناز و نعمت، عیش و عشرت اور ہوا و ہوس میں مستغرق ہوتے ہیں۔ ہر اصلاحی، انسانی اور اخلاقی آواز انہیں بُری لگتی ہے۔ لہٰذا یہی لوگ انبیاء کے مقابلے میں پہلی صف میں ہوتے تھے اور ان کی دعوت کہ جو عدل و انصاف کیلئے اور مستضعفین کی حمایت میں ہوتی تھی اسے ہمیشہ اپنے برخلاف سمجھتے تھے۔ ان وجوہ کی بناء پر خصوصیت سے انہی کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ فساد اور برائی کی اصلی جڑ یہی لوگ ہیں۔

۱۔ "قول" کا اگرچہ وسیع معنی ہے لیکن ایسے مواقع پر حکمِ عذاب کے معنی میں ہے۔

۲۔ "مترفین" "ترفة" کے مادہ سے فراواں نعمت کے معنی میں ہے یعنی وہ نعمتوں کے پلے ہوئے اور دولت مند جو خدا سے بے خبر ہیں۔

Marfat.com

ضمناً ـــ "دمرنا" اور "تدمیر" "دمار" کے مادہ سے ہلاکت کے معنی میں ہیں۔

بہر حال مندرجہ بالا آیت تمام اہلِ ایمان کے لیے تنبیہ ہے کہ وہ خبردار رہیں اور اپنی حکومت مترفین اور نفسانی خواہشوں میں سرمست دولت مندوں کے ہاتھ میں نہ دیں اور ان کے پیچھے نہ لگیں کیونکہ یہ لوگ آخرکار ان کے معاشرے کو ہلاکت و نابودی سے ہمکنار کر دیں گے۔

اگلے بعد والی آیت میں اس مسئلے کے کئی ایک نمونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کتنے ہی لوگ تھے جو نوح کے بعد کی صدیوں میں آئے اور (اسی سنت کے مطابق) ہلاک اور نابود ہو گئے (وکم اھلکنا من القرون من بعد نوح)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی فرد یا گروہ کا ظلم اور گناہ علمِ خدا کی تیز بین نگاہ سے مخفی رہ جائے "خدا اپنے بندوں کے گناہ سے کافی یعنی پورا آگاہ ہے ان کے لیے بینا ہے" (وکفی بربک بذنوب عبادہ خبیراً بصیراً)۔

"قرون" "قرن" کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے وہ لوگ جو ایک زمانے میں زندگی گزاریں۔ بعد ازاں یہ لفظ ایک زمانے اور ایک دَور کے لیے استعمال ہونے لگا۔

ایک "قرن" کتنے سال کا ہوتا ہے، اس سلسلے میں مختلف نظریات ہیں۔ بعض چالیس سال کا کہتے ہیں، بعض اَسّی سال کا، بعض سو سال کا اور بعض اس سے بھی زیادہ، ایک سو بیس سال کا کہتے ہیں۔ لیکن بنا کے واضح ہے کہ یہ ایک امر اعتباری ہے جو مختلف صورتوں میں مختلف ہوتا ہے البتہ ہمارے زمانے میں معمول یہ ہے کہ لفظ "قرن" کا اطلاق سو سال پر ہوتا ہے۔[1]

نیز یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد کے قرنوں کا خصوصی ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ اس لیے ہو کہ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے انسانی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ یہ سب اختلافات خصوصاً معاشرے کی "مترف" اور "مستضعف" کی طبقاتی تقسیم بہت کم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ بہت کم عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوئے۔

"خبیر" و "بصیر" (آگاہ و بینا) کا اکٹھا ذکر اس طرف اشارہ ہے کہ "خبیر" نیت اور عقیدے سے آگاہ کے معنی میں ہے اور "بصیر" اعمال و کردار کو دیکھنے والے کے معنی میں ہے۔ لہٰذا خدا تعالیٰ لوگوں کے اعمال کے باطنی وجود اور اسباب پر بھی مطلع ہے اور خود اعمال کو بھی جانتا ہے اور ایسی ہستی ہرگز کسی پر ظلم روا نہیں رکھتی اور اس کی حکومت میں کسی کا حق ضائع نہیں ہوتا۔

✤ ✤ ✤

---

[1] سورۂ یونس کی آیت ۱۳ کے ذیل میں بھی ہم نے اس موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے (تفسیر نمونہ ج ۸ ص ۱۹۰ اردو ترجمہ)۔

Marfat.com

(۱۸) مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ
ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ○
(۱۹) وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ
كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ○
(۲۰) كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ
عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ○
(۲۱) اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ
دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ○

ترجمہ

(۱۸) جو شخص (صرف) جلد گزر جانے والی (مادی دنیا) طلب کرتا ہے تو ہم اسے اس قدر دے دیتے ہیں، جو ہم چاہیں اور جس مقدار کا اسکے بارے میں ارادہ کریں اسکے بعد اس کے لیے دوزخ قرار دیں گے کہ وہ اس کی جلا دینے والی آگ میں جلے گا جبکہ وہ درگاہِ الٰہی سے) راندہ اور مذموم ہوگا۔

(۱۹) اور جو شخص صرف آخرت کو چاہے اور اپنی سعی و کوشش اس کے لیے انجام دے اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو تو (خدا کی طرف سے) اسے اس کی سعی و کوشش پر جزا ملے گی۔

(۲۰) ان میں سے ہر گروہ کو تیرے پروردگار کی عطا میں سے حصّہ اور مدد ملے گی اور تیرے پروردگار کی عطا و بخشش کبھی کسی سے ممنوع قرار نہیں دی گئی۔

(۲۱) دیکھو کس طرح ہم نے بعض کو (دنیا میں ان کی سعی و کوشش کی وجہ سے) بعض دوسروں پر

Marfat.com

برتری عطا کی ہے اور آخرت کے درجات اور اس کی فضیلتیں تو اس سے کہیں زیادہ ہیں۔

تفسیر

طالبانِ دنیا اور طالبانِ آخرت

گزشتہ آیات میں اوامرالٰہی کے مقابلے میں منکرین کی مخالفت اور پھر ان کی ہلاکت کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیرِ نظر آیات میں اس سرکشی اور طغیان کے حقیقی سبب یعنی حُبِّ دنیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جن لوگوں کی نظر اسی زود گزر مادی دنیا پر ہے، ہم جس مقدار میں چاہتے ہیں اور اس کے لیے مناسب سمجھتے ہیں اسی زندگی میں اسے دے دیتے ہیں، اس کے بعد اس کے لیے ہم جہنم قرار دیں گے کہ جس کی آگ میں وہ جلے گا اس حالت میں کہ وہ رحمتِ الٰہی کی درگاہ سے راندہ اور مذموم ہوگا (من کان یرید العاجلة عجلنا له فیها ما نشآء لمن نرید ثم جعلنا له جهنم یصلٰها مذمومًا مدحورًا)۔

"عاجلہ" کا معنی ہے جلد گزر جانے والی نعمتیں یا زود گزر دنیا۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص دنیا کے پیچھے جائے گا، وہ جو کچھ چاہے گا اس تک پہنچ جائے گا بلکہ اس کے لیے دو شرطیں بیان کی گئی ہیں پہلی یہ کہ وہ جو چاہے گا اس کا کچھ حصہ اسے ملے گا، اتنا ہی جتنا ہم چاہیں گے (ما نشاء)۔

دوسری یہ کہ سب لوگ بھی یہ حصہ نہیں پاسکیں گے، بلکہ ان میں سے کچھ متاعِ دنیا کے ایک حصے تک پہنچیں گے وہی کہ جن کے بارے میں ہم چاہیں گے (لمن نرید)۔

اس طرح نہ تمام دنیا پرست دنیا تک پہنچیں گے اور نہ ہی پہنچ پانے والے اتنی دنیا حاصل کرسکیں گے جتنی وہ چاہیں گے۔

روزمرہ کی زندگی میں بھی ہم اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ کتنے لوگ شب و روز دوڑتے رہتے ہیں لیکن کہیں نہیں پہنچتے اور کتنے افراد ہیں جو اس دنیا میں بڑی بڑی آرزوئیں رکھتے ہیں مگر ان میں سے کچھ ہی کی تکمیل ہوتی ہے۔

یہ امر دنیا پرستوں کے لیے تنبیہ ہے کہ اگر تم خیال کرتے ہو کہ آخرت کو دنیا کے بدلے بیچ کر اپنا مقصد حاصل کرلوگے تو یہ تمہاری بہت بڑی غلطی ہے۔ ایسا کبھی نہ ہوسکے گا۔ مقصد کا کچھ حصہ ہی تمہیں ملے گا۔

ویسے بھی انسان کی آرزوؤں کا دامن اتنا وسیع ہے کہ محدود عالمِ مادہ میں وہ سب پوری نہیں ہوسکتیں۔ ایک شخص کو ساری دنیا مل جائے تو بھی اکثر وہ سیر نہیں ہوتا۔

رہے وہ لوگ کہ جو کوششیں کرتے ہیں مگر انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا، تو اس کی کئی وجوہ ہیں۔ یا تو اس لیے

Marfat.com

کہ ابھی ان کی بیداری اور نجات کی امید ہوتی ہے اور خدا ان سے محبت کرتا ہے اور یا اس وجہ سے کہ اگر وہ کچھ حاصل کرلیں تو اس قدر سرکشی کریں گے کہ مخلوقِ خدا پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں گے ۔

"یصلی" " صلی " کے مادہ سے آگ روشن کرنے اور آگ میں جلنے کے معنی میں ہے ۔ یہاں دوسرا معنی مراد ہے ۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ سزا کے طور پر جہنم کی آگ کے ساتھ " مذموم " اور " مدحور " کے الفاظ بھی تاکید کے طور پر آئے ہیں ۔ ان میں سے پہلی سزا سرزنش اور مذمت ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری خدا سے دور رہنے کے معنی میں ہے ۔ درحقیقت جہنم کی آگ تو ان کے لیے جسمانی سزا ہے اور مذموم و مدحور ہونا ان کے لیے روحانی عذاب ہے ۔ کیونکہ معاد جسمانی بھی ہے اور روحانی بھی اس کا عذاب و ثواب اور سزا و جزا کے بھی دونوں پہلو ہیں ۔

اس کے بعد دوسرے گروہ کے حالات بیان کیے گئے ہیں تاکہ قرآن کی روش کے مطابق تقابل سے مطلب زیادہ آشکار ہو جائے ۔

ارشاد ہوتا ہے : باقی رہا وہ شخص جو آخرت طلب کرتا ہے اور اسی راستے میں سعی و کوشش کرتا ہے اور وہ صاحبِ ایمان ہے تو اس کی یہ سعی و کوشش بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوگی (ومن اراد الاٰخرۃ وسعٰی لھا سعیھا وھو مؤمن فاولٰئک کان سعیھم مشکورًا) ۔

لہٰذا جاودانی سعادت اور دائمی خوش بختی تک پہنچنے کے لیے تین بنیادی شرائط ہیں :

(۱) انسانی ارادہ ــ ایسا ارادہ جو حیاتِ ابدی سے تعلق رکھتا ہو اور زود گزر لذات ، ناپائیدار نعمات اور نِرے مادی مقاصد سے تعلق نہ رکھتا ۔ بلند ہمت اور اعلیٰ جذبہ اسے قوت دینے والا ہو ۔ اور یہ جذبہ و ہمت اسے ہر غیر الٰہی وابستگی اور تعلق سے آزاد کر دے ۔

(۲) یہ ارادہ فکر و نظر، تصور اور روح میں کمزور و ناتواں نہ ہو بلکہ ایسا ہو کہ وجودِ انسانی کے سب ذرات کو حرکت میں لائے اور انسان اپنی تمام تر کوشش صرف کر دے (توجہ رہے کہ لفظ " سعیھا " جو تاکید کے طور پر آیا ہے ، نشاندہی کرتا ہے کہ وہ اپنی حتی کوشش کہ جو آخرت تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے ، انجام دیتا ہے اور کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا) ۔

(۳) یہ سب امور ایمان کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں ۔ ایمان کہ جو استوار اور پختہ ہو کیونکہ مصمم ارادہ اور کوشش جب ہی ثمر آور ہوگی جب اس کا سرچشمہ صحیح جذبہ ہو ۔ اور صحیح جذبہ ایمان باللہ کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا ۔ یہ صحیح ہے کہ آخرت کے لیے کوشش ایمان کے بغیر نہیں ہو سکتی اور ایمان کا مفہوم اس میں پوشیدہ ہے لیکن اس راہ میں چونکہ ایمان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے لہٰذا اس سلسلے میں دلالتِ التزامی پر قناعت نہیں کی گئی اور ایمان کو بالصراحت کے شرط کے طور پر بیان کیا گیا ہے ۔

Marfat.com

یہ بات قابل توجہ ہے کہ دنیا پرستوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان کے لیے ہم جہنم قرار دیں گے لیکن آخرت کے عاشقین کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ ان کی سعی و کوشش مشکور ہوگی یعنی پروردگار اس کا تشکر اور قدردانی کرے گا۔

اس کی نسبت کہ کہا جائے "ان کی جزا بہشت ہوگی" یہ مذکورہ تعبیر بہت زیادہ جامع اور بلند تر ہے کیونکہ ہر شخص کے لیے تشکر اور قدردانی اس کی شخصیت کی وسعتِ وجودی کے مطابق ہوتی ہے نہ کہ عمل کی مقدار کے مطابق۔ اس لحاظ سے خدا کا تشکر اور قدردانی اس کی لامتناہی ذات کی مناسبت سے ہے۔ انواع و اقسام کی مادی و معنوی نعمتیں اور وہ سب کچھ جو ہمارے تصور میں آسکتا ہے اس میں جمع ہے۔

بعض مفسرین نے "مشکور" کا معنی "کئی گنا اجر"[1] بیان کیا ہے اور بعض نے اس سے "مقبولیت عمل"[2] مراد لیا ہے لیکن واضح ہے کہ "مشکور" ان سے وسیع تر معنی رکھتا ہے۔

ممکن ہے یہاں یہ توہم ہو کہ دنیا کی نعمتیں دنیا پرست لوگوں کا حصہ ہیں اور طالبانِ آخرت اس سے محروم ہیں۔ اس توہم کو دُور کرنے کے لیے بعد والی آیت کہتی ہے: ہم اس گروہ کو یعنی ان میں سے ہر ایک کو اپنی عطا و بخشش کا حصہ دیں گے اور اس کی مدد کریں گے (کلا نمد ھٰؤلاء وھٰؤلاء من عطاء ربک)۔ کیونکہ پروردگار کی بخشش کسی سے ممنوع نہیں ہے۔ یہود و نصاریٰ، مومن و مسلمان سب اس کے خوانِ نعمت سے حصہ پاتے ہیں۔

"نمد" "امداد" کے مادہ سے زیادہ کرنے کے معنی میں ہے۔

اسکے بعد والی آیت اس سلسلے میں ایک بنیادی امر بیان کرتی ہے اور وہ یہ کہ جس طرح اس دنیا میں کوشش مختلف ہو تو نتیجہ مختلف ہو جاتا ہے اُخروی امور میں بھی پوری طرح یہی بنیاد کار فرما ہے۔ فرق یہ ہے کہ دنیا محدود ہے اور یہاں کا فرق بھی محدود ہے لیکن آخرت چونکہ لامحدود ہے لہٰذا وہاں فرق بھی لامحدود ہوگا۔

ارشاد ہوتا ہے: دیکھو کس طرح ہم ان میں سے بعض کو بعض دوسروں پر (ان کی کوشش میں اختلاف کی وجہ سے) برتری دیتے ہیں البتہ آخرت کے درجات زیادہ بڑے ہیں اور اس کی برتری و فضیلت بھی بہت زیادہ ہے (انظر کیف فضلنا بعضھم علیٰ بعض وللاٰخرۃ اکبر درجات و اکبر تفضیلاً)۔

ہوسکتا ہے کہا جائے کہ اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ افراد بغیر کسی کوشش کے بہت سے فوائد حاصل کر لیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ استثنائی مواقع ہیں۔ سعی و کوشش کو عمومی بنیاد کی حیثیت حاصل ہے اور یہی کامیابی

---

[1] تفسیر قرطبی، ج ۶ ص ۳۸۵۲۔

[2] تفسیر صافی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

کی میزان ہے ۔ اس کے مقابلے میں اُن استثنائی مواقع کی پرواہ نہیں کی جاسکتی اور نہ یہ استثنائی مسئلہ عمومی دکلی بنیاد کے منافی ہے ۔

ضمنی طور پر توجہ رہے کہ کوشش سے مراد فقط اس کی مقدار نہیں ہے ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تھوڑی سی کوشش بہت سی کوششوں کے مقابلے میں اپنی کیفیت کی وجہ سے زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے ۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا دُنیا و آخرت میں تضاد ہے؟: بہت سی آیات میں دنیا اور اس کے مادی وسائل کی تعریف کی گئی ہے ۔ بعض آیات میں مال دنیا کو "خیر" کہا گیا ہے (بقرہ ۔ ۱۸۰) ۔ بہت سی آیات میں مادی نعمتوں کو "فضل اللہ" کہا گیا ہے ۔ مثلاً :

وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (جمعہ ۔ ۱۰)

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے :

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (بقرہ ۔ ۲۹)

دُنیا کی تمام نعمتیں تمہارے لیے پیدا کی گئی ہیں ۔

بہت سی آیات میں انہیں "سَخَّرَ لَكُمْ" (انہیں تمہارے لیے مسخر کیا گیا ہے) کے حوالے سے ان کا ذکر آیا ہے ۔ اگر ہم ان آیات کو جمع کریں کہ جن میں مادی وسائل کی تعریف کی گئی ہے تو آیات کا اچھا خاصا ذخیرہ ہو جائے ۔ لیکن مادی نعمات کو اس قدر اہمیت دینے کے باوجود ایسے الفاظ آیاتِ قرآن میں موجود ہیں جن میں ان کی تحقیر و تذلیل کی گئی ہے :

ایک مقام پر اسے متاعِ فانی شمار کیا گیا ہے :

تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (نساء ۔ ۹۴)

ایک اور جگہ اسے غرور و غفلت کا سبب قرار دیا گیا ہے :

وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (حدید ۔ ۲۰)

ایک اور موقع پر اسے لہو و لعب اور کھیل کود کا ذریعہ شمار کیا گیا ہے :

وَمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ (عنکبوت ۔ ۶۴)

نیز ایک مقام پر اسے یادِ خدا سے غفلت کا سبب گردانا گیا ہے :

رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور ۔ ۳۷)

یہی دو قسم کی تعبیرات رِوایاتِ اسلامی میں بھی نظر آتی ہیں ۔ ایک رُخ سے دنیا آخرت کی کھیتی ہے، مردانِ خدا کا مرکزِ تجارت ہے، دوستانِ حق کی مسجد ہے، وحیِ پروردگار کے نزول کا مقام ہے اور پند و نصیحت کا گھر ہے ۔

Marfat.com

امیر المؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

مسجد احباء اللہ و مصلی ملائکۃ اللہ و مهبط وحی اللہ و متجر اولیاء اللہ [1]

جبکہ دوسری طرف اسے یادِ خدا سے غفلت کا سبب اور متاعِ غرور وغیرہ بھی قرار دیا گیا ہے ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ دو طرح کی آیات و روایات ایک دوسرے سے متضاد ہیں ؟۔

اس سوال کا جواب خود قرآن سے تلاش کیا جا سکتا ہے ۔کیونکہ قرآن جہاں دنیا اور اس کی نعمتوں کی مذمت کرتا ہے تو اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جن کا مقصد فقط یہی زندگی ہے ۔سورہ نجم کی آیہ ۲۹ میں ہے :

وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا

وہ لوگ کہ جو دنیاوی زندگی کے سوا کچھ نہیں چاہتے ۔

دوسرے لفظوں میں ، یہاں ان لوگوں کے بارے میں گفتگو ہے جو دنیا کے بدلے آخرت کو بیچ دیتے ہیں اور مادی خواہشات کی تکمیل کے لیے کسی قسم کی غلط کاری اور جرم سے نہیں چوکتے ۔

سورۃ توبہ آیہ ۳۸ میں ہے :

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ

کیا تم آخرت کے بدلے دنیاوی زندگی قبول کرنے پر راضی ہو گئے ہو ؟۔

زیرِ بحث آیات خود اس دعویٰ کی شہادت دیتی ہیں ۔ فرمایا گیا ہے :

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ

یعنی ان کے پیشِ نظر یہی زود گزر مادی زندگی ہے ۔

اصولی طور پر کھیتی یا مرکزِ تجارت وغیرہ کے الفاظ خود اس امر پر زندہ شاہد ہیں ۔

مختصر یہ کہ مادی دنیا کی نعمتیں سب کی سب اللہ کی نعمتیں ہیں ۔ان کا وجود نظامِ خلقت میں یقیناً ضروری تھا اور ہے ۔اگر انسان ان سے سعادت اور روحانی کمال تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھ کر استفادہ کرے تو یہ ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہے ۔لیکن اگر وسیلے کی بجائے انہی کو مقصد سمجھ لیا جائے اور انہیں معنوی اور انسانی قدروں سے الگ کر لیا جائے تو فطرتاً یہ امر غرور ، غفلت ، طغیان ، سرکشی ، ظلم اور بیدادگری کا سبب ہوگا ۔ایسی دنیا یقیناً ہر قسم کی برائی کا محل قرار پائے گی اور قابلِ مذمت ٹھہرے گی ۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے اس پُرمغز اور مختصر سے جملے میں کیا خوب فرمایا ہے :

من ابصر بها بصرته و من ابصر اليها اعمته

---

[1] نہج البلاغہ ، کلماتِ قصار جملہ ۱۳۱ ۔

Marfat.com

جو اس کے ذریعے چشم بصیرت سے دیکھے تو دنیا اسے آگہی بخشتی ہے اور خود دنیا کی طرف دیکھے تو یہ اسے اندھا کر دیتی ہے [1]

درحقیقت مذموم اور ممدوح دنیا میں وہی فرق ہے جو "الیھا" اور "بھا" میں ہے۔ پہلی صورت میں دنیا مقصد ہے اور دوسری صورت میں دنیا وسیلہ ہے اور کسی اور تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

۲۔ کامیابی میں کوشش کا دخل: یہ کوئی پہلا موقع نہیں کہ قرآن کوشش کا ذکر کرتے ہوئے سست اور بیکار افراد کو تنبیہ کر رہا ہے اور انہیں بیدار کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ دوسرے جہان کی سعادت و خوش بختی صرف اظہارِ ایمان اور گفتار سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ سعادت و خوش بختی کا حقیقی عامل کوشش اور جستجو ہے۔

یہ حقیقت بہت سی قرآنی آیات سے معلوم ہوتی ہے۔ ذیل کی آیت میں انسان کو اپنے اعمال کا گیروی قرار دیا گیا ہے:

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (مدثر۔ ۳۸)

ایک اور مقام پر فرمایا گیا ہے کہ انسان کا حصہ وہی کچھ ہے جو وہ کوشش کرتا ہے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (النجم۔ ۳۹)

بہت سی آیاتِ قرآن میں ایمان کا ذکر کرنے کے بعد عملِ صالح کا ذکر کیا گیا ہے۔ تاکہ یہ خیالِ خام ہر ذہن سے نکل جائے کہ کوشش کے بغیر بھی کسی مقام تک پہنچا جا سکتا ہے۔ جب مادی دنیا کی نعمات کوشش کے بغیر حاصل نہیں کی جا سکتیں تو کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ سعادتِ جاودانی اس کے بغیر ہاتھ لگ جائے گی۔

۳۔ امدادِ الٰہی: "نمد" "امداد" کے مادہ سے مدد دینے کے معنی میں ہے۔ مفردات میں راغب کہتا ہے:

لفظ "امداد" عام طور پر مفید اور مؤثر کمک کے لیے استعمال ہوتا ہے اور "مد" ناپسندیدہ کمک کیلئے۔

بہرحال زیرِ بحث آیات کے مطابق خدا تعالیٰ اپنی نعمتوں کا کچھ حصہ تو سب کو دیتا ہے اور نیک و بد سب اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ یہ نعمتوں کے اس حصے کی طرف اشارہ ہے جس پر دنیاوی زندگی کی بقا موقوف ہے اور جس کے بغیر کوئی باقی نہیں رہ سکتا۔

دوسرے لفظوں میں یہ خدا کا وہی مقامِ رحمانیت ہے جس کا فیض مومن و کافر سب کے لیے عام ہے لیکن اس کے علاوہ بھی ایسی لامتناہی نعمتیں ہیں جو صرف مومنین اور نیک لوگوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

---

[1] نہج البلاغۃ، خطبہ ۸۲۔

Marfat.com

(۲۲) لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتَقۡعُدَ مَذۡمُوۡمًا مَّخۡذُوۡلًا ۝

(۲۳) وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا ؕ
اِمَّا يَبۡلُغَنَّ عِنۡدَكَ الۡكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوۡ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلۡ لَّهُمَاۤ
اُفٍّ وَّلَا تَنۡهَرۡهُمَا وَقُلۡ لَّهُمَا قَوۡلًا كَرِيۡمًا ۝

(۲۴) وَاخۡفِضۡ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَةِ وَقُلۡ رَّبِّ ارۡحَمۡهُمَا
كَمَا رَبَّيٰنِىۡ صَغِيۡرًا ۝

(۲۵) رَبُّكُمۡ اَعۡلَمُ بِمَا فِىۡ نُفُوۡسِكُمۡ ؕ اِنۡ تَكُوۡنُوۡا صٰلِحِيۡنَ فَاِنَّهٗ
كَانَ لِلۡاَوَّابِيۡنَ غَفُوۡرًا ۝

ترجمہ

(۲۲) اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود قرار نہ دے ورنہ مذموم و رسوا ہو جائے گا۔

(۲۳) تیرے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو جب ان میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کی ذرہ بھر اہانت بھی نہ کرو اور انہیں جھڑکو نہیں اور کریمانہ انداز سے ان سے لطیف و سنجیدہ گفتگو کرو۔

(۲۴) اور لطف و محبت سے ان کے سامنے خاکساری کا پہلو جھکائے رکھو۔ اور کہو۔ پروردگارا! جیسے انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی ہے اسی طرح تو بھی ان پر رحم فرما۔

(۲۵) تمہارا پروردگار تمہارے دلوں کے نہاں خانہ سے آگاہ ہے (اگر تم نے اس سلسلے میں

Marfat.com

کوئی لغزش کی ہو اور پھر اس کی تلافی کر دی ہو تو وہ تمہیں معاف کر دے گا کیونکہ) اگر تم صالح اور نیک ہو گے تو وہ توبہ کرنے والوں کو بخش دیتا ہے۔

تفسیر

اہم اسلامی احکام کا سلسلہ

توحید اور ماں باپ سے حُسن سلوک

زیر نظر آیات اسلامی احکام کے ایک سلسلے کا آغاز ہیں یہ سلسلہ توحید اور ایمان سے شروع ہوتا ہے۔

توحید تمام مثبت اور اصلاحی کاموں کے اسباب کا خمیر ہے۔ توحید سے احکام کے بارے میں گفتگو شروع کر کے ان آیات کا گزشتہ آیات سے تعلق باقی رکھا گیا ہے کیونکہ گزشتہ آیات میں ایمان، کوشش اور دارِ آخرت کا ارادہ رکھنے کے بارے میں گفتگو تھی۔

نیز یہ اس امر کی بھی تاکید ہے کہ قرآن صاف ترین اور بہترین راستے کی طرف دعوت دینے والا ہے۔

توحید کے ذکر سے بات شروع کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: "اللہ" خدائے یگانہ کے ساتھ کوئی معبود قرار نہ دے (لاتجعل مع اللہ الٰھًا اٰخر)۔

قرآن یہ نہیں کہتا کہ خدا کے ساتھ دوسرے معبود کی پرستش نہ کرو بلکہ کہتا ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور کو معبود قرار نہ دو۔ یہ بات زیادہ وسیع مفہوم رکھتی ہے۔ یعنی عقیدے میں، عمل میں، دعا میں اور پرستش میں۔ کسی حالت میں بھی اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود قرار نہ دو۔ اس کے بعد شرک کا ہلاکت انگیز نتیجہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: اگر تم اس کے لیے شریک کے قائل ہو گئے تو مذمت اور رسوائی میں ڈوب جاؤ گے (فتقعد مذموماً مخذولاً)۔

لفظ "قعود" (بیٹھ جانا) یہاں ضعف و ناتوانی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ عربی ادب میں یہ لفظ ضعف کے لیے کنایہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

تعد به الضعف عن القتال

ناتوانی کی وجہ سے وہ دشمن سے جنگ کرنے سے بیٹھ گیا۔

مذکورہ بالا جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک انسان میں تین بہت بُرے اثر مرتب کرتا ہے۔

(۱) شرک ضعف و ناتوانی اور ذلت و زبوں حالی کا سبب ہے جبکہ توحید قیام، حرکت اور سرفرازی کا عامل ہے۔

Marfat.com

(۲) شرک مذمت و سرزنش کا سبب ہے کیونکہ یہ ایک واضح انحرافی راستہ ہے، منطقِ عقل کا انکار ہے نعمتِ پروردگار کا واضح کفران ہے۔ جو شخص ایسا انحراف اختیار کرے وہ قابلِ مذمت ہے۔

(۳) شرک مشرک کو اس کے بنائے ہوئے معبودوں کے پاس چھوڑ دیتا ہے اور خدا اس کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ بناوٹی معبود بھی چونکہ کسی کی مدد کرنے کے قابل نہیں اور خدا بھی ان افراد کی مدد ترک کر دیتا ہے تو وہ "مخذول" یعنی بے یار و مددگار ہو کر رہ جاتے ہیں۔

قرآن کی دوسری آیات میں بھی یہی مفہوم کسی اور شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ سورہ عنکبوت کی آیہ ۴۱ میں ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۖ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

غیرِ خدا کو اپنا معبود بنانے والوں کی مثال مکڑی کی سی ہے جس نے کمزور اور بے بنیاد گھر کو اپنا سہارا بنا رکھا ہے اور کمزور ترین گھر مکڑی کا ہے۔

توحید کے بعد اس پر تاکید کے ساتھ انبیاء کی انسانی تعلیمات میں سے ایک انتہائی بنیادی تعلیم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: "تیرے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ صرف اسی کی عبادت کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو" (وقضیٰ ربک الّا تعبدوا الّا ایاہ و بالوالدین احسانًا)۔

"قضاء" "امر" کی نسبت زیادہ تاکید کا مفہوم رکھتا ہے اور قطعی و محکم فرمان کا معنی دیتا ہے۔ یہ لفظ اس مسئلے میں پہلی تاکید ہے۔

توحید۔ کہ جو اسلام کی عظیم ترین بنیاد ہے، ماں باپ سے نیکی کرنے کو اس کے ساتھ قرار دینا اس اسلامی حکم کی اہمیت کے لیے دوسری تاکید ہے۔

لفظ "احسان" یہاں مطلق ہے۔ اس میں ہر قسم کی نیکی کا مفہوم مضمر ہے۔ یہ اس معاملے پر تیسری تاکید ہے۔

اسی طرح لفظ "والدین" کا اطلاق مسلمان اور کافر دونوں پر ہوا ہے۔ یہ اس مسئلے پر چوتھی تاکید ہے۔

لفظ "احسانًا" یہاں نکرہ صورت میں ہے جو ایسے مواقع پر بیانِ عظمت کے لیے آتا ہے۔ یہ پانچویں تاکید ہے۔[۱]

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ حکم عموماً امر اثباتی کے لیے ہوتا ہے حالانکہ یہاں نفی پر ہے (تیرے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو) ہو سکتا ہے یہ اس بناء پر ہو کر لفظ "قضیٰ" سے سمجھا

---

[۱] بعض کا نظریہ ہے کہ "احسان" عام طور پر "الیٰ" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ "احسن الیہ" (اس سے احسان کیا) اور کبھی "باء" کے ذریعے متعدی ہوتا ہے۔ یہ تعبیر شاید دیکھ بھال کرنے کا معنی دینے کے لیے ہو۔ یعنی تم ذاتی طور پر بغیر کسی واسطے کے ماں باپ سے حُسنِ سلوک اور احترام و محبت کا مظاہرہ کرو۔ یہ اس مسئلے کے لیے چھٹی تاکید ہے۔

Marfat.com

جاتا ہے کہ دوسرا جملہ اثباتی شکل میں مقدر ہے اور معنی کے لحاظ سے اس طرح ہے :

تیرے پروردگار نے تاکیدی حکم دیا ہے کہ اس کی پرستش کرو اس کے غیر کی نہ کرو۔

یا یہ کہ نفی اور اثبات پر مشتمل یہ جملہ "الا تعبدوا الا ایاہ" ایک اثباتی جملے کی حیثیت رکھتا ہے یعنی پروردگار کے لیے عبادت منحصر ہے" کا اثبات۔

اس کے بعد ماں باپ سے حُسنِ سلوک کا ایک واضح مصداق بیان کیا گیا ہے : جب ان دونوں میں سے ایک یا دونوں تیرے پاس بڑھاپے تک پہنچ جائیں اور شکستہ سن ہو جائیں (اس طرح سے کہ انہیں تیری طرف سے مستقل دیکھ بھال کی احتیاج ہو) تو ان کے لیے کسی طرح سے محبت میں دریغ نہ کرنا اور ان کی تھوڑی سی بھی اہانت نہ کرنا یہاں تک کہ خفیف سا غیر مؤدبانہ لفظ "اُف" تک منہ سے نہ نکالنا (اما یبلغن عندک الکبر احدھما او کلاھما فلا تقل لھما اف)[1]

انہیں جھڑک نہ دینا اور ان کے سامنے بلند آواز سے نہ بولنا (ولا تنھرھما) بلکہ سنجیدہ، لطیف، کریمانہ اور شریفانہ انداز سے ان سے کلام کرنا (وقل لھما قولاً کریمًا)۔

اور انتہائی عجز و انکساری سے ان کے سامنے پہلو جھکائے رکھنا (واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ)۔ اور کہو : پروردگارا اپنی رحمت ان کے شاملِ حال کر جس طرح کہ انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی ہے (و قل رب ارحمھما کما ربّیٰنی صغیرًا)۔

ماں باپ کا انتہائی احترام

گزشتہ دو آیات میں اولاد کے لیے ماں باپ کا انتہائی ادب و احترام بیان کیا گیا ہے اس سلسلے میں مختلف پہلو قابلِ غور ہیں :

(۱) ایک تو ان کے عالمِ پیری کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب وہ زیادہ توجہ، محبت اور احترام کے محتاج ہوتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ ان سے ذرہ بھر اہانت آمیز بات نہ کرو کیونکہ ہو سکتا ہے بڑھاپے کی وجہ سے وہ اس عالم کو پہنچ چکے ہوں کہ اب دوسرے کی مدد کے بغیر چل پھر نہ سکتے ہوں اور نہ اپنی جگہ سے اٹھ سکتے ہوں یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ گندگی بھی اپنے سے دُور نہ کر سکتے ہوں۔ ایسی حالت میں اولاد کی بہت بڑی آزمائش شروع ہو جاتی

---

[1] "اما یبلغن" میں لفظ "اما" بعض کے بقول "ان" شرطیہ اور "ما" شرطیہ کا مرکب ہے جو کہ تاکید کے لیے یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ (تفسیر فخرالدین رازی)

بعض دوسروں کے بقول یہ "ان" شرطیہ اور "ما" زائدہ سے مرکب ہے جو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ لفظ شرط اس فعل پر آ سکے جو نون تاکید سے مؤکد ہے۔ (المیزان)

Marfat.com

ہے ۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس حالت میں اولاد ماں باپ کے وجود کو رحمت سمجھتی ہے یا مصیبت ۔ کیا ایسے میں کافی حوصلہ و صبر کے ساتھ ماں باپ کی پورے احترام سے نگہداشت کرتی ہے یا گھٹیا اور اہانت آمیز الفاظ کے ساتھ انہیں زبان کے نشتر چبھوتی ہے ، یا یہاں تک کہ بعض اوقات خدا سے ان کی موت کا تقاضا کر کے انہیں اذیت پہنچاتی ہے ۔

(۲) قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ اس موقع پر انہیں " اُف " تک نہ کہو یعنی ناراحتی ، پریشانی اور تنفر کا اظہار نہ کرو ۔ قرآن مزید کہتا ہے کہ ان سے بلند اور اہانت آمیز آواز سے بات نہ کرو ۔ مزید تاکید کرتا ہے کہ ان سے کریمانہ اور شریفانہ لہجے میں کلام کرو ۔

یہ سب چیزیں انتہائی ادب سے گفتگو کرنے کے بارے میں ہیں کیونکہ دل کی کلید زبان ہے ۔

(۳) نیز قرآن عجز و انکساری کا حکم دیتا ہے ۔ ایسی انکساری جس سے محبت اور لگاؤ ظاہر ہو نہ کہ کوئی اور چیز ۔

(۴) آخر میں یہ تک کہتا ہے کہ جب بارگاہِ خداوندی کا رُخ کرو تو (وہ زندہ ہوں یا نہ) انہیں فراموش نہ کرو اور ان کے لیے رحمتِ پروردگار کا تقاضا کرو ۔

اس تقاضے کے ساتھ خصوصیت سے یہ دلیل رکھو کہ خداوندا ! جس طرح انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی تو بھی ویسے ہی اپنی رحمت ان کے شاملِ حال فرما ۔

دیگر چیزوں کے علاوہ اس سے یہ اہم نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ماں باپ اس قدر ناتواں ہو جائیں کہ تنہا چلنے پھرنے کے قابل نہ رہیں اور گندگی اپنے سے دُور نہ کر سکیں تو پھر بھی انہیں فراموش نہ کرو کیونکہ تم بھی بچپن میں اسی طرح تھے اور وہ تمہاری حفاظت اور تجھ سے محبت میں کوئی دریغ نہ کرتے تھے لہٰذا ان کی محبت کا جواب ویسی ہی محبت سے دو ۔

نیز ممکن ہے ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی ، ان کا احترام اور ان کے سامنے انکساری کے معاملے میں اولاد سے جان بوجھ کر یا لاعلمی میں کچھ لغزشیں ہو جائیں لہٰذا زیرِ بحث آخری آیت میں قرآن کہتا ہے : جو کچھ تمہارے دل میں ہے پروردگار اس سے زیادہ آگاہ ہے (ربکم اعلم بما فی نفوسکم) ۔

کیونکہ اس کا علم تمام پہلوؤں سے حضور ، ثابت اور ازلی و ابدی ہے اور ہر طرح سے غلطی اور اشتباہ سے پاک ہے جبکہ تمہارا علم ان صفات کا حامل نہیں ہے لہٰذا اگر تم سے سرکشی کے ارادے کے بغیر حکمِ الٰہی کے خلاف ماں باپ کے احترام اور ان سے حُسنِ سلوک میں کوئی لغزش ہو جائے اور تم فوراً پشیمان ہو کر توبہ و تلافی کا رُخ کرو تو یقیناً رحمتِ الٰہی تمہارے شاملِ حال ہوگی ۔" اگر تم صالح اور نیک ہو اور توبہ کرتے ہو ، کیونکہ خدا توبہ کرنے والوں کو بخشنے والا ہے " (ان تکونوا صالحین فانه کان للاوابین غفورًا) ۔

" اوّاب " " اَوب " (بر وزن " قَوم ") کے مادہ سے ہے ۔ یہ اس بازگشت کو کہتے ہیں جس میں ارادہ شامل ہو جبکہ " رجوع " بھی بازگشت کو کہتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ارادہ بھی اس میں شامل ہو ۔ اسی بنا پر

Marfat.com

"توبہ" کو "اوبہ" کہا جاتا ہے کیونکہ توبہ درحقیقت خدا کی طرف ارادے کے ساتھ بازگشت ہے۔
یہ احتمال بھی ہے کہ صیغہ مبالغہ کا ذکر خدا کی طرف بازگشت اور رجوع کے متعدد عوامل کی طرف اشارہ ہو کیونکہ:

(۱) پروردگار پر ایمان،

(۲) قیامت کی عدالت کی طرف توجہ،

(۳) بیداریٔ ضمیر اور

(۴) گناہ کے عواقب و آثار کی طرف توجہ

یہ چاروں باہم مل کر انسان کو تاکید در تاکید کے ذریعے کجروی سے نکال کر خدا کی طرف لے جاتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ منطق اسلام میں والدین کا احترام: اگرچہ انسانی جذبات اور حق شناسی والدین کی احترام گزاری کیلئے کافی ہے لیکن اسلام ایسے امور میں بھی خاموشی روا نہیں رکھتا جن میں عقل، جذبات اور طبعی میلانات واضح رہنمائی کرتے ہیں بلکہ ایسے امور میں بھی اسلام تاکید کے طور پر ضروری احکام صادر کرتا ہے۔

والدین کے احترام کے بارے میں اسلام نے اس قدر تاکید کی ہے کہ اتنی تاکید بہت کم کسی مسئلے میں کی گئی ہے۔ نمونے کے طور پر ہم چند ایک پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

(۱) قرآن مجید میں چار سورتوں میں مسئلہ توحید کے فوراً بعد والدین سے حُسنِ سلوک کا حکم آیا ہے۔ ان دونوں مسائل کا اکٹھا بیان ہونا اس امر کو واضح کرتا ہے کہ اسلام کس حد تک ماں باپ کے احترام کا قائل ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۸۳ میں ہے:

لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا

سورہ نساء کی آیت ۳۶ میں ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا

سورہ انعام کی آیت ۱۵۱ میں ہے:

اَلَّا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا

اور زیر بحث آیات میں بھی ان دونوں کو ایک دوسرے کا ہم قرین قرار دیا گیا ہے:

وقضٰی ربک الّا تعبدوا الّا ایاہ وبالوالدین احسانا

(۲) اس مسئلے کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ قرآن میں بھی اور روایات میں بھی صراحت سے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ماں باپ کافر بھی ہوں تب بھی ان کا احترام بجا لانا ضروری ہے۔ سورہ لقمان کی

Marfat.com

آیت ۱۵ میں ہے :

وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا

اگر وہ تجھ سے اصرار کریں کہ تو مشرک ہو جا تو ان کی اطاعت نہ کر لیکن دنیاوی زندگی میں ان سے اچھا سلوک کر۔

(۳) قرآن مجید میں ماں باپ کے سامنے اظہارِ تشکر کا ذکر نعماتِ الٰہی کے شکریے کے ساتھ آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

اَنِ اشْكُرْ لِىْ وَلِوَالِدَيْكَ (لقمان - ۱۴)

اگرچہ خدا کی نعمتوں کا تو اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ امر ماں باپ کے حقوق کی عظمت اور وسعت کی دلیل ہے۔

(۴) قرآن نے ماں باپ کی ذرہ بھر بے احترامی کی اجازت نہیں دی۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

لو علم الله شيئًا هو ادنى من اف لنهى عنه ، وهو من ادنى العقوق ومن العقوق ان ينظر الرجل الى والديه فيحد النظر اليهما۔

کوئی چیز اُف[1] سے بھی کم ہوتی تو خدا اس سے بھی روکتا اور یہ ماں باپ کی مخالفت کی کم از کم حد ہے اور ان کی طرف غضبناک نگاہ سے دیکھنا بھی بے احترامی میں شامل ہے[2]

(۵) باوجود یکہ جہاد ایک نہایت اہم اسلامی حکم ہے، جب تک واجب عینی نہ ہو یعنی اتنے افراد کافی تعداد میں موجود ہوں کہ جو اپنی خواہش سے جہاد پر جائیں تو جہاد کی نسبت ماں باپ کی خدمت میں رہنا زیادہ اہم ہے اور اگر جانا ان کی پریشانی اور بے آرامی کا سبب بنے تو ناجائز ہے۔

امام صادق علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں :

ایک شخص پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں آیا۔

اُس نے عرض کیا : میں ایک خوش و خرم اور طاقتور نوجوان ہوں میرا دل چاہتا ہے کہ جہاد میں حصہ لوں لیکن میری ماں ہے جو اس سے ناراحت ہوتی ہے۔

اس کی اس بات پر رسول اللہؐ نے فرمایا :

---

[1] جیسا کہ ہم نے کہا ہے "اُف" ناراحتی کا معمولی سا اظہار ہے۔

[2] جامع السادات، ج ۲ ص ۲۵۸۔

Marfat.com

ارجع فکن مع والدتك فوالذی بعثنی بالحق لانسھا بك لیلة خیر من جھاد فی سبیل الله سنة ۔

لوٹ جاؤ اور اپنی ماں کے پاس رہو۔ قسم ہے اُس خدا کی جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے ایک رات کہ جس میں تیری ماں تجھ سے خوش رہے ایک سال جہاد سے بہتر ہے [1]

البتہ جس وقت جہاد وجوبِ عینی کی صورت اختیار کرلے اور اسلامی ملک خطرے میں ہو اور سب کا حاضر ہونا ضروری ہو تو پھر کوئی عذر قابلِ قبول نہیں یہاں تک کہ ماں باپ کی ناراضگی بھی لیکن واجباتِ کفائی کے موقع پر اسی طرح مستحبات میں مسئلہ اسی طرح ہے جیسا جہاد کے موقع پر کہا گیا ہے ۔

(۶) پیغمبرِ اکرمؐ نے فرمایا :

ایاکم و عقوق الوالدین فان ریح الجنة توجد من مسیرة الف عام ولا یجدھا عاق ۔

اس سے بچو کہ ماں باپ تمہیں عاق کردیں اور ان کے ناراض ہونے سے بچو کیونکہ جنت کی خوشبو ایک ہزار سال کی مسافت تک پہنچتی ہے لیکن ایسا شخص کبھی بھی یہ خوشبو نہیں سونگھ سکتا کہ جو ماں باپ کا عاق کردہ اور نافرمان ہو [2]

یہ تعبیر اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ایسے افراد نہ صرف جنت میں قدم نہیں رکھ سکیں گے بلکہ اس سے بہت دُور ہوں گے اور اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکیں گے ۔

سیّد قطب اپنی تفسیر فی ظلال میں پیغمبرِ اکرمؐ سے یہ حدیث نقل کرتے ہیں :

ایک شخص طواف میں مشغول تھا۔ اس نے اپنی ماں کو کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا اور اسے طواف کروا رہا تھا۔ تو رسول اللہؐ نے اسے اس حالت میں دیکھا۔ اُس نے عرض کیا: کیا یہ کام کر کے مَیں نے اپنی ماں کا حق ادا کردیا ؟ آپؐ نے فرمایا : نہیں، یہاں تک کہ تو نے (وضع حمل کے وقت کی) ایک آہ کا بدلہ بھی نہیں دیا [3]

اگر ہم قلم کو آزاد چھوڑ دیں تو گفتگو بہت لمبی ہو جائے گی اور بات تفسیر سے آگے بڑھ جائے گی لیکن ہم صراحت سے کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں جس قدر بھی گفتگو کریں تھوڑی ہے کیونکہ والدین انسان پر حق حیات رکھتے ہیں ۔

---

[1] جامع السادات ج ۲ ص ۲۶۰ ۔

[2] جامع السادات ج ۲ ص ۲۵۷ ۔

[3] فی ظلال ج ۵ ص ۳۱۸ ۔

Marfat.com

اس بحث کے آخر میں ہم اس نکتے کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ماں باپ کوئی غیر منطقی یا خلافِ شریعت بات کرتے ہیں تو واضح ہے کہ کسی ایسے موقع پر ان کی اطاعت واجب نہیں رہتی لیکن ایسی صورت میں بھی بہترین طریقے سے ان کے سامنے منطقی دلیل پیش کی جائے اور امر بالمعروف کیا جائے۔

اس سلسلۂ گفتگو کو ہم امام کاظم علیہ السلام کی ایک حدیث پر تمام کرتے ہیں۔ امامؑ فرماتے ہیں:
کوئی شخص رسول اللہ ص کے پاس آیا اور اس نے باپ اور بیٹے کے حق کے متعلق سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا:

لا یسمیہ باسمہ، ولا یمشی بین یدیہ، ولا یجلس قبلہ، ولا یستسب لہ۔

باپ کو اس کے نام سے نہ پکارے (بلکہ کہے: ابا جان، وغیرہ)، اس کے آگے آگے نہ چلے، اُس سے پہلے نہ بیٹھے اور کوئی کام ایسا نہ کرے کہ لوگ اس کے باپ کو گالیاں دیں اور بُرا بھلا کہیں۔ (یعنی یہ نہ کہیں کہ خدا تیرے باپ کو نہ بخشے کہ تُو نے یہ کام کیا ہے، وغیرہ)[۱]

۲۔ "قضاء" کے معنی کے بارے میں تحقیق: "قضی"۔ "قضاء" کے مادہ سے کسی چیز کو عمل یا گفتگو سے جدا کرنے کے معنی میں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ دراصل کسی چیز کو ختم کرنے کے معنی میں ہے۔ یہ دونوں معانی قریب الافق ہیں۔

ختم کرنا اور جدا کرنا چونکہ وسیع مفہوم رکھتے ہیں لہٰذا یہ لفظ مختلف مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔
قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس کے چھ معانی ذکر کیے ہیں:

(۱) "قضاء" بمعنی حکم اور فرمان ۔ مثلاً:

وقضٰی ربك الا تعبدوا الا ایاہ

تیرے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کر۔

(۲) "قضٰی" خلق کرنے کے معنی میں ۔ مثلاً:

فقضاھن سبع سماوات فی یومین

خدا نے جہان کو دو ادوار میں سات آسمانوں کی شکل میں خلق کیا۔ (حٰمٓ السجدۃ ۔ ۱۲)

(۳) "قضاء" فیصلے کے معنی میں ۔ مثلاً:

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ (طٰہٰ ۔ ۷۲)

---

[۱] نور الثقلین، ج ۳ ص ۱۴۹۔

Marfat.com

جو فیصلہ کرنا چاہتے ہو کرو۔

(۴) "قضاء" کسی چیز سے فراغت کے معنی میں ۔ مثلاً:

قضی الامر الذی فیہ تستفتیان (یوسف - ۴۱)

جس کام کے بارے میں تم نظریہ یا فتویٰ دینا چاہتے تھے وہ ختم ہو گیا۔

(۵) "قضی" ارادہ کے معنی میں ۔ مثلاً:

اذا قضی امراً فانما یقول لہ کن فیکون (آل عمران - ۴۷)

وہ جب کسی کام کا ارادہ کرے تو کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

(۶) "قضی" عہد و پیمان کے معنی میں ۔ مثلاً:

اذ قضینا الی موسی الامر (قصص - ۴۴)[1]

جس وقت ہم نے موسیٰ سے عہد و پیمان لیا۔

نیز ابوالفتوح رازی نے "قضی" کا معنی خبر دینا اور اعلان کرنا بھی لکھا ہے مثلاً:

وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتاب

ہم نے بنی اسرائیل کو تورات میں خبر دی ہے[2]

ان معانی میں مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ "قضاء" موت کے معنی میں بھی ہے مثلاً:

فوکزہ موسیٰ فقضی علیہ (قصص - ۱۵)

موسیٰ نے اسے ضرب لگائی اور وہ مر گیا

یہاں تک کہ بعض مفسرین نے قرآن مجید میں "قضاء" کے تیرہ سے بھی زیادہ معانی سمجھے ہیں[3] لیکن ان سب کو لفظ "قضاء" کے مختلف معانی نہیں سمجھنا چاہیئے یہ سب ایک قدر مشترک رکھتے ہیں جس میں سب جمع ہیں۔ درحقیقت زیادہ تر معانی جو سطور بالا میں ذکر کیے گئے ہیں "اشتباہ مصداق بمفہوم" کے قبیل سے ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک ایک کلی اور جامع معنی کا مصداق ہے یعنی ختم کرنا اور الگ کرنا۔

مثال کے طور پر قاضی اپنے فیصلے کے ذریعے دعویٰ ختم کرتا ہے۔ پیدا کرنے والا اپنی تخلیق کے ذریعے کسی چیز کی خلقت کو اختتام تک پہنچاتا ہے۔ خبر دینے والا اپنی خبر کے ذریعے کسی چیز کا بیان آخر تک پہنچاتا ہے۔ عہد و پیمان کرنے والا اور حکم دینے والا اپنے عہد و پیمان اور حکم کے ذریعے مسئلے کو اس طرح تمام کرتا ہے کہ اب اس میں بازگشت ممکن نہیں ہے۔ البتہ اس بات کا انکار نہیں

---

[1] تفسیر قرطبی، ج ۶ ص ۳۸۵۳۔

[2] تفسیر ابوالفتوح رازی، ج ۷، ص ۱۸۸۔

[3] وجوہ القرآن از تفلیسی ص ۲۳۵۔

Marfat.com

کیا جا سکتا کہ ان بعض مصادیق میں یہ لفظ اس طرح سے استعمال ہوا ہے کہ ایک نیا سا معنی پیدا ہو گیا ہے مثلاً " قضاء " فیصلہ کرنے اور حکم دینے کے معنی میں۔

۴۔ "اُف" کے معنی کی تحقیق : راغب مفردات میں کہتا ہے کہ " اُف " دراصل ہر کثیف اور آلودہ چیز کے معنی میں ہے اور توہین کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کا صرف رسمی معنی نہیں ہے بلکہ اس سے فعل بھی بنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں :

افففت بکذا

یعنی۔ مَیں نے فلاں چیز کو آلودہ سمجھا اور اس سے اظہارِ نفرت کیا۔

بعض مفسرین مثلاً قرطبی نے اپنی تفسیر میں اور طبرسی نے مجمع البیان میں کہا ہے کہ "اُف" اور " تف " اصل میں وہ میل کچیل ہے جو ناخن کے نیچے جمع ہو جاتی ہے جو آلودہ بھی ہوتی ہے اور حقیر بھی۔ یہاں تک کہ بعض نے "اُف" اور "تُف" میں بھی فرق کیا ہے۔ انہوں نے پہلے کو گوشت کی میل کچیل اور دوسرے کو ناخن کی میل کچیل سمجھا ہے۔

بعدازاں اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی اور ہر اس چیز کیلئے بولا جانے لگا جو ناراحتی اور تکلیف کا باعث ہو۔[1]

"اُف" سے اور معانی بھی مراد لیے گئے ہیں مثلاً تھوڑی سی چیز، ناراحتی، ملامت اور بدبو۔

بعض دیگر نے کہا ہے کہ اس لفظ کی بنیاد یہ ہے کہ جس وقت انسان کے بدن یا لباس پر مٹی یا تھوڑی سی راکھ بیٹھ جاتے اور وہ پھونک سے اسے اپنے سے دور کرے تو اس موقع پر انسان کے منہ سے جو آواز نکلتی ہے وہ " اوف " یا "اُف" کے مشابہ ہوتی ہے۔ بعدازاں یہ لفظ کی صورت میں ناراحتی اور تنفر کے اظہار کے لیے خصوصاً معمولی چیزوں کے بارے میں استعمال ہونے لگا۔

جو کچھ اس سلسلے میں کہا گیا ہے اسے مجموعی نظر سے دیکھا جائے اور دیگر قرائن بھی ملحوظِ نظر رکھے جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اصل میں "اسم صوت" تھا (وہ آواز جو انسان نفرت، رنج اور تکلیف کے موقع پر نکالتا ہے یا کسی آلودہ چیز پر پھونک مارتے ہوئے اس کے منہ سے نکلتی ہے)۔ بعدازاں یہ آواز لفظ کی صورت اختیار کر گئی۔ یہاں تک کہ اس سے الفاظ مشتق ہوئے اور یہ لفظ معمولی پریشانیوں یا چھوٹے چھوٹے مسائل پر اظہارِ تنفر کیلئے بولا جانے لگا۔ لہٰذا اوپر جو مختلف معانی بیان ہوتے ہیں یوں لگتا ہے کہ وہ اسی جامع اور کلی معنی کے مصداق ہیں۔

بہرحال آیت چاہتی ہے کہ ایک مختصر سی عبارت میں انتہائی فصاحت و بلاغت سے یہ بات سمجھائے کہ ماں باپ کا احترام اس قدر زیادہ ہے کہ ان کے سامنے ذرا سی بھی ایسی بات نہ کی جائے جو انکی ناراحتی یا تنفر کا باعث ہو۔

---

[1] تفسیر فخرالدین رازی، ج ۲۰ ص ۱۸۱۔

Marfat.com

(۲۶) وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا
تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ○
(۲۷) اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ وَكَانَ
الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ○
(۲۸) وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا
فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّیْسُوْرًا ○
(۲۹) وَلَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰی عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ
الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ○
(۳۰) اِنَّ رَبَّكَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ
بِعِبَادِهٖ خَبِیْرًا بَصِیْرًا ○

ترجمہ

(۲۶) اور نزدیکیوں کو ان کا حق دے اور (اسی طرح) مسکین اور مسافر کا اور ہرگز اسراف
اور فضول خرچی نہ کر۔
(۲۷) کیونکہ اسراف کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان نے اپنے پروردگار
(کی نعمتوں) کا کفران کیا۔
(۲۸) اور اگر تُو ان (حاجت مندوں) سے اعراض کرے اور تم اپنے پروردگار کی رحمت کے
انتظار میں ہو (کہ وہ تیرے کام میں کشائش کرے اور تُو ان کی مدد کرے) تو ان سے تو

Marfat.com

نرم اور لطف و کرم کے پیرائے میں بات کر ۔

(۲۹) کبھی بھی اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کا حلقہ نہ بنا (اور انفاق و بخشش کو ترک نہ کر) اور نہ ہی اسے بالکل کھول دے کہ (آخر کار) تو ملامت زدہ اور بے کار ہو کر رہ جائے ۔

(۳۰) تیرا پروردگار جسے چاہتا ہے اس کی روزی کشادہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے وہ اپنے بندوں کے بارے میں آگاہ و بینا ہے ۔

تفسیر

انفاق و بخشش میں اعتدال

ان آیات میں اسلام کے بنیادی احکام کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے ۔ ان میں قریبیوں، حاجت مندوں اور مسکینوں کے حق کی ادائیگی کے بارے میں حکم ہے نیز انفاق میں فضول خرچی سے روکا بھی گیا ہے ۔

پہلے فرمایا گیا ہے : قریبیوں اور نزدیکیوں کا حق انہیں دے (و اٰت ذاالقربیٰ حقہٗ)۔اسی طرح حاجت مندوں اور راہ میں رہ جانے والوں کا حق انہیں دے (والمسکین وابن السبیل)۔لیکن اس طرح سے کہ ہرگز فضول خرچی نہ ہو (ولا تبذر تبذیرًا) ۔

" تبذیر " اصل میں " بذر " کے مادہ سے بیج ڈالنے اور دانہ چھڑکنے کے معنی میں ہے لیکن یہ لفظ ایسے مواقع سے مخصوص ہے جہاں انسان اپنے اموال کو غیر منطقی اور غلط کام میں خرچ کرے ۔ فارسی میں اس کا متبادل ہے " ریخت و پاش " دوسرے لفظوں میں " تبذیر " نامناسب مقام پر مال خرچ کرنے کو کہتے ہیں چاہے تھوڑا سا ہی کیوں نہ ہو ۔ برمحل مقام پر خرچ کرنے کو " تبذیر " نہیں کہتے چاہے زیادہ ہی کیوں نہ ہو ۔ جیسا کہ تفسیر عیاشی میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے اس آیت کے بارے میں سوال کرنے والے کے جواب میں فرمایا :

من انفق شیئًا فی غیر طاعة اللّٰه فهو مبذر ومن انفق فی سبیل اللّٰه فهو مقتصد ۔

جو شخص حکم الٰہی کی اطاعت کے خلاف کہیں خرچ کرے وہ " مبذر " (فضول خرچ) ہے اور جو شخص راہِ خدا میں خرچ کرے وہ مقتصد (میانہ رو) ہے [1]

[1] تفسیر صافی، زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

Marfat.com

آپؑ ہی سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ آپؑ نے حاضرین کے لیے تر و تازہ کھجوریں لانے کا حکم دیا۔ بعض لوگ کھجوریں کھاتے اور ان کی گٹھلیاں دور پھینک دیتے۔ آپؑ نے فرمایا: ایسا نہ کرو یہ "تبذیر" ہے اور خدا برائی کو پسند نہیں کرتا۔[1]

اسراف اور تبذیر کا معاملہ اتنا باریک ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک راستے سے گزر رہے تھے۔ آپؐ کے ایک صحابی سعد وضو کر رہے تھے اور پانی زیادہ ڈال رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا:

اسراف کیوں کرتے ہو؟

سعد نے عرض کیا:

کیا وضو کے پانی میں بھی اسراف ہے؟

آپؐ نے فرمایا:

نعم و ان کنت علی نهر جار

ہاں اگرچہ تم جاری دریا کے کنارے ہی کیوں نہ ہو۔[2]

اس سلسلے میں کہ "ذی القربیٰ" سے آنحضرتؐ کے سب رشتہ دار مراد ہیں یا مخصوص رشتہ دار (کیونکہ آیت میں مخاطب آنحضرتؐ ہی ہیں)، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

متعدد احادیث کہ جن کے بارے میں "چند اہم نکات" کے زیرِ عنوان بحث آئے گی، میں ہم پڑھیں گے کہ یہ آیت رسول اللہؐ کے "ذوی القربیٰ" سے تفسیر ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض احادیث میں ہے کہ یہ آیت آنحضرتؐ کی طرف سے حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کو فدک کا علاقہ بخشنے کے بارے میں ہے لیکن جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے ایسی تفاسیر آیات کے وسیع مفہوم کو محدود نہیں کرتیں۔ دراصل ان میں روشن اور واضح مصداق کا ذکر ہوتا ہے۔

"وآت" میں رسول اللہؐ سے خطاب کیا گیا ہے لیکن یہ بات اس امر کی دلیل نہیں کہ حکم آنحضرتؐ ہی سے مخصوص ہے۔ کیونکہ باقی احکام جو ان آیات میں آئے ہیں مثلاً فضول خرچی کی ممانعت، سائل اور مسکین سے نرمی یا بخل کی ممانعت سب رسولِ اکرمؐ سے خطاب کی صورت میں ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ احکام آپؐ سے مخصوص نہیں ہیں اور ان کا مفہوم پوری طرح عام ہے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرنے کے حکم کے

---

1. تفسیر صافی، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔
2. تفسیر صافی، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

بعد فضول خرچی کی ممانعت اس طرف اشارہ ہے کہ کہیں انسان قرابت کے جذبات یا مسکین اور مسافر سے کسی جذباتی وابستگی کے زیر اثر نہ آجائے اور ان پر ان کے استحقاق سے زیادہ خرچ نہ کرے اور اسراف کی راہ اختیار نہ کرے کیونکہ اسراف اور فضول خرچی ہر مقام پر مذموم ہے۔

بعد والی آیت "تبذیر" کی ممانعت پر استدلال اور تاکید کے طور پر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اسراف کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں (ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین)۔

اور شیطان نے پروردگار کی نعمتوں کا کفران کیا تھا (وکان الشیطان لربہ کفورًا)۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیطان نے پروردگار کی نعمتوں کا کیسے کفران کیا تو اس کا جواب واضح ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اسے بہت زیادہ قوت و استعداد دے رکھی تھی۔ اس نے ان سب قوتوں کو غلط مقام پر صرف کیا یعنی لوگوں کو گمراہ کیا۔

رہا یہ کہ اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی کیسے ہیں؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی خداداد نعمتوں کا کفران کرتے ہیں اور جہاں انہیں استعمال کرنا چاہیئے وہاں کی بجائے انہیں غلط مقام پر خرچ کرتے ہیں۔

"اخوان" (بھائی) یا اس بناء پر ہے کہ ان کے اعمال شیطانوں سے اس طرح ہم آہنگ ہیں جیسے بھائیوں کے کہ جو ایک جیسے عمل کرتے ہیں اور یا اس بناء پر کہ وہ دوزخ میں شیطانوں کے ہم نشین ہوں گے جیسا کہ سورہ زخرف آیہ ۳۹ میں شیطان کا گناہوں سے آلودہ انسانوں سے بہت نزدیکی تعلق بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ○

آج شیطان سے اظہار برأت اور علیٰحدگی کا تقاضا تمہارے لیے سود مند نہیں ہے کیونکہ تم سب عذاب میں مشترک ہو۔

رہا یہ کہ "شیاطین" یہاں جمع کی صورت میں ہے۔ ہوسکتا ہے یہ اس چیز کی طرف اشارہ ہو جو سورہ زخرف کی آیات سے معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص یادِ خدا سے منہ پھیر لے ایک شیطان کو اس کا ہمنشین قرار دیا جاتا ہے جو نہ صرف اِس جہان میں اس کے ہمراہ ہوگا بلکہ اُس جہان میں بھی ساتھ ہوگا۔ قرآن کے الفاظ میں:

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ..... حَتّٰى
اِذَا جَآءَنَا قَالَ يَالَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ (زخرف ۳۶ و ۳۸)

بعض اوقات کوئی مسکین کسی کے پاس آتا ہے لیکن اس کی ضرورت کے مطابق اس کی مدد کرنا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں اگلی آیت بتاتی ہے کہ ضرورت مندوں سے کیسا سلوک کرنا چاہیئے۔

Marfat.com

ارشاد ہوتا ہے : "اگر تو ان ضرورت مندوں سے (وسائل نہ ہونے کی وجہ سے اور) رحمت کے انتظار میں ہونے کے باعث رُخ موڑے تو ایسا تحقیر، سختی اور بے حُرمتی سے نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ان سے نرم اور سنجیدہ گفتگو سے اور بڑی محبت سے پیش آنا چاہیئے"۔ یہاں تک کہ اگر ہو سکے تو ان سے آئندہ کا وعدہ کرلے تاکہ وہ مایوس نہ ہوں (واما تعرضن عنهم ابتغاء رحمة من ربك ترجوها فقل لهم قولًا ميسورًا)۔

"میسور" "یسر" کے مادہ سے راحت اور آسان کے معنی میں ہے۔ یہاں یہ لفظ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس میں ہر قسم کی اچھی گفتگو اور محبت آمیز برتاؤ کا مفہوم شامل ہے۔ لہٰذا اگر بعض نے اس کی تفسیر کسی خاص عبارت سے کی ہے یا آئندہ کا وعدہ کرنا مراد لیا ہے تو یہ مصداق کی حیثیت رکھتا ہے۔

روایات میں ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد جب کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ مانگتا اور آپؐ کے پاس دینے کو کچھ نہ ہوتا تو فرماتے :

یرزقنا الله وایاکم من فضله

مَیں امید رکھتا ہوں کہ خدا ہمیں اور تمہیں اپنے فضل سے رزق دے گا [1]

ہمارے ہاں قدیمی طریقہ ہے کہ کوئی سائل گھر کے دروازے پر آئے اور اسے دینے کو کچھ نہ ہو تو کہتے ہیں : معاف کرو۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تیرے آنے سے ہمارے اوپر ایک حق عائد ہوگیا ہے اور تو اخلاقی طور پر ہم سے کچھ طلب کر رہا ہے۔ ہم تجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنا یہ اخلاقی حق ہمیں بخش دے کیونکہ ہم تمہارے حق کا تقاضا پورا نہیں کر سکتے۔

اعتدال چونکہ ہر چیز میں ضروری ہے یہاں تک کہ انفاق میں بھی، لہٰذا اگلی آیت میں اس بارے میں تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : اپنے ہاتھ کا گردن کے گرد حلقہ نہ بنا (ولا تجعل يدك مغلولة الى عنقك)۔

یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دینے والا ہاتھ تیرے پاس ہونا چاہیئے اسے بخیلوں کے ہاتھ کی طرح گردن کی زنجیر نہیں بن جانی چاہیئے کہ انسان مدد کرنے کے قابل نہ رہے۔

دوسری طرف یہ بھی ہے کہ "اپنا ہاتھ اتنا بھی کھلا نہ رکھ اور بخشش اتنی بھی بے حساب نہ کر کہ تو کام کاج سے رہ جائے اور کبھی اِس کی اور کبھی اُس کی ملامت سنتا رہے اور لوگوں سے جدا ہو جائے" (ولا تبسطها كل البسط فتقعد ملوماً محسورًا)۔

جیسے ہاتھ کا گردن کے لیے حلقۂ زنجیر بن جانا بخل کے لیے کنایہ ہے اسی طرح ہاتھ کا بالکل کھلا ہونا

---

[1] تفسیر مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

بے حساب بخشش کر کے بیٹھ رہنے اور بیکار ہو جانے کی طرف اشارہ ہے لفظ "تقعد" "قعود" کے مادہ سے بیٹھنے کے معنی میں ہے۔

لفظ "ملوم" اس طرف اشارہ ہے کہ بعض اوقات زیادہ انفاق اور بخشش نہ صرف انسان کی فعالیت ختم کر دیتی ہے اور اسے ضروریاتِ زندگی کا محتاج کر دیتی ہے بلکہ اسے لوگوں کی ملامت کا بھی شکار کر دیتی ہے۔

"محسور" "حسر" (بروزن "قصر") کے مادہ سے دراصل لباس اتار کر کچھ حصہ برہنہ کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی بناء پر "حاسر" اس جنگجو کو کہتے ہیں جس کے بدن پر زرہ اور سر پر خود نہ ہو۔ نیز وہ جانور کہ جو زیادہ چلنے کی وجہ سے تھک کر رہ گئے ہوں انہیں بھی "حسیر" یا "حاسر" کہا جاتا ہے۔ گویا ان کی جسمانی طاقت کا لباس اتر جاتا ہے اور وہ برہنہ ہو جاتے ہیں۔ بعد ازاں اس لفظ کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوگئی اور ہر اس شخص کو جو تھکا ماندہ ہو اور مقصد تک پہنچنے سے عاجز ہو "محسور" "حسیر" یا "حاسر" کہا جانے لگا۔

لفظ "حسرت" (بمعنی غم و اندوہ) بھی اسی مادہ سے لیا گیا ہے کیونکہ یہ حالت عام طور پر انسان پر ایسے عالم میں طاری ہوتی ہے جب وہ مشکلات کو ختم کرنے کی سکت نہ رکھتا ہو گویا اس کی طاقت کا جامہ اتر گیا ہو۔

انفاق میں بھی جب انسان حد سے گزر جائے اور اس میں اپنی تمام تر قوت ہاتھ سے دے بیٹھے تو فطری امر ہے کہ وہ اپنی کارکردگی کو جاری رکھنے اور زندگی کا سازو سامان مہیا کرنے سے رہ جاتا ہے گویا اُس کی قوتیں برطرف ہو جاتی ہیں اور وہ غم و الم میں ڈوب جاتا ہے اور لوگوں سے بھی اس کا میل ملاپ منقطع ہو جاتا ہے۔

بعض روایات جو اس آیت کی شانِ نزول میں منقول ہیں۔ ان میں یہ مفہوم وضاحت سے نظر آتا ہے ایک روایت میں ہے:

> رسول اللہؐ ایک گھر میں موجود تھے۔ اس گھر کے دروازے پر ایک سائل آیا۔ اسے دینے کے لیے کوئی چیز مہیا نہ تھی۔ اس نے قمیص مانگی تھی۔ رسول اللہؐ نے اپنی قمیص اتار کر اسے دے دی۔ اس وجہ سے آپؐ اس روز مسجد میں نماز کے لیے نہ جا سکے۔ کفار نے اس مسئلے کو اچھالا طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے کہا، محمد (ص) سو گیا ہے یا لہو و لعب میں مشغول ہے اور اس نے اپنی نماز بھلا دی ہے۔

اس طرح یہ کام دشمن کی ملامت و شماتت کا سبب بھی بنا اور دوستوں کی جدائی کا بھی۔ یعنی "ملوم و محسور" کا مصداق ہوا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ اس کام کا اعادہ نہ ہو۔

Marfat.com

یہ مسئلہ ظاہراً جس موقع پر مسئلہ ایثار سے متضاد ہے، اس کے بارے میں ہم "چند اہم نکات" کے زیر عنوان بحث کریں گے۔

بعض نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ بعض اوقات رسول اللہؐ بیت المال میں جو کچھ ہوتا کسی ضرورت مند کو دے دیتے۔ بعد میں کوئی حاجت مند آتا تو پھر آپؐ کے پاس کچھ نہ ہوتا اور آپؐ کو شرمندگی محسوس ہوتی ایسے میں بسا اوقات ضرورتمند شخص ملامت کرنے لگتا اور پیغمبر اکرمؐ کے پاک دل کو آزردہ کرتا لہٰذا حکم دیا گیا کہ جو کچھ بیت المال میں ہو سارے کا سارا نہ دے دیا جائے اور نہ ہی سارا رکھ چھوڑا جائے تاکہ اس قسم کی مشکلات پیش نہ آئیں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اصلاً بعض لوگ محروم، نیاز اور مسکین کیوں ہیں کہ جن کی وجہ سے ان کے لیے خرچ کرنا ضروری ہے۔ کیا بہتر نہ تھا کہ خدا تعالےٰ خود انہیں جس چیز کی ضرورت ہے دے دیتا تاکہ وہ اس کے محتاج نہ ہوتے کہ ان پر خرچ کیا جائے۔

زیر نظر آخری آیت گویا اس سوال کا جواب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا اپنی روزی جس کیلئے چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کرتا ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں کے بارے میں آگاہ و بیناہے (ان ربك يبسط الرزق لمن يشاء ويقدر انه كان بعباده خبيراً بصيراً)۔

یہ تمہارے لیے ایک آزمائش اور امتحان ہے ورنہ اس کے لیے تو ہر چیز ممکن ہے۔ وہ اس طرح سے تمہاری تربیت کرنا چاہتا ہے۔ وہ تم میں سخاوت اور فداکاری کے جذبے پروان چڑھانا چاہتا ہے وہ تمہارے اندر خود غرضی کا خاتمہ چاہتا ہے۔

علاوہ ازیں بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ اگر وہ بالکل بے نیاز ہو جائیں تو سرکشی کی راہ اختیار کرلیں۔ ان کے لیے مصلحت اسی میں ہے کہ ان کو محدود طور پر روزی ملے کہ جس سے وہ فقر و فاقہ میں بھی مبتلا نہ ہوں اور طغیان و سرکشی کی راہ بھی اختیار نہ کریں۔

ان تمام امور سے قطع نظر انسانوں میں (معلول، معذور اور مجبور افراد کے علاوہ) رزق کی تنگی اور وسعت ان کی سعی و کوشش سے وابستہ ہے اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ خدا جس کے لیے چاہتا ہے روزی کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، اس کا یہ چاہنا اس کی حکمت کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ جس شخص کی کوشش زیادہ ہے اُس کا حصہ زیادہ ہو اور جس کی کوشش کم ہے اس کا حصہ کم ہو۔

بعض مفسرین نے اس آیت کے گزشتہ آیات سے تعلق کے بارے میں ایک اور احتمال قبول کیا ہے وہ یہ کہ زیر نظر آخری آیت انفاق میں افراط و تفریط سے روکنے کے حکم کی دلیل کے طور پر آئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ یہاں تک کہ خدا اپنی اس قدرت و طاقت کے باوجود عطائے رزق میں اعتدال رکھتا ہے نہ اس طرح

Marfat.com

سے بخشتا ہے کہ برائی اور سرکشی برپا ہوجائے اور اس طرح تنگ کرتا ہے کہ لوگ زحمت و مصیبت میں پڑجائیں یہ سب کچھ بندوں کے مفاد کے پیشِ نظر ہے لہٰذا حق یہی ہے کہ تم بھی خدائی اخلاق اپنا کر اعتدال کی راہ اختیار کرو اور افراط و تفریط سے پرہیز کرو۔[1]

چند اہم نکات

۱۔ "ذی القربیٰ" سے یہاں کون لوگ مراد ہیں؟ : لفظ "ذی القربیٰ" جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں وابستہ اور نزدیکی افراد کے معنی میں ہے۔ مفسرین نے اس بارے میں بحث کی ہے کہ یہ لفظ یہاں مخصوص افراد کے لیے ہے یا عام ہے۔

بعض کا نظریہ ہے کہ تمام مومنین و مسلمین مخاطب ہیں اور انہیں اپنے رشتہ داروں کا حق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

بعض دیگر کہتے ہیں کہ مخاطب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور آپؐ سے کہا گیا ہے کہ اپنے نزدیکیوں کو ان کا حق ادا کریں۔ مثلاً خمس غنائم اور خمس سے باقی متعلقہ چیزوں میں سے اور کلی طور پر بیت المال میں جو اُن کے حقوق ہیں وہ ادا کریں۔

متعدد روایات جو شیعہ اور سنی طرق سے نقل ہوئی ہیں اُن کے مطابق جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کو بلایا اور فدک کی سرزمین آپؑ کو بخش دی۔[2]

اہل سنت کے منابع سے ایک حدیث مشہور صحابیٔ رسول ابو سعید خدری سے منقول ہے:

لما نزل قوله تعالٰی : "وات ذا القربٰی حقه" اعطی رسول الله فاطمة فدکًا۔

جب یہ آیت نازل ہوئی: "وات ذاالقربٰی حقه" تو رسول اللہؐ نے فدک

---

[1] المیزان، ج ۱۳ ص۸۳۔

[2] فدک خیبر کے پاس اور مدینہ سے تقریباً ۱۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک آباد اور زرخیز زمین ہے۔ خیبر کے بعد حجاز کے یہودیوں کا یہ واحد سہارا شمار ہوتی تھی۔ (کتاب مراصد الاطلاع" کے مادہ "فدک" کی طرف رجوع کریں)۔
جب اس علاقے کے یہودیوں نے جنگ کیے بغیر ہتھیار ڈال دیے اور انہوں نے اپنے تئیں آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کر دیا تو معتبر اسناد اور تواریخ کیمطابق آنحضرتؐ نے یہ زمین حضرت فاطمہ زہراؑ کو بخش دی لیکن آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد مخالفین نے اسے غصب کر لیا، سالہا سال تک یہ علاقہ ایک سیاسی حربے کے طور پر ان کے ہاتھ میں رہا لیکن بعض خلفاء نے اسے اولادِ فاطمہؑ کو واپس کر دیا۔
(بعض تواریخ کے مطابق فدک کا علاقہ تقریباً دس مرتبہ چھینا گیا اور واپس کیا گیا)

Marfat.com

کا علاقہ فاطمہؑ کو دے دیا۔[1]

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تک کہ حضرت سجاد علیہ السلام نے اسیری کے دوران شام میں اسی آیت سے شامیوں کے سامنے استدلال کرتے ہوئے فرمایا:

آیت " اٰت ذاالقربٰی حقہ " سے مراد ہم ہیں کہ جن کے بارے میں خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیا ہے کہ ان کا حق انہیں ادا کرو (جبکہ شامیو! تم نے ہمارے سب حقوق ضائع کر دیئے ہیں)۔[2]

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ یہ دونوں تفاسیر ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں۔

سب لوگوں کا فرض ہے کہ ذی القربیٰ کا حق ادا کریں۔ رسول اللہؐ چونکہ اسلامی معاشرے کے رہبر ہیں لہٰذا اُن کی بھی ذمہ داری ہے کہ اس عظیم خدائی فریضہ پر عمل کریں۔

درحقیقت اہلِ بیتِ رسولؐ " ذی القربیٰ " کے واضح ترین مصداق ہیں اور رسول اللہؐ خود اس آیت کے روشن ترین مخاطب ہیں۔ لہٰذا پیغمبر اکرمؐ نے ذی القربیٰ کا حق کہ جو خمس، فدک یا اسی طرح دوسری چیزوں کی صورت میں تھا انہیں دے دیا کیونکہ زکوٰۃ کہ جو درحقیقت عمومی اموال میں شمار ہوتی ہے اس کا لینا ان کے لیے ممنوع تھا۔

۲۔ اسراف کے بُرے اثرات: اس میں شک نہیں کہ کرۂ ارض میں موجود نعمتیں اس میں رہنے والوں کے لیے کافی و وافی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ انہیں بے ہودہ اور فضول استعمال نہ کیا جائے بلکہ صحیح اور معقول طریقے سے ہر قسم کی افراط و تفریط سے بچ کر ان سے استفادہ کیا جائے ورنہ یہ نعمات اس قدر غیر محدود بھی نہیں کہ ان کے غلط استعمال کے مہلک نتائج نہ نکلیں۔

افسوس کا مقام ہے کہ اکثر اوقات زمین کے ایک علاقے میں اسراف اور فضول خرچی کے باعث دوسرا علاقہ محرومیت کا شکار ہو جاتا ہے یا ایک زمانے کے لوگوں کا اسراف آئندہ نسلوں کی محرومیت کا باعث بن جاتا ہے۔

جس زمانے میں آج کے دَور کی طرح لوگوں کے پاس آبادی کے اعداد و شمار موجود نہ تھے، اسلام نے خبردار کیا تھا کہ خدائی نعمتوں سے استفادہ کرتے ہوئے اسراف اور فضول خرچی نہ کرو۔

قرآنِ حکیم نے بہت سی آیات میں مسرفین کی بڑی شدت سے مذمت کی ہے۔

---

[1] بزاز، ابویعلیٰ، ابنِ ابی حاتم اور ابنِ مردویہ نے یہ حدیث ابوسعید سے نقل کی ہے (کتاب میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۸۸ اور کنزالعمال ج ۲ ص ۱۵۸ کی طرف رجوع کریں) مجمع البیان میں اور اسی طرح درمنثور میں زیرِ بحث آیت کے ذیل میں شیعہ اور سنی طرق کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔

[2] نورالثقلین، ج ۳ ص ۲۵۵

Marfat.com

ایک جگہ فرماتا ہے:

وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

اسراف نہ کرو کہ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (انعام - ۱۴۱، اعراف - ۳۱)۔

ایک اور مقام پر فرماتا ہے:

وَ اَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ

اور یقیناً مسرفین اصحاب دوزخ ہیں۔ (مومن - ۴۳)

ایک مقام پر مسرفین کی پیروی سے روکتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

اور مسرفین کے حکم کی اطاعت نہ کرو۔ (شعراء - ۱۵۱)

ایک اور جگہ فرماتا ہے:

مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝

مسرفین پر تیرے پروردگار کی طرف سے نشان لگا دیئے گئے ہیں۔ (ذاریات - ۳۴)

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

شک نہیں کہ فرعون روئے زمین پر بڑا بن بیٹھا تھا اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ مسرفین میں سے تھا۔ (یونس - ۸۳)

ایک اور جگہ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝

یقیناً اللہ جھوٹے مسرف کو ہدایت نہیں کرتا۔ (مومن - ۲۸)

اور آخر کار ان کا انجام ہلاکت و نابودی بتایا گیا ہے:

وَ اَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۝

اور ہم نے مسرفین کو ہلاک کر ڈالا۔ (انبیاء - ۹)

نیز جیسا کہ ہم نے لکھا ہے کہ زیر بحث آیت میں مسرفین کو شیطان کا بھائی اور ہمنشین شمار کیا گیا ہے۔

۔ اسراف اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے ہر قسم کے کام میں تجاوز کا مفہوم رکھتا ہے لیکن عام طور پر اخراجات میں حد سے تجاوز کے لیے بولا جاتا ہے۔

خود آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اسراف کنجوسی اور تنگی کا متضاد ہے۔

قرآن کہتا ہے:

Marfat.com

وَالَّذِيْنَ إِذَآ أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ؕ

وہ لوگ کہ جو خرچ کرتے وقت اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ میانہ روی سے کام لیتے ہیں۔ (فرقان - ۶۷)

۳۔ "اسراف" اور "تبذیر" میں فرق: اس سلسلے میں مفسرین کی طرف سے کوئی واضح بحث نظر سے نہیں گزری لیکن ان دونوں الفاظ کے بنیادی معانی پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابلے پر ہوں تو اسراف حدِ اعتدال سے نکل جانے کے معنی میں ہے بغیر اس کے کہ ظاہراً کسی چیز کو ضائع کیا ہو۔ مثلاً یہ کہ ہم ایسا گراں قیمت لباس پہنتے ہیں کہ جو ہماری ضرورت کے لباس سے سو گنا زیادہ قیمت کا ہے یا اپنی ایسی گراں قیمت غذا تیار کرتے ہیں کہ جتنی قیمت سے بہت سے لوگوں کو عزت و آبرو سے کھانا کھلایا جا سکتا ہے۔ ایسے موقع پر ہم حد سے تجاوز کر گئے ہیں لیکن ظاہراً کوئی چیز ختم اور ضائع نہیں ہوئی۔

جبکہ "تبذیر" اس طرح سے خرچ کرنے کو کہتے ہیں کہ جو اتلاف اور ضیاع کی حد تک پہنچ جائے مثلاً دو مہمانوں کے لیے دس افراد کا کھانا پکالیں جیسا کہ بعض نادان کرتے ہیں اور پھر اس پر فخر کرتے ہیں اور بچے ہوئے کھانے کو کوڑے کرکٹ میں پھینک کر ضائع کرتے ہیں۔

لیکن بنا کسے واضح ہے کہ بہت سے مواقع پر دونوں الفاظ بالکل ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں یہاں تک کہ تاکید کے طور پر ایک دوسرے کے ساتھ آتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

الا ان اعطاء المال فی غیر حقه تبذیر و اسراف و هو یرفع صاحبه فی الدنیا و یضعه فی الاٰخرة و یکرمه فی الناس و یهینه عند الله

خبردار! مال کو اس کے مقام استحقاق کے علاوہ خرچ کرنا تبذیر و اسراف ہے۔ ہوسکتا ہے یہ کام انسان کو دنیا میں بلند مرتبہ کردے لیکن آخرت میں وہ یقیناً پست و حقیر ہوگا۔ ہوسکتا ہے عام لوگوں کی نظر میں اسے عزت و اکرام حاصل ہو جائے مگر بارگاہِ الٰہی میں یہ کام انسان کی تنزلی اور سقوط کا سبب ہے۔

زیر بحث آیات کی تشریح میں ہم نے پڑھا ہے کہ احکام اسلامی میں اسراف و تبذیر کی اس قدر ممانعت کی گئی ہے کہ وضو کے لیے زیادہ پانی ڈالنے سے بھی منع کیا گیا ہے اگرچہ وضو کرنے والا لبِ دریا ہی کیوں نہ بیٹھا ہو۔ اسی طرح امام نے خرمے کی گٹھلیاں تک دُور پھینکنے سے منع کیا ہے۔

آج کی دنیا میں بعض مواد کی کمی کے احساس نے اس امر کی طرف اتنی شدت سے توجہ دلائی ہے کہ اب ہر چیز سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ کوڑا کرکٹ سے کھاد تیار کی جا رہی ہے اور بھوک سے اشیائے ضرورت تیار کی جا رہی ہیں۔ استعمال شدہ گندے اور بچے ہوئے پانی سے زراعت کے لیے استفادہ کیا جا رہا ہے

Marfat.com

کیونکہ آج لوگ محسوس کرتے ہیں کہ عالم طبیعی میں موجود مواد غیر محدود نہیں ہے کہ جس کے باعث اس امر سے آسانی سے صرف نظر کر لیا جائے بلکہ لوگ سمجھتے ہیں ہر چیز سے دوہرا استفادہ کرنا چاہیئے۔

۴۔ کیا میانہ روی ایثار کے منافی ہے: زیر بحث آیات کہ جو "انفاق میں اعتدال ملحوظ رکھنے کا حکم دیتی ہیں ان سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ سورہ دہر اور دیگر قرآنی آیات میں اور اسی طرح روایات میں ایثار کرنے والوں کی تعریف و توصیف اور مدح و ثنا کی گئی ہے یہاں تک کہ انتہائی مشکل حالات میں بھی اپنی ذات کو فراموش کر کے دوسروں کے لیے ایثار کرنے کی تشویق کی گئی ہے۔ لہٰذا یہ دونوں باتیں آپس میں کس طرح ہم آہنگ ہو سکتی ہیں؟

زیر بحث آیات کی شان نزول پر غور و خوض کرنے سے اور اسی طرح دیگر قرائن کو سامنے رکھنے سے مسئلہ واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ اعتدال ملحوظ رکھنے کا حکم وہاں ہے جہاں زیادہ بخشش انسان کی اپنی بے سروسامانی کا سبب بن جائے اور اصطلاح کے مطابق وہ "ملوم و محسور" ہو جائے۔ یا ایثار اس کی اولاد کے لیے ناراحتی، پریشانی، دباؤ اور تنگی کا باعث ہو جائے اور اس کے اپنے گھر کا نظام خطرے میں پڑ جائے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو یقیناً ایسے میں ایثار بہترین راہ ہے۔

اس سے قطع نظر اعتدال ملحوظ رکھنے کا حکم عمومی ہے جبکہ ایثار ایک خاص حکم ہے جو معین مواقع سے مربوط ہے لہٰذا یہ دونوں حکم ایک دوسرے سے متضاد نہیں ہیں۔

Marfat.com

(٣١) وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ
اِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝
(٣٢) وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝
(٣٣) وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا
فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ
كَانَ مَنْصُوْرًا ۝
(٣٤) وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ
اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْــُٔوْلًا ۝
(٣٥) وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ
خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝

ترجمہ

(٣١) اور اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں اور تمہیں رزق دیتے ہیں انہیں قتل کرنا ایک بہت بڑا گناہ ہے۔

(٣٢) اور زنا کے قریب نہ جاؤ کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

(٣٣) اور جس شخص کا خون خدا نے حرام قرار دیا ہے اسے سوائے حق کے قتل نہ کرو اور جو شخص مظلوم مارا گیا ہے اس کے ولی کو ہم نے (حق قصاص) پر تسلط دیا ہے لیکن وہ قتل میں اسراف نہ کرے کیونکہ وہ مدد دیا گیا ہے۔

Marfat.com

(۳۴) اور سوائے احسن طریقے کے مالِ یتیم کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ حدِّ بلوغ کو پہنچ جائے
اور اپنے عہد کو ایفا کرو کیونکہ عہد کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

(۳۵) اور جب تم ناپ تول کرو تو پیمانہ کا حق ادا کرو اور ترازو سے وزن صحیح کرو یہ تمہارے
لیے بہتر ہے اور اس کا انجام بہت اچھا ہے۔

تفسیر

چھ اہم احکام

گزشتہ آیات میں احکامِ اسلامی کے کچھ حصے آئے ہیں۔ ان کے بعد زیرِ نظر آیات میں کچھ مزید احکام پیش کیے گئے ہیں۔ چھ اہم احکام پانچ آیات میں بہت پُرمعنی اور دلنشین پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) پہلے زمانۂ جاہلیت کے ایک بہت قبیح اور بُرے عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ انتہائی دردناک گناہوں میں سے تھا۔ ارشاد ہوتا ہے: اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے قتل نہ کرو (ولا تقتلوا اولادکم خشیة املاق)۔ ان کی روزی تمہارے ذمہ نہیں ہے بلکہ انہیں اور تمہیں ہم رزق دیتے ہیں (نحن نرزقھم و ایاکم)۔ کیونکہ ان کا قتل ایک بہت بڑا گناہ تھا اور ہے (ان قتلھم کان خطاً کبیرًا)۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی اقتصادی حالت اتنی سخت اور پریشان کُن تھی کہ وہ اپنی مالی حالت پتلی ہونے کی وجہ سے اپنی عزیز اولاد تک کو قتل کر دیتے تھے۔

مفسّرین میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا زمانۂ جاہلیت کے عرب فقر کے خوف سے صرف اپنی بیٹیوں کو مٹی میں دبا دیتے تھے یا بیٹوں کو بھی زندہ درگور کر دیتے تھے۔

بعض کا نظریہ ہے کہ یہ سب گفتگو بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ وہ لوگ ایسا دو وجوہ کی بناء پر کرتے تھے۔ ایک تو اس خیال کی بناء پر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی جنگ میں دشمنوں کی قید میں چلی جائیں اور اس طرح ان کی عزت و ناموس دوسروں کے ہاتھ آ جائے۔

دوسرا فقر و فاقہ کی وجہ سے اور اسبابِ زندگی مہیا کرنے کی طاقت نہ ہونے کے سبب وہ لڑکیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ کیونکہ اس زمانہ میں لڑکی مالی پیداوار کا ذریعہ نہ تھی بلکہ اکثر اوقات اخراجات کا سبب شمار ہوتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابتداً میں بیٹے بھی اخراجات ہی کا باعث تھے لیکن زمانۂ جاہلیت کے عرب ہمیشہ بیٹوں کو اہم سرمائے کے طور پر دیکھتے تھے اور انہیں گنوانے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔

Marfat.com

بعض دوسروں کا نظریہ ہے کہ وہ دو طرح سے اولاد کو قتل کرتے تھے۔ ایک قتل وہ ناموس کی حفاظت کے غلط نام پر لڑکیوں کا کرتے تھے اور دوسرا فقر و فاقہ کے خوف سے بلا تخصیص بیٹے اور بیٹی کا۔

آیت کی ظاہری تعبیر کہ جو جمع مذکر (قتلھم اور نرزقھم) کی صورت میں آئی ہے، اس نظریے کی دلیل بن سکتی ہے کیونکہ عربی ادب کے لحاظ سے جمع مذکر کا اطلاق بیٹوں اور بیٹیوں پر مجموعی طور پر درست ہے لیکن خصوصیت سے اس کا بیٹیوں کے لیے ہونا بعید معلوم ہوتا ہے۔

البتہ یہ جو کہا گیا ہے کہ بیٹے پیداواری صلاحیت رکھتے تھے اور سرمایہ شمار ہوتے تھے، یہ بالکل صحیح ہے لیکن یہ اس صورت میں کہ جب اس تھوڑی مدت کے لیے وہ اخراجات برداشت کر سکتے۔ حالانکہ بعض اوقات تو وہ اس قدر تنگ دستی میں ہوتے کہ اس تھوڑی سی مدت کے لیے بھی اسبابِ زندگی مہیا کرنے کے قابل نہ ہوتے۔

لہٰذا دوسری تعبیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال یہ بات ایک وہم و گمان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی کہ روزی دینے والے ماں باپ ہی ہیں۔ خدا تعالیٰ اعلان کر رہا ہے کہ اس شیطانی خیال کو دماغ سے نکال دو زیادہ سے زیادہ سعی و کوشش کیلئے اٹھ کھڑے ہو تو خدا بھی مدد کرے گا اور ان کی زندگی کا نظام چلا دے گا۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ ہم اس قبیح اور شرمناک جرم سے وحشت کرتے ہیں حالانکہ یہی جرم ہمارے زمانے میں ایک اور شکل میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ یہ کام بہت زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی انجام پاتا ہے اور وہ ہے اسقاطِ حمل۔ یہ کام بہت زیادہ بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام اور اقتصادی حالات کے نام پر کیا جا رہا ہے۔

(مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۶ سورہ انعام کی آیہ ۱۵۱ کی طرف رجوع کریں)

"خشیۃ املاق" بھی اس شیطانی وہم کی نفی کے لیے ایک لطیف اشارہ ہے کہ یہ صرف ایک خوف ہے جو تمہیں اس بہت بڑے جرم پر ابھارتا ہے ورنہ اس میں حقیقت نہیں ہے۔

ضمناً توجہ رہے کہ "کان خطأ کبیرا" کہ جو فعل ماضی کے ساتھ آیا ہے اس امر کے لیے اشارہ اور تاکید ہے کہ اولاد کو قتل کرنا ایک بہت بڑا گناہ ہے کہ جو قدیم زمانے سے لوگوں میں موجود ہے اور اس کی قباحت اور برائی فطرت کی گہرائیوں میں موجود ہے لہٰذا یہ قباحت کسی زمانے سے مخصوص نہیں ہے۔

(۲) ایک اور عظیم گناہ کہ جس کی طرف اگلی آیت اشارہ کرتی ہے وہ زنا اور منافی عفت عمل ہے۔ قرآن کہتا ہے: زنا کے قریب نہ جاؤ کیونکہ یہ بہت بُرا اور قبیح عمل ہے اور بہت بُری روش ہے (ولا تقربوا الزنا انہ کان فاحشۃ وساء سبیلا)۔

اس مختصر سے جملے میں تین نکات کی طرف اشارہ ہوا ہے:

Marfat.com

الف ۔ یہ نہیں فرمایا کہ زنا نہ کرو۔ بلکہ فرمایا کہ اس شرمناک کام کے قریب نہ جاؤ۔ یہ تعبیر اپنی گہرائی کے اعتبار سے اس حکم کے لیے تاکید ہے نیز یہ اس امر کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ اکثر اوقات اس گناہ کے کچھ تمہیدی اعمال بھی ہوتے ہیں جو تدریجاً انسان کو اس کے قریب کر دیتے ہیں۔ ہوا و ہوس کی نظر سے عورتوں کو دیکھنا بھی اس کا ایک مقدمہ ہے۔ بے پردگی اس کا دوسرا مقدمہ ہے۔ بُری تعلیم، بُری باتیں سکھانے والی کتابیں، گندی فلمیں، گھٹیا جرائد اور برائی کے مختلف مراکز بھی اس کام کا مقدمہ فراہم کرتے ہیں۔

اسی طرح نامحرم عورتوں کے ساتھ خلوت بھی اس کا ایک عامل ہے (یعنی ایک نامحرم مرد اور عورت کسی خالی مکان یا مقام پر ہوں تو وہ بھی اس کا عامل بن سکتا ہے)۔

اسی طرح جوان لڑکے اور لڑکی کی شادی نہ کرنا اور دونوں پر بلا وجہ سختیاں عائد کرنا بھی اس کا سبب بن جاتا ہے۔

یہ سب "زنا کے قریب جانے کے" عامل ہیں۔ مذکورہ آیت اپنے مختصر جملے میں ان سب سے روکتی ہے۔ اسلامی روایات میں ان مقدمات میں سے ہر ایک کی الگ الگ ممانعت کی گئی ہے۔

ب۔ "انه کان فاحشة" میں تین تاکیدیں موجود ہیں۔
ایک "انّ" دوسری فعل ماضی اور تیسری "فاحشة"۔
ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گناہ کتنا بڑا ہے۔

ج۔ "ساء سبیلا" (یعنی زنا بہت بُری روش ہے)۔ یہ جملہ اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ یہ عمل معاشرے میں دیگر بُرائیوں کو بھی کھینچ لاتا ہے۔

حرمتِ زنا کا فلسفہ

(۱) اس سے خاندانی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ماں باپ اور اولاد کے درمیان رابطہ ختم ہو جاتا ہے جبکہ یہ وہ رابطہ ہے جو نہ صرف معاشرے کی شناخت کا سبب ہے بلکہ خود اولاد کی نشو و نما کا موجب بھی ہے۔ یہی رابطہ ساری عمر محبت کے ستونوں کو قائم رکھتا ہے اور انہیں دوام دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ جس معاشرے میں غیر شرعی اور بے باپ کی اولاد زیادہ ہو اس کے اجتماعی روابط سخت تزلزل کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ ان روابط کی بنیاد خاندانی روابط ہیں۔

اس مسئلے کی اہمیت سمجھنے کے لیے لحظہ بھر اس امر پر غور کرنا کافی ہے کہ اگر سارے انسانی معاشرے میں زنا جائز اور مباح ہو جائے اور شادی بیاہ کا قانون ختم کر دیا جائے تو ان حالات میں غیر مشخص اور بے ٹھکانہ اولاد پیدا ہو گی۔ اس اولاد کو کسی کی مدد اور سرپرستی حاصل نہ ہو گی۔ اسے نہ پیدائش کے وقت کوئی پوچھے گا نہ بڑا ہو کر۔

Marfat.com

اس سے قطع نظر برائیوں، سختیوں اور مشکلوں میں محبت کا اثر تسلیم شدہ ہے جبکہ ایسی اولاد اس محبت سے محروم ہو جائے گی اور انسانی معاشرہ پوری طرح تمام پہلوؤں سے حیوانی درندگی کی شکل اختیار کرے گا۔

(ب) یہ شرمناک اور قبیح عمل ہوس باز لوگوں کے درمیان طرح طرح کے جھگڑوں اور کشمکشوں کا باعث بنے گا۔ وہ واقعات کہ جو بعض افراد نے بدنام محلوں اور غلط مراکز کی داخلی کیفیت کے بارے میں لکھے ہیں ان سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جنسی بے راہ رویاں بدترین جرائم کو جنم دیتی ہیں۔

(ج) یہ بات علم اور تجربے نے ثابت کر دی ہے کہ زنا طرح طرح کی بیماریاں پھیلنے کا سبب بنا ہے۔ اس کے آثارِ بد اور بُرے نتائج کی روک تھام کے لیے آج کے دور میں بہت سے ادارے قائم ہیں اور بہت سے اقدامات کیے گئے ہیں مگر اعداد و شمار نشاندہی کرتے ہیں کہ کس قدر افراد اس راستے میں اپنی صحت و سلامتی گنوا بیٹھے ہیں۔

(د) اکثر اوقات یہ عمل اسقاطِ حمل، قتلِ اولاد اور انقطاعِ نسل کا سبب بنتا ہے کیونکہ ایسی عورتیں ایسی اولاد کی نگہداری کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتیں اور اصولاً اولاد ان کے لیے ایسا منحوس عمل جاری رکھنے میں بہت بڑی رکاوٹ ہوتی ہے لہٰذا وہ ہمیشہ اسے پہلے سے ختم کر دینے کی کوشش کرتی ہیں۔

یہ مفروضہ بالکل موہومی ہے کہ ایسی اولاد حکومت کے زیرِ کنٹرول اداروں میں رکھی جا سکتی ہے۔ اس مفروضے کی ناکامی عملی طور پر واضح ہو چکی ہے اور ثابت ہو چکا ہے کہ اس صورت میں بن باپ کی اولاد کی پرورش کس قدر مشکلات کا باعث ہے اور نتیجتاً بہت ہی نامرغوب اور غیر پسندیدہ ہے۔ ایسی اولاد سنگدل، مجرم، بے حیثیت اور ہر چیز سے عاری ہوتی ہے۔

(ہ) یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ شادی بیاہ کا مقصد صرف جنسی تقاضے پورے کرنا نہیں بلکہ تشکیلِ حیات میں اشتراک، روحانی محبت، فکری سکون، اولاد کی تربیت اور تمام حالاتِ زندگی میں ہمکاری شادی کے نتائج میں سے ہیں اور ایسا بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ عورت اور مرد باہم مخصوص ہوں اور عورتیں دوسروں پر حرام ہوں۔

امام علی بن ابی طالب علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

مَیں نے پیغمبرِ اکرمؐ سے سنا آپؐ نے فرمایا:

فی الزنا ست خصال:

ثلث فی الدنیا وثلث فی الاٰخرة

فاما اللواتی فی الدنیا فیذهب بنور الوجه، ویقطع الرزق، و یسرع الفناء۔

واما اللواتی فی الاٰخرة فغضب الرب و سوء الحساب والدخول فی النار، او الخلود فی النار۔

Marfat.com

زنا کے چھ بُرے اثرات ہیں :
ان میں سے تین کا تعلق دنیا سے ہے
اور تین کا تعلق آخرت سے ہے ۔
دُنیاوی بُرے اثرات یہ ہیں کہ یہ عمل انسان کی نورانیت گنوا دیتا ہے ، روزی منقطع کر دیتا ہے
اور جلد فنا سے ہمکنار کر دیتا ہے ۔
اُخروی آثار یہ ہیں کہ یہ عمل پروردگار کے غضب ، حساب کتاب میں سختی اور آتشِ جہنم میں
دخول یا دوام کا سبب بنتا ہے [1]

(۳) اگلی آیت میں ایک اور حکم ہے ۔ یہ حکم انسانوں کے خون کے احترام کے بارے میں ہے اور قتل نفس کی انتہائی حرمت کا ترجمان ہے ۔ قرآن کہتا ہے : جس شخص کا خون خدا نے حرام قرار دیا ہے اسے سوائے حق کے قتل نہ کرو (ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق) ۔

انسان کے خون کا احترام اور قتل نفس کی حرمت ایسے مسائل ہیں جن میں تمام آسمانی شریعتیں ، دین اور انسانی قوانین متفق ہیں اور اس قتل کو ایک بہت بڑا جرم اور گناہ شمار کرتے ہیں لیکن اسلام نے اس مسئلے کو بہت ہی زیادہ اہمیت دی ہے یہاں تک کہ ایک انسان کا قتل ساری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے ۔ قرآن کہتا ہے :

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا

جو کسی کو نہ جان کے بدلے اور نہ فساد فی الارض کی سزا میں قتل کر دے تو اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا ۔ (مائدہ ۔ ۳۲)

یہاں تک کہ قرآن کی بعض آیات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دائمی عذاب جہنم کہ جو کفار کے لیے مخصوص ہے قاتل کے لیے بھی بیان ہوا ہے اور ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ممکن ہے یہ تعبیر اس بات کی دلیل ہو کہ وہ افراد جن کے ہاتھ بے گناہ افراد کے خون سے رنگین ہوتے ہیں وہ دنیا سے ایمان کے ساتھ نہیں جائیں گے بہر حال قرآن کہتا ہے :

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا

جس کسی نے کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دیا تو اس کی جزا جہنم ہے کہ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا ۔ (نساء ۔ ۹۳)

یہاں تک کہ جو افراد لوگوں کے سامنے ہتھیار کھینچتے ہیں ان کے لیے اسلام میں محارب کی حیثیت

---

[1] تفسیر مجمع البیان ج ۶ ص ۴۱۳ ۔

Marfat.com

سے سنگین سزا مقرر ہوئی ہے جس کی تفصیل فقہی کتب میں آئی ہے اس سلسلے میں ہم سورہ مائدہ آیہ ۳۳ کے ذیل میں اشارہ کر آئے ہیں۔

نہ صرف قتل کرنا بلکہ کسی شخص کو کم سے کم اور چھوٹے سے چھوٹا آزار پہنچانے پر بھی اسلام میں سزا موجود ہے۔

یہ بات بڑے اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ خون، جان اور انسان کے مقام کا یہ سب احترام جو اسلام میں ہے کسی اور دین و آئین میں موجود نہیں ہے۔

لیکن بالکل اسی وجہ سے کچھ ایسے مواقع آتے ہیں کہ خون کا احترام اٹھ جاتا ہے اور یہ ان افراد کیلئے ہے جو قتل یا اس جیسے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسی لیے زیرِ بحث آیت میں پہلے حرمت قتل نفس کا بنیادی اور عمومی قانون بیان کیا گیا اور اس کے فوراً بعد "الا بالحق" کہہ کر ایسے افراد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مشہور حدیث میں فرمایا ہے:

لا یحل دم امرء مسلم یشھد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ الا باحدی الثلاث: النفس بالنفس والزانی المحصن، والتارک لدینہ المفارق للجماعۃ۔

کسی مسلمان کا خون کہ جو لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی گواہی دیتا ہو حلال نہیں ہے مگر تین مواقع پر۔ ایک یہ کہ وہ قاتل ہو، زانی محصن ہو اور وہ کہ جو اپنا دین چھوڑ کر مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جائے[1]

قاتل کے بارے میں حکم تو واضح ہے۔ اس کے قصاص میں معاشرے کی حیات اور انسانوں کی حفظِ جان کی ضمانت ہے۔ اگر اولیاءِ مقتول کو حقِ قصاص نہ دیا جائے تو قاتلوں کو شہ ملے گی اور معاشرے کا امن و امان تباہ ہو جائے گا۔

باقی رہا زانی محصن تو اس کا قتل ایک ایسے انتہائی قبیح گناہ کے بدلے میں ہے جو قتل کے برابر ہے۔

نیز مرتد کا قتل اسلامی معاشرے میں ہرج مرج کو روکتا ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ ایک سیاسی حکم ہے، تاکہ نظامِ اجتماعی کی حفاظت کی جا سکے کیونکہ ارتداد نہ صرف اجتماعی امن و امان کے لیے خطرہ ہے بلکہ خود نظامِ اسلام کے لیے بھی خطرہ ہے۔

اصولی طور پر اسلام کسی شخص کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ یہ دین قبول کرے۔ دوسرے ادیان سے اسلام منطقی

---

[1] تفسیر فی ظلال ج ۵ ص ۳۲۳ بحوالہ صحیح بخاری و صحیح مسلم۔

Marfat.com

بنیاد پر معاملہ کرتا ہے اور آزاد بحث و مباحثہ کا قائل ہے لیکن اگر کسی نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لیا اور اسلامی معاشرے کا جزو بن گیا اور اس طرح مسلمانوں کے اسرار سے آگاہ ہو گیا۔ اب اگر وہ دین سے پلٹ جانا چاہے اور عملی طور پر نظام اسلام کی بنیاد کمزور کرنا چاہے اور اسلامی معاشرے کے ستون گرانا چاہے تو یقیناً یہ عمل ناقابلِ برداشت ہے اور ان شرائط کے ساتھ اس کی سزا قتل ہے [۱]

البتہ اسلام میں انسانوں کے خون کا احترام مسلمانوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ غیر مسلمان جو مسلمانوں سے برسرِ جنگ نہیں ہیں اور ان سے امن و سلامتی کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کی جان و مال اور ناموس بھی محفوظ ہے اور ان پر تجاوز کرنا حرام اور ممنوع ہے۔

اس کے بعد قرآن اولیاءِ مقتول کے حقِ قصاص کے بارے میں کہتا ہے: جو شخص مظلوم مارا جائے اس کے ولی کو ہم نے (قاتل سے قصاص لینے کا) تسلط دیا ہے (ومن قتل مظلومًا فقد جعلنا لولیہ سلطانًا)۔

لیکن اسے بھی نہیں چاہیئے کہ ان حالات میں وہ اپنے حق سے زیادہ کا مطالبہ کرے اور قتل میں اسراف کرے کیونکہ وہ مدد دیا گیا ہے (فلا یسرف فی القتل انہ کان منصورًا)۔

جی ہاں! اولیاءِ مقتول جب تک حدِ اسلام کے اندر رہتے ہیں اور اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتے وہ نصرتِ الٰہی کے زیرِ سایہ ہیں۔ یہ جملہ ان اعمال کی طرف اشارہ ہے جو زمانۂ جاہلیت میں تھے اور بعض اوقات آج کل بھی ہوتے ہیں۔ کبھی ایک شخص کے قتل ہو جانے پر مقتول کا قبیلہ دوسرے قبیلے کے کئی قتل کر ڈالتا ہے یا ایک شخص کے قتل کے بدلے قاتل کے علاوہ اور بہت سے بے گناہ افراد قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ جیسے زمانۂ جاہلیت کی رسوم میں تھا کہ جب کسی قبیلے کا کوئی معروف آدمی قتل ہو جاتا تو مقتول کا قبیلہ قاتل کے قتل پر قناعت نہ کرتا بلکہ ضروری سمجھتا کہ قاتل کے قبیلے کا سردار یا دوسرا معروف شخص قتل کرے چاہے اس قتل میں اس کا کوئی حصہ نہ ہو [۲]

ہمارے زمانے میں بھی بعض اوقات ایسے جرائم ہوتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں، اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ خصوصاً غاصب اسرائیل کا یہی کردار ہے۔ جب کوئی فلسطینی مجاہد ان میں سے کسی کو قتل کر دے تو وہ فوراً فلسطینی بچوں اور عورتوں پر بم برسانے لگتے ہیں اور بعض اوقات ایک شخص کے بدلے بیسیوں بے گناہ افراد کو خاک و خون میں تڑپا دیتے ہیں۔

عراق کی بعث پارٹی کی طرف سے ہمارے اسلامی ملک پر مسلط کردہ جنگ میں بھی یہی صورتِ حال

۱۔ ارتداد اور اس کی سخت سزا کے بارے میں سورہ نحل آیہ ۱۰۶ کے ذیل میں تفسیر نمونہ جلد ۱۱ میں ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

۲۔ تفسیر روح المعانی از آلوسی، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

دیکھتے ہیں۔ آئندہ تاریخ ان کے بارے میں فیصلہ کرے گی ہم یہ معاملہ اسی کے سپرد کرتے ہیں۔

اسلام میں عدالت کی اس قدر اہمیت ہے کہ اسے قاتل تک کے لیے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام اپنی وصیتوں میں فرماتے ہیں:

یا بنی عبد المطلب لا الفینکم تخوضون دماء المسلمین خوضًا تقولون قتل امیرالمؤمنین، الا لا تقتلن بی الا قاتلی، انظروا اذا انا مت من ضربته هذه فاضربوه، ضربة بضربة، ولا تمثلوا بالرجل۔

اے اولادِ عبدالمطلب! مبادا میری شہادت کے بعد مسلمانوں کا خون بہانے لگو اور کہو کہ امیرالمؤمنین مارے گئے ہیں اور اس بہانے سے لوگوں کا خون بہانے لگو۔ آگاہ رہو کہ صرف میرا قاتل (عبدالرحمن بن ملجم مرادی) قتل ہوگا۔ پوری طرح غور کرنا کہ جب میں اس ضرب سے شہید ہو جاؤں کہ جو مجھ پر لگائی گئی ہے تو اسے صرف ایک ضرب کاری لگانا اور قتل کے بعد اس کا مثلہ نہ کرنا (ناک کان وغیرہ نہ کاٹنا)۔[1]

(۴) اگلی آیت میں اس سلسلۂ احکام کا چوتھا حکم ہے۔ پہلے یتیموں کے مال کی حفاظت کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ اس میں وہی لب و لہجہ اختیار کیا گیا ہے جو منافیٔ عفت عمل کے بارے میں گزشتہ آیات میں اختیار کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: یتیموں کے مال کے قریب نہ جاؤ (ولا تقربوا مال الیتیم)۔

نہ صرف یہ کہ یتیموں کا مال نہ کھاؤ بلکہ اس کے حریم و حدود کو بھی محترم سمجھو۔ لیکن ممکن تھا کہ ناآگاہ لوگ اس حکم کو منفی حوالے سے دیکھتے اور یتیموں کا مال بے سرپرست چھوڑنے کے لیے اسے سند بنا لیتے اور یوں یتیموں کا مال حوادث کے رحم و کرم پر رہ جاتا لہٰذا فوراً بلا فاصلہ استثناء فرمایا گیا ہے: مگر نہایت اچھے طریقے سے (الا بالتی ھی احسن)۔

اس جامع اور واضح تعبیر کے مطابق یتیموں کے اموال میں ہر ایسا تصرف جائز ہے جو ان کی حفاظت، اصلاح اور اضافے کی نیت سے ہو اور جس میں قبل ازیں ان کے ضروری پہلوؤں کا اتلاف نہ ہونے کی منصوبہ بندی کر لی گئی ہو بلکہ ایسا تصرف ان یتیموں کی ایک خدمت ہے جو اپنے مفادات کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ البتہ یہ کیفیت یتیم کے فکری و اقتصادی رُشد تک پہنچنے کے وقت تک ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ زیرِ بحث آیت جاری رکھتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اس زمانے تک کہ اُن میں یہ طاقت پیدا ہو جائے (حتّٰی یبلغ اشدّہ)۔

"اشدّ"، مادہ "شدّ" (بروزن "جدّ") سے محکم گرہ کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو

---

[1] نہج البلاغہ، حصہ مکتوبات نمبر ۴۷۔

Marfat.com

گئی اور اب یہ لفظ ہر قسم کے جسمانی و روحانی استحکام کے لیے بولا جاتا ہے۔

یہاں "اشد" سے مراد حدِ بلوغ کو پہنچنا ہے لیکن جسمانی بلوغت کافی نہیں بلکہ فکری و اقتصادی بلوغت ہونا چاہیئے۔ اس طرح سے کہ یتیم اپنے اموال کی حفاظت کر سکے یہ تعبیر اسی لیے منتخب کی گئی ہے کہ یقینی طور پر آزما کر دیکھ لیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ ہر معاشرے میں مختلف حوادث کے باعث یتیم موجود ہوتے ہیں۔ انسانی اقدار اور دیگر حوالوں سے ضروری ہے کہ یہ یتیم تمام پہلوؤں سے معاشرے کے خیر خواہ افراد کی سرپرستی میں ہوں۔ اسی لیے اسلام نے اس مسئلے کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس کا کچھ حصہ ہم سورہ نساء کی آیہ ۲ کے ذیل میں ذکر کر آئے ہیں (تفسیر نمونہ جلد ۳ کی طرف رجوع فرمائیں)۔

جس چیز کا ہمیں یہاں اضافہ کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ بعض روایات میں یتیم وسیع تر معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ان افراد کو بھی یتیم کہا گیا ہے جو اپنے امام اور پیشوا سے جدا ہو چکے ہیں اور آوازِ حق ان کے کانوں تک نہیں پہنچتی۔ یہ دراصل یتیم کے مفہوم میں ایک وسعت ہے اور ایک مادی حکم سے معنوی استفادہ کیا گیا ہے۔

(۵) اس کے بعد ایفائے عہد کا مسئلہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اپنا عہد وفا کرو کیونکہ ایفائے عہد کے بارے میں سوال کیا جائے گا (واوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولا)۔

بہت سے معاشرتی روابط، اقتصادی نظام اور سیاسی مسائل عہد و پیمان کے گرد گھومتے ہیں۔ اگر عہد و پیمان متزلزل ہو جائے اور اعتماد اٹھ جائے تو معاشرے کا نظام تیزی سے درہم برہم ہو جائے اور اس پر وحشتناک ہرج مرج مسلط ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنی آیات میں ایفائے عہد پر بہت زور دیا گیا ہے۔

عہد و پیمان کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس میں افراد کے درمیان جو اقتصادی اور کاروباری پیمان ہوتے ہیں وہ بھی شامل ہیں اور شادی بیاہ وغیرہ کے پیمان بھی شامل ہیں۔ ان میں وہ معاہدے بھی شامل ہیں جو اقوام وملل اور حکومتوں کے درمیان ہوتے اور ان سے بڑھ کر خدائی پیمان اور آسمانی رہبروں کے اپنی امتوں سے کیے گئے پیمان یا امتوں کی طرف سے ان سے باندھے گئے پیمان بھی اس میں شامل ہیں[1]۔

(۶) آخری زیر بحث آیت میں آخری حکم ناپ تول میں عدالت کے بارے میں ہے۔ اس کے ذریعے حقوق الناس کی حفاظت اور کم فروشی کا سدِ باب مقصود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب کسی پیمانہ سے کوئی چیز ناپو تو اس کا حق ادا کرو (و اوفوا الكيل اذا كلتم)۔ اور صحیح اور سیدھے ترازو سے وزن کرو (وزنوا بالقسطاس المستقيم)۔ کیونکہ یہ کام تمہارے فائدے میں ہے اور اس کا انجام سب سے بہتر ہے (ذلك خير و

---

[1] ایفائے عہد اور قسم پوری کرنے کی اہمیت کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۱ سورہ نحل آیہ ۹۱ تا ۹۲ کے ذیل میں ہم تفصیل بحث کر چکے ہیں۔

Marfat.com

احسن تأویلاً)۔

چند اہم نکات

١۔ کم فروشی کا نقصان: پہلا نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیئے یہ ہے کہ قرآن مجید میں بار ہا کم فروشی، وزن میں کمی اور دھوکا بازی کے خاتمے پر زور دیا گیا ہے۔ ایک مقام پر یہ مسئلہ وسیع عالم ہستی کے نظام خلقت کے ہم پلّہ رکھا گیا ہے:

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۙ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝

خدا نے آسمان بلند کیا اور ہر چیز میں میزان اور حساب و کتاب رکھا تاکہ تم وزن اور حساب و کتاب میں سرکشی نہ کرو۔ (رحمٰن۔ ۷ و ۸)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ناپ تول پورا رکھنا کوئی کم اہم مسئلہ نہیں بلکہ اصل عدالت اور اس آفرینش کے نظم و ضبط کا حصّہ ہے جو پورے عالم ہستی پر حکم فرما ہے۔

ایک اور مقام پر شدید اور دھمکی آمیز لہجے میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ۖ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ؕ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۙ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۙ

وائے اور ہلاکت ہے کم فروشی کرنے والوں کے لیے کہ جو خریدتے وقت اپنا حق پورا پورا لیتے ہیں اور بیچتے وقت وزن میں کمی کرتے ہیں کیا وہ یہ گمان نہیں کرتے کہ قیامت کے عظیم دن عدلِ الٰہی کی بارگاہ میں مبعوث ہوں گے۔ (مطففین۔ ١ تا ٥)

یہاں تک کہ قرآن مجید میں بعض انبیاء کے حالات میں ہے کہ ان کے شدید مبارزہ کا رُخ شرک کے بعد کم فروشی کی طرف تھا مگر ان کی ظالم قوم نے پرواہ نہ کی اور خدا کے شدید عذاب میں گرفتار ہو کر نابود ہو گئی۔

(تفسیر نمونہ جلد ۶ دیکھیے۔ سورہ اعراف کی آیہ ۸۵ کے ذیل میں، مدین میں حضرت شعیبؑ کی تبلیغ کے ضمن میں تفصیلات ذکر کی گئی ہیں)۔

اصولی طور پر حق و عدالت، نظم و ضبط اور حساب و کتاب ہر چیز میں اور ہر جگہ بنیادی اور حیاتی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ یہ وہ روح ہے جو تمام عالم ہستی پر حکم فرما ہے۔ لہٰذا اس بنیادی مسئلے سے کسی بھی قسم کا انحراف خطرناک اور بد انجام ہو گا خصوصاً کم فروشی اعتماد و اطمینان کا سرمایہ ختم کر دیتی ہے کہ جو مبادلات کا اہم رکن ہے۔ یہ کام اقتصادی نظام کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

بہت ہی افسوس کا مقام ہے کہ بعض اوقات ہم دیکھتے ہیں اس اصول کو اپنانے میں غیر مسلم بعض فرض شناس مسلمانوں سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ دنیا کی منڈیوں میں اسی وزن کے مطابق اجناس پہنچائیں

Marfat.com

جو اُن پر لکھا ہوا ہے تاکہ دوسروں کا اعتماد حاصل کر سکیں ۔

جی ہاں ! وہ جانتے ہیں کہ انسان اہلِ دنیا بھی ہو تو اس کا راستہ یہی ہے کہ معاملہ میں خیانت نہ کرے ۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ حقوق کے اعتبار سے کم فروش خریداروں کے مقروض ہیں۔ لہٰذا ان کی توبہ یہ حقوق ادا کیے بغیر نہیں ہو سکتی جو انہوں نے غصب کیے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ ان حقوق کے مالکوں کو نہیں پہچانتے تب بھی انہیں چاہیئے کہ ان کے برابر "ردِ مظالم" کے طور پر اصلی مالکوں کی طرف سے فقرا اور مساکین کو دیں ۔

۲۔ **کم تولنے کے مفہوم کی وسعت :** بعض اوقات کم فروشی کا مفہوم وسعت اختیار کر جاتا ہے اور اس میں عمومیت آجاتی ہے ۔ اس طرح سے کہ ہر قسم کی کوتاہی اور فرائض کی انجام دہی میں کمی اس کے مفہوم میں شامل ہو جاتی ہے ۔ لہٰذا وہ کاریگر جو اپنے کام میں کچھ کمی چھوڑ دیتا ہے، وہ استاد جو ٹھیک طرح سے درس نہیں دیتا' وہ مزدور جو بر وقت کام پر حاضر نہیں ہوتا اور دل جمعی سے کام نہیں کرتا ۔ اس حکم کے مخاطب ہیں اور اس کی خلاف ورزی کے نتائج کے حصہ دار ہیں ۔

البتہ زیرِ بحث آیت کے الفاظ براہِ راست اس عمومیت کیلئے نہیں ہیں بلکہ مفہوم کی یہ وسعت عقلی ہے لیکن سورہ رحمٰن میں جو تعبیر آئی ہے وہ اس عمومیت اور وسعت کی طرف اشارہ کرتی ہے ،

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۙ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝

۳۔ **"قسطاس" کا مفہوم :** قاف کے نیچے زیر اور پیش کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے (بروزنِ "مقیاس" اور کبھی بروزنِ "قرآن") اس کا معنی ہے ترازو۔ بعض اسے رومی زبان کا لفظ سمجھتے ہیں اور بعض عربی کا۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اصل میں یہ دو لفظوں کا مرکب ہے ۔ "قسط" بمعنی عدل و انصاف اور "طاس" بمعنی ترازو کا پلڑا۔ بعض کہتے ہیں کہ "قسطاس" بڑے ترازو کو اور "میزان" چھوٹے ترازو کو کہتے ہیں [1]

بہر حال "قسطاس" سے مراد مستقیم اور صحیح سالم ترازو ہے جو بے کم و کاست عادلانہ وزن کرے ۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام اس لفظ کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

هو المیزان الذی له لسان

ترازو وہ میزان ہے جس کی زبان (دو پلڑوں کا توازن بتانے والی سوئی) ہو [2]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جو ترازو اس سوئی کے بغیر ہوتے ہیں وہ دو پلڑوں کی حرکات اور توازن کو پوری طرح واضح نہیں کرتے لیکن اگر ترازو میں یہ معیاری سوئی ہو تو پلڑوں کی تھوڑی سی حرکت بھی اس سے ظاہر ہو جائے گی اور عدالت پوری طرح ملحوظ رکھی جا سکے گی ۔

---

[1] تفسیر المیزان، تفسیر فخرالدین رازی و تفسیر مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں ۔

[2] تفسیر صافی، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں ۔

Marfat.com

(۳۶) وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ
وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ○
(۳۷) وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ
تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ○
(۳۸) كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ○
(۳۹) ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ
اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ○
(۴۰) اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ اِنَاثًا ۭ اِنَّكُمْ
لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ○

ترجمہ

(۳۶) اس کی پیروی نہ کر جس کا تجھے علم نہ ہو کیونکہ کان، آنکھ اور دل سے سوال کیا جائے گا۔
(۳۷) زمین پر تکبّر سے نہ چل، تُو زمین کو چیر نہیں سکتا اور تیرے قد کی لمبائی ہرگز پہاڑوں تک نہیں پہنچ سکتی۔
(۳۸) ان سب کے گناہ تیرے پروردگار کے ہاں لائقِ نفرت قرار پائے ہیں۔
(۳۹) یہ احکام ان حکمتوں میں سے ہیں جو تجھے تیرے پروردگار نے وحی کے ذریعے دی ہیں اور اللہ کے ساتھ ہرگز کسی کو معبود قرار نہ دے کہ تُو جہنم میں جا گرے گا اس حالت میں کہ درگاہِ خدا سے ملامت شدہ اور زاندہ ہو گا۔

Marfat.com

(۴۰) کیا خدا نے بیٹے تم سے مخصوص کر دیئے ہیں اور خود ملائکہ میں سے بیٹیاں لے لی ہیں۔ تم بہت بڑی (اور انتہائی غلط) بات کہتے ہو۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں ہم نے اسلام کی کچھ انتہائی بنیادی تعلیمات پڑھی ہیں۔ یہ سلسلہ توحید سے شروع ہوتا ہے کہ جس سے ان تمام تعلیمات کا خمیر اٹھتا ہے اور پھر وہ احکام ہیں کہ جو انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے مربوط ہیں۔ زیر نظر آیات میں ہم ان احکام کے آخری حصے تک پہنچ جاتے ہیں یہاں چند مزید اہم احکام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(۱) **صرف علم کی پیروی کرو:** پہلے تمام چیزوں میں تحقیق کو ضروری قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کی پیروی نہ کر (ولا تقف ما لیس لک بہ علم)۔ نہ اپنے ذاتی عمل میں علم کے بغیر عمل کر اور نہ دوسروں کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت بغیر علم کے شہادت دے اور نہ ہی علم کے بغیر کوئی عقیدہ و نظریہ قائم کر۔

گویا غیر علم کی پیروی سے یہ ممانعت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے۔ اس میں اعتقادی امور بھی شامل ہیں، شہادت، قضاوت اور عمل بھی۔ یہ جو بعض مفسرین نے اسے کچھ امور میں محدود کر دیا ہے اس کی کوئی واضح دلیل نہیں ہے کیونکہ "تقف" "قفو" (بروزن "عفو") کے مادہ سے کسی چیز کے پیچھے لگنے کے معنی میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ غیر علم کے پیچھے لگنا وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اور اس میں تمام مذکورہ چیزیں شامل ہیں۔ لہٰذا ہر چیز کی شناخت کا معیار علم و یقین ہے اور اس کے علاوہ ظن و گمان ہو، حدس و تخمین ہو یا شک و احتمال کچھ بھی قابل اعتماد نہیں ہے۔ جو لوگ ان امور کی بنیاد پر اعتقاد کر لیتے ہیں یا فیصلے کی مسند پر بیٹھ جاتے ہیں یا شہادت دیتے ہیں یا یہاں تک کہ اپنے ذاتی عمل میں ان کی بنیاد پر قدم اٹھاتے ہیں وہ اس صریح حکم اسلامی کے خلاف عمل کرتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں نہ شہرت پانے والی چیزیں قضاوت، شہادت اور عمل کی بنیاد بن سکتی ہیں نہ قرائن ظنی اور غیر یقینی خبریں کہ جو غیر موثق ذرائع سے ہم تک پہنچتی ہیں۔

آیت کے آخر میں اس ممانعت کی دلیل اس طرح بیان کی گئی ہے: "کان، آنکھ اور دل سب کے سب مسئول ہیں" اور جو کچھ وہ انجام دیتے ہیں اس کے بارے میں ان سے پوچھا جائے گا (ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا)۔

یہ ذمہ داری اس بنا پر ہے کہ جو باتیں انسان علم و یقین کے بغیر کہتا ہے وہ یا تو اس نے غیر موثق افراد

Marfat.com

سے سُنی ہوتی ہیں، یا وہ کہتا ہے کہ میں نے دیکھا ہے جبکہ اس نے دیکھا نہیں ہوتا، یا وہ اپنے فکر و خیال کی بنیاد پر بے بنیاد فیصلے کرتا ہے کہ جو حقیقت پر منطبق نہیں ہوتے۔ اسی بنا پر اُس کی آنکھ، کان اور فکر و عقل سے سوال کیا جائے گا کہ کیا واقعاً تم ان امور کے بارے میں یقین رکھتے تھے کہ تم نے ان کے بارے میں گواہی دی یا فیصلہ کیا یا ان کے معتقد ہوئے اور ان کے مطابق عمل کیا۔

اگرچہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ان اعضاء و جوارح سے سوال کرنے سے مراد یہ اعضاء رکھنے والوں سے سوال کرنا ہے لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن دیگر آیات (مثلاً فصلت - ۲۱) میں تصریح کرتا ہے کہ روزِ قیامت انسانی جسم کے اعضاء یہاں تک کہ بدن کی کھال بھی بات کرے گی اور یہ اعضاً حقائق بیان کریں گے، تو کوئی دلیل موجود نہیں کہ ہم آیت کے ظاہری مفہوم کو چھوڑ دیں اور یہ نہ کہیں کہ خود ان اعضاء سے سوال ہوگا۔

رہا یہ سوال کہ حواسِ انسانی میں سے صرف آنکھ اور کان کا ذکر کیوں کیا گیا ہے، تو اس کی دلیل اور وجہ واضح ہے کیونکہ انسان کی حسّی معلومات کا ذریعہ عام طور پر دو ہی ہیں اور باقی حواس ان کے تحت ہیں۔

نظم معاشرہ کے لیے ایک اہم درس

مذکورہ بالا آیت اجتماعی زندگی کے ایک انتہائی اہم اصول کی طرف اشارہ کرتی ہے جسے نظر انداز کر دینے کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہوگا کہ معاشرہ ہرج مرج کا شکار ہو جائے گا انسانی روابط ختم ہو جائیں گے اور احساسات کے رشتے ٹوٹ جائیں گے۔

اور اگر یہ قرآنی پروگرام تمام انسانی معاشروں میں پوری طرح سے جاری ہو جائے تو بہت سی بدنظمیاں، بے اعتدالیاں اور مشکلات ختم ہو جائیں کہ جن کا سرچشمہ جلد بازی کے فیصلے، بے بنیاد گمان، مشکوک اور جھوٹی خبریں ہوتی ہیں۔

اگر قرآن کا یہ حکم رائج نہ ہو تو معاشرہ پر ہرج مرج اور فتنہ و فساد کی فضا چھا جائے گی اور کوئی شخص دوسرے کی بدگمانی سے نہیں بچ سکے گا، کسی کو کسی پر اطمینان نہیں ہوگا اور تمام افراد کی عزت و آبرو اور مقام ہمیشہ خطرے میں رہے گا۔

بہت سی دیگر قرآنی آیات اور اسلامی روایات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے۔ مثلاً:

(۱) وہ آیات کہ جو ظن و گمان کی پیروی کرنے کی وجہ سے بے ایمان افراد کی شدید مذمت کرتی ہیں۔ مثلاً:

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ

ان میں سے اکثر اپنے فیصلوں میں صرف ظن و گمان کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ ظن و گمان انسان کو کسی طرح بھی حق و حقیقت تک نہیں پہنچا سکتے۔ (یونس - ۳۶)

Marfat.com

(ii) ایک اور مقام پر پیروی ظن کو ہوائے نفس کی پیروی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے :

اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهۡوَی الۡاَنۡفُسُ

وہ صرف گمان اور ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ (نجم - ۲۳)

(iii) ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے :

ان من حقیقة الایمان ان لا یجوز منطقك علمك

ایمان کی حقیقت میں سے یہ ہے کہ تیری گفتگو تیرے علم سے زیادہ نہ ہو اور جتنا تُو جانتا ہے تُو اس سے زیادہ بات نہ کرے [1]

(iv) ایک اور حدیث میں امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے مروی ہے، آپ اپنے آباؤ اجداد سے نقل کرتے ہیں :

لیس لك ان تتکلم بما شئت ، لان الله عز وجل یقول ولا تقف ما لیس لك به علم

تُو جو چاہے نہیں کہہ سکتا کیونکہ خدا کہتا ہے : جس کا تجھے علم نہیں اس کی پیروی نہ کر [2]

(v) ایک اور حدیث میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے منقول ہے، آپ فرماتے ہیں :

ایاکم والظن فان الظن اکذب الکذب

گمان سے پرہیز کرو کیونکہ گمان بدترین جھوٹ ہے [3]

(vi) ایک شخص امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا۔ اس نے عرض کی :

میرے کچھ ہمسائے ہیں۔ ان کے پاس گانے بجانے والی کنیزیں ہیں۔ وہ گاتی بجاتی ہیں۔ بعض اوقات میں بیت الخلاء میں جاتا ہوں تو زیادہ دیر بیٹھا رہتا ہوں تاکہ ان کے گیت سن سکوں حالانکہ مَیں اس مقصد کے لیے نہیں جاتا۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا :

کیا تُو نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سُنا :

اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِكَ کَانَ عَنۡهُ مَسۡـُٔوۡلًا ٥

(یقیناً کان، آنکھ اور دل سب سے سوال ہوگا)

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۸ ص ۱۶۔

[2] وسائل الشیعہ، ج ۱۸ ص ۱۷۔

[3] وسائل الشیعہ، ج ۱۸ ص ۳۸۔

Marfat.com

اس نے عرض کیا :

مجھے یوں لگا ہے کہ جیسے یہ آیت مَیں نے ہرگز کبھی کسی عرب یا عجم سے نہیں سُنی۔ مَیں ابھی سے یہ کام چھوڑتا ہوں اور بارگاہِ الٰہی میں توبہ کرتا ہوں [۱]

بعض مصادرِ حدیث میں اس روایت کے ذیل میں ہے کہ امامؑ نے اسے حکم دیا :

جاؤ اور غسل توبہ کرو اور جس قدر ہو سکے نماز پڑھو کیونکہ تم نے بہت بُرا کام کیا۔ اگر تُو اس حالت میں مرجاتا تو تجھے عظیم جواب دہی کا سامنا کرنا پڑتا۔

یہ آیات اور پیغمبرِ اکرمؐ اور آئمہ ہُدیٰؑ سے منقول احادیث سے واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام کس طرح انسان کی آنکھ اور کان کو مسئول قرار دیتا ہے۔ اسلام کا تقاضا ہے کہ انسان جب تک نہ دیکھے نہ کہے، جب تک نہ سنے فیصلہ نہ کرے اور تحقیق، علم اور یقین کے بغیر کسی چیز کا اعتقاد نہ رکھے، نہ عمل کرے اور نہ قضاوت کرے۔

گمان، تخمینے، اندازے اور سُنی سنائی باتوں کی پیروی کرنا اور علم ویقین کے بغیر کسی چیز کے پیچھے لگنا فرد اور معاشرے کے لیے بہت بڑے خطرات پیدا کرتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے بہت زیادہ نقصانات ہیں، مثلاً :

(۱) غیر علم پر بھروسہ کرنا لوگوں کے حقوق کی پامالی اور غیر مستحق افراد کو کسی کا حق دینے کا سرچشمہ ہے۔

(۲) غیر علم کی پیروی آبرومند افراد کی عزت و آبرو کو خطرے میں ڈال دیتی ہے اور خدمت گزاروں کو بددل کر دیتی ہے۔

(۳) غیر علم پر اعتماد پراپیگنڈا، افواہوں اور جعل سازیوں کا بازار گرم کر دیتا ہے۔

(۴) غیر علم کی پیروی انسان میں تحقیق وجستجو کا جذبہ ختم کر دیتی ہے اور اسے ایک جلد باور کرنے والا اور احمق شخص بنا دیتی ہے۔

(۵) غیر علم کی پیروی گھر، بازار، کاروبار غرض ہر جگہ پر سے گرم جوشی اور دوستی کے روابط ختم کر دیتی ہے اور لوگوں کو ایک دوسرے کے بارے میں بدگمان بنا دیتی ہے۔

(۶) غیر علم کی پیروی ہمارے استقلالِ فکری کو ختم کر دیتی ہے اور ہماری روح کو ہر قسم کا زہریلا پراپیگنڈا قبول کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

(۷) غیر علم کی پیروی ہر شخص اور ہر چیز کے بارے میں جلد بازی سے فیصلہ کرنے کا سرچشمہ ہے اور یہ خود طرح طرح کی ناکامیوں اور پشیمانیوں کا سبب ہے۔

* * *

---

۱ نورالثقلین ج ۳ ص ۱۶۴۔

Marfat.com

گمان کی طرف میلان کا سدِّ باب

اب جو سوال باقی رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اس بُری اور منحوس عادت اور اس کے دردناک انجام سے کس طرح اپنے آپ کو اور معاشرے کو نجات دلا سکتے ہیں۔ اس سوال کے جواب کے لیے ایک طویل بحث کی ضرورت ہے البتہ ہم یہاں مختصر اور جچے تُلے نکات کی صورت میں ایک دستورالعمل پیش کرتے ہیں۔

(ا) اس عمل کے دردناک نتائج اور انجام سے لوگوں کو پیہم آگاہ کرنا چاہیئے اور ان سے تقاضا کرنا چاہیئے کہ وہ غیر علم کے منحوس نتائج پر غور و فکر کریں۔

(ب) اسلامی طرزِ تفکر اور اسلام کے اندازِ جہاں بینی کو لوگوں میں زندہ کرنا چاہیئے تاکہ وہ جان سکیں کہ خدا ہر حالت میں لوگوں پر نگران ہے۔ وہ سمیع و بصیر ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہمارے افکار و نظریات سے بھی آگاہ ہے۔

قرآن کہتا ہے:

یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ ۝

وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے اور جو کچھ سینوں میں چھپاتے ہیں اس سے بھی وہ آگاہ ہے۔ (مؤمن - ۱۹)

ہم جو بات بھی کرتے ہیں اور جو قدم بھی اٹھاتے ہیں ہمارے حساب میں لکھا جاتا ہے اور ہم اپنے تمام اعمال، فیصلوں اور اعتقادات کے جوابدہ ہیں۔

(ج) رشدِ فکری کی سطح بلند کرنا چاہیئے کیونکہ غیر علم کی پیروی عام طور پر ناآگاہ اور بے علم عوام کرتے ہیں کہ جو ایک بے بنیاد خبر سن کر فوراً اس سے چمٹ جاتے ہیں اور فیصلہ کر لیتے ہیں اور اسی کے مطابق پھر اقدام کرتے ہیں۔

۲۔ متکبر نہ بنو

اگلی آیت غرور و تکبر کے خلاف ہے۔ اس میں مومنین کو زندہ اور روشن تعبیر سے غرور کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

رسول اللہؐ کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: روئے زمین پر غرور و تکبر سے نہ چلو (ولا تمش فی الارض مرحا)[1] کیونکہ تم ہرگز زمین کو چیر نہیں سکتے اور تمہارا لمبا قد پہاڑوں تک نہیں پہنچ سکتا (انك لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولاً)۔

---

[1] "مَرَح" (بروزن "فَرَح") ایک باطل اور بے بنیاد بات پر بہت زیادہ خوشی کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ مغرور لوگ عام طور پر چلتے وقت زمین پر زور زور سے پاؤں پٹختے ہیں تاکہ لوگوں کو بتائیں کہ ہم آرہے ہیں۔ گردن اوپر اکڑا کر رکھتے ہیں تاکہ اہلِ زمین پر بزعم خود اپنی برتری جتا سکیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ تم بھی زمین پر کیسے ہی اپنے پاؤں پٹخو، کیا اسے چیر سکو گے جبکہ اس کرۂ خاکی پر تمہارا وجود بالکل ناچیز ہے۔ یہ تو بالکل اس چیونٹی کی طرح ہے جو بہت بڑے پتھر پر چل رہی ہو اور اپنا پاؤں اس پر پٹخے تو پتھر اس کی حماقت اور کم ظرفی پر ہنسے گا ہی۔

تُو اپنی گردن کو جتنا بھی اکڑالے کیا پہاڑوں کا ہمطراز ہو سکتا ہے۔ اس طرح تُو زیادہ سے زیادہ چند سنٹی میٹر اپنے تئیں اونچا کر سکتا ہے جبکہ اس زمین کے بلند ترین پہاڑوں کی چوٹی بھی اس کرہ کے مقابلے میں کوئی قابلِ ذکر حیثیت نہیں رکھتی اور خود زمین پوری کائنات کے مقابلے میں ایک ذرۂ بے مقدار ہے۔ پس تیرا یہ غرور وتکبر چہ معنی دارد؟

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ غرور وتکبر ایک خطرناک باطنی بیماری ہے لیکن قرآن نے براہِ راست اس پر بحث نہیں کی بلکہ اس کے ظاہری آثار میں سے بھی سادہ ترین اثرات کی نشاندہی کی ہے اور خود پسند بے مغز متکبروں اور مغروروں کی چال کے بارے میں بات کی ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تکبر وغرور اپنے کمترین آثار کی سطح پر بھی مذموم، ناپسندیدہ اور شرمناک ہے۔ نیز یہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان کی اندرونی صفات جو بھی ہوں وہ چاہے نہ چاہے ان کی جھلک اس کے اعمال میں ضرور نظر آجاتی ہے۔ اس کی چال ڈھال میں، اس کے دیکھنے کے انداز میں، اس کی بات کرنے کے طریقے میں اور اس کے تمام کاموں میں اس کی داخلی صفات جھلکتی ہیں۔ لہٰذا اگر ان صفات کا کچھ بھی اثر اعمال میں نظر آئے تو ہمیں متوجہ ہونا چاہیئے کہ خطرہ نزدیک آگیا ہے لہٰذا ہمیں فکر کرنا چاہیئے کہ اس مذموم عادت نے ہماری روح میں گھونسلا بنا لیا ہے لہٰذا ہمیں اس کے خلاف مقابلے کے لیے اٹھ کھڑا ہونا چاہیئے۔

ضمنی طور پر ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ زیرِ بحث آیت میں (اسی طرح سورہ لقمان میں اور قرآن کی دوسری سورتوں میں) قرآن کا ہدف یہ ہے کہ غرور وتکبر کی کلی طور پر مذمت کی جائے نہ کہ اس کے کسی خاص موقع کی یعنی چلنے پھرنے کے انداز کی۔

کیونکہ غرور وتکبر خدا فراموشی، خود فراموشی، فیصلے میں اشتباہ، راہِ حق سے گمراہی، شیطان کے راستے سے وابستگی اور طرح طرح کے گناہوں سے آلودگی کا سرچشمہ ہے۔

حضرت علی علیہ السلام خطبہ "ہمام" میں پرہیزگاروں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ومشیھم التواضع

اور ان کی چال ڈھال میں انکساری ہوتی ہے[1]

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۳

Marfat.com

نہ صرف کوچہ و بازار میں چلتے ہوئے ان میں انکساری ہوتی ہے بلکہ زندگی کے تمام امور میں یہاں تک کہ مطالعاتِ فکری میں اور نظریات و افکار کے سفر میں انکساری ان کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔

ہادیانِ اسلام کی اپنی زندگی اس سلسلے میں ہر مسلمان کے لیے بہت ہی سبق آموز اور نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت میں ہم پڑھتے ہیں کہ آپؐ ہرگز اجازت نہیں دیتے تھے کہ جس وقت آپؐ سوار ہوں تو کچھ لوگ پیادہ آپؐ کے ہمرکاب چلیں بلکہ فرماتے تھے:

تم فلاں جگہ پہنچو، میں بھی آجاؤں گا۔ وہاں ملاقات ہوگی پیادہ شخص کا سوار کے ساتھ چلنا سوار کے غرور اور پیادہ کی ذلت کا سبب بنتا ہے۔

نیز ہم پڑھتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ زمین پر بیٹھتے، غلاموں کی سی سادہ غذا کھاتے، بکری کا دودھ دوہتے اور گدھے کی ننگی پشت پر سوار ہوتے۔

یہاں تک کہ جب آپؐ کے اقتدار کا زمانہ تھا مثلاً فتح مکہ کے دن بھی اسی طرح کے کام انجام دیتے تھے تاکہ لوگ یہ گمان نہ کریں کہ کسی مقام پر پہنچنے سے غرور پیدا ہوگیا ہے اور آپؐ کوچہ و بازار کے لوگوں اور مستضعفین سے الگ رہنے لگے ہیں اور محنت کش عوام سے بیگانہ ہوگئے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کے حالات میں بھی ہے کہ آپؑ گھر کے لیے خود پانی بھرتے اور بعض اوقات گھر میں جھاڑو دیتے۔

امام حسن مجتبیٰؑ کے حالات میں ہے کہ کئی سواریاں آپؑ کے پاس تھیں اس کے باوجود آپؑ بیس مرتبہ پاپیادہ بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ آپؑ فرماتے تھے:

میں ایسا بارگاہِ الٰہی میں عجز و انکساری کے لیے کرتا ہوں[1]

اگلی آیت میں گزشتہ آیات میں بیان کیے گئے احکام پر تاکید کی گئی ہے۔ شرک، قتل نفس، زنا، قتل اولاد، مال یتیم میں تصرف اور ماں باپ کو آزار پہنچانے کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ان تمام کا گناہ تیرے پروردگار کے نزدیک قابل نفرت ہے (کل ذٰلک کان سیئہ عند ربک مکروھا)[2]

اس تعبیر سے واضح ہو جاتا ہے کہ مکتبِ جبر کے پیروکاروں کے قول کے برخلاف خدا نے ہرگز ارادہ نہیں کیا کہ کسی سے گناہ سرزد ہو اگر اس نے ایسا ارادہ کیا ہوتا تو اس آیت میں اس سے کراہت اور ناراضگی مناسب نہ تھی۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۶ میں بھی غرور و تکبر کے نقصان کے بارے میں گفتگو کر چکے ہیں (دیکھیے اُردو ترجمہ)۔

[2] "سیئہ" کی ضمیر "ذٰلک" یا "کل" کی طرف لوٹتی ہے اور یہ ان الفاظ کے مفرد ہونے کی وجہ سے مفرد ہے اگرچہ یہاں جمع کے معنی رکھتی ہے۔

Marfat.com

ضمناً واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کی زبان میں بہت بڑے گناہوں کے لیے بھی لفظ مکروہ استعمال ہوا ہے۔

(۳) مشرک نہ بنو

تاکید مزید کے لیے اور اس لیے کہ ان تمام حکیمانہ احکام کا سرچشمہ وحیِ الٰہی ہے فرمایا گیا ہے: یہ سب حکمت آمیز احکام ہیں کہ جن کی تیرے پروردگار نے تیری طرف وحی کی ہے (ذٰلك مما اوحی الیك ربك من الحکمة)۔

"حکمت" کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ ان آسمانی احکام کا سرچشمہ وحیَ الٰہی ہے، اس کے علاوہ یہ میزانِ عقل پر بھی بالکل پورے اترتے ہیں اور عقل کے مطابق قابلِ ادراک ہیں۔

کون شخص شرک، قتلِ نفس یا ماں باپ کو آزار پہنچانے کی قباحت کا انکار کر سکتا ہے۔ اسی طرح کون زنا تجبر، یتیموں پر ظلم اور پیمان شکنی کے منحوس نتائج کا انکار کر سکتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں، یہ احکام حکمتِ عقلی کے ذریعے بھی ثابت شدہ ہیں اور وحیَ الٰہی کے ذریعے سے بھی اور تمام احکامِ الٰہی کے اصول اسی طرح ہیں اگرچہ عقل کے کم فروغ چراغ سے ان کی تفصیلات کو اکثر اوقات مشخص نہیں کیا جا سکتا اور صرف وحیَ الٰہی کے طاقتور نور ہی سے انہیں پہچانا جا سکتا ہے۔

بعض مفسّرین نے حکمت کی تعبیر سے یہ استفادہ بھی کیا ہے کہ متعدد احکام جو گزشتہ آیات میں گزرے ہیں ثابت، مستحکم اور ناقابلِ تنسیخ ہیں اور یہ تمام آسمانی ادیان میں تھے۔ مثلاً شرک، قتلِ نفس، زنا، پیمان شکنی ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ جو کسی بھی مذہب میں جائز شمار ہوتی ہوں۔ پس یہ احکام محکمات اور قوانینِ ثابت کا حصہ ہیں۔

اس کے بعد جس طرح ان احکام کی ابتداء تحریمِ شرک سے کی گئی ہے حرمتِ شرک کی تاکید کے ساتھ ان کا اختتام ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے: خدائے یگانہ کے ساتھ ہرگز شریک کا قائل نہ ہونا اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود قرار نہ دینا (ولا تجعل مع الله الٰهاً اٰخر)۔

کیونکہ اس امر کے سبب تو دوزخ میں جا گرے گا جبکہ مخلوقِ خدا کی ملامت بھی تجھے دامن گیر ہوگی اور بارگاہِ الٰہی سے بھی تو دھتکارا جائے گا اور اس کا قہر و غضب بھی تجھے لاحق ہوگا (فتلقی فی جهنم ملوما مدحورا)۔

درحقیقت تمام انحرافات، جرائم اور گناہوں کا خمیر شرک اور دوگانہ پرستی سے اٹھتا ہے۔ اسی لیے اسلام کے اساسی احکام کا یہ سلسلہ حرمتِ شرک سے شروع ہوتا ہے اور تحریمِ شرک پر ہی تمام ہوتا ہے۔

آخری زیرِ بحث آیت میں مشرکین کی ایک بیہودہ خرافاتی فکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کے پایۂ منطق اور سطحِ فکر کو واضح کیا گیا ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں حالانکہ خود بیٹی کا نام سن کر شرم محسوس کرتے تھے اور اپنے گھر میں اس کی ولادت کو بدبختی کا باعث خیال کرتے تھے قرآن مجید خود انہی کی منطق کی زبان میں انہیں جواب دیتا ہے: کیا تمہارے پروردگار نے بیٹے صرف تمہارے

Marfat.com

حصے ہیں دے دیئے ہیں اور خود اپنے لیے اس نے فرشتوں میں سے بیٹیاں لے لی ہیں (افاصفاکو ربکو بالبنین واتخذ من الملائکۃ اناثًا)۔

اس میں شک نہیں کہ بیٹیاں بھی بیٹوں کی طرح نعمات الٰہی ہیں اور انسانی قدر و قیمت کے لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہیں۔ اصولی طور پر بقائے نسلِ انسانی ان دونوں میں سے کسی ایک کے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا زمانۂ جاہلیت میں لڑکیوں کو جو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا وہ بیہودہ، فضول اور خرافاتی فکر تھی۔ اس کا پس منظر کیا تھا، اس کے بارے میں ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں [1]

لیکن قرآن کا مقصد یہ ہے کہ انہیں ان ہی کی منطق کے ذریعے مغلوب کرے کہ تم کیسے نادان لوگ ہو کہ اپنے پروردگار کے لیے ایسی چیز کا نظریہ رکھتے ہو جس سے خود تم عار محسوس کرتے ہو۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں ایک قاطع اور یقینی حکم کی صورت میں فرمایا گیا ہے: تم بہت بڑی اور کفر آمیز بات کرتے ہو (انکم لتقولون قولاً عظیمًا)۔ ایسی بات جو کسی منطق سے مناسبت نہیں رکھتی اور کئی حوالوں سے بے بنیاد ہے۔ مثلاً:

۱۔ خدا کی اولاد ہونے کا اعتقاد اس کی ساحتِ مقدس میں ایک بہت بڑی اہانت ہے کیونکہ نہ وہ جسم ہے نہ عوارضِ جسمانی رکھتا ہے اور نہ بقائے نسل کا محتاج ہے۔ لہٰذا اس کے لیے اولاد کا اعتقاد صرف اس کی پاکیزہ صفات کو نہ پہچاننے کی وجہ سے ہے۔

۲۔ تم خدا کی ساری اولاد بیٹیوں میں منحصر کیوں سمجھتے ہو جبکہ بیٹی کے لیے بہت پست قدر و منزلت کے قائل ہو۔ تمہارے خیالات کے لحاظ سے یہ احمقانہ اعتقاد خدا کی بارگاہ میں ایک اور اہانت ہے۔

۳۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر یہ عقیدہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کے مقام کی بھی توہین ہے، جبکہ وہ فرمانِ حق پر قائم ہیں اور مقرب بارگاہِ الٰہی ہیں۔ خود بیٹی کے نام سے گھبرا جاتے ہو لیکن ان سب مقربانِ الٰہی کو بیٹی فرض کرتے ہو۔

ان امور کی جانب توجہ سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بات ایک بہت بڑی بات ہے، واقعات سے انحراف کے لحاظ سے بڑی ہے، گناہ اور سزا کے لحاظ سے بڑی ہے اور خود تمہارے معمول اور عادت کے لحاظ سے بھی بڑی ہے کہ تم معصوم بیٹیوں کی تحقیر و تذلیل کرتے ہو اور ان کے احترام میں کمی کرتے ہو۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرکینِ عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کیوں خیال کرتے تھے۔ اسی طرح زمانۂ جاہلیت کے عرب بیٹیوں کو زندہ درگور کیوں کرتے تھے اور ان کے نام سے وحشت کیوں کرتے تھے نیز دوسری طرف اسلام نے عورت کو کیا مقام و منزلت عطا کیا اور کس طرح سے صنفِ عورت کی تذلیل کے نظریات کا مقابلہ کیا۔ ان تمام امور پر تفصیلی بحث تفسیر نمونہ جلد ۱۱، سورہ نحل آیات ۵۷ تا ۵۹ کے ذیل میں آچکی ہے۔

---

[1] تفسیر نمونہ، ج ۱۱ سورہ نحل کی آیات ۵۸ و ۵۹ کے ذیل میں دیکھئے۔

Marfat.com

(۴۱) وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۝
(۴۲) قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى
ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝
(۴۳) سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝
(۴۴) تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ
اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ
حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝

ترجمہ

(۴۱) ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے مؤثر طور پر بیان کیا تاکہ وہ کسی طرح سمجھیں لیکن (جن کے دل اندھے تھے) ان میں نفرت کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا۔

(۴۲) کہہ دو: اگر اس کے ساتھ اور خدا ہوتے، جیسا کہ تمہارا خیال ہے تو وہ کوشش کرتے کہ مالکِ عرش خدا کی طرف کوئی راہ نکالیں۔

(۴۳) جو کچھ یہ کہتے ہیں وہ اس سے پاک و برتر ہے، بہت ہی برتر۔

(۴۴) سات آسمان اور زمین اور جو اس میں ہیں، سب اس کی تسبیح کرتے ہیں اور ہر موجود اس کی تسبیح اور حمد کرتا ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ وہ حلیم اور بخشنے والا ہے۔

Marfat.com

تفسیر

وہ حق سے کیونکر فرار کرتے ہیں؟

گزشتہ آیات میں گفتگو مسئلہ توحید پر تمام ہوئی۔ زیر بحث آیات میں واضح اور قاطع انداز میں اسی مسئلے پر تاکید کی جا رہی ہے۔

پہلے تو توحید کے مختلف دلائل کے سامنے ایک گروہ مشرکین کی انتہائی ہٹ دھرمی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے اس قرآن میں بہت سے استدلال پیش کیے اور طرح طرح سے مؤثر طور پر بیان کیا تاکہ وہ سمجھیں اور راہ حق میں قدم اٹھائیں لیکن ان سب استدلال اور بیانات پر انہوں نے فرار ہی کیا اور ان کی نفرت کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا (ولقد صرفنا فی هٰذا القراٰن لیذکروا وما یزیدهم الا نفورًا)۔

"صرف" مادہ "تصریف" سے تبدیل کرنے اور دگرگوں کرنے کے معنی میں ہے۔ خصوصاً اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ باب تفعیل سے ہے، کثرت کا مفہوم اس میں پنہاں ہے۔

قرآن میں توحید کے اثبات اور شرک کی نفی کے لیے کبھی منطقی استدلال پیش کیا گیا ہے، کبھی برہان فطرت سے کام لیا گیا ہے، کبھی تہدید کی صورت اپنائی گئی ہے اور کبھی تشویق کی راہ اختیار کی گئی ہے خلاصہ یہ کہ مشرکین کو بیدار اور آگاہ کرنے کے لیے کلام کے مختلف طریقوں اور فنون سے استفادہ کیا گیا ہے لہٰذا "صرفنا" کی تعبیر اس مقام پر بہت ہی مناسب ہے۔

اس تعبیر کے ذریعے قرآن کہتا ہے: ہم ہر دروازے سے وارد ہوئے اور ہم نے ہر راستے سے استفادہ کیا تاکہ ان کے اندھے دلوں میں توحید کا چراغ روشن کر دیں لیکن ان میں سے ایک گروہ اس قدر ہٹ دھرم، متعصب اور سخت ہے کہ نہ صرف ان بیانات سے وہ حقیقت کے قریب نہیں ہوئے الٹا ان کی نفرت اور دوری میں اضافہ ہوا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان بیانات کا الٹا نتیجہ نکلتا ہے تو پھر ان کے ذکر کا فائدہ؟

جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ قرآن ایک فرد یا ایک خاص گروہ کے لیے نازل نہیں ہوا بلکہ یہ سارے انسانی معاشرے کے لیے ہے اور مسلم ہے کہ سب انسان تو ایسے نہیں ہیں۔ بہت سے ایسے بھی ہیں کہ وہ یہ دلائل سنتے ہیں تو راہ حق ان پر آشکار ہو جاتی ہے۔ ان تشنگان حقیقت کا ہر دستہ قرآن کے کسی ایک طرح کے بیان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور بیدار ہو جاتا ہے اور ان آیات کے نزول کا یہی اثر کافی ہے اگرچہ کور دل اس سے الٹا اثر لیتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس متعصب اور ہٹ دھرم گروہ کا راستہ اگرچہ غلط ہے اور یہ خود بدبخت ہیں لیکن حق طلب

Marfat.com

افراد ان سے اپنا موازنہ کر کے راہِ حق کو بہتر طور پر پا سکتے ہیں کیونکہ نور و ظلمت کے مقابلے سے نور کی قیمت بیشتر معلوم ہوتی ہے یہاں تک کہ بے ادبوں سے بھی ادب سیکھا جا سکتا ہے۔

ضمنی طور پر اس آیت سے تربیتی اور تبلیغی مسائل کے سلسلے میں یہ درس لیا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ تربیتی اہداف و مقاصد تک پہنچنے کے لیے صرف ایک ہی طریقے سے استفادہ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ مختلف اور طرح طرح کے وسائل سے استفادہ کیا جانا چاہیئے کیونکہ مختلف لوگوں کا ذوق اور استعداد مختلف ہوتی ہے۔ ہر ایک پر اثر انداز ہونے کے لیے خاص انداز ہونا چاہیئے۔ فنونِ بلاغت میں سے ایک یہ اسلوب ہے۔

دلیل تمانع

اگلی آیت توحید کی ایک دلیل کی طرف اشارہ کرتی ہے جو علماء اور فلاسفہ کی زبان میں "دلیل تمانع" کے نام سے مشہور ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اے رسول! ان سے کہہ دو: اگر خداوند قادر متعال کے ساتھ اور بھی خدا ہوتے جیسا کہ تمہارا خیال ہے، تو وہ خدا کوشش کرتے کہ خدائے عظیم صاحبِ عرش تک پہنچنے کی کوئی راہ نکالیں اور اس پر غلبہ حاصل کرلیں (قل لو کان معه الهة کما یقولون اذا لابتغوا الی ذی العرش سبیلا)۔

"اذا لابتغوا الی ذی العرش سبیلا" کا مفہوم اگرچہ یہ ہے کہ "وہ صاحبِ عرش کی طرف راہ نکالتے" لیکن طرزِ بیان نشاندہی کرتا ہے کہ مراد اس پر غلبہ حاصل کرنے کی کوئی سبیل پیدا کرنا ہے خصوصاً "اللہ" کی بجائے "ذی العرش" کی تعبیر اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہے یعنی وہ بھی چاہتے کہ عرشِ اعلیٰ کے مالک بن جائیں اور سارے جہانِ ہستی پر حکومت کریں۔ لہٰذا اس سے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔

بہرحال یہ امر فطری اور طبیعی ہے کہ ہر صاحبِ قدرت چاہتا ہے کہ اپنے اقتدار کو زیادہ کامل کرے اور اپنے قلمرو حکومت کو توسیع دے اور اگر سچ مچ کوئی اور خدا موجود ہوتے تو توسیع حکومت کا یہ تنازع اور تمانع ان میں رونما ہوتا۔[1]

ممکن ہے کہا جائے کہ کونسا مانع ہے اور کیا حرج ہے کہ متعدد خدا ایک دوسرے کے ساتھ ہمکاری

---

[1] بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس جملے کا معنی یہ ہے کہ دوسرے خدا کوشش کرتے کہ اپنے آپ کو "اللہ" کی بارگاہ میں مقرب بنائیں یعنی یہ تمہارے بُت اور خدا جب خود اللہ کا تقرب حاصل نہیں کر سکتے تو تمہارے تقرب کا وسیلہ کیسے بن سکتے ہیں۔

لیکن اس آیت کی تعبیرات اور بعد کی آیت اس تفسیر سے ہرگز مناسبت نہیں رکھتیں۔

Marfat.com

اور تعاون کرتے ہوئے اس عالم پر حکومت کریں اور کیا ضروری ہے کہ وہ آپس میں جھگڑیں ۔

اس سوال کے جواب میں اس حقیقت کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ اگرچہ ہر موجود کے لیے تکامل اور توسیع اقتدار سے لگاؤ فطری اور طبیعی ہے اور یہ بھی کہ جن خداؤں کا مشرکین عقیدہ رکھتے تھے وہ بہت سی بشری صفات کے حامل تھے کہ جن میں سے حکومت و قدرت سے لگاؤ ایک زیادہ واضح صفت ہے لیکن ان سب امور سے قطع نظر اختلاف تعدّدِ وجود کا لازمہ ہے کیونکہ اگر کسی رویے، پروگرام اور دیگر پہلوؤں سے کوئی اختلاف نہ ہو تو تعدد کا کوئی معنی ہی نہیں اور دونوں ایک چیز ہوں گے (غور کیجئے گا) ۔

اس بحث کی نظیر سورہ انبیاء کی آیت ۲۲ میں بھی موجود ہے ۔ جہاں فرمایا گیا ہے :

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا

اگر زمین و آسمان میں "اللہ" کے علاوہ خدا ہوتے تو نظام جہاں دگرگوں اور فاسد ہو جاتا ۔

اشتباہ نہیں ہونا چاہیئے، یہ دونوں بیان بعض جہات سے اگرچہ ایک دوسرے کے مشابہ ہیں لیکن دو مختلف دلیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ ایک کی خداؤں کے تعدد کی وجہ سے نظام جہاں کے فساد کی طرف بازگشت ہے اور دوسری نظام جہاں سے قطع نظر متعدد خداؤں کے درمیان وجود تمانع و تنازع کے بارے میں گفتگو کرتی ہے ۔

(سورہ انبیاء کی آیہ ۲۲ کے ذیل میں بھی ہم انشاء اللہ اس سلسلے میں بحث کریں گے)

چونکہ مشرکین کہتے ہیں کہ خدائے بزرگ نے ایک طرف نزاع کی حد سے تنزل کیا ہے لہٰذا اگلی آیت میں بلافاصلہ فرمایا گیا ہے : جو کچھ وہ کہتے ہیں خدا اس سے پاک اور منزہ ہے اور جو کچھ وہ سوچتے ہیں خدا اس سے بہت برتر اور بالاتر ہے (سبحانہ و تعالٰی عما یقولون علوًّا کبیرًا) ۔

اس مختصر سے جملے میں درحقیقت اللہ تعالٰی نے چار مختلف تعبیروں سے ناروا نسبتوں سے اپنے دامن کبریائی کی پاکیزگی بیان کی ہے :

۱۔ خدا ان نقائص اور ناروا نسبتوں سے منزہ ہے (سبحانہ)

۲۔ جو کچھ یہ کہتے ہیں وہ اس سے بالاتر ہے (و تعالٰی عما یقولون)

۳۔ لفظ "علوًّا" مفعول مطلق ہے اور تاکید کے لیے آیا ہے ۔

۴۔ اور آخر میں "کبیرًا" کہہ کر مزید تاکید کی گئی ہے ۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ "عما یقولون" (جو کچھ وہ کہتے ہیں) ۔ ایک وسیع معنی رکھتا ہے ۔ اس میں ان کی تمام ناروا نسبتیں اور ان کے لوازم شامل ہیں (غور کیجئے گا) ۔

اس کے بعد پروردگار کا مقام عظمت بیان کیا گیا ہے کہ وہ مشرکین کے وہم و خیال سے برتر ہے ۔ فرمایا

Marfat.com

گیا ہے کہ موجوداتِ جہاں اس کی ذاتِ مقدس کی تسبیح کرتی ہیں۔ ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب خدا کی تسبیح کرتے ہیں (تسبح له السمٰوات السّبع والارض ومن فیھن)۔ اس کے باوجود وہ حلیم وغفور ہے (انه کان حلیمًا غفورًا)۔

تمہارے کفر اور شرک پر اللہ تمہارا فوری مواخذہ نہیں کرتا بلکہ کافی مہلت دیتا ہے اور تمہارے لیے توبہ کے دروازے کھلے رکھتا ہے تاکہ اتمام حجت ہو جائے۔

دوسرے لفظوں میں تم یہ صلاحیت رکھتے ہو کہ عالم کے تمام ذرات میں سے سن سکو کہ موجودات تسبیح الٰہی کا نغمہ گنگنا رہے ہیں اور تم اس قابل ہو کہ خدائے یگانہ قادرِ متعال کی معرفت حاصل کر سکو لیکن تم کوتاہی کرتے ہو اور اس کوتاہی کے باوجود وہ فوراً مواخذہ اور عذاب نہیں کرتا اور تمہیں زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کرتا ہے کہ تم توحید کی شناخت کر سکو اور راہِ شرک ترک کر سکو۔

موجوداتِ عالم کی عمومی تسبیح

قرآن کی مختلف آیات میں یہ بات آئی ہے کہ عالمِ ہستی کے موجودات خدائے عظیم کی تسبیح اور حمد کرتے ہیں۔ ان سب آیات میں سے شاید زیادہ صریح زیرِ بحث آیت ہے۔ اس آیت کے مطابق عالمِ ہستی کے تمام موجودات بلا استثناء مصروفِ تسبیح ہیں۔ اس کے مطابق زمین، آسمان، ستارے، کہکشاں، انسان، حیوان، نباتات یہاں تک کہ ایٹم کے چھوٹے چھوٹے ذرات بھی اس عمومی تسبیح و حمد میں شریک ہیں۔

قرآن کہتا ہے عالمِ ہستی سرتاپا زمزمہ و نغمہ ہے۔ ہر موجود ایک طرح سے حمد و ثنائے حق میں مشغول ہے۔ بظاہر خاموش عالمِ ہستی کے صحن میں مسلسل ایک غلغلہ برپا ہے۔ بے خبر لوگ اسے سننے کی توانائی نہیں رکھتے لیکن وہ صاحبانِ فکر و نظر جن کا قلب و روح نورِ ایمان سے زندہ اور روشن ہے ہر طرف سے کان اور جان سے یہ صدا سن رہے ہیں۔ بقولِ شاعر:

۱۔ گر تو را از غیب چشمی باز شد	با تو ذراتِ جہاں ہمراز شد
۲۔ نطقِ آب و نطقِ خاک و نطقِ گل	ہست محسوسِ حواسِ اہلِ دل!
۳۔ جملۂ ذرات در عالم نہاں	با تو می گویند روزان و شباں
۴۔ ما سمیعیم و بصیر و با ہشیم	با شما نامحرماں ما خامشیم!
۵۔ از جمادی سوئے جان جاں شوید	غلغل اجزای عالم بشنوید!
۶۔ فاش تسبیح جمادات آیدت	وسوسہ ی تاویلہا بزدایدت

۱۔ اگر تجھے نگاہِ غیب حاصل ہو جائے تو ذراتِ عالم تجھ سے باتیں کرنے لگیں۔

Marfat.com

۲۔ پانی، خاک اور مٹی کا بولنا اہلِ دل محسوس کرتے ہیں۔
۳۔ سارے عالم کے موجودات چپکے چپکے شب و روز تجھ سے کہتے ہیں۔
۴۔ ہم سنتے ہیں، دیکھتے ہیں اور باہوش ہیں البتہ تم نامحرموں سے بات نہیں کرتے۔
۵۔ ایک جمادِ بے جاں سے جانِ جاں ہو جاؤ تو اجزائے عالم کا غلغلہ سنو۔
۶۔ جمادات کی تسبیح تمہیں صاف سنائی دے گی اور تاویلوں کا وسوسہ کم کر دے گی۔

اس حمد و تسبیح کی حقیقت کے بارے میں فلاسفہ اور مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے بعض نے اسے "حالی" کہا ہے اور بعض نے "قالی"۔ ہمارے نزدیک ان کے جو قابلِ قبول نظریات ہیں، ذیل میں ان کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔

۱۔ ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ اس جہان کے سب ذرات انہیں ہم عاقل سمجھیں یا غیرعاقل ایک قسم کے ادراک اور شعور کے حامل ہیں اگرچہ ہم میں یہ قدرت نہیں کہ اُن کے ادراک و احساس کی کیفیت سمجھ سکیں اور ان کی حمد و تسبیح سُن سکیں۔

وہ مختلف آیات اپنے نظریے کا شاہد قرار دیتے ہیں، مثلاً

وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ

بعض پتھر خوفِ خدا سے پہاڑوں کی چوٹی سے نیچے گر جاتے ہیں۔ (بقرہ - ۷۴)

فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ

اللہ نے آسمان و زمین سے فرمایا طوعاً یا کرہاً میرے فرمان کی طرف آؤ تو انہوں نے کہا کہ ہم اطاعت کا راستہ اپنائیں گے۔ (حٰم السجدہ - ۱۱)

۲۔ بہت سوں کا نظریہ ہے کہ یہ تسبیح اور حمد وہی چیز ہے جسے ہم "زبانِ حال" کہتے ہیں۔ یہ تسبیح حقیقی ہے نہ کہ مجازی لیکن زبانِ حال سے ہے نہ کہ زبانِ قال سے (غور کیجئے گا)۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کے چہرے اور آنکھوں سے تکلیف، رنج و غم اور بے خوابی نمایاں ہو تو ہم کہتے ہیں کہ اگرچہ تم اپنی تکلیف اور رنج و غم کے بارے میں زبان سے کچھ نہیں کہتے لیکن تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ تم کل رات نہیں سوئے اور تمہارا چہرہ کہہ رہا ہے کہ تم کسی جان کاہ رنج و غم سے گزر رہے ہو۔ یہ زبانِ حال کبھی اس قدر قوی ہوتی ہے کہ زبانِ قال سے انکار چھپانے کی کوشش بھی کی جائے تو حقیقت چھپ نہیں سکتی۔ بقول شاعر:

گفتم کہ با مکر و فسوں پنہاں کنم رازِ دروں
پنہاں نمی گردد کہ خوں از دیدگانم می رود

مَیں نے چاہا کہ کسی حیلے سے رازِ دروں چھپا لوں۔

Marfat.com

لیکن وہ نہیں چھپتا کیونکہ میری آنکھوں سے خون جاری ہے ۔

یہی بات حضرت علی علیہ السلام اپنے مشہور جملے میں فرماتے ہیں :

ما اضمر احد شیئًا الا ظهر فی فلتات لسانه وصفحات وجهه

کوئی شخص اپنے دل کا بھید نہیں چھپاتا مگر یہ کہ لاعلمی میں اس کی گفتگو کے دوران اور اس کے چہرے کے صفحہ پر آشکار ہو جاتا ہے [1]

اسی طرح کیا اس بات سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ایک بہت ہی خوبصورت منظر جو کسی کے ہنر کا سچا شاہکار ہے نقاش اور مصور کے ذوق اور مہارت پر گواہی دیتا ہے اور اسے زبانِ حال سے خراجِ تحسین پیش کرتا ہے ۔

کیا انکار کیا جا سکتا ہے کہ عظیم نامور شعراء کا دیوان ان کے ذوق ادراک اور طبیعت عالی کی حکایت کرتا ہے اور ہمیشہ صاحبِ دیوان کی تعریف کرتا ہے ۔ کیا انکار کیا جا سکتا ہے کہ عظیم عمارتیں اور بڑے بڑے کارخانے اور پیچیدہ کمپیوٹر وغیرہ زبانِ بے زبانی سے اپنے موجد کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی حد تک اپنے موجد کی ستائش کرتا ہے ۔

لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یہ عجیب و غریب عالمِ ہستی اپنے عجیب نظام، اسرار، خیرہ کن عظمت اور حیرت انگیز باریکیوں کے ساتھ خدا کی تسبیح و حمد کرتا ہے ۔

کیا "تسبیح" عیوب سے پاک شمار کرنے کے علاوہ کچھ اور ہے؟ اس عالمِ ہستی کی ساخت اور اس کا نظم و نسق کہتا ہے کہ اس کا خالق ہر قسم کے نقص و عیب سے مبرا و منزہ ہے ۔

کیا حمد و ثنا صفاتِ کمال بیان کرنے کے علاوہ کچھ اور ہے؟ جہانِ آفرینش کا نظام — اللہ کی صفاتِ کمال، اس کے بے پایاں علم، بے انتہا قدرت اور وسیع و ہمہ گیر حکمت کی حکایت کرتا ہے ۔

خصوصاً سائنس اور علم و دانش کی پیش رفت سے اور اس وسیع عالم کے اسرار کے بعض گوشوں سے پردہ اٹھنے سے موجوداتِ عالم کی یہ عمومی حمد و تسبیح زیادہ آشکار ہوئی ہے ۔

اگر ایک دن کوئی نکتہ پرداز شاعر سبز درختوں کے ہر پتے کو معرفتِ پروردگار کا ایک دفتر سمجھتا تھا تو آج کے ماہرینِ نباتات اور سائنس دانوں نے ایک دفتر نہیں بلکہ کئی کتابیں لکھی ہیں۔ آج ان ماہرین نے پتوں کے چھوٹے سے چھوٹے اجزاء کی حیرت انگیز ساخت پر بحث کی ہے۔ پتوں کے اجزائے حیات Cellules، سے لے کر ان کی سات تہوں، ان کے تنفس کے نظام، آب و غذا کے حصول کے لیے ان کے رشتے ناتوں پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کئی پیچیدہ پتوں کی خصوصیات پر بھی ایسی کتابوں میں بحث

---

[1] نہج البلاغۃ، کلمات قصار ۲۶ ہ

Marfat.com

کی گئی ہے۔

لہٰذا ہر پتہ شب و روز زمزمۂ توحید گنگناتا ہے۔ پتوں کی تسبیح کی دلنشیں آواز باغوں، کہساروں اور دَرّوں کے پُرپیچ راستوں میں گونج رہی ہے لیکن بے خبر لوگوں کو کچھ سمجھ نہیں آتا وہ انہیں خاموش اور گونگا سمجھتے ہیں۔

موجودات کی عمومی تسبیح وحمد کا یہ مفہوم پوری طرح قابلِ فہم ہے اور ضروری نہیں کہ ہم اس بات کے قائل ہوں کہ عالمِ ہستی کے تمام ذرّات ادراک وشعور رکھتے ہیں کیونکہ اس بات کے لیے ہمارے پاس کوئی قطعی دلیل نہیں ہے اور زیادہ احتمال یہی ہے کہ مذکورہ آیات اسی "زبانِ حال" کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر تسبیح وحمد سے مراد یہ ہے کہ نظامِ آفرینش خدا کی پاکیزگی، عظمت، قدرت اور صفات ثبوتیہ وسلبیہ کی حکایت و ترجمانی کرتا ہے تو پھر قرآن کیوں کہتا ہے کہ تم ان کی حمد و تسبیح نہیں سمجھتے کیونکہ بعض لوگ نہیں سمجھتے تو کم از کم علماء اور دانشمند تو سمجھتے ہیں۔

اس سوال کے دو جواب ہیں:

پہلا یہ کہ روئے سخن لوگوں کی نادان اکثریت خصوصاً مشرکین کی طرف ہے اور صاحبِ ایمان علماء کہ جو اقلیت میں ہیں اس عموم سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ہر عام میں استثناء ہے۔

دوسرا یہ کہ اسرارِ عالم میں سے جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ اس کے مقابلے میں کہ جسے ہم نہیں جانتے سمندر کے مقابلے میں قطرے کی مانند ہے اور عظیم پہاڑ کے مقابلے میں ذرّے کی طرح ہے۔ اگر اس میں صحیح طور پر غور و فکر کیا جائے تو اسے علم و دانش کا نام بھی نہیں دیا جاسکتا۔

تا بدانجا رسید دانشِ من کہ بدانستمی کہ نادانم!

میرا علم یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ مَیں نہیں جانتا۔

اس بناء پر اگر ہم عالم بھی ہوں تو بھی ان موجودات کی حمد و تسبیح نہیں پہچانتے کیونکہ جو کچھ ہم سُن رہے ہیں وہ ایک عظیم کتاب کا ایک لفظ ہے۔ اس لحاظ سے ایک عمومی حکم کے طور پر یہ سب لوگوں سے خطاب ہے کہ عالمِ ہستی کی موجودات زبانِ حال سے جو تسبیح وحمد کرتے ہیں تم انہیں نہیں سمجھتے کیونکہ جو کچھ تم سمجھتے ہو وہ اس قدر ناچیز اور حقیر ہے کہ کسی حساب و شمار ہی میں نہیں آتا۔

۳۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہاں موجودات کی عمومی تسبیح وحمد زبانِ حال اور زبانِ قال دونوں کا مرکب ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ تسبیح "تسبیح تکوینی" بھی ہے اور "تسبیح تشریعی" بھی کیونکہ بہت

Marfat.com

سے انسان اور تمام فرشتے ادراک و شعور کے ساتھ اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور باقی تمام موجودات کے ذرے بھی اپنی زبانِ حال سے خالق کی عظمت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں ۔

یہ دونوں قسم کی حمد و تسبیح اگرچہ آپس میں فرق رکھتی ہے لیکن حمد و تسبیح کے وسیع مفہوم میں دونوں مشترک ہیں لیکن جیسا کہ واضح ہے دوسری تفسیر اس تشریح کے ساتھ کہ جو ہم نے بیان کی ہے سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔

اہلِ بیتؑ سے چند روایات

پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام سے جو روایات اس سلسلے میں ہم تک پہنچی ہیں ان میں جاذبِ نظر تعبیرات دکھائی دیتی ہیں ۔

امام صادق علیہ السلام کا ایک صحابی کہتا ہے : مَیں نے آیہ " وان من شیء الا یسبح بحمده " کی تفسیر کے متعلق سوال کیا تو امامؑ نے جواب میں فرمایا :

کل شیء یسبح بحمده و انا لنری ان ینقض الجدار و هو تسبیحها

جی ہاں ہر چیز خدا کی تسبیح و حمد کرتی ہے ۔ یہاں تک کہ جب دیوار گر رہی ہوتی ہے اور اس کے گرنے کی آواز ہمیں سنائی دے رہی ہوتی ہے تو وہ بھی تسبیح ہوتی ہے [1]

امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

نهی رسول الله عن ان توسم البهائم فی وجوهها ، وان تضرب وجوهها لانها تسبح بحمد ربها

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جانوروں کے منہ نہ داغو اور ان کے منہ پر تازیانہ نہ مارو کیونکہ وہ خدا کی حمد و ثنا کرتے ہیں [2]

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے :

ما من طیر یصاد فی بر ولا بحر ولا شیء یصاد من الوحش ـــــ الا بتضییعه التسبیح

کوئی پرندہ صحرا و دریا میں شکار نہیں ہوتا اور کوئی جانور دام صیاد میں نہیں پھنستا مگر تسبیح ترک کرنے سے [3]

---

[1] نور الثقلین ج ۳ ص ۱۶۸ ۔

[2] نور الثقلین ج ۳ ص ۱۶۸ ۔

[3] نور الثقلین ج ۳ ص ۱۶۹ ۔

Marfat.com

امام باقر علیہ السلام نے چڑیا کی آواز سنی تو فرمایا :

جانتے ہو یہ کیا کہتی ہیں ؟

ابو حمزہ ثمالی جو آپ کے خاص اصحاب میں سے تھے نے عرض کیا : نہیں ۔ اس پر آپ نے فرمایا :

یسبحن ربھن عزوجل و یسئلن قوت یومھن

یہ خدائے عزوجل کی تسبیح کرتی ہیں اور اس سے دن کی روزی مانگتی ہیں [1]

ایک اور حدیث میں ہے :

ایک روز رسول اکرمؐ حضرت عائشہ کے پاس آئے ۔ فرمایا : میرے یہ دونوں کپڑے دھو ڈالو ۔ کہنے لگیں : یا رسول اللہؐ ! کل میں نے انہیں دھویا تھا ۔

رسول اللہؐ نے فرمایا :

اما علمت ان الثوب یسبح فاذا اتسخ انقطع تسبیحہ ۔

کیا جانتی نہیں ہو کہ کپڑے تسبیح کرتے ہیں اور جب میلے ہو جائیں تو ان کی تسبیح رک جاتی ہے [2]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا :

للدابۃ علی صاحبھا ستۃ حقوق لا یحملھا فوق طاقتھا ، ولا یتخذ ظھرھا مجلسا یتحدث علیھا ، و یبدء بعلفھا اذا نزل ، ولا یسمھا فی وجھھا ، ولا یضربھا فانھا تسبح و یعرض علیھا الماء اذا مربھا ۔

جانور اپنے مالک پر چھ حق رکھتا ہے :

۱ ۔ اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار نہ لادے ۔

۲ ۔ اس کی پشت کو باتیں کرنے کی مجلس نہ بنائے (بلکہ جب کسی سے سرِ راہ ملاقات ہو جائے اور اس سے باتیں کرنا چاہے تو سواری سے اتر کر باتیں کرے اور بات چیت ختم ہو جائے تو سوار ہو کر چل دے) ۔

۳ ۔ جس منزل پر پہنچے اسے پہلے چارہ مہیا کرے ۔

۴ ۔ اس کے منہ کو نہ داغے ۔

۵ ۔ اور نہ اس کے منہ پر مارے کیونکہ وہ خدا کی تسبیح کرتا ہے ۔

---

[1] تفسیر المیزان ، بحوالہ حلیۃ الاولیاء ، از ابو نعیم اصفہانی ۔

[2] تفسیر المیزان ، بحوالہ حلیۃ الاولیاء ، از ابو نعیم اصفہانی ۔

Marfat.com

۶۔ اور جب چشمہ آب یا ایسی کسی جگہ سے گزرے تو اسے پانی کے پاس لے جائے (تاکہ اگر وہ پیاسا ہے تو پانی پی لے) [1]

مجموعی طور پر یہ روایات کہ جن میں سے بعض دقیق اور باریک معانی کی حامل ہیں، نشاندہی کرتی ہیں کہ موجودات کی تسبیح والا عام حکم بلا استثناء سب چیزوں پر محیط ہے اور یہ سب چیزیں مذکورہ بالا دوسری تفسیر (تفسیر تکوینی اور زبان حال کے معنی میں تسبیح) سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہیں اور یہ جو ان روایات میں ہے کہ جس وقت لباس کثیف ہو جاتا ہے تو اس کی تسبیح رُک جاتی ہے، ممکن ہے یہ اس طرف اشارہ ہو کہ جب تک موجودات طبیعی حالت میں اور پاک صاف ہوں تو انسان کو یادِ الٰہی میں ڈالتی ہیں۔ لیکن جب طبیعی حالت میں اور پاک صاف نہ ہوں تو پھر یاد کا یہ سلسلہ باقی نہیں رہتا۔

---

[1] تفسیر المیزان، بحوالہ کافی ج۔

Marfat.com

(۴۵) وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَیْنَکَ وَبَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ○

(۴۶) وَّجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَکِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَفِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِذَا ذَکَرْتَ رَبَّکَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ○

(۴۷) نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ یَسْتَمِعُوْنَ اِلَیْکَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓی اِذْ یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ○

(۴۸) اُنْظُرْ کَیْفَ ضَرَبُوْا لَکَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا ○

ترجمہ

(۴۵) اور جب تُو قرآن پڑھتا ہے تو ہم تیرے اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے درمیان ایک غیر محسوس حجاب پیدا کر دیتے ہیں۔

(۴۶) اور ہم ان کے دلوں پر غلاف چڑھا دیتے ہیں تاکہ وہ اسے نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی (پیدا کر دیتے ہیں) اور جب تُو قرآن میں اپنے پروردگار کو تنہا یاد کرتا ہے تو وہ پشت کر لیتے ہیں اور تجھ سے پیٹھ پھیر لیتے ہیں۔

(۴۷) اور ہم جانتے ہیں کہ وہ کیوں تیری باتیں کان لگا کر سنتے ہیں اور جب وہ آپس میں کانا پھوسی کرتے ہیں جبکہ ظالم کہتے ہیں کہ تم تو بس ایک سحر زدہ شخص کی پیروی کرتے ہو۔

Marfat.com

(۴۸) دیکھ! یہ تجھ پر کیسی پھبتیاں کستے ہیں اور اسی بنا پر یہ گمراہ ہو گئے ہیں اور یہ (حق کا) راستہ پا ہی نہیں سکتے۔

شانِ نزول

مجمع البیان میں طبرسی نے، تفسیر کبیر میں فخرالدین رازی نے اور بعض دیگر مفسرین نے مندرجہ بالا آیات کی شانِ نزول کے بارے میں کہا ہے کہ ان میں سے پہلی آیت مشرکین کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جب رات کے وقت آپؐ قرآن کی تلاوت کرتے اور خانۂ کعبہ کے پاس نماز پڑھتے تو یہ لوگ آپؐ کو اذیت پہنچاتے۔ آپؐ کو پتھر مارتے اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے سے روکتے۔

خدا تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے ایسا کیا کہ وہ آپؐ کو اذیت نہ دے سکیں (اور شاید یہ اس طرح سے تھا کہ ان کے دلوں میں آپؐ کا رعب ڈال دیا تھا)۔[۱]

ایک اور روایت میں ہے کہ جس وقت رسول اللہؐ قرآن پڑھتے تو مشرکین میں سے دو آدمی دائیں طرف اور دو آدمی بائیں طرف کھڑے ہو جاتے۔ تالیاں بجاتے، سیٹیاں بجاتے اور بلند آواز سے شعر پڑھتے تاکہ آپؐ کی آواز لوگوں کے کانوں تک نہ پہنچے۔[۲]

ابن عباس کہتے ہیں کہ کبھی کبھار ابوسفیان اور ابوجہل رسول اللہؐ کے پاس آتے اور آپؐ کی باتیں سنتے۔ ایک دن ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: مجھے سمجھ نہیں آتا کہ محمدؐ کیا کہتا ہے؟ صرف یہ نظر آتا ہے کہ اس کے لب ہلتے ہیں۔

ابوسفیان نے کہا: مَیں سوچتا ہوں کہ اس کی بعض باتیں حق ہیں۔

ابوجہل نے اظہار کیا: وہ دیوانہ ہے۔

ابولہب نے مزید کہا: وہ کاہن ہے۔

ایک اور نے کہا: وہ شاعر ہے۔

ان غیر موزوں اور ناروا باتوں اور تہمتوں کے بعد مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں۔[۳]

۱۔ مجمع البیان۔

۲۔ تفسیر کبیر زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۳۔ تفسیر کبیر زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

تفسیر

جاھل مغرور

گزشتہ آیات کے بعد بہت سے لوگوں کے سامنے یہ سوال ابھرتا ہے کہ مسئلہ توحید اس قدر واضح ہے کہ تمام موجوداتِ عالم اس کی گواہی دیتے ہیں تو پھر مشرکین اس حقیقت کو کیوں قبول نہیں کرتے، وہ یہ گویا اور رسا آیاتِ قرآن سننے کے باوجود بیدار کیوں نہیں ہوتے؟

ہو سکتا ہے زیر بحث آیات اس سوال کے جواب کی طرف اشارہ ہوں۔ پہلی آیت کہتی ہے:

اے رسولؐ! "جس وقت تو قرآن پڑھتا ہے ہم تیرے اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے درمیان پردہ حائل کر دیتے ہیں" (و اذا قرأت القراٰن جعلنا بینک و بین الذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ حجاباً مستورًا)۔

یہ حجاب دراصل ہٹ دھرمی، تعصب، خود پرستی، غرور و تکبر اور جہالت ہی تھی کہ جو ان کی فکر و نظر سے حقائقِ قرآن چھپا دیتی تھی اور انہیں اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ توحید و معاد، دعوتِ پیغمبرؐ کی صداقت اور اس قسم کے دیگر حقائق کا ادراک کر سکیں۔

لفظ "مستور" یہاں "حجاب" کی صفت ہے یا ذاتِ پیغمبرؐ کی یا حقائقِ قرآن کی، اس بارے میں مفسرین نے مختلف آراء پیش کی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ان آیات کی تفسیر کے آخر میں بحث کریں گے۔ اسی طرح خدا کی طرف سے اس حجاب کے پیدا ہونے کی کیفیت کے بارے میں بھی وہیں پر بحث آئے گی۔

اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: "ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ وہ قرآن کو نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی اور بوجھ ہے" (وجعلنا علیٰ قلوبھم اکنۃ ان یفقھوہ و فی اٰذانھم وقرًا)۔ اسی لیے جب تو اپنے پروردگار کو قرآن میں تنہا یاد کرتا ہے تو وہ پیٹھ پھیر لیتے ہیں (واذا ذکرت ربک فی القراٰن وحدہ ولوا علیٰ ادبارھم نفورا)۔

واقعاً حق سے فرار کیسی عجیب بات ہے یعنی سعادت و نجات سے فرار، خوش بختی اور کامیابی سے فرار اور فہم و شعور سے فرار۔ اس معنی کی نظیر سورہ مدثر کی آیات ۵۰ اور ۵۱ میں بھی ہے:

كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ ۝ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ ۝

گویا وہ خوفزدہ گدھے ہیں کہ جو غضبناک شیر سے بھاگ رہے ہیں۔

مزید فرمایا گیا ہے: ہم جانتے ہیں کہ وہ کیوں تمہاری باتیں کان دھر کر سنتے ہیں (نحن اعلم بما یستمعون بہ اذ یستمعون الیک)۔ اور جب وہ آپس میں سرگوشیاں اور کان پھوسیاں کرتے ہیں (واذ ھم نجوٰی)۔

Marfat.com

جس وقت ظالم لوگ مومنین سے کہتے ہیں کہ صرف تم ایسے شخص کی پیروی کرتے ہو جو سحر زدہ ہے اور ساحروں نے جس کی عقل و ہوش کو ختم کر دیا ہے (اذ یقول الظالمون ان تتبعون الا رجلا مسحورا)۔

یہ لوگ دراصل ادراکِ حقیقت کے لیے تیرے پاس نہیں آتے اور تیری باتیں دل کے کانوں سے نہیں سنتے بلکہ ان کا مقصد تو یہ ہے کہ وہ آکر مخل ہوں اور اگر ہو سکے تو مومنین کو راستے سے بھٹکا دیں۔ اصولی طور پر جس کے دل پر پردہ پڑا ہو اور جس کے کان ایسے بوجھل ہوں کہ وہ حق بات سن ہی نہ سکے وہ مردانِ حق کی باتیں ایسے مقاصد کے علاوہ نہیں سنتے۔

زیرِ بحث آخری آیت میں پیغمبر اکرمؐ کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے مختصر سی عبارت میں ان گمراہوں کو دنداں شکن جواب دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: دیکھ! تیرے بارے میں کیسی کیسی پھبتیاں کستے ہیں (کوئی تجھے جادوگر کہتا ہے، کوئی سحرزدہ، کوئی کاہن اور کوئی مجنون)، یہی وجہ ہے کہ وہ گمراہ ہوتے ہیں اور راہِ حق پانے کی سکت نہیں رکھتے (انظر کیف ضربوا لک الامثال فضلوا فلا یستطیعون سبیلا)۔

ایسا نہیں کہ راستہ واضح نہیں ہے اور حق کا چہرہ چھپ گیا ہے بلکہ ان کے پاس چشمِ بینا نہیں ہے اور وہ بغض و جہالت، تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اپنی عقل و خرد گنوا بیٹھے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ ان آیات کا مجموعی جائزہ: زیرِ نظر آیات میں گمراہ لوگوں کی حالت اور شناختِ حق کی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کا عمدہ نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ آیات کہتی ہیں کہ حق کی پہچان میں ان کے لیے تین بڑی رکاوٹیں موجود ہیں۔ وہ نہ ہوں تو ان کے لیے حق کا چہرہ دیکھنا آسان ہو جائے۔

پہلی یہ کہ قرآن رسول اللہ سے کہتا ہے کہ تیرے اور ان کے درمیان ایک حجاب حائل ہے یہ حجاب سوائے بغض، کینے، حسد اور عداوت کے کچھ اور نہیں کہ جو ان کے سینوں میں تیرے لیے موجود ہے۔ اسی وجہ سے وہ تیری بلند شخصیت کو نہیں دیکھ پاتے اور تیری گفتار و رفتار کی عظمت کو نہیں سمجھ پاتے۔ یہاں تک کہ اچھائیاں بھی انہیں برائیاں معلوم ہوتی ہیں۔

دوسری یہ کہ وہ رسول اللہؐ سے کینہ اور حسد ہی نہ رکھتے تھے بلکہ ان کے دلوں پر جہالت اور اندھی تقلید کے پردے بھی پڑے ہوئے تھے یہاں تک کہ وہ کسی شخص سے حق بات سننے کے لیے بھی تیار نہ تھے۔

تیسری رکاوٹ شناختِ حق میں یہ حائل تھی کہ ان کے آلاتِ شناخت ہی حق قبول کرنے کیلئے آمادہ نہ تھے۔ مثلاً ان کے کان ہی حق بات سے ایسی نفرت کرتے تھے کہ گویا حق بات کو دفع کرتے تھے اور اس کے سامنے گویا بہرے ہو جاتے تھے جبکہ اس کے برعکس باطل کی باتیں انہیں پسند تھیں۔ باطل ان کے لیے لذت بخش تھا اور ان پر فوری اثر کرتا تھا۔

Marfat.com

خصوصاً یہ بات تو تجربے سے ثابت ہوئی ہے کہ جن باتوں کی طرف انسان رغبت نہ رکھتا ہو انہیں مشکل ہی سے سنتا ہے اور جن کی طرف میلان رکھتا ہے انہیں خاص تیزی کے ساتھ سنتا اور سمجھتا ہے گویا اندرونی میلانات بھی انسان کے ظاہری حواس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔

ان تین موانع کا نتیجہ یہ تھا کہ :

اولاً: وہ کلمۂ حق سننے سے بھاگتے تھے خصوصاً جب اللہ کی وحدانیت کے بارے میں گفتگو ہوتی کہ جو ان کے تمام مشرکانہ عقائد کی بنیاد ہی سے متصادم تھی تو وہ تیزی سے بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔

ثانیاً: وہ اپنے انحرافی خط کو صحیح ثابت کرنے کے لیے رسول اللہؐ اور اُن کے ارشادات کے بارے میں غلط توجیہیں کرتے تھے اور آپ پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے۔ کوئی ساحر کہتا اور کوئی شاعر، کوئی آپ کو مجنون قرار دیتا اور کوئی دیوانہ۔

تمام دشمنانِ حق کہ جن کے اعمال و صفاتِ رذیلہ ان کے لیے حجاب ہیں، کی یہی حالت ہے۔ اسی مقام پر ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص راہِ حق اور صراطِ مستقیم پر چلنا چاہتا ہے اور انحراف و گمراہی سے بچنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اسے اپنی اصلاح کی کوشش کرنا چاہیئے۔ دل کو بُغض و کینہ اور حسد و عناد سے پاک کرنا چاہیئے۔ روح کو غرور و نخوت سے پاک کرنا چاہیئے۔ خلاصہ یہ کہ اپنے وجود کو صفاتِ رذیلہ سے پاک کرنا چاہیئے چونکہ جب دل کا آئینہ ان رذائل سے پاک صاف ہو کر صیقل ہو جائے گا تو پھر تمام حقائق اس پر اپنا پر تو ڈال سکیں گے یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات بے علم پاک دل افراد حقائق سمجھ لیتے ہیں لیکن غیر تہذیب یافتہ عالم نہیں سمجھ پاتے۔

۲۔ **خدا کی طرف نسبت کا مفہوم**: دوسری بہت سی آیات کی طرح زیرِ بحث آیات میں بھی حجابوں کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے :

ہم ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔

تیرے اور ان کے درمیان ہم حجاب حائل کر دیتے ہیں اور ان کے کانوں میں سنگینی قرار دیتے ہیں۔

ہو سکتا ہے ایسی تعبیرات سے جاہل افرادِ مکتبِ جبر کا مفہوم لیں حالانکہ یہ تو ان کے اعمال ہی کے آثار اور نتائج ہیں۔ درحقیقت وہ خود ہی ہیں جو اپنے گناہوں اور بُری صفات کے ذریعے یہ حجاب پیدا کرتے ہیں لیکن چونکہ ہر چیز کی خاصیت خدا کی طرف سے ہے اور عملِ قبیح اور صفاتِ رذیلہ میں خدا نے یہ تاثیر پیدا کی ہے لہٰذا اس خاصیت اور حجاب کی نسبت خدا کی طرف بھی دی جا سکتی ہے۔ اس بارے میں گزشتہ مباحث میں ہم بارہا گفتگو کر چکے ہیں اور اس سلسلے میں قرآن سے بھی بہت سے شواہد پیش کیے جا چکے ہیں۔

۳۔ **حجاب مستور کیا ہے؟**: اس سلسلے میں مفسرین کی کئی مختلف آراء ہیں۔ مثلاً:

(۱) بعض "مستور" کو "حجاب" کی صفت سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن کی تعبیر کا ظہور یہ ہے کہ حجاب

Marfat.com

نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ درحقیقت کینہ و عداوت اور حسد و بغض کے حجاب ایسے نہیں ہیں جو آنکھ سے دکھائی دیں جبکہ ان کے باعث جس سے حسد اور کینہ ہوتا ہے اُس کے اور اس کے درمیان ایک ضخیم پردہ حائل ہو جاتا ہے۔

(ب) بعض دیگر مفسرین "مستور" کو "ساتر" کے معنی میں سمجھتے ہیں (کیونکہ اسم مفعول بعض اوقات فاعل کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ آیاتِ مذکورہ میں بھی بعض مفسرین "مسحور" کو "ساحر" کے معنی میں سمجھتے ہیں[1]

(ج) بعض "مستور" کو "حجاب" کی مجازی توصیف سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مراد یہ نہیں ہے کہ یہ حجاب مستور ہے بلکہ وہ حقائق جو اس حجاب کے ماوراء ہیں وہ مستور ہیں (مثلاً پیغمبر اکرمؐ کی شخصیت، آپؐ کی دعوت کی عظمت اور آپؐ کے ارشادات کی عظمت)۔

لیکن ان تینوں تفسیروں میں غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ پہلی تفسیر ظاہر آیت سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ بعض روایات میں بھی ہے کہ بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سخت ترین دشمن آپؐ کی طرف آتے جبکہ آپؐ اپنے اصحاب کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہوتے لیکن وہ آپؐ کو نہ دیکھ پاتے گویا آپؐ کی خیرہ کن عظمت کے باعث یہ دل کے اندھے آپؐ کو نہ دیکھ پاتے اور نہ پہچان پاتے لہٰذا آپؐ ان کی طرف سے اذیت سے محفوظ رہتے۔

۴۔ "اکنہ" اور "وقر" کیا چیز ہے؟ : "اکنہ" "کنان" (بروزن "زبان") کی جمع ہے۔ یہ دراصل ہر قسم کی ڈھانپنے والی چیز کے معنی میں ہے کہ جس سے کسی چیز کو ڈھانپتے اور مستور کرتے ہیں لیکن "کن" (بروزن "جن") اس برتن کو کہتے ہیں جس میں کسی چیز کو محفوظ رکھا جاتا ہے۔ "کن" کی جمع "اکنان" ہے۔ بعد ازاں اس معنی میں وسعت پیدا ہو گئی اور ہر چیز کہ جو مستور ہونے کا سبب بننے کے لیے بولا جانے لگا، مثلاً پردہ، گھر اور وہ اجسام کہ جن کے پیچھے انسان اپنے آپ کو چھپائے۔

"وقر" (بروزن "جبر") سنگینی کے معنی میں ہے کہ جو کان میں پیدا ہو جائے اور "وقر" (بروزن "رزق") بارِ سنگین کے معنی میں ہے۔

۵۔ "مایستمعون به" کی تفسیر : اس کی مفسرین نے دو تفسیریں کی ہیں :

طبرسی نے مجمع البیان میں اور فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں اور بعض دیگر مفسرین نے اسے "سبب استماع" کے معنی میں لیا ہے یعنی ہم جانتے ہیں کہ وہ تیری باتیں کیوں کان لگا کر سنتے ہیں، ادراکِ حق کے لیے؟ نہیں بلکہ

---

[1] اخفش سے منقول ہے کہ وہ کہتا ہے :

"اسم مفعول کبھی اسم فاعل کے معنی میں ہوتا ہے۔ مثلاً "میمون" "یامن" کے معنی میں اور "مشئوم" "شائم" کے معنی میں۔

Marfat.com

استہزاء اور جوڑ توڑ لگانے اور الٹی سیدھی توجیہات کرنے کے لیے، مختصر یہ کہ گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے کیلئے۔

علامہ طباطبائی نے المیزان میں اور بعض دیگر مفسرین نے اسے "وسیلۂ استماع" کے معنی میں لیا ہے یعنی ہم جانتے ہیں کہ وہ کن کانوں سے تیری باتیں کان لگا کر سنتے ہیں اور ہم ان کے دلوں اور ان کی سرگوشیوں سے آگاہ ہیں۔

(پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے)۔

۶۔ وہ پیغمبر اکرمؐ کو "مسحور" کیوں کہتے تھے؟ "مسحور" کا معنی ہے سحر شدہ اور "ساحر" کا معنی ہے سحر کرنے والا۔

دشمن رسول اللہؐ کو "مسحور" یا تو اس بناء پر کہتے تھے کہ وہ اس طرح آپؐ کی طرف جنون کی نسبت دینا چاہتے تھے اور کہنا چاہتے تھے کہ جادوگروں نے آپؐ کی فکر و عقل پر اثر کیا ہے اور ساحروں نے (معاذ اللہ) آپؐ کے حواس مختل کر دیئے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ "مسحور" یہاں "ساحر" کے معنی میں ہے (کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اسم مفعول کبھی اسم فاعل کے معنی میں بھی آتا ہے)۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ رسول اللہؐ کا غیر معمولی کلام جادو ہے جو لوگوں کے دلوں پر اثر کرتا ہے۔ ضمنی طور پر یہ بات کہہ کر وہ آپؐ کے کلام کی عجیب تاثیر کا اعتراف کرتے تھے۔

۷۔ توحید کی آواز پر مشرکین کا خوف: زیر بحث آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ مشرکین خاص طور پر توحید کی آواز سن کر سخت خوف میں مبتلا ہو جاتے تھے اور بھاگ کھڑے ہوتے تھے کیونکہ ان کی تمام تر زندگی کی بنیاد شرک اور بت پرستی تھی اور ان کے معاشرے پر مشرکانہ نظام حکمران تھا۔ اگر توحید کی بنیاد پڑ جاتی تو نہ صرف ان کے مذہبی عقائد پر ضرب پڑتی تھی بلکہ ان کا معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، ثقافتی اور تمدنی نظام بھی جو شرک پر مبنی تھا تباہ ہو کر رہ جاتا، اس طرح حکومت پسے ہوئے مستضعف لوگوں کے ہاتھ آجاتی۔ مستکبرین کا خاتمہ ہو جاتا، اور استعمار اور لوٹ کھسوٹ کہ جو مشرکانہ نظاموں کا نتیجہ ہے ختم ہو جاتا، اور طبقاتی تفاوت ختم ہو جاتا تھا۔ لہٰذا جن کے اقتدار کا انحصار شرک پر تھا ان کی سخت کوشش تھی کہ توحید کی پکار کسی کے کان تک پہنچنے پاتے لیکن جیسا کہ زیر بحث آیات اشارہ کرتی ہیں وہ ظالم اور ستمگر لوگ تھے کہ جو مستضعف عوام پر بھی ظلم کرتے تھے اور اپنے آپ پر بھی۔ کیونکہ ہر ظالم منحرف اپنی قبر آپ کھودتا ہے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ مشرکین چاہتے تھے کہ انہیں فسق و فجور اور گناہ جاری رکھنے کا کوئی جواز ہاتھ آجائے لہٰذا بار بار پوچھتے تھے کہ قیامت کا دن کب آئے گا:

بَلْ يُرِيدُ الْإِنسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ ﴿﴾ يَسْأَلُ أَيَّانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ ﴿﴾

بلکہ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ ہمیشہ برائی کرتا رہے۔ (جبھی تو) پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آئیگا۔
(قیامت۔ ۵، ۶)

Marfat.com

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ بھی ذمہ داری اور جوابدہی سے فرار کے لیے ایک بہانہ سازی تھی۔

(۴۹) وَقَالُوٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوثُونَ
خَلْقًا جَدِيدًا ۝
(۵۰) قُلْ كُونُوا حِجَارَةً اَوْ حَدِيدًا ۝
(۵۱) اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ ۚ فَسَيَقُولُونَ مَنْ
يُّعِيدُنَا ؕ قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُونَ اِلَيْكَ
رُءُوسَهُمْ وَيَقُولُونَ مَتٰى هُوَ ؕ قُلْ عَسٰى اَنْ يَّكُونَ قَرِيبًا ۝
(۵۲) يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّونَ اِنْ
لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيلًا ۝

ترجمہ

(۴۹) اور انہوں نے کہا کہ جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے اور بکھر جائیں گے تو دوبارہ نئی خلقت حاصل کریں گے۔

(۵۰) کہہ دو: تم پتھر یا لوہا ہو جاؤ۔

(۵۱) یا جو مخلوق تمہاری نظر میں ان سے بھی زیادہ سخت ہو (اور جس میں زندگی کے دُور دُور تک کوئی آثار نہ ہوں۔ پھر بھی خدا قادر ہے کہ تمہیں نئی زندگی کی طرف پلٹا دے)۔ عنقریب وہ کہیں گے کون ہمیں دوبارہ پلٹائے گا۔ کہہ دو: وہی جس نے پہلے تمہیں پیدا کیا تھا۔ وہ (تعجب اور انکار سے) تیرے سامنے اپنے سر جھکاتے ہیں اور کہتے ہیں:

Marfat.com

ایسا کس وقت ہوگا۔ کہہ دو: شاید نزدیک ہو۔

(۵۲) وہی دن کہ جب وہ تمہیں (تمہاری قبروں سے) بُلائے گا تم بھی جواب دو گے اس حالت میں کہ اُس کی حمد کر رہے ہو گے اور خیال کرو گے کہ تم تھوڑی سی مدت ہی (عالم برزخ میں) رہے ہو۔

تفسیر

قیامت یقینی ہے

گزشتہ آیات، توحید سے متعلق اور شرک کے خلاف مبارزہ کے بارے میں تھیں لیکن زیرِ نظر آیات میں معاد اور قیامت کے بارے میں گفتگو ہے اور ہر مقام پر اس گفتگو سے مسئلہ توحید کی تکمیل ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ عقائدِ اسلامی میں سے بنیادی ترین مبداء و معاد کا عقیدہ ہے یہی عقیدہ انسان کی عملی اور اخلاقی طور پر تربیت کرتا ہے۔ یہ عقیدہ آلودگی اور گناہ سے بچاتا اور ادائیگی فرض کی دعوت دیتا ہے اور انسان کو تکامل و ارتقاء کے راستے پر لے جاتا ہے۔

ان آیات میں منکرینِ معاد کے تین سوالات یا تین اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: انہوں نے کہا کہ جب ہم ہڈیوں میں تبدیل ہو گئے اور یہ ہڈیاں بھی بوسیدہ ہو کر منتشر ہو گئیں تو کیا ہمیں نئے سرے سے تخلیق کیا جائے گا (وقالوا ء اذا کنا عظاماً و رفاتاً ء انا لمبعوثون خلقاً جدیداً)[1]

کیا اصولی طور پر اس بات کا امکان ہے کہ بوسیدہ اور ذرہ ذرہ ہو کر بکھر جانے والی ہڈیاں نئے سرے سے جمع ہوں اور اس کے بعد پھر انہیں لباسِ حیات عطا ہو جائے۔ بوسیدہ اور پراگندہ ہڈیاں کہاں اور ایک زندہ طاقتور اور عقلمند انسان کہاں۔

معاد کے بارے میں قرآن کی دیگر بہت سی تعبیرات کی طرح یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ رسول اللہؐ اپنی گفتگو میں ہمیشہ معادِ جسمانی کی بات کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ بکھر جانے کے بعد یہ جسم پھر پلٹ آئے گا۔ ورنہ اگر معادِ روحانی کی بات ہوتی تو مخالفین کے ایسے اعتراضات کے کوئی معنی نہ تھے۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: کہہ دو: کہ بوسیدہ اور خاک شدہ ہڈی سے لباسِ حیات عطا کرنا تو آسان کام ہے "تم پتھر یا لوہا بن جاؤ" تو پھر بھی خدا قادر ہے کہ تمہارے بدن کو لباسِ حیات پہنا دے (قل

---

[1] رفات - بروزن کرات۔

Marfat.com

کونوا حجارۃ او حدیدًا)۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مخلوق پتھر اور لوہے سے بھی سخت تر ہو اور زندگی سے بہت دُور ہو اور اس لحاظ سے تمہاری نظر میں زیادہ بڑا کام ہو تو بھی خدا قادر ہے کہ اس کے بدن پر جامۂ حیات پہنا دے (او خلقًا مما یکبر فی صدورکم)۔

واضح ہے کہ ہڈیاں بوسیدہ ہو کر خاک ہو جاتی ہیں اور مٹی میں ہمیشہ آثارِ حیات ہوتے ہیں۔ نباتات خاک ہی سے اُگتے ہیں۔ زندہ موجودات خاک ہی میں پرورش پاتے ہیں اور انسانی وجود کی اصل بھی خاک ہے۔ مختصر یہ کہ خاک زندگی کا دروازہ ہے لیکن پتھر، لوہا یا وہ موجودات جو ان سے زیادہ سخت ہیں ان کا فاصلہ زندگی سے بہت زیادہ ہے۔ نباتات کبھی پتھر اور لوہے سے نہیں پھوٹتے مگر قرآن کہتا ہے کہ قدرت خدا کے سامنے یہ بات اہم نہیں، تم جو کچھ بھی ہو اور جو کچھ بھی ہو جاؤ تمہاری طرف زندگی لوٹا دینا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں۔

پتھر بوسیدہ ہو کر خاک میں بدل جاتے ہیں اور پھر مٹی کے سینے سے زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ لوہا بھی بوسیدہ ہو کر پراگندہ ہو جاتا ہے اور پھر اس کرۂ خاکی کے دوسرے موجودات سے مل کر مبداِ حیات بن جاتا ہے۔

اس زمین میں ہم جس موجود کا بھی تصور کریں، وہ معدنیات میں سے ہو یا معدنیات سے مشابہ کسی چیز سے انسانی بدن کی عمارت میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ چیز نشاندہی کرتی ہے کہ اس عالم کے تمام ذرات میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ موجودِ زندہ میں تبدیل ہو جائے اگرچہ ان میں سے بعض کسی مرحلے میں زندگی سے زیادہ قریب ہوتے ہیں مثلاً مٹی اور بعض نسبتاً دور ہوتے ہیں مثلاً پتھر اور لوہا۔

ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ اچھا اگر ہم مان لیں کہ یہ بوسیدہ اور منتشر ہڈیاں پھر زندگی حاصل کر سکتی ہیں تو یہ کام انجام دینے کی قدرت کس میں ہے؟ وہ یہ اس لیے کہتے تھے کیونکہ وہ اس تبدیلی کو ایک نہایت پیچیدہ اور مشکل امر سمجھتے تھے۔ "وہ کہتے تھے کون انہیں پلٹائے گا" (فسیقولون من یعیدنا)۔

اس سوال کا جواب قرآن اس طرح دیتا ہے: ان سے کہو کہ وہی جس نے پہلی مرتبہ تمہیں پیدا کیا تھا (قل الذی فطرکم اول مرۃ)۔

اگر "قابل" کی قابلیت میں تمہیں شک ہے تو سوچو کہ تم پہلے بھی تو خاک تھے، پھر اب کیا رکاوٹ ہے کہ پھر خاک بننے کے بعد تمہیں زندگی دے دی جائے؟ اگر "فاعل" کی فاعلیت میں شک ہے تو وہی خدا جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا وہ پھر بھی یہ کام کر سکتا ہے کیونکہ:

حکم الامثال فیما یجوز و فیما لا یجوز واحد

ہم مثل چیزوں کے جائز اور ناجائز کا فیصلہ ایک جیسا ہوتا ہے۔

آخر میں ان کا تیسرا اعتراض بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ تعجب اور انکار کرتے ہوئے اپنا سر ہلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قیامت کب برپا ہوگی (فسینغضون الیك رءوسهم ویقولون متیٰ هو)۔

Marfat.com

" سینغضون" " انغاض" کے مادہ سے کسی مقابل شخص کی جانب تعجب سے سر ہلانے کے معنی میں ہے۔
اس اعتراض سے ان کی مراد یہ تھی کہ فرض کریں یہ مادۂ خاکی انسان میں تبدیل ہونے کے قابل ہے اور یہ بھی مان لیں کہ خدا میں یہ قدرت ہے لیکن یہ تو ایک ادھار والے وعدے سے زیادہ بات نہیں ہے اور معلوم نہیں کہ قیامت کب واقع ہوگی، اگر ہزاروں یا لاکھوں سال بعد ہوئی تو ہماری آج کی زندگی میں اس کا کیا اثر ہوگا، نقد بات کرو ادھار کی بات چھوڑو۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: ان سے کہہ دو: اس کا زمانہ قریب ہے (قل عسٰی ان یکون قریبًا)۔
قیامت کی گھڑی قریب ہی ہے کیونکہ اس عالم کی مجموعی عمر کتنی ہی کیوں نہ ہو دوسرے جہان کی بے پایاں زندگی کے مقابلے میں تو جلدی گزر جانے والے ایک لمحے سے زیادہ نہیں ہے۔
اس سے قطع نظر اگر قیامت ہمارے چھوٹے اور محدود معیار کے مطابق دور بھی ہو تو بھی قیامت کا آستانہ — یعنی موت — ہم سب کے قریب ہے۔ کیونکہ موت قیامتِ صغریٰ ہے:
اذا مات الانسان قامت قیامته.
جب انسان کو موت آجاتی ہے تو اس کے لیے قیامت واقع ہو جاتی ہے۔
یہ ٹھیک ہے کہ موت قیامتِ کبریٰ نہیں ہے لیکن اس کی یاد تو دلاتی ہے۔
ضمنی طور پر "عسٰی" کی تعبیر شاید اس طرف اشارہ ہو کہ کوئی شخص دقیقاً قیامت کی تاریخ نہیں جانتا اور یہ ان علوم میں سے ہے جو ذاتِ پروردگار سے مخصوص ہیں۔ اُس کے علاوہ کوئی بھی اس سے آگاہ نہیں۔
اگلی آیت میں قیامت کی متعین تاریخ ذکر کیے بغیر اس کی بعض خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: زندگی کی طرف یہ بازگشت اس دن ہوگی جس دن تمہیں تمہاری قبروں سے پکارا جائے گا اور تم چاہو یا نہ چاہو اس کی دعوت پر لبیک کہو گے اور خدا کی حمد و ثنا کرتے ہوئے زندگی کی طرف پلٹ آؤ گے (یوم یدعوکم فتستجیبون بحمده)۔

اور وہ ایسا دن ہے کہ تم موت اور قیامت کے درمیان کے فاصلہ (دورِ برزخ) کو کم سمجھو گے اور خیال کرو گے کہ برزخ میں تو تم تھوڑی سی مدت ہی رہے ہو (وتظنون ان لبثتم الا قلیلاً)۔ اگرچہ یہ طولانی ہو لیکن عالمِ بقاء کی بے انتہا عمر کے مقابلے میں چند جلدی سے گزر جانے والے لمحات سے زیادہ نہیں ہے۔
بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ دنیا میں توقف کی طرف اشارہ ہے یعنی وہ دن کہ جب تم جان لو گے کہ دنیاوی زندگی کوئی زیادہ طولانی نہ تھی چند مختصر سی زود گزر گھڑیاں تھیں۔

Marfat.com

(۵۳) وَقُلۡ لِّعِبَادِیۡ یَقُوۡلُوا الَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ یَنۡزَغُ
بَیۡنَهُمۡ ؕ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ كَانَ لِلۡاِنۡسَانِ عَدُوًّا مُّبِیۡنًا ○
(۵۴) رَبُّكُمۡ اَعۡلَمُ بِكُمۡ ؕ اِنۡ یَّشَاۡ یَرۡحَمۡكُمۡ اَوۡ اِنۡ یَّشَاۡ یُعَذِّبۡكُمۡ ؕ
وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ عَلَیۡهِمۡ وَكِیۡلًا ○
(۵۵) وَرَبُّكَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَلَقَدۡ فَضَّلۡنَا
بَعۡضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعۡضٍ وَّاٰتَیۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ○
(۵۶) قُلِ ادۡعُوا الَّذِیۡنَ زَعَمۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ فَلَا یَمۡلِكُوۡنَ كَشۡفَ الضُّرِّ
عَنۡكُمۡ وَلَا تَحۡوِیۡلًا ○
(۵۷) اُولٰٓئِكَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ یَبۡتَغُوۡنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الۡوَسِیۡلَةَ اَیُّهُمۡ
اَقۡرَبُ وَیَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَهٗ وَیَخَافُوۡنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ
رَبِّكَ كَانَ مَحۡذُوۡرًا ○

ترجمہ

(۵۳) میرے بندوں سے کہہ دو: ایسی بات کریں کہ جو زیادہ اچھی ہو کیونکہ شیطان (ناموزوں باتوں کے ذریعے) ان کے درمیان فتنہ و فساد کھڑا کر دیتا ہے۔ شیطان ہمیشہ انسان کا کھلا دشمن رہا ہے۔

(۵۴) تمہارا پروردگار (تمہاری نیتوں اور اعمال کو) تم سے زیادہ جانتا ہے اگر وہ چاہے (اور تمہیں اس لائق سمجھے) تو اپنی رحمت تمہارے شامل حال کر دے اور اگر چاہے

Marfat.com

تو عذاب دے، اور ہم نے تجھے ان پر وکیل نہیں بنایا (کہ تیرے لیے لازم ہو کہ وہ جبراً ایمان لے آئیں)۔

۵۵ وہ تمام لوگ کہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں ان کے حالات سے تیرا پروردگار زیادہ آگاہ ہے (اور اگر ہم نے تجھے دوسروں پر فضیلت بخشی ہے تو وہ تیری اہلیت کی وجہ سے ہے)۔ ہم نے بعض نبیوں کو بعض دوسرے نبیوں پر فضیلت عطا کی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی ہے۔

۵۶ ان سے کہہ دو: تم نے خدا کے علاوہ جو (اپنے معبود) بنا رکھے ہیں انہیں پکار کر دیکھو، وہ تمہاری کوئی مشکل حل نہیں کر سکتے اور نہ اس میں کوئی تبدیلی لا سکتے ہیں۔

۵۷ وہ تو وہ ہیں جو خود اپنے پروردگار سے (تقرب کا) وسیلہ طلب کرتے ہیں، ایسا وسیلہ جو زیادہ قریب ہو اور یہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ سب تیرے پروردگار کے عذاب سے بچنے کی فکر میں اور وحشت زدہ ہیں۔

تفسیر

تمام مخالفین سے منطقی طرزِ عمل

گزشتہ آیات میں مبداء و معاد کے بارے میں گفتگو تھی اور ان دو اہم عقائد کے بارے میں دلائل پیش کیے گئے تھے۔ زیرِ بحث آیات میں مخالفین خصوصاً مشرکین کے ساتھ گفتگو اور استدلال کے آداب سکھائے گئے ہیں کیونکہ مکتب جتنا بھی عالی ہو اور منطق جتنی بھی قوی ہو اگر بحث و گفتگو صحیح طریقے اور لطف و محبت کی بجائے خشونت و سختی پر مبنی ہو گی تو بے اثر ہو کر رہ جائے گی۔

لہٰذا پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: میرے بندوں سے کہہ دو کہ ایسی گفتگو کریں جو بہت اچھی ہو (و قل لعبادی یقولوا التی ھی احسن)۔ ان کی گفتگو مضمون کے لحاظ سے، طرزِ بیان کے لحاظ سے، اخلاق کے حوالے سے، انسانی آداب کے حوالے سے بہترین ہو۔

Marfat.com

کیونکہ اگر انہوں نے "قولِ احسن" کو ترک کر دیا اور کلام میں خشونت، سختی اور ہٹ دھرمی ہوتی تو شیطان ان کے درمیان فتنہ و فساد اُٹھا دے گا (ان الشیطان ینزغ بینھم)۔

اور یہ بات کبھی فراموش نہ کرو کہ شیطان کمین لگائے بیٹھا ہے اور چین سے نہیں بیٹھا" کیونکہ شیطان شروع ہی سے نوعِ انسان کا کھلا دشمن ہے" (ان الشیطان کان للانسان عدوًا مبینًا)۔

اس آیت میں لفظ "عباد" سے کون لوگ مراد ہیں، اس سلسلے میں مفسرین میں دو مختلف نظریے ہیں۔ بعض قرائن سے ان میں سے ہر ایک کی تائید ہوتی ہے۔

۱۔ "عباد" سے مراد مشرک بندے ہیں اگرچہ انہوں نے غلط راہ اختیار کر رکھی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے انسانی جذبات کی تحریک کے لیے انہیں "عبادی" (میرے بندے) سے یاد کیا ہے اور انہیں دعوت دی ہے کہ وہ "احسن" یعنی توحید اور نفیِ شرک کا راستہ اختیار کریں اور شیطانی وسوسوں سے خبردار رہیں۔ گویا ان آیات کا مقصد یہ ہے کہ توحید و معاد کے دلائل پیش کرنے کے بعد مشرکین کے دلوں کو اپیل کی جائے تاکہ ان میں سے جو تھوڑی بہت آمادگی رکھتے ہیں وہ بیدار ہو جائیں اور راہِ راست پر آجائیں۔

یہ سورہ مکی ہے اور اُس وقت ابھی جہاد کا حکم نازل نہیں ہوا تھا اور اس صورت میں منطق و استدلال کے علاوہ ان سے مقابلے کا اور کوئی راستہ نہ تھا اس حوالے سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔

۲۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ لفظ "عبادی" مومنین کی طرف اشارہ ہے اور انہیں دشمنوں سے بحث کرنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے کیونکہ بعض اوقات نووارد مومنین اپنے پہلے والے طرزِ عمل ہی کا مظاہرہ کرتے، اپنے عقیدے کے ہر مخالف سے سخت رویہ اختیار کرتے، انہیں صراحت سے اہلِ جہنم، اہلِ عذاب، بدبخت اور گمراہ کہتے پھرتے اور اپنے تئیں اہلِ نجات قرار دیتے۔ اس سے رسول اللہؐ کی دعوت کے بارے میں مخالفین میں ایک منفی ردِعمل جنم لیتا۔

اس سے قطع نظر بعض اوقات مخالفین رسول اللہؐ کے بارے میں جو توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے اس پر بھی مومنین بے اختیار ہو کر انہیں سخت سست کہتے تھے۔ جیسا کہ گزشتہ آیات میں گزر چکا ہے۔ مخالفین رسول اللہؐ کے لیے مسحور، مجنون، کاہن اور شاعر جیسے الفاظ کہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ بعض مومنین بھی ان سے جھگڑ پڑتے اور جو منہ میں آتا کہہ ڈالتے۔ قرآن مومنین کو اس طرزِ عمل سے روکتا ہے اور انہیں دعوت دیتا ہے کہ نرمی و لطافت سے جواب دیں اور بحث و گفتگو میں بہترین الفاظ استعمال کریں تاکہ شیطانی نقصان سے بچ جائیں۔

اس تفسیر کے مطابق لفظ "بینھم" (ان کے درمیان) کا مفہوم یہ ہوگا کہ شیطان کوشش کرتا ہے کہ مومنین اور مخالفین کے درمیان فتنہ و فساد پیدا کر دے یا کوشش کرتا ہے کہ مومنین میں غیر محسوس طور پر نفوذ کرے اور انہیں فتنہ و فساد پر ابھارے۔ کیونکہ "ینزغ"، "نزغ" کے مادہ سے فساد کروانے کی نیّت

Marfat.com

سے کسی کام میں مداخلت کرنے کے معنی میں ہے۔

لیکن تمام قرآن کو ملحوظِ نظر رکھا جائے تو دوسری تفسیر ظاہر آیت سے زیادہ میل کھاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کیونکہ عام طور پر لفظ "عبادی" قرآن میں مومنین کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں بعض مفسرین نے اس آیت کی جو شانِ نزول نقل کی ہے اس میں ہے کہ مکہ میں مشرکین اصحاب رسول کو اذیت دیتے تھے تو گاہے دل تنگی کے عالم میں اصحاب رسول اللہؐ سے اصرار کرتے تھے کہ ہمیں جہاد کی اجازت دی جائے (یا پھر گفتگو میں سخت کلامی اور جیسا سوال ویسا جواب کی اجازت دی جائے) اس پر رسولِ خدا فرماتے تھے کہ ابھی تک مجھے ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ اس موقع پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انہیں حکم دیا گیا کہ صرف منطقی گفتگو سے جواب دینے کا اسلوب جاری رکھیں [1]

بعد والی آیت مزید کہتی ہے: تمہارا پروردگار تمہارے حالات سے زیادہ آگاہ ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنی رحمت تمہارے شاملِ حال کر دے اور اگر چاہے تو تمہیں سزا دے (ربکم اعلم بکم ان یشأ یرحمکم او ان یشأ یعذبکم)۔

پہلی آیت کی دو تفسیروں کے پیشِ نظر اس آیت کی بھی دو تفسیریں ممکن ہیں:

پہلی یہ کہ اے مشرکین اور اے تہی از ایمان لوگو! تمہارا خدا وسیع رحمت بھی رکھتا ہے اور دردناک عذاب بھی، تمہیں وہ جس لائق سمجھے گا وہ سلوک کرے گا۔ کیا ہی بہتر ہے کہ تم اس کی وسیع رحمت کے سائے میں آجاؤ اور اس کے عذاب سے بچو۔

دوسری یہ کہ اے اہلِ ایمان! یہ گمان نہ کرو بس تمہی اہلِ نجات ہو اور دوسرے سب اہلِ جہنم ہیں۔ خدا تمہارے اعمال اور قلوب سے زیادہ آگاہ اور باخبر ہے اگر چاہے تو تمہارے گناہوں کے سبب تمہیں عذاب دے اور چاہے تو اپنی رحمت تمہارے شاملِ حال کر دے۔ اپنی حالت پر کچھ غور و فکر کرو اور اپنے اور دوسروں کے درمیان عدل و انصاف سے فیصلہ کرو۔

بہر حال آیت کے آخر میں روئے سخن پیغمبرِ اکرمؐ کی طرف ہے۔ آپ کی دلجوئی کی گئی ہے اور مشرکین کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے آپؐ کے انتہائی رنج کو دُور کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: ہم نے تجھے ان پر وکیل نہیں بنایا کہ تم یہ سمجھو کہ انہیں لازمی طور پر ایمان لانا چاہیئے (وما ارسلناك علیهم وکیلا)۔ تیری ذمہ داری تو یہ ہے کہ انہیں کھلے بندوں حق کی طرف دعوت دو اور اپنی جدوجہد جاری رکھو۔ اگر وہ ایمان لے آئیں تو بہت خوب ورنہ تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تُو نے تو اپنا فریضہ ادا کر دیا۔

اس جملے میں مخاطب اگرچہ رسول اللہؐ کی ذات ہے لیکن بعید نہیں کہ قرآن کے ایسے دیگر بہت سے

---

[1] مجمع البیان اور تفسیر قرطبی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

مقامات کی طرح مراد تمام مومنین ہوں۔ یہ بات دوسری تفسیر کی تائید میں ایک اور قرینہ ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ تم مسلمانوں کی ذمہ داری حق کی طرف دعوت دینا ہے چاہے وہ ایمان لائیں یا نہ لائیں لہٰذا گفتگو میں سختی اور توہین و ہتک کا طریقہ اختیار کرنے اور اس طرح حد سے زیادہ جوش و خروش دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اگلی آیت اس سے بھی بڑھ کر بات کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا تمہارے ہی حالات سے آگاہ نہیں بلکہ "تیرا پروردگار آسمان اور زمین کے سب باسیوں کی نسبت زیادہ آگاہ ہے اور زیادہ علم رکھتا ہے" (وربك اعلم بمن فی السماوات والارض)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے بعض نبیوں کو بعض دیگر نبیوں پر فضیلت بخشی ہے اور داؤد کو زبور عطا کی ہے (ولقد فضلنا بعض النبیین علی بعض واٰتینا داؤد زبورًا)۔

یہ جملہ درحقیقت مشرکین کے ایک اعتراض کا جواب ہے۔ وہ نہایت تحقیر انداز میں کہتے تھے کہ کیا خدا کے پاس اور کوئی شخص نہ تھا کہ اس نے ایک یتیم محمدؐ کو نبوت کے لیے انتخاب کیا اور اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ اسے تمام انبیاء کا سردار اور خاتم النبیین قرار دے دے۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ خدا ہر شخص کے انسانی مقام اور قدر و قیمت سے آگاہ ہے اور انہی عام لوگوں میں سے اپنے انبیاء کو منتخب کرتا ہے اور اس نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ کسی کو خلیل کے اعزاز سے نوازا، کسی کو کلیم اللہ کا مقام عطا کیا کسی کو "روح اللہ" قرار دیا اور پیغمبر اسلام کو "حبیب اللہ" کی حیثیت سے چن لیا۔ خلاصہ یہ کہ اس نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور یہ فضیلت اس نے ان معیاروں کے مطابق عطا کی ہے جنہیں وہ خود جانتا ہے اور جو اس کی حکمت کے مطابق ہیں۔

رہا یہ سوال کہ سب انبیاء میں سے یہاں صرف حضرت داؤدؑ کو زبور عطا کرنے کی بات کیوں کی گئی ہے، ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ پہلو ہوں:

۱۔ کتب انبیاء میں حضرت داؤدؑ کی زبور کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ تمام تر مناجات، دعاؤں اور پند و نصیحت پر مشتمل ہے اور تمام تر "قول احسن" اور اچھی گفتگو کا نمونہ ہے کہ جس کا حکم پہلی آیات میں دیا گیا ہے یہ کتاب اس حکم سے سب سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

۲۔ زبور داؤد میں صالحین اور نیک بندوں کی حکومت کی خبر دی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ اگرچہ وہ لوگ ظاہراً تہی دست، فقیر اور یتیم ہوں گے[1]

---

[1] کتاب مزامیر داؤد (زبور) جس صورت میں آج ہماری دسترس میں ہے اس کے مزمور ۳۷ میں ہے:

.... کیونکہ شریر منقطع ہو جائیں گے لیکن اللہ پر توکل کرنے والے زمین کے وارث ہوں گے۔ ہاں ایک عرصے بعد شریر باقی نہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

اور یہ بات رسول اللہؐ اور سچے مومنین کی دعوت سے بالکل ہم آہنگ ہے کہ جو بہت تہی دست تھے اور یہ مشرکین کے اعتراض کا جواب ہے ۔

۳۔ حضرت داؤد علیہ السلام اگرچہ وسیع حکومت کے مالک تھے لیکن خدا تعالیٰ اس بات کو ان کے لیے اعزاز و افتخار قرار نہیں دیتا بلکہ کتابِ زبور کو ان کے لیے اعزاز شمار کرتا ہے تاکہ مشرکین جان لیں کہ ایک انسان کی عظمت کا معیار مال و دولت اور ظاہری اقتدار و حکومت نہیں ہے لہٰذا یتیم اور غریب ہونا تحقیر و تذلیل کی دلیل نہیں ہے ۔

۴۔ یہودی کہتے تھے کہ موسیٰ کے بعد کسی کتاب کا نازل ہونا ممکن نہیں ہے ۔ اس پر قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ جبکہ ہم نے داؤدؑ کو زبور عطا کی تو تم نزولِ قرآن کے بارے میں کیوں تعجب کرتے ہو (البتہ حضرت داؤد علیہ السلام کی کتاب احکام کی کتاب نہ تھی بلکہ اخلاق کی کتاب تھی لیکن جو کچھ بھی تھی تورات کے بعد اور خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھی) ۔

بہر حال کوئی مانع نہیں کہ زیرِ بحث آیت میں تمام انبیاء اور تمام کتب میں سے حضرت داؤدؑ اور زبور کا انتخاب ان مذکورہ چاروں پہلوؤں کی بناء پر ہو ۔

بعد والی آیت میں پھر مشرکین کے بارے میں گفتگو ہے ۔ گزشتہ مباحث کو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اکرمؐ سے فرمایا گیا ہے : ان سے کہو کہ خدا کے علاوہ جن معبودوں کو لائقِ پرستش سمجھتے ہیں انہیں صدا دیں ۔ نہ ان کے بس میں یہ ہے کہ وہ تمہاری مشکلات اور مصائب دور کر سکیں اور نہ ہی ان میں کوئی تغیر و تبدل پیدا کر سکتے ہیں (قل ادعوا الذین زعمتم من دونہ فلا یملکون کشف الضر عنکم ولا تحویلاً) ۔

درحقیقت یہ آیت قرآن کی دیگر بہت سی آیات کی طرح مشرکین کے عقیدے اور منطق کو اس حوالے سے باطل قرار دیتی ہے کہ معبودوں کی پرستش یا تو حصولِ مفاد کے لیے ہے یا دفعِ نقصان کے لیے جبکہ ان کے تو بس میں نہیں کہ کسی کی مشکل کو ٹال سکیں یہاں تک کہ وہ تو کسی مشکل میں کوئی تبدیلی بھی پیدا نہیں کر سکتے یعنی اس کی شدت میں کمی بھی نہیں کر سکتے کہ جس سے ان کی کوئی قدرت ظاہر ہو سکے ۔ لہٰذا " فلا یملکون کشف الضر" کے بعد " ولا تحویلاً " اس طرف اشارہ ہے کہ وہ نہ تو مشکلات کی پوری تاثیر برطرف کر سکتے ہیں نہ ان میں تغیر کر کے کچھ تھوڑی تاثیر کم کر سکتے ہیں ۔

بقیہ حاشیہ :- رہے گا تو اس کے بارے میں سوچ بچار کرے گا اور وہ نہیں ہو گا لیکن اہلِ حکمت (صالحین) زمین کے وارث ہوں گے ۔

اسی مزمور کے بائیسویں اور انتیسویں جملے میں اس سے بالکل مشابہ تعبیرات موجود ہیں ۔ یہی بات قرآن مجید کی سورہ انبیاء کی آیہ ۱۰۵ میں ہے :

ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون

ہم نے زبور میں یہ بات رقم کی ہے کہ کچھ عرصے بعد ہمارے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے ۔

Marfat.com

"زعمتم"، "زعم" کے مادہ سے ہے اور عام طور پر غلط خیال و تصوّر کو کہا جاتا ہے۔ اسی لیے ابن عباس سے منقول ہے کہ جہاں کہیں قرآن میں لفظ "زعم" استعمال ہوا ہے جھوٹ اور کذب (اور بے بنیاد عقیدے) کے معنی میں ہے۔

مفردات میں راغب کہتا ہے:

الزعم حکایة قول یکون مظنة للکذب....

زعم نقلِ قول (یا عقیدہ) ہے کہ جس میں جھوٹ کا احتمال ہو یہ قرآن میں جن جن مواقع پر استعمال ہوا ہے وہاں مذمت و سرزنش کا پہلو لیے ہوئے ہے۔

لفظ "کشف" اصل میں کسی چیز سے پردہ، لباس یا ایسی کسی چیز کو ہٹانے کے معنی میں ہے اور یہ جو "کشف الضر" غم و اندوہ، بیماری یا پریشانی برطرف ہونے کے موقع پر بولا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ غم و اندوہ، بیماری یا پریشانی انسانی بدن اور روح پر گویا پردے کی طرح آگرتی ہے اور آسائش، آرام اور سکون کہ جو حقیقی چہرہ ہے، اسے چھپا دیتی ہے لہٰذا غم، دکھ اور پریشانی کے دور ہونے کو "کشف الضر" کہا جاتا ہے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ اس آیت میں "الذین" کی تعبیر یہ بات بیان کرتی ہے کہ مراد اللہ کے علاوہ سب معبود نہیں ہیں بلکہ فرشتے، حضرت عیسیٰؑ اور ان جیسے معبود مراد ہیں (کیونکہ "الذین" عام طور پر ذوی العقول کی جمع کے لیے بولا جاتا ہے)۔

بعد والی آیت درحقیقت پہلی آیت میں جو کچھ کہا گیا ہے اُس کے لیے دلیل ہے۔ یہ آیت کہتی ہے: جانتے ہو کہ تمہاری مشکلوں کو اذنِ پروردگار کے بغیر ٹالنے پر کیوں قادر نہیں ہیں، اس لیے کہ وہ تو خود اپنی مشکلات بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتے ہیں۔ وہ خود کوشش کرتے ہیں کہ اُس کی پاک ذات کا تقرب حاصل کریں اور وہ جو کچھ بھی چاہتے ہیں اُسی سے چاہتے ہیں" وہ ایسے افراد ہیں جو خدا کو پکارتے ہیں اور اُس کے تقرب کے لیے اس کی اطاعت کو وسیلہ بناتے ہیں" (اولٰئك الذین یدعون یبتغون الی ربھم الوسیلة)۔ "ایسا وسیلہ جو قریب ترین ہو" (ایھم اقرب)۔ "اور اس کی رحمت کے امیدوار ہیں" (ویرجون رحمته)۔" اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں" (ویخافون عذابه)۔ "کیونکہ تیرے پروردگار کا عذاب اس قدر شدید ہے کہ سب اس سے بچتے ہیں اور وحشت زدہ ہیں" (ان عذاب ربك كان محذورًا)۔

اسلام کے عظیم مفسرین نے "ایھم اقرب" کی مختلف تفسیریں کی ہیں:

بعض کہتے ہیں: یہ اولیاء خدا فرشتے ہوں یا انبیاء، ان میں سے جسے بھی معبود سمجھا گیا جتنا وہ اللہ کے زیادہ نزدیک ہے اتنا ہی مزید بارگاہِ الٰہی میں تقرب کے درپے ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے پاس اپنی طرف سے کچھ نہیں ہے جو کچھ بھی ہے خدا کی طرف سے ہے اور ان کا مقام و منزلت جتنا بلند ہوتا جاتا ہے ان

Marfat.com

کی طرف سے اطاعت و بندگی اتنی ہی زیادہ ہوتی جاتی ہے [1]

بعض کا نظریہ ہے کہ جملے کا مفہوم یوں ہے : وہ کوشش کرتے ہیں کہ تقرب پروردگار میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں۔ گویا اطاعتِ پروردگار اور تقربِ الٰہی کے راستے میں وہ ایک روحانی مقابلے میں شریک ہیں اور ہر ایک کی کوشش ہے کہ اس میدان میں دوسرے پر بازی لے جائے۔ وہ لوگ جو ایسے ہوں کیا وہ معبود ہو سکتے ہیں اور کیا وہ خدا سے ہٹ کر کوئی ذاتی حیثیت رکھتے ہیں؟ [2]

رہی یہ تفسیر کہ وہ ہر اُس وسیلہ سے تقرب الٰہی چاہتے ہیں جو خدا کے زیادہ قریب ہو، بہت بعید احتمال ہے کیونکہ "ایھم" میں "ھم" کی ضمیر کہ جو عام طور پر جمع مذکر کے لیے ہوتی ہے اس معنی سے مناسبت نہیں رکھتی بلکہ اس طرح تو "ایھا" ہونا چاہیے تھا [3]

"وسیلہ" کیا ہے؟

لفظ "وسیلہ" قرآن مجید میں دو مواقع پر استعمال ہوا ہے۔ ایک آیاتِ بالا میں اور دوسرا سورہ مائدہ کی آیہ ۳۵ میں۔

جیسا کہ ہم سورہ مائدہ کی آیہ ۳۵ کے ذیل میں کہہ چکے ہیں "وسیلہ" قرب حاصل کرنے کے معنی میں یا اُس چیز کے معنی میں جو قرب کا باعث بنے استعمال ہوتا ہے یا پھر اس کا مطلب ہے وہ نتیجہ جو قرب سے حاصل ہو۔

اس طرح سے "وسیلہ" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں ہر اچھا کام اور ہر اچھی صفت شامل ہے کیونکہ یہ سب چیزیں قربِ پروردگار کا موجب ہیں۔

نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۱۰ میں اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام کے انتہائی پُرمغز جملے ہیں :

> بہترین وسیلہ کہ جس سے بندے قربِ خدا چاہتے ہیں خدا پر ایمان، قیام نماز، ادائیگیٔ زکوٰۃ، ماہِ رمضان کے روزے، حج و عمرہ، صلۂ رحمی، راہ خدا میں پنہاں و آشکار انفاق اور تمام نیک اعمال ہیں کہ جو انسان کو زوال اور پستی سے

---

[1] اس تفسیر کے مطابق "ایھم" "یبتغون" کی ضمیر کا بدل ہے یا کسی محذوف کا مبتدا ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا :

"ایھم اقرب ھو اکثر دعاءً وابتغاءً للوسیلۃ"

[2] اس صورت میں "ایھم" صرف "یبتغون" کی ضمیر کا بدل ہی ہو سکتا ہے۔

[3] اس سے قطع نظر "ایھم اقرب" مبتدا اور خبر کی صورت میں ہے حالانکہ اس معنی کے مطابق مفعول کی صورت میں یا مفعول سے بدل کی شکل میں ہونا چاہیے۔ (غور کیجئے گا)۔

Marfat.com

نجات دیں [1]

اسی طرح نبیوں، خدا کے نیک بندوں اور اس کی بارگاہ کے مقرب لوگوں کی شفاعت بھی اس کے تقرب کا ایک وسیلہ ہے اور اس شفاعت کو آیاتِ قرآن میں صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔

غلط فہمی نہ ہو۔ بارگاہِ پروردگار کے مقرب لوگوں سے توسل سے یہ مراد نہیں کہ انسان نبی یا امام سے مستقلاً تقاضا کرے یا اس مفہوم میں ان سے کسی مشکل کا حل چاہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کے راستے پر چلے، اُن کے پروگراموں سے ہم آہنگ ہو جائے اور ان کے مقام و منزلت کا واسطہ دے کر خدا کو پکارے تاکہ خدا شفاعت و سفارش کی اجازت دے [2]

* * *

---

[1] تلخیص خطبہ ۱۱۰ نہج البلاغہ۔ اس کی تشریح ہم تفسیرِ نمونہ جلد ۴ ص ۲۷۹ (اُردو ترجمہ) پر کر چکے ہیں۔

[2] مزید وضاحت کے لیے تفسیرِ نمونہ جلد ۴ ص ۲۰۰ (اُردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

(۵۸) وَاِنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا نَحۡنُ مُهۡلِكُوۡهَا قَبۡلَ يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ
اَوۡ مُعَذِّبُوۡهَا عَذَابًا شَدِيۡدًا‌ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِى الۡكِتٰبِ
مَسۡطُوۡرًا ○
(۵۹) وَمَا مَنَعَنَاۤ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ كَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ‌ؕ
وَاٰتَيۡنَا ثَمُوۡدَ النَّاقَةَ مُبۡصِرَةً فَظَلَمُوۡا بِهَا‌ؕ وَمَا نُرۡسِلُ
بِالۡاٰيٰتِ اِلَّا تَخۡوِيۡفًا ○
(۶۰) وَاِذۡ قُلۡنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ‌ؕ وَمَا جَعَلۡنَا
الرُّءۡيَا الَّتِىۡۤ اَرَيۡنٰكَ اِلَّا فِتۡنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الۡمَلۡعُوۡنَةَ فِى
الۡقُرۡاٰنِ‌ؕ وَنُخَوِّفُهُمۡ ۙ فَمَا يَزِيۡدُهُمۡ اِلَّا طُغۡيَانًا كَبِيۡرًا ○ؑ

ترجمہ

(۵۸) قیامت سے پہلے ہم ہر شہر اور آبادی کو ہلاک کریں گے یا (اگر گنہگار ہیں تو) انہیں سخت عذاب میں گرفتار کریں گے، یہ کتابِ الٰہی (لوح محفوظ) میں ثبت ہے۔

(۵۹) ہمارے لیے کوئی امر مانع نہیں کہ ہم (بہانہ ساز لوگوں کے تقاضوں پر) یہ معجزات بھیجتے سوائے اس کے کہ گزرے ہوئے لوگوں نے (کہ جو اسی قسم کے تقاضے کرتے تھے اور انہی جیسے تھے انہوں نے) ان کی تکذیب کی۔ (انہی میں سے) ثمود کو ہم نے ناقہ دیا (اور وہ ایسا معجزہ تھا کہ) جو واضح اور روشن تھا لیکن انہوں نے اس پر ظلم کیا اور ناقہ کو ہلاک کر دیا) ہم معجزات صرف ڈرانے (اور اتمام حجت) کیلئے بھیجتے ہیں۔

Marfat.com

(۶۰) وہ وقت یاد کر جب ہم نے تجھ سے کہا کہ تیرا پروردگار لوگوں پر پوری طرح محیط ہے (اور ان کی کیفیت سے پوری طرح آگاہ ہے)۔ ہم نے جو خواب تجھے دکھایا تھا وہ صرف لوگوں کی آزمائش کے لیے تھا۔ اسی طرح جس شجرِ ملعونہ کا ہم نے قرآن میں ذکر کیا ہے، ہم انہیں ڈراتے (اور تنبیہ کرتے) ہیں لیکن ان کے طغیان و سرکشی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں ہوتا۔

تفسیر

بہانہ سازوں کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرو

پہلے مشرکین سے توحید و معاد کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث پہلی آیت میں بیدار کرنے کے انداز میں انہیں پند و نصیحت کی گئی ہے۔ اس میں ان کی نگاہِ عقل کے سامنے اس دنیا کے فانی ہونے کو مجسم کیا گیا ہے تاکہ وہ جان لیں کہ یہ دنیا سرائے فانی ہے اور سرائے بقا کوئی دوسری جگہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال کے نتائج کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کر لیں۔ ارشاد ہوتا ہے: روئے زمین پر کوئی ایسی آبادی نہیں جسے روزِ قیامت سے قبل ہم ہلاک نہ کر دیں یا اسے عذابِ شدید میں گرفتار نہ کریں (وان من قریة الا نحن مهلكوها قبل يوم القيامة او معذبوها عذابًا شديدًا)۔ ستمگروں، بدکاروں اور سرکش باغیوں کو عذابِ شدید کے ذریعے ہلاک کر دیں گے اور دوسرے طبعی موت یا عام حوادث کا سامنا کریں گے۔

آخرکار یہ دنیا ختم ہو جائے گی اور سب راہِ فنا اختیار کریں گے اور یہ ایک تسلیم شدہ اور قطعی اصول ہے کہ جو کتابِ الٰہی میں ثبت ہے (کان ذٰلك فی الکتاب مسطورا)۔ یہ کتاب وہی لوحِ محفوظ، پروردگار کا علم بے پایاں اور عالمِ ہستی میں اس کے ناقابلِ تغیر قوانین کا مجموعہ ہے۔ اس قطعی اور ناقابلِ تغیر کتابِ الٰہی کی طرف توجہ کرتے ہوئے گمراہوں، ستمگروں اور آلودہ مشرکین کو ابھی سے اپنے اعمال کے انجام کا اندازہ کر لینا چاہیئے۔ انہیں جان لینا چاہیئے کہ اگر وہ اس جہان کے اختتام تک بھی زندہ رہے تو بھی آخرکار ان کے لیے فنا ہے اور اس کے بعد انہیں حساب اور جزا و سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یہاں مشرکین کا ایک اعتراض باقی رہ جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اچھا، ہمیں کوئی اعتراض نہیں، ہم ایمان لے آئیں گے لیکن ایک شرط کے ساتھ اور وہ یہ کہ ہم جس معجزے کی فرمائش کریں پیغمبرِ اسلام وہ پیش کریں اور

Marfat.com

درحقیقت ہمارے عذر بہانوں کے سامنے سر جھکا دیں۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: اس چیز میں ہمارے لیے کوئی امر مانع نہیں کہ ہم اس قسم کے معجزات بھیجیں، سوائے اس کے کہ گزشتہ لوگوں نے ان معجزات کی تکذیب کی تھی (وما منعنا ان نرسل بالاٰیات الا ان کذب بها الاولون)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ معجزات جو صداقتِ پیغمبر کی دلیل ہیں کافی مقدار میں بھیجے جا چکے ہیں اور اب تمہارے من پسند کے معجزات اور تقاضے ایسے نہیں کہ جن سے موافقت کی جائے کیونکہ تم شاہد کے بعد بھی ایمان نہیں لاؤ گے۔ اگر تم پوچھو کہ اس کی دلیل کیا ہے تو اس کی دلیل ان گزشتہ امتوں کا طرزِ عمل ہے جن کی حالت بالکل تم جیسی تھی وہ بھی بہانے تراشتے اور طرح طرح کے تقاضے کرتے تھے لیکن بعد میں وہ ایمان نہ لائے۔

اس کے بعد قرآن اس کی ایک واضح مثال پیش کرتا ہے: ہم نے قوم ثمود کو ایک ناقہ دیا کہ جو واضح کرنے والا تھا (وآتینا ثمود الناقة مبصرة)۔

یہ وہی اونٹنی تھی جو حکمِ خدا سے پہاڑ سے برآمد ہوئی تھی کیونکہ انہوں نے ایسا ہی معجزہ طلب کیا تھا۔ یہ ایک واضح اور واضح کرنے والا معجزہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ ایمان نہ لائے۔ "انہوں نے اس ناقہ پر ظلم کیا" اور اسے قتل کر دیا (فظلموا بها)۔

اصولی طور پر ہمارا یہ پروگرام نہیں کہ جو شخص بھی کسی معجزے کی فرمائش کرے ہمارا پیغمبر اسے قبول کرلے ہم تو لوگوں کو سوائے متنبہ کرنے اور ان پر اتمامِ حجت کرنے کے، آیات و معجزات نہیں بھیجتے" (وما نرسل بالاٰیات الا تخویفا)۔ ہمارے انبیاء معجزہ گر لوگ نہیں کہ بیٹھ جائیں اور جو شخص بھی کوئی فرمائشِ معجزہ کرے اسے پورا کرتے رہیں۔ ان کا فریضہ بس یہ ہے کہ لوگوں تک دعوتِ الٰہی پہنچائیں، تعلیم و تربیت کریں اور حکومتِ عدل قائم کریں البتہ خدا سے اپنے رابطے کے اثبات کے لیے اس قدر معجزے پیش کریں کہ جو کافی ہوں اور بس۔

اس کے بعد دشمنوں کی سختی اور ہٹ دھرمی کے مقابلے میں، خدا تعالیٰ اپنے رسولؐ کی دلجوئی کرتا ہے اور کہتا ہے: تیری باتیں سُن کر اگر یہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ایمان نہیں لاتے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے "وہ وقت یاد کر جب ہم نے تجھ سے کہا تھا کہ تیرا پروردگار لوگوں کی کیفیت سے بخوبی آگاہ ہے اور ان پر احاطۂ علمی رکھتا ہے" (واذ قلنا لك ان ربك احاط بالناس)۔

ہمیشہ یہ ہوا کہ انبیاء کی دعوت سُن کر کچھ پاک دل لوگ ایمان لے آئے جبکہ متعصب اور ہٹ دھرم لوگ بہانہ تراشی، مخالفت اور دشمنی کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ گزشتہ زمانے میں بھی ایسا ہی تھا اور اب بھی ویسا ہی ہے۔

Marfat.com

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے جو خواب تجھے دکھایا وہ صرف لوگوں کی آزمائش کے طور پر تھا (وماجعلنا الرءیا التی اریناك الا فتنة للناس)۔

اسی طرح جس شجرِ ملعونہ کی طرف ہم نے قرآن میں اشارہ کیا ہے وہ بھی لوگوں کی آزمائش کے لیے ہے (والشجرة الملعونة فی القرآن)۔

آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: ان دل کے اندھے اور ہٹ دھرم لوگوں کو ہم مختلف طریقوں سے ڈراتے ہیں لیکن اصلاحی اور تربیتی پروگرام ان کی سرکشی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتے (ونخوفهم فمایزیدهم الا طغیانا کبیرا)۔

کیونکہ انسان کا دل قبولِ حق کے لیے آمادہ نہ ہو تو نہ صرف یہ کہ حق بات اس پر اثر نہیں کرتی بلکہ عام طور پر اس کا الٹا نتیجہ نکلتا ہے اور ان کی سختی واصرار کی وجہ سے ان کی گمراہی اور ہٹ دھرمی بڑھ جاتی ہے (غور کیجئے گا)۔

چند اہم نکات

۱۔ رسول اللہؐ کا خواب اور شجرِ ملعونہ: اس "رؤیا" کے بارے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے:

د۔ کچھ مفسرین کا کہنا ہے کہ "رؤیا" یہاں خواب کے معنی میں نہیں ہے بلکہ آنکھ کا واقعی مشاہدہ ہے ان مفسرین نے اسے واقعۂ معراج کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جس کا ذکر اسی سورہ کی ابتداء میں آیا ہے۔

اس تفسیر کے مطابق قرآن کہتا ہے: معراج کا واقعہ لوگوں کے لیے آزمائش تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب دن چڑھا تو رسول اللہؐ نے لوگوں کو واقعۂ معراج سنایا۔ اس پر بہت شور اٹھا۔ دشمن اس کا مذاق اڑانے لگے۔ کمزور ایمان والے اس پر شک کرنے لگے اور حقیقی مومنین نے اسے مکمل طور پر قبول کر لیا۔ کیونکہ قدرتِ الٰہی کے سامنے یہ سب مسائل معمولی ہیں۔

اس تفسیر پر ایک ہی اہم اعتراض ہے اور وہ یہ کہ لفظ "رؤیا" عام طور پر خواب کے معنی میں ہے نہ کہ جاگتے ہوئے دیکھنے کے معنی میں۔

ب۔ ابنِ عباس سے منقول ہے کہ "رؤیا" اس خواب کی طرف اشارہ ہے جو آپؐ نے (ہجرت کے چھٹے برس) حدیبیہ کے سال میں مدینہ میں دیکھا تھا اور لوگوں کو بشارت دی تھی کہ تم جلد ہی قریش پر فتح پاؤ گے اور بڑے امن و آرام سے مسجد الحرام میں داخل ہو جاؤ گے لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس سال اس خواب نے عملی صورت اختیار نہ کی بلکہ دو سال بعد فتح مکہ کے موقع پر صورت پذیر ہوا لیکن اتنی تاخیر کی وجہ سے مومنین آزمائش میں سے گزرے اور کمزور ایمان والے شک میں پڑ گئے حالانکہ رسول اللہؐ نے ان سے بالصراحت

Marfat.com

فرمایا کہ میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم اس سال مکہ جاؤ گے بلکہ میں نے کہا تھا کہ جلد ایسا ہوگا (اور اسی طرح ہوا)۔

اس تفسیر پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ سورۂ بنی اسرائیل مکی سورتوں میں سے ہے اور حدیبیہ کا واقعہ ہجرت کے چھٹے سال میں ہوا۔

ج۔ بعض سُنّی اور شیعہ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ یہ ایک مشہور خواب کی طرف اشارہ ہے جس میں رسول اللہؐ نے دیکھا کہ بندر آپؐ کے منبر پر اُچھل کود رہے ہیں۔ اس پر آپؐ بہت غمگین ہوئے اور اس واقعہ کے بعد آپؐ بہت کم ہنستے تھے۔

(ان بندروں سے بنی امیہ مراد لی گئی ہے۔ وہ یکے بعد دیگرے رسول اللہؐ کی جگہ اور منبر پر بیٹھے۔ انہوں نے اس میں ایک دوسرے کی تقلید کی۔ وہ بے حیثیت افراد تھے۔ وہ اسلامی حکومت اور خلافتِ رسول اللہؐ کو تباہی کی طرف لے گئے)۔

یہ تفسیر فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں، اہلِ سنت کے مشہور مفسّر قرطبی نے تفسیر الجامع میں، طبرسی نے مجمع البیان میں اور متعدد دیگر مفسرین نے نقل کی ہے۔

مرحوم فیض کاشانی تفسیر صافی میں کہتے ہیں کہ یہ روایت عامہ اور خاصہ میں مشہور روایات میں سے ہے۔

البتہ یہ تینوں تفسیریں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ تینوں آیت میں جمع ہوں لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے دوسری تفسیر سورہ کے مکی ہونے سے مناسبت نہیں رکھتی۔

"شجرۂ ملعونہ" کے بارے میں بھی اسی طرح متعدد تفاسیر ہیں:

۱۔ قرآن میں جس "شجرۂ ملعونہ" کا ذکر ہے وہ "شجرۂ زقوم" ہے۔ یہ وہ درخت ہے جو سورۂ صافات کی آیہ ۶۴ کے مطابق جہنم کی بنیاد میں اُگے گا۔ اس کا پھل ناگوار اور رنج آور ہوگا۔ قرآنی الفاظ میں:

اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ۝

یہ وہ درخت ہے جو جہنم کی بنیاد سے اٹھے گا۔

سورہ دخان کی آیات ۴۳ اور ۴۴ کے مطابق یہ درخت گنہگاروں کی خوراک ہے۔ یہ اس دنیا کے کھانوں کی طرح نہیں ہے بلکہ یہ پگھلی ہوئی دھات کی طرح دل میں جوش مارے گا۔ اس کی مکمل تفسیر انشاء اللہ سورہ دخان کی آیات کے ذیل میں آئے گی۔

اس میں شک نہیں کہ "شجرۂ زقوم" اس دنیا کے درختوں سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا۔ اسی بناء پر آگ کے اندر سے اُگے گا۔

واضح ہے کہ اس قسم کے مسائل کہ جو دوسرے جہان سے مربوط ہیں ہمارے لیے تو ایک خیالی تصویر کی طرح

Marfat.com

ہیں جسے دور سے دیکھا جائے تو بس سیاہی سی معلوم ہوتی ہے۔

مشرکینِ قریش قرآن کی اس تعبیر کا مذاق اڑاتے تھے۔ ابوجہل کہتا تھا:

محمدؐ تمہیں ایسی آگ کی دھمکی دیتا ہے جو پتھروں کو جلائے گی اور اس کا خیال ہے کہ دوزخ میں درخت اُگے گا۔

نیز یہ بھی منقول ہے کہ وہ تمسخر کے طور پر کھجوریں اور مکھن منگواتا، انہیں کھاتا اور اپنے ساتھیوں سے کہتا:

اسے کھاؤ۔ یہی زقوم ہے [1]

اسی بناء پر قرآن زیرِ بحث آیات میں شجرۂ ملعونہ کا لوگوں کی آزمائش کے ذریعے کے طور پر تعارف کرواتا ہے کیونکہ ہٹ دھرم مشرک اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور سچے مومنین سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

ممکن ہے سوال کیا جائے کہ یہ درخت قرآن میں "شجرہ ملعونہ" کے نام سے نہیں آیا۔ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے مراد کھانے والوں پر لعنت ہو۔ علاوہ ازیں لعنت رحمتِ خدا سے دوری کے علاوہ کچھ نہیں اور واضح ہے کہ ایسا درخت رحمتِ پروردگار سے بہت دور ہے۔

ب۔ "شجرۂ ملعونہ" سے مراد سرکش یہودی قوم ہے۔ وہ ایسے درخت کی طرح ہیں جس کی بہت شاخیں اور پتے ہیں لیکن بارگاہِ الٰہی سے دھتکارے ہوئے ہیں۔

ج۔ بہت سی شیعہ اور سُنّی تفاسیر میں منقول ہے کہ شجرہ ملعونہ بنی امیہ ہیں۔ فخرِ رازی نے مشہور اسلامی مفسر ابنِ عباس سے اس سلسلے میں اپنی تفسیر میں ایک روایت نقل کی ہے:

یہ تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خواب کے بارے میں مذکورہ بالا روایت سے بھی مناسبت رکھتی ہے۔ نیز اس حدیث سے بھی مناسبت رکھتی ہے جو حضرت عائشہ سے منقول ہے، انہوں نے مروان کی طرف منہ کر کے کہا:

لعن الله اباک وانت فی صلبه فانت بعض من لعنه الله

اللہ نے تیرے باپ پر لعنت کی جبکہ تُو اس کی صلب میں تھا لہٰذا تُو اس کا ایک حصّہ ہے جس پر خدا نے لعنت کی ہے [2]

یہاں پھر ایک سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن میں کہاں بنی امیہ کے شجرہ پر لعنت ہوئی ہے۔ جواب یہ ہے کہ سورہ ابراہیم کی آیہ ۲۶ میں، جہاں شجرۂ خبیثہ کا ذکر آیا ہے۔ اگر شجرۂ خبیثہ کے وسیع مفہوم کی طرف نظر رکھی جائے اور اس آیت کی تفسیر میں وارد روایات کہ جن میں بنی امیہ کو شجرۂ خبیثہ قرار دیا گیا ہے کی طرف توجہ کی جائے اور

---

[1] تفسیر روح المعانی، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر قرطبی ج ۶ صـ ۳۹۰۲ اور تفسیر فخر رازی ج ۲۰ صـ ۲۳۷

Marfat.com

یہ دیکھا جائے کہ لفظ "خبیثہ" معنی کے لحاظ سے لفظ "ملعونہ" کے ساتھ لازم و ملزوم ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں بنی امیہ کے شجرۂ خبیثہ پر لعنت ہوئی ہے [1]

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ تمام تر یا زیادہ تر تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں ممکن ہے ہر منافق خبیث اور درگاہِ الٰہی سے راندہ ہوا شجرہ ملعونہ کے مفہوم میں شامل ہو اور خصوصاً بنی امیہ، سنگدل، ہٹ دھرم یہودی اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے تمام لوگ اس سے مراد ہوں اور ہو سکتا ہے شجرۂ زقوم دوسرے جہان میں انہی شجراتِ خبیثہ کی تجسیم ہو اور یہ سب شجرات خبیثہ اس جہان میں سچے مومنین کی آزمائش اور امتحان کا باعث ہوں۔

وہ یہودی کہ جو آج کل حساس اسلامی مراکز پر غاصبانہ طور پر مسلط ہیں اور ہر لمحہ دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں آگ لگا رہے ہیں اور جو کچھ جرائم اور بے انصافیاں کر رہے ہیں، اسی طرح وہ منافقین جن کے ان سے سیاسی یا غیر سیاسی روابط ہیں اور تمام آمر حکمران کہ جنہوں نے اسلام کا راستہ چھوڑ کر اسلامی ممالک میں بنی امیہ کا راستہ اپنا رکھا ہے اور معاشرے کے منظر سے نیک لوگوں کو دُور کر رکھا ہے، جنہوں نے پست اور کمینے افراد کو عوام کے سروں پر مسلط کر رکھا ہے، وہ کہ جو دوستانِ حق پر مظالم ڈھا رہے ہیں اور سچے مجاہدین کو شہید کر رہے ہیں، وہ کہ جنہوں نے ایسے افراد کے ہاتھ میں معاشرے کی باگ ڈور دے رکھی ہے جو دورِ جاہلیت کی یادگار ہیں — یہ سب "شجرۂ ملعونہ" کے شاخ و برگ ہیں اور لوگوں کے لیے آزمائش اور امتحان کا باعث ہیں۔

۲۔ **منکرین اعجاز کی عذر تراشیاں:** ہمارے زمانے کے بعض بے خبر افراد یہ راگ الاپتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قرآن کے علاوہ کوئی معجزہ نہ تھا۔ اپنی اس بات کے لیے وہ کئی طرح کے بہانے تراشتے ہیں۔ وہ "وما منعنا ان نرسل بالاٰیات ..." کو بھی اس بات کی دلیل بناتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے گزشتہ انبیاء کے برخلاف کوئی معجزہ پیش نہیں کیا لیکن تعجب کی بات ہے کہ وہ آیت کے ابتدائی حصے کا تو ذکر کرتے ہیں لیکن آخری حصے کو چھوڑ دیتے ہیں جس میں ہے کہ:

وما نرسل بالاٰیات الا تخویفاً

ہم آیات صرف مخالفین کو ڈرانے کے لیے بھیجتے ہیں۔

یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ معجزات دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم ان معجزات کی ہے جو دعوتِ رسولؐ کی صداقت ثابت کرنے کے لیے، اہل ایمان کی تشویق کے لیے اور منکرین کو ڈرانے کے لیے ضروری ہیں۔ جبکہ دوسری قسم ان من پسند کے معجزات کی ہے جن کا تقاضا لوگ بہانہ جوئی کے طور پر کرتے تھے۔ تاریخ انبیاء میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ انبیاء نے ایسے معجزات منکرین کے سامنے پیش کیے لیکن وہ ہرگز ایمان نہ لائے۔

---

[1] نور الثقلین ج ۲ ص ۵۳۸۔

Marfat.com

اسی لیے وہ لوگ خدائی عذاب میں گرفتار ہوئے کیونکہ ان کے مجوزہ معجزات کے ظہور پذیر ہونے کے باوجود وہ ایمان نہ لائے لہٰذا فوری عذاب کے مستحق قرار پائے۔ اس بناء پر مندرجہ بالا آیت میں قرآن جس چیز کی پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں نفی کر رہا ہے وہ صرف دوسری قسم کے معجزات ہیں نہ کہ پہلی قسم کے معجزات کی کیونکہ ان کا وجود دعوئ نبوت کے ثبوت کے لیے ناگزیر ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ قرآن خود تنہا ایک واضح اور جاوداں معجزہ ہے اور اگر اس کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی اور معجزہ نہ بھی ہوتا تب بھی آپؐ کی دعوت کی صداقت ہمارے لیے ثابت ہو سکتی تھی لیکن اس میں شک نہیں کہ قرآن آپؐ کا روحانی اور معنوی معجزہ ہے اور اہلِ فکر و نظر کے لیے یہ بہترین شاہد ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس معجزے کو اگر دوسرے محسوس مادی معجزات کے ساتھ ملا دیا جائے تو عامۃ الناس کے لیے انتہائی اہم ہو جائے بالخصوص جبکہ قرآن نے دیگر انبیاء کے ایسے معجزات کا بارہا ذکر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان معجزات کا ذکر اس بات کا سبب ہے کہ لوگ آپؐ سے تقاضا کریں کہ آپ کیسے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ سب انبیاء الٰہی سے افضل اور آخری پیغمبر ہیں جبکہ ان کے معجزات میں سے چھوٹا سا معجزہ بھی پیش نہیں کر سکتے۔

یقیناً اس سوال کا مطمئن کرنے والا جواب اس کے علاوہ نہ تھا کہ پیغمبر اکرمؐ انبیائے سلف کے معجزات کا نمونہ پیش کریں اور متواتر اسلامی تاریخ بھی کہتی ہے کہ رسول اللہؐ نے ایسے معجزات دکھائے۔

قرآن کی متعدد آیات میں ان معجزات کے نمونے موجود ہیں۔ مثلاً آئندہ کے واقعات کے بارے میں مختلف پیش گوئیاں، دشمن کے خلاف فرشتوں کا لشکرِ اسلام کی مدد کرنا اسی طرح دیگر معجزات خصوصاً وہ معجزات جو اسلامی جنگوں میں وقوع پذیر ہوئے۔

۳۔ گزشتہ لوگوں کے انکار کا آئندہ لوگوں سے تعلق؟: مندرجہ بالا آیات میں قرآن کہتا ہے کہ گزشتہ لوگوں نے چونکہ معجزات کا مطالبہ کیا تھا اور ان کے ظہور پذیر ہونے کے باوجود انہوں نے تکذیب کی لہٰذا اس سلسلے میں اب تمہارے مطالبے تسلیم نہیں کیے جا سکتے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا گزشتہ لوگوں کی تکذیب بعد کی نسلوں کی محرومیت کا سبب بن سکتی ہے؟۔

جو کچھ سطور گزشتہ میں کہا گیا ہے اس سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ یہ ایک رائج طریقہ ہے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ہم تمہاری بہانہ سازیوں کو نہیں مانتے۔ اگر دوسرا پوچھے کہ کیوں؟ تو ہم کہتے ہیں کہ پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے کہ لوگوں نے ایسے تقاضے کیے تھے مگر بعد میں حق کو تسلیم نہیں کیا تمہاری کیفیت بھی انہی جیسی ہے۔ اس کے علاوہ تم ان کی روش کی تائید کرتے ہو اور عملی طور پر تم نے ثابت کیا ہے کہ تمہارا مقصد تحقیق و جستجو نہیں ہے بلکہ تم تو صرف بہانے تراشتے ہو اور پھر ہٹ دھرمی، ڈھٹائی اور انکار پر باقی رہتے ہو لہٰذا تمہارے تقاضوں کا کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا۔

Marfat.com

یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہؐ نے خبر دی کہ جہنم کی گہرائیوں میں ایک درخت اُگے گا کہ جو ان اوصاف کا حامل ہو گا اور اس سے اہل دوزخ کو غذا حاصل ہو گی، تو وہ فوراً تمسخر اڑانے لگے۔ کبھی کہتے کہ "زقوم" کھجور اور مکھن کے علاوہ کچھ نہیں، آؤ یہ میٹھی اور روغنی غذا "زقوم" کی یاد میں کھائیں اور کبھی کہتے کہ جس دوزخ کے پتھروں میں سے اُگے گی اس میں درخت کیسے اُگے گا حالانکہ واضح تھا کہ وہ درخت اس جہان کے درختوں کی مانند نہیں ہے۔

(۶۱) وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۝

(۶۲) قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۡ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

(۶۳) قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ۝

(۶۴) وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝

(۶۵) اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝

ترجمہ

(۶۱) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ان سب

Marfat.com

نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے کہ جس نے کہا کہ کیا ایسے کو سجدہ کروں جسے تُو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔

(۶۲) (پھر) اس نے کہا یہ شخص جسے تُو نے مجھ پر ترجیح دی ہے اگر تو نے مجھے قیامت تک زندہ رکھا تو تھوڑے سے افراد کے سوا اس شخص کی ساری اولاد کو گمراہ کروں گا اور ان کی بیخ کنی کروں گا۔

(۶۳) فرمایا: نکل جا، ان میں سے جو شخص بھی تیری اتباع کرے گا اس کی سزا جہنم ہے اور یہ بہت سخت سزا ہے۔

(۶۴) ان میں سے جس پر تیرا بس چلے اسے آواز دے کر ابھار اور اپنے سوار اور پیادہ لشکر کو ان پر لگا دے اور مال اور اولاد میں ان کے ساتھ شریک ہو اور ان سے (جھوٹے) وعدے کر لیکن شیطان کا وعدہ سوائے جھوٹ اور فریب کے کچھ نہیں ہے۔

(۶۵) (لیکن جان لے) تُو ہرگز میرے بندوں پر تسلّط حاصل نہیں کر سکے گا (اور وہ کبھی تیرے دام میں گرفتار نہیں ہوں گے) یہی کافی ہے کہ تیرا پروردگار ان کا محافظ و وکیل ہے۔

تفسیر

شیطان کے جال

یہ آیات ابلیس کی رُوگردانی کے بارے میں ہیں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اس نے انکار کر دیا۔ علاوہ ازیں اس میں اس کے بُرے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے نیز اس واقعے کے بعد کے کچھ امور کا بھی ذکر ہے۔

قبل ازیں ہٹ دھرم مشرکین سے متعلق مباحث تھیں۔ ان کے بعد شیطان کے بارے میں یہ آیات

Marfat.com

اس طرف اشارہ ہیں کہ شیطان استکبار اور کفر و عصیان کا مکمل نمونہ تھا۔ دیکھو کہ اس کا کیا انجام ہوا لہٰذا تم کہ جو اس کے پیرو کار ہو تمہارا بھی وہی انجام ہوگا۔

علاوہ ازیں یہ آیات اِس طرف بھی اشارہ کرتی ہیں کہ یہ دل کے اندھے مشرکین کہ جو خلافِ حق راستے پر ڈٹے ہوئے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ شیطان کئی طریقوں سے انہیں گمراہ کرنے کے درپے ہے اور درحقیقت وہ اپنے اس پروگرام پر عمل پیرا ہے کہ جس کا اعلان اس نے اِن الفاظ میں کیا تھا:

مَیں اکثر اولادِ آدم کو گمراہ کروں گا۔

پہلے ارشاد فرمایا گیا ہے: وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب سجدہ ریز ہوگئے (واذ قلنا للملائکۃ اسجدوا لاٰدم فسجدوا الّا ابلیس)۔

جیسا کہ خلقتِ آدمؑ سے مربوط آیات کی تفسیر میں ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہ سجدہ ایک طرح کا خضوع اور اظہارِ احترام تھا اور اس سے خلقتِ آدمؑ کی عظمت اور دیگر مخلوقات کی نسبت ان کے امتیازی مقام کے اظہار کے طور پر تھا اور یا یہ عبادت کے طور پر خدا کو سجدہ تھا کہ اُس نے ایسی عجیب و غریب مخلوق پیدا کی ہے۔

ہم یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ اگرچہ یہاں ابلیس کا ذکر فرشتوں کے ساتھ آیا ہے لیکن قرآن کی شہادت کے مطابق ان میں سے نہیں تھا بلکہ بندگیٔ خدا کے باعث ان کی صف میں جا پہنچا تھا۔ وہ جنات میں سے تھا اور اس کی خلقت مادی تھی۔ ابلیس کے سر پر غرور و تکبر سوار تھا۔ خود غرضی و خود بینی نے اس کی عقل و ہوش پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ اسے گمان تھا کہ مٹی آگ سے بہت کم حیثیت کی حامل ہے جبکہ مٹی تمام برکات کا منبع اور سرچشمۂ حیات ہے۔ اس نے اعتراض کے لہجے میں بارگاہِ خداوندی میں کہا: کیا مَیں ایسے شخص کو سجدہ کروں جسے تو نے گیلی مٹی سے پیدا کیا ہے (قال ءاسجد لمن خلقت طیناً)۔

جس وقت اس نے دیکھا کہ فرمانِ خدا کے سامنے غرور و تکبر اور سرکشی کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لیے اس کی بارگاہِ مقدس سے دھتکار دیا گیا ہے تو اس نے عرض کیا، اگر تُو مجھے روزِ قیامت تک مہلت دے تو جسے تُو نے مجھ پر ترجیح دی ہے اور اعزاز بخشا ہے مَیں تھوڑے سے افراد کے سوا اس کی ساری اولاد کو گمراہ کر دوں گا اور اس کی بیخ کنی کر دوں گا (قال ارءیتک ھذا الذی کرمت علیّ لئن اخرتن الی یوم القیامۃ لاحتنکن ذریتہ الّا قلیلاً)[1]

---

[1] بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "ارءیتک" کا کاف حرفِ زائد یا حرفِ خطاب ہے کہ جو تاکید کے طور پر آیا ہے اور "ارءیتک" کا معنی "اخبرنی" (مجھے خبر دے) ہے جس کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر میں اس طرح تھا: (باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

" احتنکن " " احتناك " کے مادہ سے کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے معنی میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ٹڈی دل زراعت کو بالکل کھا جائے تو عرب کہتے ہیں :

احتنك الجراد الزرع

لہٰذا مذکورہ گفتگو کا مفہوم یہ ہے کہ میں معدودِ چند افراد کے سوا ساری اولادِ آدم کو تیرے جادۂ اطاعت سے ہٹا دوں گا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ " احتنکن " " حنك " کے مادہ سے زیرِ گلو اور زیرِ حلق کے معنی میں ہو جس وقت جانور کی گردن میں رسی یا لگام ڈالتے ہیں تو عرب اسے

حنك الدابہ

کہتے ہیں۔

اس بنا پر مذکورہ گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کہتا ہے کہ میں سب کی گردن میں وسوسے کی رسی ڈال دوں گا اور انہیں گناہ کے راستے کی طرف کھینچ لے جاؤں گا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے شیطان کو مہلت دے دی گئی تا کہ ساری اولادِ آدم کے لیے میدانِ امتحان معرضِ وجود میں آجائے اور حقیقی مومنین کی تربیت کا وسیلہ فراہم ہو جائے کیونکہ حوادث کی بھٹی میں انسان ہمیشہ پختہ تر ہوتا ہے اور طاقتور دشمن کے مقابلے میں دلیر ہو جاتا ہے۔ فرمایا: نکل جا، ان میں سے جو لوگ تمہاری پیروی کریں گے ان کی سزا جہنم ہوگی اور یہ بہت سزا ہے (قال اذهب فمن تبعك منهم فان جهنم جزاؤكم جزاءً موفورًا)۔

اس ذریعے سے آزمائش کا اعلان کیا گیا ہے اور آخر میں اس عظیم خدائی آزمائش میں کامیابی اور شکست کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اس کے بعد شیطان کے ان ہتھکنڈوں، حربوں اور وسائل کا ذکر کیا گیا جن سے وہ کام لیتا ہے۔ اس سلسلے میں بہت واضح اور جاذب توجہ انداز میں فرمایا گیا ہے : ان میں سے ہر ایک کو اپنی آواز کے ذریعے تحریک کر سکتا ہے اور وسوسے میں ڈال سکتا ہے (واستفزز من استطعت منهم بصوتك) اور اپنی پکار کے ذریعے اپنے سوار اور پیادہ لشکر کو ان کی طرف ہانک سکتا ہے واجلب عليهم بخيلك ورجلك)۔ وہ ان کے اموال اور اولاد میں شریک ہو جاتا ہے (و

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) در مجموعی طور پر اس کا یہ معنی ہو :-

جسے تو نے ترجیح دی ہے کیا اُس شخص کو تُو نے دیکھا ہے ؟ اگر مجھے زندہ رہنے دیا تو تُو دیکھے گا کہ میں اس کی اکثر اولاد کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔

دوسرا احتمال آیت کی ترکیب اور معنی کے لحاظ سے زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

Marfat.com

شارکھم فی الاموال والاولاد) اور اپنے جھوٹے وعدوں کے ذریعے انہیں فریب دیتا ہے (وعدھم) ۔

اس کے بعد قرآن خبردار کرتا ہے : شیطان فریب ، دھوکا اور غرور پر مبنی وعدوں کے علاوہ کچھ نہیں دیتا (وما یعدھم الشیطان الا غرورًا) ۔

پھر خدا اس سے کہتا ہے : لیکن جان لے کہ "میرے بندوں پر تیرا کچھ بس نہ چلے گا" (ان عبادی لیس لك علیھم سلطان) ۔ اتنا ہی کافی ہے کہ تیرا پروردگار ان بندوں کا ولی و حافظ ہے (و کفی بربك وکیلًا) ۔

چند اہم نکات

۱۔ **چند الفاظ کا مفہوم** : "استفزز" "استفزاز" کے مادہ سے تحریک کرنا اور ابھارنا کے معنی میں ہے ۔ اس میں سریع اور سادہ تحریک کا مفہوم پنہاں ہے لیکن در اصل یہ لفظ قطع و برید کرنے کے معنی میں ہے ۔ اسی لیے جب کوئی کپڑا یا لباس پھٹ جائے تو عرب کہتے ہیں :

تفزز الثوب

تحریک پانے اور برانگیختہ ہونے کے معنی حق سے قطع ہونے اور باطل کی طرف ملتفت ہو جانے کی وجہ سے ہے ۔

"اجلب" "اجلاب" کے مادہ در اصل "جلبہ" یعنی سخت قسم کی چیخ و پکار کے معنی میں ہے ۔ "اجلاب" کا معنی ہے شور وغل مچا کر ہانکنا اور چلانا ۔ بعض روایات میں "جلب" سے منع کیا گیا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ جمع کرنے پر مامور شخص حقِ شرعی لینے کے لیے چراگاہ میں جاتے تو چلائے نہیں کہ کہیں چراگاہ کے چوپائے وحشت زدہ ہو جائیں یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ گھڑسواری کے مقابلے میں شریک کوئی بھی دوسرے کے گھوڑے کے سامنے غل غپاڑہ نہ کرے تاکہ وہ خود دوڑ لگاتے [1]

"خیل" دو معانی میں آیا ہے ۔ گھوڑوں کے معنی میں اور گھڑسواروں کے معنی میں ۔ یہاں البتہ دوسرے معنی میں ہے اور سوار لشکر کی طرف اشارہ ہے ۔

اس کے برعکس "رجل" پیادہ لشکر کے معنی میں ہے ۔

البتہ شیطان کا سوار اور پیادہ لشکر کسی باقاعدہ فوج کے مفہوم میں نہیں ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ خود اس کی اپنی جنس میں سے اور انسانوں میں سے بہت سے افراد گمراہی اور بے راہ روی پھیلانے کے لیے اس کے

---

[1] مفردات راغب اور مجمع البیان کی طرف رجوع کریں ۔

Marfat.com

مددگار اور ساتھی ہیں۔ اس کے ان مددگاروں میں بعض زیادہ تیز اور زیادہ طاقتور ہیں کہ جو سوار لشکر کی طرح ہیں اور بعض نسبتاً سُست ہیں کہ جو پیادہ لشکر کی طرح ہیں۔

۲۔ وسوسے کے لیے شیطانی ذرائع: مندرجہ بالا آیات میں اگرچہ مخاطب شیطان ہے اور خدا تعالیٰ تہدید آمیز لہجے میں اُس سے کہتا ہے کہ تجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے کر لے مختلف ذرائع سے بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ لیکن یہ درحقیقت تمام انسانوں کے لیے تنبیہ اور بیداری کا الارم ہے۔ انہیں شیطانی ہتھکنڈوں سے آگاہ کیا گیا ہے اور انہیں بتایا گیا ہے کہ وہ کس طرح وسوسے پیدا کرتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں شیطانی ذرائع کے چار اہم اور بنیادی حصوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور انسانوں سے فرمایا گیا ہے کہ وہ ان سے خبردار رہیں:

ا۔ شیطان کا پہلا ہتھکنڈا پراپیگنڈا ہے: ابھی ہم نے پڑھا ہے:

واستفزز من استطعت منهم بصوتک

بعض مفسرین نے اس جملے سے صرف ہوس انگیز گانوں اور موسیقی کا مفہوم لیا ہے لیکن اس کا مفہوم وسیع تر ہے۔ اس میں سمعی اور صوتی ذرائع سے کیا جانے والا تمام تر گمراہ کن پراپیگنڈا شامل ہے۔ آج کی دنیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی دنیا ہے۔ آج کی دنیا وسیع سمعی و بصری کی دنیا ہے۔ آج کی دنیا میں آواز کے ذریعے گمراہ کرنے کا مفہوم زیادہ واضح ہے۔ کیونکہ مشرق و مغرب میں شیطان اور شیطانی گروہ اس مؤثر ذریعے کو استعمال کر رہے ہیں۔ یہ لوگ بہت زیادہ دولت اسی راستے پر خرچ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو راہِ حق سے گمراہ کر سکیں، وہی راہِ حق کہ جو حریت و استقلال اور ایمان و تقویٰ کی راہ ہے۔ وہ انسانوں کو بے ارادہ اور کمزور غلاموں میں بدل دینا چاہتے ہیں۔

ب۔ شیطان کا دوسرا ہتھکنڈا فوجی قوت کا استعمال ہے: شیطان کا یہ طرزِ عمل صرف ہمارے زمانے ہی میں نہیں۔ فوجی طاقت ہمیشہ سے ظالموں اور جابروں کا اہم اور خطرناک ہتھیار رہا ہے۔ جب بھی وہ ضرورت محسوس کرتے ہیں فوری طور پر اپنی مسلح طاقتوں کو پکارتے ہیں اور ان علاقوں کی طرف روانہ کر دیتے ہیں جہاں وہ محسوس کرتے ہیں کہ لوگوں میں آزادی اور استقلال کی تڑپ پیدا ہو رہی ہے اور خطرہ ہے کہ وہ پھر سے آزادی حاصل نہ کر لیں۔

خود آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ سریع الحرکت فوج[1] تیار کی گئی ہے جو بالکل "اجلاب" کا مفہوم رکھتی ہے۔

---

[1] امریکہ نے ایران کے خلاف یہ فوج تیار کی تھی اسے انگریزی میں Rapid Deployed Army کا نام دیا گیا تھا۔ (مصحح)۔

Marfat.com

اسی طرح مغرب کی بعض دیگر طاغوتی طاقتوں نے بھی خاص فوج تیار کی ہے تاکہ دنیا کے جس کسی حصے میں بھی ان کے غیر شرعی شیطانی مفادات کو خطرہ ہو اسے وہاں بھیج سکیں اور حق کی ہر آواز اور حرکت کو دبا سکیں۔ یہ قوتیں اپنی سریع الحرکت فوج پہنچنے سے پہلے اپنے ماہر جاسوسوں کے ذریعے زمین ہموار کرتی ہیں۔ یہ جاسوس درحقیقت ان کا پیادہ لشکر ہے۔ یہ طاقتیں اس بات سے غافل ہیں کہ خدا کا اپنے سچے بندوں سے وعدہ ہے کہ شیطان اور اس کی فوج ہرگز ان پر غلبہ حاصل نہیں کرسکے گی۔

ج۔ **اقتصادی ہتھکنڈا:** یہ ظاہراً انسانی طرز عمل معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت شیطانی اثر و نفوذ کے لیے مالی و اقتصادی امور میں شرکت کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔

بعض مفسرین نے اموال میں شرکت سے صرف سود اور اولاد میں شرکت سے صرف غیر شرعی اولاد مراد لیا ہے[۱]۔ حالانکہ ان کا مفہوم بہت وسیع ہے جس میں ہر طرح کا حرام مال اور ہر طرح کی غیر شرعی اولاد وغیرہ شامل ہے۔

ہم خود اپنے اس زمانے میں دیکھتے ہیں کہ عالمی شیطانی سامراجی انسان دشمن قوتیں کس کس طرح سرمایہ لگاتی ہیں۔ یہ طاقتیں اقتصادی کمیٹیاں قائم کرتی ہیں کمزور ملکوں میں مختلف قسم کے کارخانے لگاتی ہیں اور پیداواری مراکز قائم کرتی ہیں اور پھر ان کے ذریعے طرح طرح کے خطرناک کھیل کھیلتی ہیں۔ یہ طاقتیں فنی اور اقتصادی ماہرین کے نام پر ان ملکوں میں اپنے جاسوس بھیجتی ہیں اور ہمدرد بن کر ان ملکوں کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیتی ہیں۔ یہ طاقتیں ان ملکوں میں ان ذرائع سے اقتصادی ترقی، استقلال اور خود مختاری پر ضرب لگاتی ہیں اور انہیں آگے نہیں بڑھنے دیتیں۔

اسی طرح یہ شیطانی قوتیں اسکولوں، کالجوں، لائبریریوں، ہسپتالوں اور سیاحت کے راستے ان کی اولاد میں شرکت کرتی ہیں۔ ان ممالک میں بعض افراد کو اپنی طرف مائل کرلیتی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات بڑی سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے کچھ افراد کو اپنے ہاں اعلیٰ تعلیم کے نام پر بلاتی ہیں اور ان ملکوں کے جوانوں کو اپنی تمدن و ثقافت کے رنگ میں پوری طرح رنگ لیتی ہیں اور اس طرح ان کے افکار و نظریات میں شریک ہو جاتی ہیں۔

یہ شیطان برائی کے مراکز بھی قائم کرتے ہیں۔ انٹرنیشنل ہوٹلوں، جدید تفریحی کلبوں، سینماؤں اور گمراہ کن فلموں

---

[۱] ان آیات کے بارے میں وارد روایات میں بھی شیطان کے شریک اولاد ہونے کا مفہوم ۔ غیر شرعی اولاد یا وہ اولاد جن کا نطفہ مالِ حرام سے بنا اور یا نطفہ ٹھہرتے وقت جن کے ماں باپ یادِ خدا سے غافل تھے، بیان کیا گیا ہے۔
لیکن جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے اس قسم کی تفاسیر بعض واضح مصادیق کو بیان کرتی ہیں البتہ آیت کا مفہوم انہی میں منحصر نہیں ہے۔ تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۱۸۴ کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

کے ذریعے قوموں کا اخلاق تباہ کرتے ہیں۔ صرف ان ذرائع سے برائیوں ہی کو جنم نہیں دیتے بلکہ غیر شرعی اولاد میں بھی اضافے کا باعث بنتے ہیں بلکہ ان ذرائع سے یہ شیطان ایک بھٹکی ہوئی بے راہ رو، بے ارادہ، اوباش اور ہوس پرست نسل کو پروان چڑھاتے ہیں۔

ان کے طور طریقوں پر ہم جتنا گہرا غور کریں گے اتنا زیادہ ان کے خطرناک شیطانی وسوسوں کی گہرائی سے آشنا ہوں گے۔

د۔ نفسیاتی تباہی کے شیطانی پروگرام: مزور کرنے والے اور طرح طرح کے پُر فریب وعدے، شیطانوں کا ایک اور چلن ہیں۔ انہوں نے لوگوں کو فریب دینے کے لیے بڑے بڑے ماہرین نفسیات رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا کام لوگوں کو حقائق سے غافل کرنا ہے۔ کبھی یہ کہتے ہیں کہ عظیم تمدن کا دروازہ تم سے چند قدم دور ہے۔ کبھی سمجھاتے ہیں کہ تم جلد ہی ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہو جاؤ گے۔ کبھی کہتے ہیں کہ تمہاری قوم بڑی عظیم ہے جو اس پروگرام پر عمل کر کے اوج عظمت تک جا پہنچے گی۔ وہ پسماندہ قوموں اور لوگوں کو انہی تصورات میں لگائے رکھتے ہیں اور یہ سب کام " وعدھم " کا مصداق ہیں۔

کبھی وہ اس کے برعکس دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ تحقیر و تضعیف کرتے ہیں۔ چھوٹے اور کمزور ملکوں سے کہتے ہیں کہ تم بڑی عالمی طاقتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمہارے اور ترقی یافتہ ممالک میں سینکڑوں سالوں کا فرق ہے۔ اس طرح یہ شیطان انہیں ہمت و کوشش سے روکتے ہیں۔

یہ قصہ بہت طویل ہے۔ شیطان اور اس کے لشکروں کے نفوذ کا کوئی ایک طریقہ نہیں۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں " عباد اللہ " اور خدا کے سچے بندے ہمت نہیں ہارتے، ان کے وہ جذبے اسی طرح سلامت رہتے ہیں کہ جو وہ ان آیات سے حاصل کرتے ہیں۔ ان آیات میں وہ خدا کا قطعی وعدہ دیکھتے ہوئے ان شیطانوں کے خلاف جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ان سے ذرہ بھر خوف نہیں کھاتے۔ وہ جانتے ہیں کہ شیطانوں کا شور و غل جتنا زیادہ ہو اتنا ہی بے معنی اور کھوکھلا ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ قوت ایمان اور توکل علی اللہ سے ان سب پر کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے اور ان کے منصوبوں کو نقش بر آب کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وکفٰی بربك وکیلاً

خدا ان کا بہترین محافظ، نگہبان اور یار و مددگار ہے

۳۔ خدا نے شیطان کو کیوں پیدا کیا؟: اس بارے میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۳۶ کی تفسیر میں ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ اسی طرح مختلف طرح کے شیطانی وسوسوں اور لفظ شیطان کے سلسلہ میں ج ۶ صـ۱۱۲ اور ج ۱ صـ۱۶۶ پر بحث کی جا چکی ہے۔ (اردو ترجمہ)

Marfat.com

(۶۶) رَبُّكُمُ الَّذِىْ يُزْجِىْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِى الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ
فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝
(۶۷) وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِى الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ
اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ
الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ۝
(۶۸) اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ
عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ۙ۝
(۶۹) اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ
عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ
لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ۝

ترجمہ

(۶۶) تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے لیے دریا میں کشتی چلاتا ہے تاکہ تم اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ وہ تمہارے لیے مہربان ہے۔

(۶۷) اور جس وقت تمہیں دریا میں کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے تو اس کے سوا ہر ایک کو بھول جاتے ہو لیکن جس وقت وہ تمہیں بچا کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو منہ پھیر لیتے ہو اور انسان (نعمتوں کا) کفران کرنے والا ہے۔

(۶۸) کیا تم اس سے مامون ہو کہ وہ خشکی پر (ایک شدید زلزلے کے ذریعے) تمہیں زمین

Marfat.com

میں دھنسا دے یا تم پر سنگریزوں کا طوفان بھیج دے اور (تمہیں اس میں دفن کر دے
اور) پھر تمہیں کوئی محافظ (اور مددگار) نہ ملے۔

(۶۹) یا کیا تم اِس سے مامون ہو کہ وہ پھر تمہیں دریا کی طرف پلٹا دے، تمہاری طرف
شدید آندھی بھیج دے اور تمہیں تمہارے کفر کی وجہ سے غرق کر دے یہاں تک کہ
کسی ایسے شخص کو بھی پیدا نہ کرے کہ جو تمہارے خون کا مطالبہ کرے۔

تفسیر

نعمتوں کے باوجود کفران کیوں؟

اس سے قبل توحید کے بارے میں اور شرک کے خلاف بحث ہو چکی ہے۔ زیر نظر آیات بھی اس بحث کا تسلسل ہیں۔ ان آیات میں اس موضوع پر دو حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ ایک استدلال و برہان کے حوالے سے اور دوسرے وجدان وضمیر کے حوالے سے۔

پہلا توحید استدلالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تمہارا پروردگار وہ ہے کہ جو دریا میں کشتی کو حرکت عطا کرتا ہے، ایک مسلسل اور دائمی حرکت (ربکم الذی یزجی لکم الفلك فی البحر)۔

واضح ہے کہ دریا یا سمندر میں کشتیوں کے چلنے کے لیے بہت سے باہم پیوستہ نظام موجود ہیں۔ ایک طرف پانی کو مُرکّب کی طرح پیدا کیا گیا ہے۔ دوسری طرف بعض چیزوں کا مخصوص وزن پانی سے بہت ہلکا ہے، اس طرح سے کہ وہ پانی کے اوپر رہ سکیں یا پھر انہیں ایسی شکل میں بنایا جا سکتا ہے کہ عملی طور پر ان کا وزن پانی سے کم ہو جائے بلکہ یہاں تک کہ بھاری بوجھ اور بہت سے انسانوں کو اٹھا سکیں تیسری طرف کشتی کو حرکت دینے والی قوت کی ضرورت ہے۔ پرانے زمانے میں یہ ضرورت منظم ہَوائیں پورا کرتی تھیں۔ یہ ہَوائیں سمندروں پر ایک خاص نظم کے ساتھ چلتی ہیں۔ ملاح اُن سے آشنائی حاصل کر کے ان کے ذریعے بادبانی کشتیوں کو چلاتے ہیں اور بھاپ بھی ہَوا کی بہن ہی ہے۔ چوتھی طرف راستے سے آگاہی ضروری ہے۔ گزشتہ زمانے میں راہوں کو پہچاننے کے لیے سورج اور ستاروں سے مدد لیتے تھے اور آج کے دَور میں قطب نما اور نقشوں سے۔

بہرحال اگر یہ چاروں امور باہم مربوط نہ ہوتے اور کشتیوں کو چلانے کے لیے آپس میں ہم آہنگ نہ ہوتے تو انسان نقل وحمل کے اس انتہائی اہم وسیلے سے محروم ہوتا۔

Marfat.com

آپ جانتے ہیں کہ کشتیاں ہمیشہ سے انسان کے لیے نقل وحمل اور آمد و رفت کا ایک انتہائی اہم وسیلہ رہی ہیں۔ آج تو ایسے ایسے بحری جہاز ہیں جو اپنے آپ میں ایک چھوٹے سے شہر کے برابر ہوتے ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اور یہ سب کچھ اس لیے ہے تاکہ تم فضلِ خدا سے بہرہ مند ہو (لتبتغوا من فضله)۔ اپنی آمد و رفت کے لیے، مالِ تجارت کی نقل وحمل کے لیے اور دین و دنیا میں تمہاری مدد کیلئے "کیونکہ پروردگار تم پر مہربان ہے" (انه كان بكم رحيمًا)۔

نظامِ خلقت کے ایک چھوٹے سے گوشے کے حوالے سے یہ توحید استدلالی کے بارے میں بات تھی۔ اس میں خالق کے علم، قدرت اور حکمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اب بات کا رُخ استدلالِ فطری کی طرف مڑتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کہیں بھول نہ جانا کہ "جب کبھی تم کسی دریا یا سمندر میں ہوتے ہو اور تمہیں پریشانیاں اور مشکلات آگھیرتی ہیں (اور تم وحشت ناک طوفانی لہروں میں گھر جاتے ہو) تو وہ تمام معبود تمہیں بھول جاتے ہیں جنہیں تم خدا کے علاوہ پکارتے ہو اور وہی ایک تمہارا سہارا رہ جاتا ہے (واذا مسكم الضر في البحر ضل من تدعون الا اياه)۔ اور ایسے میں انہیں کھو ہی جانا چاہیئے کیونکہ طوفانی حوادث میں جب تقلید و تعصب کے پردے فطرتِ انسانی کے چہرے سے ہٹتے ہیں تو نورِ فطرت چمکنے لگتا ہے، وہی نورِ فطرت کہ جو نورِ توحید، نورِ خدا پرستی اور نورِ یگانہ پرستی ہے۔ جی ہاں! ایسے لمحات میں تمام تصوراتی؛ خیالی معبود کہ جنہیں انسانی توہم نے وجود بخشا ہوتا ہے ذہن سے محو ہو جاتے ہیں، اس طرح سے جیسے تیز دھوپ میں برف پانی ہو جاتی ہے۔

یہ ایک عمومی قانون ہے کہ جس کا تقریباً ہر شخص نے تجربہ کیا ہے کہ مصائب و آلام کی شدت میں جب جان پر بن جاتی ہے، اس وقت تمام ظاہری اسباب بیکار ہو جاتے ہیں اور مادی امداد ناتواں ہو جاتی ہے ایسے میں انسان علم و قدرت کے عظیم مبداء کو یاد کرتا ہے کہ جو سخت ترین مشکلات کو حل کرنے پر قادر ہے۔

ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ اس مبداء کا نام کیا رکھتے ہیں۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ امید کا ایک دریچہ دل کی طرف کھُل جاتا ہے اور ایک لطیف و طاقتور نور دل کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ انسانی رُوح و قلب کے اندر خدا شناسی کا یہ ایک بہت ہی نزدیکی راستہ ہے۔[1]

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: لیکن تم ایسے مرد و فراموش ہو کہ "اِدھر دستِ قدرتِ الٰہی تمہیں ساحل تک پہنچاتا ہے اور اُدھر تم اس سے منہ پھیر لیتے ہو اور انسان دراصل ہے ہی کفران کرنے والا" (فلما نجاكم الى البر اعرضتم وكان الانسان كفورًا)۔

ایک بار پھر غرور، غفلت، اندھی تقلید اور تعصب کے پردے اس نورِ الٰہی کو چھپا دیتے ہیں اور گناہ و

---

[1] توحیدِ فطری کی تفصیل "آفریدگارِ جہاں" میں مطالعہ کیجئے۔ نیز سورہ نحل کی آیہ ۱۴ کی تفسیر میں بھی ہم اس مسئلے کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

Marfat.com

نافرمانی کا غبار اور مادی زندگی کی سرگرمیاں اس کا تابناک چہرہ پنہاں کر دیتی ہیں۔
لیکن کیا تمہارا خیال ہے کہ خدا خشکی اور صحرا میں تمہیں عذاب شدید میں مبتلا نہیں کر سکتا۔ کیا تم اس سے مامون ہو کہ اس کے حکم سے زمین پھٹ جائے اور تم اس میں دھنس جاؤ (افامنتم ان یخسف بکم جانب البر)۔ اور کیا تم اس سے مامون ہو کہ تم پر پتھروں کی بارش ہو اور تم پتھروں کے نیچے دفن ہو جاؤ (جبکہ یہ ایسا عذاب ہے کہ جو غرقاب ہونے سے کئی گنا سخت تر ہے) اور پھر تمہیں کوئی محافظ و نگہبان بھی نہ ملے (او یرسل علیکم حاصباً ثم لا تجدوا لکم وکیلاً)۔
صحرا نورد اس بات سے خاص طور پر آشنا تھے کہ کبھی کبھی بیابان میں ایسے طوفان آتے ہیں کہ ریت اور سنگریزوں کے انبار اٹھائے ہوتے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے نئے ٹیلے بن جاتے ہیں اور بعض اوقات تو اونٹوں کی قطار کی قطار ان کے نیچے دفن ہو جاتی ہے۔ قرآن کی اس دھمکی کو یہ بیاباں نورد زیادہ سمجھ سکتے تھے۔
اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اے بھول جانے والو! کیا تمہارا خیال ہے یہ تمہارا آخری بحری سفر تھا۔ کیا اس سے مامون ہو کہ تمہیں تمہاری ضرورتیں پھر سمندر میں نہ لے جائیں اور وہاں خدا تباہ کن تیز ہواؤں کو حکم دے کہ تمہیں تمہارے کفر اور کفرانِ نعمت کے باعث غرق کر دیں اور اس وقت پھر یہ عالم ہو گا کہ کوئی تمہارے خون کا مطالبہ کرنے والا نہ ہو گا، کوئی نہ ہو گا جو کہے کہ ایسا کیوں ہوا (ام امنتم ان یعیدکم فیہ تارۃ اخریٰ فیرسل علیکم قاصفاً من الریح فیغرقکم بما کفرتم ثم لا تجدوا لکم علینا بہ تبیعاً)۔

چند اہم نکات

۱۔ کم ظرف انسان: بہت سے لوگ یہ کرتے ہیں کہ مشکلات میں تو خدا کو یاد کرتے ہیں لیکن راحت و آرام میں اسے بھول جاتے ہیں۔ یہ لوگ حقائقِ زندگی پر توجہ نہیں دیتے لہٰذا انہیں بھول جانے کی عادت پڑ چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی ان کی توجہ خدا اور حقائقِ زندگی کی طرف ہو تو یہ ان کی ایک استثنائی حالت ہو گی کہ جس کے لیے انتہائی شدید عوامل کی ضرورت ہے۔ جب تک ان عوامل کے تحت کوئی غیر معمولی صورتِ حال باقی رہے گی انہیں خدا یاد رہے گا لیکن جونہی وہ گھڑی ٹلے گی یہ لوگ اپنی انحرافی طبیعت کی طرف پلٹ آئیں گے اور اللہ کو بھول جائیں گے۔ خلاصہ یہ کہ ایسے لوگ بہت کم ملیں گے جو سنگین و روح فرسا مشکلات میں اللہ کی باعظمت بارگاہ میں سر نہ جھکائیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس اضطراری بیداری اور توجہ کی کوئی قیمت نہیں۔ صاحبانِ ایمان اور سچے مسلمان وہ ہیں جو راحت و مشکل میں، سلامتی و بیماری میں، خوشحالی و قحط میں، اقتدار و زندان میں ـــ غرض ہر حالت میں اس کی یاد میں رہتے ہیں اور اصولی طور پر حالات کی تبدیلی ان پر ہرگز کوئی اثر نہیں کرتی۔ ان کی روح اس قدر عظیم ہے کہ سب کچھ ان کے اندر سما جاتا ہے جیسے حضرت علی علیہ السلام کی

Marfat.com

مثال ہے۔ ان کی عبادت، ان کا زہد اور ان کی دردمندوں کی خبرگیری تخت و اقتدار پر بھی ایسی ہی تھی جیسی گوشۂ تنہائی میں تھی، جیسا کہ آپؑ خود پرہیزگاروں کی صفات کے بارے میں فرماتے ہیں:

نزلت انفسهم منهم فی البلاء کالتی نزلت فی الرخاء

خوشی اور غمی میں ان کی ایک سی حالت رہتی ہے[1]

مختصر یہ کہ ایمان، توجہ الی اللہ، توسل، عبادت، توبہ اور اللہ کے حضور سرِ تسلیم خم کی تبھی کوئی قدر و قیمت ہے جب یہ دائمی اور پائیدار ہوں۔ باقی رہا موسمی ایمان، موسمی توبہ اور موسمی عبادتیں کہ جو اضطراری حالت میں انجام دی جائیں یا اس حالت میں کہ جب ذاتی مفادات کا تقاضا ہو تو یہ سب بے فائدہ یا انتہائی کم قیمت ہیں۔ آیاتِ قرآنی میں ایسے لوگوں کی بارہا مذمت کی گئی ہے۔

۲۔ **خدا کی حدود و حکومت سے فرار ممکن نہیں:** بعض لوگ مثلاً زمانۂ جاہلیت کے بت پرست ــــ صرف اس وقت خدا کی طرف رُخ کرتے تھے جب کسی مشکل میں گرفتار ہوتے تھے۔ مثلاً کبھی وسطِ سمندر میں طوفان میں گھر جانے پر یا کسی خطرناک گھاٹی پر یا کسی شدید بیماری میں، حالانکہ اگر صحیح طرح سے سوچا جائے تو ہر حالت میں اور ہر جگہ انسان کے لیے خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔

دریا ہو یا صحرا، سلامتی ہو یا بیماری، ہلاکت کے گڑھے کا سامنا ہو یا کوئی اور موقع ــــ درحقیقت سب برابر ہیں۔ ہو سکتا ہے زلزلے کا ایک مختصر سا جھٹکا ہمارے خانۂ امن و امان کو وحشت ناک ویرانے میں تبدیل کر دے۔ خون کا ایک چھوٹا سا ذرہ ہمارے دل کی شہ رگ کو بند کر سکتا ہے۔ دل یا دماغ کے ایک ثانیے کے سکتے کی وجہ سے موت آ سکتی ہے۔ ان امور کی طرف توجہ کی جائے تو واضح ہو گا کہ خدا سے غفلت اور اس کی پاک ذات کو فراموش کر دینا کس قدر جاہلانہ ہے۔

وہ لوگ کہ جو اس مفروضے کے حامی ہیں کہ مذہب کی بنیاد خوف ہے، ہو سکتا ہے اس بات کو دستاویز کے طور پر پیش کریں کہ مختلف طبیعی عوامل کا خوف انسان کو خدا کے تصور کی طرف لے جاتا ہے اور ایسے خیالات کو تقویت پہنچاتا ہے۔

قرآنی آیات نے ایسے اوہام کا جواب دیا ہے کیونکہ قرآن نے خداشناسی کی بنیاد کبھی اس مسئلے پر نہیں رکھی بلکہ اس کی بنیاد نظامِ خلقت کے مطالعے اور اس مطالعے کے ذریعے اس کی پاک ذات تک پہنچنے کو قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ زیرِ بحث آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ توحیدِ فطری سے پہلے ایمانِ استدلالی کے بارے میں بات کی گئی ہے اور درحقیقت ان حوادث کو خدا یاد دلانے والے شمار کیا گیا ہے نہ کہ اس کی شناخت و معرفت کا موجب کیونکہ حق طلب افراد کے لیے اس کی شناخت و معرفت طریقِ استدلال سے

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۳۔

Marfat.com

بھی واضح ہے اور راہ فطرت سے بھی آشکار ہے۔

۲۔ چند الفاظ کا مفہوم : "یزجی" جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں "ازجاء" کے مادہ سے کسی چیز کو مسلسل حرکت دینے کے معنی میں ہے۔

"حاصب" ایسی ہوا کو کہتے ہیں کہ جو سنگریزوں کو اپنے ہمراہ اٹھا لائے اور ان کے ٹیلے بنا دے۔ یہ لفظ دراصل "حصباء" سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے "سنگریزہ"۔

"قاصف" توڑنے والے کے معنی میں ہے۔ یہاں ایسی شدید آندھی کی طرف اشارہ ہے کہ جو ہر چیز کو درہم برہم کر کے رکھ دے۔

"تبیع" "تابع" کے معنی میں ہے۔ یہاں ایسے شخص کی طرف اشارہ ہے کہ جو خون یا خونبہا کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑا ہو اور اس کا پیچھا کرے۔

Marfat.com

(۷۰) وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِىۡۤ اٰدَمَ وَحَمَلۡنٰهُمۡ فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ وَرَزَقۡنٰهُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلۡنٰهُمۡ عَلٰى كَثِيۡرٍ مِّمَّنۡ خَلَقۡنَا تَفۡضِيۡلًا ۟

(۷۱) يَوۡمَ نَدۡعُوۡا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمۡۚ فَمَنۡ اُوۡتِىَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيۡنِهٖ فَاُولٰٓـئِكَ يَقۡرَءُوۡنَ كِتٰبَهُمۡ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا ۟

(۷۲) وَمَنۡ كَانَ فِىۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰى فَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰى وَاَضَلُّ سَبِيۡلًا ۟

ترجمہ

(۷۰) ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور خشکی و دریا میں انہیں سواریاں عطا کیں ، طرح طرح کے پاکیزہ رزق میں سے انہیں روزی دی اور انہیں اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت عطا کی ۔

(۷۱) وہ دن یاد کرو کہ جب ہر گروہ کو ہم اس کے امام کے ساتھ پکاریں گے۔ پس جس کا نامہ اعمال داہنے ہاتھ میں ہوگا وہ اسے (بڑی مسرت سے) پڑھیں گے اور ان پر رائی برابر بھی ظلم نہیں ہوگا ۔

(۷۲) لیکن وہ لوگ جو اس دنیا میں (چہرہ حق کو دیکھ کر بھی) اندھے بنے رہے وہ وہاں بھی اندھے رہیں گے بلکہ گمراہ تر ۔

تفسیر

انسان گلشن حیات کا بہترین پھول

تربیت و ہدایت کا ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو ان کی عظمت اور مقام یاد دلایا جائے ۔ قرآن مجید بھی یہ

Marfat.com

طریقہ اختیار کرتا ہے۔ گزشتہ آیات میں مشرکین اور منحرف افراد کے بارے میں گفتگو تھی۔ اب زیرِ نظر آیات میں نوعِ انسانی کے بلند مقام کا تذکرہ ہے نیز اس کو عطا ہونے والی نعمات الٰہی کا بیان ہے تاکہ وہ اپنے اس انتہائی اعلیٰ مقام کی طرف توجہ کرے اور اپنے مقام گراں بہا کو ضائع نہ کر دے اور اپنے تئیں کسی حقیر سی قیمت پر نہ بیچ ڈالے۔

ارشاد ہوتا ہے: ہم نے اولادِ آدم کو عزت و تکریم بخشی اور اسے گرامی قدر بنایا (ولقد کرمنا بنی اٰدم)۔

اس کے بعد انسانوں کو عطا ہونے والی تین طرح کی نعماتِ الٰہی کا ذکر کیا گیا ہے:

پہلی نعمت: "ہم نے انہیں خشکی و دریا میں سواریاں عطا کی ہیں" (وحملناھم فی البر والبحر)۔

دوسری نعمت: پاکیزہ رزق میں سے ہم نے انہیں روزی دی ہے" (ورزقناھم من الطیبات)۔

لفظ "طیب" کے مفہوم میں ہر پاکیزہ موجود شامل ہے۔ اس مفہوم پر توجہ کی جائے تو اس عظیم خدائی نعمت کی وسعت واضح ہو جاتی ہے۔

تیسری نعمت: "ہم نے انہیں اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی ہے" (وفضلناھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلاً)۔

چند اہم نکات

۱۔ سواری۔ انسان کے لیے اولین نعمت: یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نعمتیں عطا کی ہیں ان میں سے سب سے پہلے خشکی اور دریا میں اس کی آمد و رفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ممکن ہے یہ اس بنا پر ہو کہ طیبات اور مختلف قسم کے رزق سے حرکت اور سفر کے بغیر فائدہ اٹھانا ممکن نہیں اور صفحۂ زمین پر اس سفر کے لیے انسان کو سواری کی ضرورت ہے۔ یہ بجا کہا جاتا ہے کہ حرکت میں برکت ہے۔

یا پھر یہ اس بنا پر ہے کہ خدا تعالیٰ اس تمام وسیع زمین پر انسانی حکمرانی کو بیان کرنا چاہتا ہے۔ دریا ہو یا صحرا انسان کا اقتدار موجود ہے۔ اس زمین پر دیگر موجود کا تسلط محدود اور ایک حصے پر ہے۔ یہ صرف انسان ہے جو پورے کرۂ خاکی پر حکومت کرتا ہے۔ دریا، صحرا، اونچائی، اُترائی اور ہوا سب میں انسان کی حکومت ہے۔

۲۔ خدا کی طرف سے انسان کی عزت و تکریم: مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے

Marfat.com

کہ ہم نے انسان کو عزت بخشی۔ یہ ایک سربستہ سی بات ہے۔ اللہ نے انسان کو کس چیز سے عزت بخشی اس سلسلے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس اعطاء سے مراد عقل و نطق کی قوت، مختلف استعدادیں اور ارادے کی آزادی ہے۔

بعض سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد انسان کی موزوں جسامت اور قامتِ راست ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ اس اعطاء سے انگلیاں مراد ہیں جن کے ذریعے انسان بہت سے ظریف اور دقیق کام انجام دے سکتا ہے اور اسی طرح لکھنے کی قدرت رکھتا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ اس سے انسان کی اس صلاحیت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ وہ تقریباً واحد موجود ہے جو اپنی غذا اپنے ہاتھ سے کھا سکتا ہے۔

بعض سمجھتے ہیں کہ یہ انسان کی اس سربلندی کی طرف اشارہ ہے کہ وہ روئے زمین کی تمام موجودات پر تسلط رکھتا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ اس اعطاء کی طرف اشارہ ہے کہ انسان معرفتِ الٰہی پر اور اس کے فرمان کی اطاعت پر قدرت رکھتا ہے۔

لیکن یہ واضح ہے کہ یہ سب نعمتیں انسان میں جمع ہیں اور ان میں سے کوئی دوسرے کے متضاد نہیں ہے۔

لہٰذا اس عظیم مخلوق کو خدا نے جو گرامی قدر بنایا اور عزت عطا کی ہے وہ ان تمام نعمات اور ان کے علاوہ دیگر نعمات کی بنیاد پر ہے۔ مختصر یہ کہ انسان دیگر مخلوقات پر بہت سے امتیازات رکھتا ہے اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بلند تر اور جاذبِ نظر زیادہ ہے۔

انسان کے جسمانی امتیازات کے علاوہ انسان ایسی روح کا حامل ہے جو کمال حاصل کرنے کے لیے اعلیٰ صلاحیتیں اور بہت توانائی رکھتی ہے۔

۳۔ "کرّمنا" اور "فضّلنا" میں فرق: اس سلسلے میں مختلف نظریات بیان کیے گئے ہیں:

بعض کا کہنا ہے کہ "کرّمنا" ان نعمات کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ذاتاً انسان کو دی ہیں جبکہ "فضّلنا" ان فضائل کی طرف اشارہ ہے جو انسان نے توفیقِ الٰہی سے کسب کیے ہیں۔

یہ احتمال بھی بہت صحیح معلوم ہوتا ہے کہ "کرّمنا" مادی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہو اور "فضّلنا" روحانی پہلوؤں کی طرف کیونکہ لفظ "فضّلنا" عام طور پر قرآن میں اسی معنی میں آیا ہے۔

۴۔ آیت میں "کثیر" کا مفہوم: بعض مفسرین کا خیال ہے کہ زیرِ بحث آیت تمام اولادِ آدم پر

Marfat.com

فرشتوں کی برتری کی دلیل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ قرآن اس آیت میں کہتا ہے کہ ہم نے انسانوں کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت و برتری عطا کی ہے۔ لہٰذا اس کا واضح مطلب ہے کہ ایک گروہ ایسا ہے کہ جس سے انسان افضل نہیں ہے اور یہ گروہ فرشتوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

لیکن خلقتِ آدم اور فرشتوں کا ان کے سامنے سجدہ و خضوع کرنے اور آدمؑ کی طرف سے انہیں علم اسماء کی تعلیم کی طرف توجہ کی جائے تو اس امر میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ انسان فرشتوں سے افضل و برتر ہے لہٰذا "کثیر" یہاں "جمیع" کے معنی میں ہوگا۔

عظیم مفسر طبرسی نے مجمع البیان میں کہا ہے کہ قرآن میں عرب محاورات میں بہت معمول ہے کہ یہ لفظ "جمیع" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ طبرسی کہتے ہیں کہ اس جملے کا معنی یہ ہوگا:

"انا فضلناهم علی من خلقناهم وهم کثیر

ہم نے انسان کو ان سب پر فضیلت عطا کی ہے جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے اور یہ مخلوقات کثیر ہیں۔

شیاطین کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

وَاَكْثَرُهُمْ كَاذِبُوْنَ (شعراء - ۲۲۳)

واضح ہے کہ شیطان تو سب جھوٹے ہیں نہ کہ ان میں سے اکثر۔

بہرحال اس معنی کو خلاف ظاہر سمجھیں تو بھی خلقتِ انسان کے بارے میں موجود آیات ہماری مذکورہ بات کے لیے واضح قرینہ ہیں۔

۵۔ انسان کیوں افضل ہے؟ : اس سوال کا جواب کوئی پیچیدہ نہیں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان ہی وہ واحد موجود ہے جس میں مختلف مادی و معنوی اور جسمانی و روحانی قوتیں اور توانائیاں موجود ہیں۔ یہی انسان متضاد چیزوں میں رہ کر پرورش پا سکتا ہے۔ صرف انسان ہی ہے جو کمال و ارتقاء اور پیش رفت کی لامحدود صلاحیت رکھتا ہے۔

حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام سے منقول ایک مشہور حدیث بھی اس مدعا پر ایک گواہ ہے آپؑ فرماتے ہیں:

اللہ نے عالم کو تین قسم کا پیدا کیا ہے۔ فرشتے، حیوان اور انسان۔ فرشتے عقل رکھتے ہیں اور ان میں شہوت و غضب کی قوت نہیں ہے۔ حیوان شہوت و غضب کا مجموعہ ہیں لیکن انسان دونوں کا مجموعہ ہے تاکہ معلوم ہو کہ کونسی قوت غالب آتی ہے۔ اگر اس کی عقل شہوت پر غالب آجائے تو یہ فرشتوں سے افضل ہے اور اگر اس کی شہوت اس کی عقل پر غالب آجائے تو

Marfat.com

یہ حیوانات سے پست تر ہے[1]

یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ کیا تمام انسان فرشتوں سے افضل ہیں جبکہ بہت سے لوگ بے ایمان، شریر اور ستمگر ہیں اور ایسے لوگ مخلوقِ خدا میں سے پست ترین شمار ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کیا زیرِ بحث آیت میں لفظ "بنی آدم" سب انسانوں کے لیے ہے یا ان میں سے صرف ایک گروہ کے لیے۔

اس سوال کا جواب ایک جملے میں دیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ:

جی ہاں! تمام انسان برتر ہیں لیکن بالقوۃ و استعداد کے لحاظ سے — یعنی سب یہ مقام اور اہلیت رکھتے ہیں۔ البتہ اگر وہ اس سے استفادہ نہ کریں اور اپنے مقام سے گر جائیں تو یہ کام خود ان سے مربوط ہے۔

انسان کی تمام موجودات پر برتری اگرچہ روحانی اور انسانی حوالے سے ہے تاہم نامناسب نہیں کہ ہم علماء کے بقول بعض حوالوں سے جسمانی قوت کے لحاظ سے بھی اسے افضل جانیں۔ (اگرچہ بعض پہلوؤں سے انسان کمزور نظر آتا ہے)۔

کتاب "انسان موجودِ ناشناختہ" کا مؤلف الیکسز کارل کہتا ہے:

انسانی بدن غیر معمولی استحکام اور قابلیت کا حامل ہے۔ یہ ہر قسم کے حادثے میں استقامت دکھاتا ہے۔ اسی طرح بھوک، بے خوابی، تکان، بہت زیادہ غصے، درد، بیماری، دکھ، مشقت اور روح و بدن میں موجود حیرت انگیز اعتدال کی حفاظت کے موقع بہت عجیب و غریب تحمل اور قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام حیوانات میں سے انسان میں باقی رہنے اور جدوجہد کی زیادہ صلاحیت ہے۔ اپنی اسی عجیب و غریب فکری و جسمانی توانائی ہی کی وجہ سے وہ صنعت و تمدن میں اس مقام پر آپہنچا ہے اور تمام جانداروں پر اپنی برتری ثابت کرچکا ہے[2]

اگلی آیت میں انسان کے لیے ایک اور خدائی نعمت کی طرف اشارہ ہے۔ نیز اس نعمت کے بعد انسان پر جو سنگین ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

پہلے مسئلۂ رہبری اور انسانی سرنوشت میں اس کی تاثیر کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: قیامت کے دن ہم ہر گروہ کو اس کے امام اور رہبر کے ساتھ پکاریں گے (یوم ندعوا

---

[1] نور الثقلین ج ۳ ص۱۸۱۔

[2] "انسان موجودِ ناشناختہ" ص۴۳ و ص۴۴۔

Marfat.com

کل اناس بامامھم)۔

یعنی وہ لوگ کہ جنہوں نے ہر زمانے میں انبیاء اور ان کے اوصیاء کی رہبری کو قبول کیا ہے وہ اپنے ان پیشواؤں کے ساتھ ہوں گے اور جنہوں نے شیطان، آئمہ ضلال اور جابر و ظالم پیشواؤں کی رہبری کو اختیار کیا ہے وہ ان کے ساتھ ہوں گے۔

خلاصہ یہ کہ رہبری اور پیروی کا جو رشتہ اِس جہان میں ہوگا وہ پوری طرح اُس جہان میں منعکس ہوگا۔ اسی بنیاد پر اہلِ نجات اور اہلِ عذاب ایک دوسرے سے جُدا ہو جائیں گے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے چاہا ہے کہ یہاں "امام" کا مطلب صرف "انبیاء" لیں۔ نیز بعض نے اس کی تفسیر آسمانی کتب بیان کی ہے اور بعض نے علماء۔

لیکن واضح ہے کہ "امام" کا یہاں وسیع مفہوم ہے اور اسی میں ہر پیشوا شامل ہے چاہے وہ انبیاء ہوں یا آئمہ ہدیٰ یا علماء۔ اور کتاب و سنت اور اسی طرح آئمہ کفر و ضلال بھی۔ لہٰذا وہاں ہر شخص اس رہبر کی صف میں ہوگا جس کا اس نے یہاں طریقہ اپنایا ہوگا۔

انسان کے کمال و ارتقاء کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہ تعبیر سب انسانوں کے لیے ایک تنبیہ بھی ہے اور اسے خبردار کرتی ہے کہ رہبر کے انتخاب میں بہت زیادہ غور و فکر سے کام لے اور اپنی فکر و نظر اور زندگی کی مہار ہر کسی کے سپرد نہ کر دے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ وہاں لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے، "جن کا نامۂ اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ افتخار اور سرور کے ساتھ اپنا نامۂ اعمال پڑھیں گے اور ان پر ذرہ بھر ظلم نہ ہوگا" (فمن اوتی کتابہ بیمینہ فاولٰئک یقرءون کتابھم ولا یظلمون فتیلاً) [۱]

"لیکن جو لوگ اِس جہان میں کور دل تھے وہ آخرت میں بھی اندھے ہوں گے۔" (ومن کان فی ھٰذہ اعمٰی فھو فی الاٰخرۃ اعمٰی)۔ اور فطری امر ہے کہ دل کے یہ اندھے سب سے زیادہ گمراہ ہوں گے (واضل سبیلاً)۔ وہ نہ اِس دنیا میں راہِ ہدایت پائیں گے اور نہ آخرت میں بہشت و سعادت کی راہ ــ کیونکہ انہوں نے خود سے اپنی آنکھیں تمام حقائق کے سامنے بند کر رکھی ہیں۔ انہوں نے حق کا چہرہ دیکھنے کے لیے آنکھیں نہ کھولیں۔ آیاتِ خدا اور جو کچھ باعثِ ہدایت و عبرت تھا اُس سے آنکھیں چرائے رکھیں اور

---

[۱] "فتیل" اس باریک اور نازک تار کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے شگاف کے اندر ہوتی ہے۔ جبکہ کھجور کی گٹھلی کی پشت پر جو تار ہوتی ہے اسے "نقیر" کہتے ہیں جبکہ "قطمیر" اس نازک چھلکے کو کہتے ہیں جس نے کھجور کی گٹھلی کو چھپا رکھا ہوتا ہے اور یہ تمام الفاظ بہت چھوٹی اور حقیر چیز کے لیے کنائے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

Marfat.com

خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے انہوں نے اپنے آپ کو محروم رکھا اور دارِ آخرت چونکہ اس جہان کا عکس العمل ہے تو کیا تعجب کی بات ہے کہ یہ کور دل وہاں عرصۂ محشر میں نابینوں کی صورت میں پیش ہوں۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ انسانی زندگی پر رہبری کا اثر: انسان کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کو رہبری کے مسئلے سے جدا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کسی بھی گروہ کے حقیقی راستے کو واضح کرنے کے لیے ہمیشہ رہبر اور پیشوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اصولی طور پر کمال وارتقاء وجودِ رہبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ انبیاء اور اوصیاء کے بھیجے جانے اور انتخاب کا یہی راز ہے۔

علم عقائد و کلام میں بھی قاعدہ لطف سے استفادہ کرتے ہوئے اور معاشرے کے نظم ونسق کے حصول اور انحراف سے بچانے میں رہبر کی ضرورت کے حوالے سے بعثتِ انبیاء اور ہر زمانے میں وجودِ امام کا ضروری ہونا ثابت کیا گیا ہے لیکن ایک خدائی رہبر اور عالم و صالح انسان کی رہبری انسان کے لیے اصلی ہدف تک رسائی کو جیسے آسان اور تیز تر کر دیتی ہے ایسے ہی آئمہ کفر و ضلال کی رہبری کو قبول کرنے سے انسان بدبختی اور بد انجامی کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں متعدد احادیثِ اسلامی مصادر میں موجود ہیں۔ ان کے مطالعے سے مفہوم آیت اور ہدفِ امامت واضح ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث شیعہ اور سُنّی حضرات نے امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے صحیح اسناد کے ساتھ نقل کی ہے۔ اس میں ہے کہ امامؑ نے اپنے آباؤ اجداد کے واسطے سے رسولِ اکرمؐ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل فرمایا:

یدعی کل اناس بامام زمانهم وکتاب ربهم وسنة نبيهم

اس روز ہر قوم کو اس کے زمانے کے امام، اس کی کتابِ الٰہی اور اس کے پیغمبر کی سنت کے ساتھ پکارا جائے گا۔[1]

نیز امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

الا تحمدون الله اذا كان يوم القيامة فدعا كل قوم الى من يتولونه ودعانا الى رسول الله وفزعتم الينا فالى اين ترون يذهب بكم الى الجنة ورب الكعبة — قالها ثلاثاً —

---

[1] مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

کیا تم اللہ کی حمد و ثنا بجا نہیں لاتے کہ جب قیامت کا دن ہوگا، خدا ہر گروہ کو اس شخص کے ساتھ پکارے گا جس کی اس نے ولایت قبول کی ہوگی، ہمیں رسول اللہؐ کے ساتھ پکارے گا اور تمہیں ہمارے ساتھ۔ تم سوچتے ہو کہ ایسے میں تمہیں کدھر لے جائیں گے۔ رب کعبہ کی قسم! بہشت کی طرف — پھر امام نے اس جملے کو تین مرتبہ دہرایا [۱]

۲۔ بنی آدم کا شرف: "بنی آدم" عموماً قرآن میں انسان کے لیے ایک ایسا عنوان ہے جس میں مدح و ستائش اور احترام شامل ہے جبکہ لفظ انسان کی توصیف "ظلوم"، "جہول"، "ہلوع" (کم ظرف)، "ضعیف" نافرمان اور ناسپاس کے الفاظ سے کی گئی ہے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ لفظ "بنی آدم" تربیت یافتہ انسانوں کی طرف اشارہ کرتا ہے یا کم از کم یہ انسان کی مثبت صلاحیتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ (حضرت آدمؑ کا افتخار و اعزاز اور فرشتوں پر ان کی فضیلت کہ جو اس لفظ "بنی آدم" میں پنہاں ہے یہ بھی اس معنی کی ایک مؤید ہے)۔ جبکہ لفظ "انسان" اس کے مطلق معنی کے لحاظ سے ہے اور کبھی کبھی انسان کے منفی پہلوؤں کی طرف اشارے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اسی لیے زیر بحث آیات کہ جن میں انسان کے شرف و فضیلت کا ذکر ہے یہاں لفظ "بنی آدم" استعمال ہوا ہے۔

قرآن مجید میں انسان کے معنی کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۸ صفحہ ۱۹۴ پر ہم نے تفصیلی بحث کی ہے۔

۳۔ رہبری — اسلام کی نظر میں: امام باقر علیہ السلام سے ایک مشہور حدیث منقول ہے۔ اس میں ہے کہ ایک مرتبہ آپؑ اسلام کے بنیادی ارکان کے بارے میں گفتگو فرما رہے تھے۔ اس وقت آپؑ نے پانچواں رکن ولایت (رہبری) کو قرار دیا اور اس کا تعارف اہم ترین رکن کی حیثیت سے کروایا۔ جبکہ اس حدیث کے مطابق نماز کہ جو خالق و مخلوق کے مابین تعلق کا مظہر ہے، روزہ کہ جو شہوات سے مقابلے کا راز ہے، زکوٰۃ کہ جو انسان سے انسان کے تعلق کا اظہار ہے اور حج کہ جو اسلام کے اجتماعی پہلوؤں کا ترجمان ہے دیگر چار بنیادی رُکن ہیں۔

بعد میں امامؑ نے مزید فرمایا:

کسی چیز کو ولایت کی سی اہمیت حاصل نہیں ہے (کیونکہ دیگر ارکان کا اجرا اسی کے سائے میں ہوگا) [۲]

۱۔ مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

۲۔ حدیث کی عبارت یوں ہے:

قال الباقر (ع): بنی الاسلام علی خمس علی الصلوٰة والزکوٰة والصوم والحج والولایة ولم یناد بشیء کما نودی بالولایة (اصول کافی ج ۲ ص ۱۵)۔

Marfat.com

یہی وجہ ہے کہ رسول اکرمؐ کی ایک مشہور حدیث میں منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

من مات بغیر امام مات میتة الجاهلیة

جو شخص اس دنیا سے امام و رہبر کے بغیر چلا جائے گا وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔[1]

تاریخ میں ایسے بہت سے مواقع دکھائی دیتے ہیں کہ کبھی ایک ملت ایک عظیم اور لائق قیادت و رہبری کی بدولت دنیا کی قوموں میں پہلی صف میں آکھڑی ہوئی اور کبھی وہی ملت اسی افرادی قوت اور انہی وسائل کے باوجود کمزور اور نالائق قائد و رہبر کی بدولت ایسی گری کہ شاید کوئی باور نہ کرے کہ یہ وہی ملت ہے۔

کیا زمانۂ جاہلیت کے عرب نہ تھے کہ جو جہالت، بدبختی، فتنہ و فساد، ذلت و نکبت اور انتشار و انحطاط میں غوطہ ور تھے کیونکہ ان کا کوئی قابل قائد نہ تھا لیکن جب الٰہی رہبر یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہور فرمایا تو اس قوم نے وہ ترقی و کمال اور عظمت حاصل کی کہ پوری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

جی ہاں — یہ ہے رہبر کی تاثیر — اُس زمانے میں، اس زمانے میں اور ہر زمانے میں۔

البتہ خدا تعالیٰ نے ہر زمانے کے انسانوں کی نجات و ہدایت کے لیے رہبر مقرر کیے ہیں کیونکہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ فرمانِ سعادت ضامن کے بغیر جاری نہ ہو۔

لیکن یہ بات بہت اہم ہے کہ لوگ اپنے رہبر کو پہچانیں اور گمراہ و فاسد اور مفسد رہبروں کے دام فریب میں گرفتار نہ ہوں کیونکہ پھر ان کے چنگل سے نجات مشکل ہے۔

شیعوں کا اعتقاد ہے کہ ہر زمانے میں ایک معصوم امام ہوتا ہے۔ اس اعتقاد کا بھی یہی فلسفہ ہے۔ جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اللّٰهم بلی لا تخلوا الارض من قائم لله بحجة، اما ظاهراً مشهوراً واما خائفاً مغموراً، لئلا تبطل حجج الله وبيناته

جی ہاں! بخدا زمین کبھی ایسے رہبر سے خالی نہیں ہوتی کہ جو حجتِ الٰہی کے ساتھ قیام کرے، چاہے وہ ظاہر و آشکار ہو یا (درکار پیروکار نہ ہونے کی وجہ سے) مخفی و تنہا ہو۔ ایسے رہبر کا وجود اس لیے ضروری ہے کہ خدا کی نشانیاں اور اس کے فرمان کے دلائل ختم نہ ہونے پائیں۔[2]

مفہوم امامت اور جہانِ انسانیت کے لیے اس کی ناگزیر ضرورت کے بارے میں ہم پہلی جلد میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۲۴ کے ذیل میں بھی بحث کر چکے ہیں۔

۴۔ دل کے اندھے: مشرکوں اور ظالموں کے بارے میں زیر بحث آیت میں قرآن نے ایک

---

[1] نور الثقلین ج ۳ ص ۱۹۲ اور دیگر بہت سی کتابیں۔

[2] نہج البلاغہ کلماتِ قصار ۱۴۷۔

Marfat.com

نہایت عمدہ تعبیر استعمال کی ہے اور وہ ہے "اعمٰی" (اندھے)۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ حق کا چہرہ ہر جگہ آشکار ہوتا ہے البتہ چشم بینا کی ضرورت ہے۔ ایسی آنکھ کہ جو اس وسیع کائنات میں آیاتِ الٰہی کو دیکھ سکے، وہ آنکھ کہ جو صفحاتِ تاریخ میں سے درسِ عبرت کا مطالعہ کر سکے اور ایسی آنکھ کہ جو ظالموں اور جابروں کے انجام کا مشاہدہ کر سکے۔ خلاصہ یہ کہ ایسی کھلی آنکھ کی ضرورت ہے کہ جو حق کو دیکھ سکے۔

لیکن جب جہالت، غرور، تعصب، ہٹ دھرمی، شہوت اور ہَوا و ہوس کے موٹے موٹے پردے انسان کی آنکھ کے سامنے پڑ جائیں تو پھر وہ دیکھنے کے قابل نہیں رہتی۔ جمالِ حق تو حجاب میں نہیں ہوتا مگر ایسی آنکھ اس کے مشاہدے سے عاجز ہوتی ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک حدیث امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

من لم یدلہ خلق السمٰوات والارض، واختلاف اللیل والنہار، و دوران الفلك والشمس والقمر والاٰیات العجیبات علٰی ان وراء ذٰلك امر اعظم منه، فهو فی الاٰخرة اعمٰی واضل سبیلا۔

جس شخص کو زمین و آسمان کی خلقت، روز و شب کی آمد و شد، سورج چاند ستاروں کی گردش اور اس کی عجیب و غریب نشانیاں اس عالم کے ماورا چھپی ہوئی عظیم حقیقت سے آگاہ نہ کریں، وہ آخرت میں اندھا ہو گا اور بہت زیادہ گمراہ۔[1]

نیز متعدد روایات میں اس آیت کی تفسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ اس سے وہ شخص مراد ہے کہ جو حج کی استطاعت رکھنے کے باوجود آخر عمر تک حج پر نہ جائے۔[2]

اس میں شک نہیں کہ ایسا شخص اس آیت کا ایک مصداق ہے نہ کہ آیت کا مفہوم اسی میں منحصر ہے شاید اس مصداق کا ذکر اس بناء پر ہو کہ مراسم حج میں شرکت سے، اس عظیم اسلامی سیمینار میں حاضری سے اور اس میں پنہاں عبادی و سیاسی اسرار کے مشاہدے سے انسان کی آنکھ بینا ہو جاتی ہے اور اسے بہت سے حقائق دکھائی دینے لگتے ہیں۔

بعض دیگر روایات میں بدترین اندھا پن دل کے اندھے پن کو قرار دیا گیا ہے:

شر العمی عمی القلب

بدترین نابینائی دل کا اندھا پن ہے۔[3]

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۱۹۶۔

[2] و [3] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۱۹۶ و ص ۱۹۷

Marfat.com

بہرحال جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ عالم قیامت ہمارے اس عالم کے عقائد و اعمال کا عکس العمل ہے۔ اسی بنا پر سورہ طٰہ کی آیہ ۱۲۴ سے لے کر ۱۲۶ تک میں ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِىْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝

جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرے گا وہ سخت زندگی سے دوچار ہوگا اور روز قیامت اندھا محشور ہوگا۔ اس وقت کہے گا: پروردگارا! مجھے تُو نے کیوں اندھا محشور کیا ہے حالانکہ پہلے تو (دنیا میں) میں بینا تھا۔ وہ فرمائے گا: اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آتی تھیں اور تُو ان سے آنکھیں بند کر لیتا تھا اور انہیں بھلا رکھا تھا آج تجھے بھی بھلا دیا جائے گا۔

❖ ❖ ❖

Marfat.com

۷۳ وَاِنۡ كَادُوۡا لَيَفۡتِنُوۡنَكَ عَنِ الَّذِىۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ لِتَفۡتَرِىَ
عَلَيۡنَا غَيۡرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوۡكَ خَلِيۡلًا ○
۷۴ وَلَوۡلَاۤ اَنۡ ثَبَّتۡنٰكَ لَقَدۡ كِدْتَّ تَرۡكَنُ اِلَيۡهِمۡ
شَيۡـئًا قَلِيۡلًا ○ۙ
۷۵ اِذًا لَّاَذَقۡنٰكَ ضِعۡفَ الۡحَيٰوةِ وَضِعۡفَ الۡمَمَاتِ ثُمَّ لَا
تَجِدُ لَكَ عَلَيۡنَا نَصِيۡرًا ○

ترجمہ

۷۳ قریب تھا کہ ہم نے تجھے جو وحی کی ہے اس کے بارے میں (اپنے وسوسوں
کے ذریعے) تجھے فریب دیں تاکہ تُو اس کی بجائے کسی اور کی ہماری طرف نسبت
دے اور اس صورت میں وہ تجھے اپنا دوست قرار دے لیں۔
۷۴ اگر ہم تجھے ثابت قدم نہ رکھتے (اور تُو مقام عصمت کی وجہ سے انحراف سے محفوظ نہ
ہوتا) تو قریب تھا کہ تُو کچھ اُن کی طرف مائل ہو جاتا۔
۷۵ اور اگر تُو ایسا کرتا تو ہم تجھے (مشرکین کی نسبت) دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی
دوگنی سزا کا مزہ چکھاتے پھر ہمارے مقابلے میں تجھے کوئی مددگار نہ ملتا۔

شانِ نزول

ان بحث انگیز آیات کے بارے میں مفسرین نے مختلف شانِ نزول نقل کی ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ایسی ہیں جو ان آیات کی تاریخ نزول سے مطابقت نہیں رکھتیں لیکن چونکہ بعض منحرف لوگوں نے انہیں دستاویز بنا لیا ہے لہٰذا ہم ان سب کا ذکر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں پانچ مختلف

Marfat.com

اقوال نقل کیے ہیں :

۱۔ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا :

ہم تجھے اس وقت تک حجرِ اسود کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دے سکتے جب تک کم ازکم تُو ہمارے خداؤں کو احترام کی نظر سے نہ دیکھے ۔

رسول اللہؐ نے دل میں خیال کیا کہ خدا تو جانتا ہے کہ مَیں ان بتوں سے متنفر ہوں لہٰذا اس میں کیا حرج ہے کہ مَیں ان کی طرف دیکھ لوں تاکہ یہ لوگ مجھے حجرِ اسود کو ہاتھ لگانے دیں ۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کام سے منع کیا گیا۔

۲۔ قریش نے تجویز کیا :

ہمارے خداؤں کو بُرا کہنا چھوڑ دے ۔ ہمیں کم عقل کہنے سے باز آجا اور ان حقیر غلاموں کو اپنے سے دُور کر دے کہ جن سے ہمیں بدبو آتی ہے تاکہ ہم تیری مجلس میں حاضر ہوں اور تیری باتیں سنیں ۔

اس امید پر کہ شاید یہ لوگ مسلمان ہو جائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوچا کہ (چاہے وقتی طور پر ہی سہی) ان کی بات مان لی جائے۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور آپؐ کو اس کام سے روکا گیا ۔

۳۔ رسول اللہؐ نے بتوں کو مسجد حرام سے نکال باہر پھینکا تو قریش نے تقاضا کیا کہ آپ اجازت دیں کہ جو بُت خانہ کعبہ کے نزدیک کوہِ مروہ پر تھا اسے وہیں رہنے دیا جائے ۔

پہلے تو پیغمبر اکرمؐ نے سیاسی مقاصد کے پیشِ نظر ارادہ کیا کہ ان کی بات مان لی جائے لیکن بعد ازاں اس ارادے کو ترک کر دیا اور حکم دیا کہ یہ بُت بھی توڑ دیا جائے ۔

اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں ۔

۴۔ ثقیف قبیلے کے کچھ نمائندے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ انہوں نے عرض کیا :

ہم آپ کی بیعت کرنے کو تیار ہیں لیکن ہماری تین شرطیں ہیں ۔ پہلی یہ کہ ہم نماز میں رکوع و سجود کے لیے نہیں جھکیں گے ۔ دوسری یہ کہ ہم اپنے بتوں کو اپنے ہاتھ سے نہیں توڑیں گے بلکہ آپ خود توڑیں ۔ تیسری یہ کہ آپ اجازت دیں کہ "لات" کو ایک سال تک باقی رہنے دیا جائے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

وہ دین جس میں رکوع و سجود نہ ہو وہ کسی کام کا نہیں ۔ رہا تمہارے بتوں کو تمہارے اپنے ہاتھ سے توڑنا تو اگر چاہو تو اپنے ہاتھ سے توڑ دو اگر تمہارا دل نہیں چاہتا تو ہم خود توڑ دیں گے ۔

Marfat.com

رہی "لات" کے بارے میں تمہاری بات تو میں تمہیں اس قسم کی اجازت نہیں دیتا۔
اس موقع پر رسول اللہؐ کھڑے ہو گئے اور وضو کیا تو حضرت عمر نے لوگوں کی طرف رُخ کیا اور کہا:
رسول کو کیوں اذیت دیتے ہو وہ ہرگز اجازت نہیں دیں گے کہ سرزمینِ عرب میں بُت باقی رہیں۔
لیکن وہ لوگ یہی تقاضا کرتے رہے یہاں تک کہ مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں۔
۵۔ قبیلہ "ثقیف" کے چند نمائندے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔
وہ کہنے لگے:
ہمیں ایک سال کے لیے اجازت دیجئے کہ لوگ بتوں کے لیے جو ہدیے اور تحفے لاتے ہیں وہ ہم لے لیں۔ اس کے بعد ہم خود بتوں کو توڑ دیں گے اور اسلام لے آئیں گے۔
رسول اللہؐ اس سوچ میں تھے کہ بعض پہلوؤں کے پیش نظر انہیں یہ مہلت دے دیں کہ مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اور اس امر سے شدت کے ساتھ منع کیا گیا۔
اِن کے علاوہ بھی اِن سے ملتی جلتی کچھ شانِ نزول نقل ہوئی ہیں لیکن شاید وضاحت کی ضرورت نہ ہو کہ ان میں سے اکثر کا غلط ہونا خود انہی میں پوشیدہ ہے کیونکہ رسول اللہؐ کی خدمت میں قبائل کے نمائندوں کا آنا جانا اور آپؐ سے تقاضا کرنا یا بتوں کو مسجد الحرام سے باہر پھینکنا اور انہیں توڑنا یہ سب فتح مکہ کے بعد ہجرت کے آٹھویں سال کے واقعات ہیں جبکہ یہ سورت بنیادی طور پر ہجرت سے پہلے نازل ہوئی اور اس زمانے میں ظاہری طور پر پیغمبرِ اکرمؐ کو ایسا اقتدار حاصل نہ تھا کہ مشرکین آپؐ کے سامنے ایسی انکساری کرتے۔
اس سے قطع نظر بعض دیگر شانِ نزول کا بے بنیاد ہونا تفسیر کے ضمن میں پیش کی جانے والی توضیحات سے واضح ہو جائے گا۔

تفسیر

شرک کیلئے تھوڑے سے جھکاؤ کی سزا

گزشتہ آیات میں شرک اور مشرکین کے بارے میں بحث تھی۔ زیرِ نظر آیات میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ ان لوگوں کے وسوسوں سے بچیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ شرک و بت پرستی کے خلاف معرکے میں تھوڑی سی بھی کمزوری پیدا ہو جائے لہٰذا ضروری ہے کہ مکمل قاطعیت کے ساتھ یہ معرکہ جاری رہے۔
پہلے فرمایا گیا ہے: قریب تھا کہ ان کے وسوسے تیرے دل پر اثر انداز ہوتے اور ہم نے جو تجھے وحی

Marfat.com

کی ہے اس کے بارے میں تجھے فریب دیتے تاکہ تو اس کی بجائے کسی اور کی ہماری طرف نسبت دے اور پھر وہ تجھے اپنا دوست مان لیتے (و ان کادوا لیفتنونک عن الذی اوحینا الیک لتفتری علینا غیرہ واذاً لاتخذوک خلیلاً)۔

اور اگر ہم تیرے دل کو حق و حقیقت پر ثابت قدم نہ رکھے ہوتے (اور نورِ عصمت کے باعث تو ثابت قدم نہ ہوتا) تو قریب تھا کہ تو تھوڑا سا ان پر اعتماد کرتا اور ان کی طرف مائل ہوجاتا (ولولا ان ثبتناك لقد كدت تركن اليهم شيئاً قليلاً)۔

اور اگر تو ایسا کرلیتا تو ہم تجھے مشرکین کی دنیاوی اور اُخروی سزا سے دوگنی سزا چکھاتے اور پھر ہمارے مقابلے میں تیرا کوئی مددگار نہ ہوتا (اذاً لاذقناك ضعف الحيوة وضعف الممات ثم لاتجد لك علينا نصيراً)۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا یہ کشادہ دلی تھی؟ : بعض بہانہ سازوں نے انبیاء کے غیر معصوم ہونے کے بارے میں اپنے عقیدے کے لیے مندرجہ بالا آیات کو دستاویز بنانا چاہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان آیات اور ان کے بارے میں منقول شان ہائے نزول سے ظاہر ہوتا ہے کہ بُت پرستوں کے وسوسوں کے سامنے رسول اللہؐ نے کچھ میلان ظاہر کیا اور فوراً اللہ نے ان سے مؤاخذہ کیا۔

لیکن زیر بحث آیات خود اس قدر واضح اور منہ بولتا ثبوت ہیں کہ اس طرز فکر کے بطلان کے لیے ہمیں دیگر شواہد پیش کرنے سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ زیر بحث دوسری آیت صراحت سے کہتی ہے: "اگر ہم نے تجھے ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو قریب تھا کہ تو اُن کی طرف مائل ہوجاتا"۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ "تثبیتِ الٰہی" یعنی اللہ کی طرف سے ثباتِ قدم جسے ہم "مقامِ عصمت" سے تعبیر کرتے ہیں اس میلان میں رکاوٹ بن گیا نہ یہ کہ رسول اللہؐ مائل ہو چکے تھے اور خدا نے انہیں منع کیا اور ان کا مؤاخذہ کیا۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ پہلی اور دوسری آیت میں درحقیقت رسول اللہؐ کی دو مختلف حالتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پہلی حالت کہ جو بشری اور ایک عام انسان کی حالت ہے۔ اس کی طرف پہلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اور یہ حالت ہے دشمنوں کے وسوسوں کی اثر اندازی خصوصاً جبکہ اس میلان میں ظاہراً مصلحتیں بھی دکھائی دیں۔ مثلاً اس میلان کے بغیر سردارانِ قریش کے اسلام لانے کی امید یا خوں ریزی اور زیادہ مشکلات سے بچت، ہر عام آدمی چاہے وہ جتنا بھی قوی ہو ایسے وسوسوں کی اثر خیزی کا احتمال ہوتا ہے۔

Marfat.com

لیکن دوسری آیت روحانی پہلو، عصمتِ الٰہی اور پروردگار کا لطفِ خاص بیان کرتی ہے وہ لطفِ خاص کہ جو انبیاء اور خصوصاً پیغمبرِ اسلامؐ کے بحرانی لحات میں شاملِ حال تھا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ طبیعت بشری کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم، ان وسوسوں کو قبول کرنے کے قریب تو ہوئے لیکن تائیدِ الٰہی نے انہیں بچالیا اور ان کی حفاظت کی۔

یہ بعینہٖ وہی تعبیر ہے جو سورۂ یوسف میں ہے کہ انتہائی بحرانی لحات میں برہانِ الٰہی نے اُن کا رُخ کیا اور اگر اس برہان کا مشاہدہ نہ ہوتا تو عزیزِ مصر کی بیوی کے انتہائی قوی وسوسوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے۔ قرآنی الفاظ میں:

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝ (یوسف۔ ۲۴)

ہمارے نظریے کے مطابق زیرِ بحث آیات نہ صرف یہ کہ نفیِ عصمت کے لیے دلیل نہیں ہیں بلکہ عصمت پر دلالت کرنے والی آیات میں سے ہیں کیونکہ مسلماً یہ تثبیتِ الٰہی (افکار و میلانات اور عملی اقدامات کے لحاظ سے خدا کی طرف سے ثباتِ قدم) صرف اسی موقع پر نہ تھا کیونکہ اس سے مشابہ مواقع پر بھی اس کی دلیل موجود ہے۔ لہٰذا یہ انبیاء اور ہادیانِ الٰہی کے معصوم ہونے پر ایک شاہدِ زندہ ہے۔

رہی تیسری آیت کہ جو کہتی ہے: اگر تیرا میلان ان کی طرف ہو جاتا تو تجھے شدید عذاب ہوتا — تو یہ اسی چیز کی دلیل ہے کہ جو عصمتِ انبیاء سے مربوط مباحث میں آئی ہے کہ ان کا معصوم ہونا اضطراری پہلو نہیں رکھتا بلکہ ایک قسم کی خود آگہی کے ساتھ ہے کہ جو اختیار اور ارادے کی آزادی کے ساتھ انجام پاتی ہے لہٰذا ایسی حالت میں ارتکابِ گناہ عقلاً محال نہیں ہے بلکہ آگہی و ایمان کے اعلیٰ درجے کی وجہ سے عملاً یہ حضرات ہرگز گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ فرض کریں اگر وہ گناہ کرتے تو ان پر بھی خدائی عذاب ہوتا (غور کیجئے گا)۔[1]

۲۔ دوگنا عذاب کیوں؟: واضح ہے کہ علم و آگہی، معرفت و ایمان اور ایقان کے لحاظ سے انسان کا مقام جس قدر بلند ہوگا اس کے نیک اعمال اتنے ہی گہرے اور زیادہ قدر و قیمت کے ہوں گے۔ ظاہر ہے ثواب و جزا بھی زیادہ ہوگی۔ اسی لیے بعض روایات میں ہے:

ان الثواب علی قدر العقل

ثواب انسان کی عقل کے حساب سے دیا جائے گا۔[2]

---

[1] اس بات کی مزید تفصیل کتاب "رہبرانِ بزرگ" میں پڑھیں۔

[2] اصول کافی ج ۱ کتاب "العقل والجہل" ص ۹ حدیث ۸

Marfat.com

عذاب اور سزا بھی اسی نسبت سے ہوگی۔ ایک اَن پڑھ ضعیف الایمان انسان گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہو تو زیادہ غیر متوقع نہیں ہے لہذا اسے سزا بھی کم ملے گی لیکن اگر ایک باایمان، صاحب علم جس کا ماضی روشن ہو وہ کوئی چھوٹا سا گناہ بھی انجام دے تو بہت تعجب ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ اس چھوٹے گناہ پر اس کی سزا اس عام اَن پڑھ آدمی کے گناہ کبیرہ کی سزا سے شدید تر اور سنگین تر ہو۔

اسی بنا پر قرآن مجید میں پیغمبر اکرمؐ کی بیویوں کے بارے میں ہے :

یَانِسَآءَ النَّبِیِّ مَنۡ یَّاۡتِ مِنۡکُنَّ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ یُّضٰعَفۡ لَہَا الۡعَذَابُ ضِعۡفَیۡنِ ؕ وَکَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرًا ۝ وَمَنۡ یَّقۡنُتۡ مِنۡکُنَّ لِلّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَتَعۡمَلۡ صَالِحًا نُّؤۡتِہَاۤ اَجۡرَہَا مَرَّتَیۡنِ ۙ وَاَعۡتَدۡنَا لَہَا رِزۡقًا کَرِیۡمًا ۝

اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کوئی واضح بُرا اور ناپسندیدہ عمل انجام دے گی اس کے لیے دوگنا عذاب ہوگا اور خدا کے لیے یہ امر آسان ہے اور تم میں سے جو خدا اور اس کے رسول کے سامنے خضوع کرے گی اور عملِ صالح انجام دے گی ہم اسے دوگنی جزا دیں گے اور اس کے لیے ہم نے آبرومندانہ رزق تیار کر رکھا ہے۔ (احزاب - ۳۰ ؍ ۳۱)

روایات میں بھی ہے :

یغفر للجاھل سبعون ذنبًا قبل ان یغفر للعالم ذنب واحد[1]

خدا جاہل کے ستر گناہوں سے درگزر کردے گا اس سے پہلے کہ عالم کے ایک گناہ سے درگزر کرے۔

مندرجہ بالا آیات بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ یہ پیغمبرؐ سے کہہ رہی ہیں کہ اگر تم نے شرک و مشرکین کی طرف میلان کیا تو تمہاری دنیا و آخرت کی سزا دوگنی ہوگی۔

۲۔ "ضعف" کا مفہوم : اس نکتے کی طرف بھی پوری توجہ ضروری ہے کہ عربی زبان میں "ضعف" صرف دوگنا کے معنی میں نہیں ہے بلکہ دوگنا اور کئی گنا کے معنی میں ہے۔

آٹھویں صدی کا مشہور لغت شناس فیروز آبادی کتاب "قاموس" میں کہتا ہے :

کبھی " ضعف فلان شیئ " کہا جاتا ہے اور اس کا مطلب دوگنا یا تین گنا ہوتا ہے کیونکہ یہ لفظ لامحدود اضافے کے معنی میں آتا ہے۔

اس بات کا شاہد یہ ہے کہ آیاتِ قرآن میں "حسنات" کے بارے میں ہے :

اِنۡ تَکُ حَسَنَۃً یُّضٰعِفۡہَا

اگر عملِ حسنہ ہو تو خدا اسے کئی گنا کر دیتا ہے۔ (نساء - ۴۰)

---

[1] اصول کافی جلد اول صفحہ ۳۷

Marfat.com

اور کبھی قرآن کہتا ہے :

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا

جو کوئی ایک نیکی انجام دے گا اسے اس کے دس گنا جزا ملے گی۔ (انعام - ۱۶۰)

روایات اسلامی میں امام صادق علیہ السلام سے سورہ بقرہ کی آیہ ۲۶۱ کی تفسیر میں مروی ہے :

اذا احسن المؤمن عمله ضاعف الله عمله بكل حسنة سبع مأة ضعف، وذلك قول الله والله يضاعف لمن يشاء۔

جس وقت کوئی صاحبِ ایمان کوئی نیک عمل انجام دیتا ہے تو اللہ ہر نیک عمل کے بدلے سات سو کا اضافہ کر دیتا ہے اور خدا کے اس قول کا یہی مطلب ہے جس میں وہ فرماتا ہے :

وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ

خدا جس کے عمل کو چاہتا ہے کئی گنا کر دیتا ہے [1]

لیکن یہ بات اس سے مانع نہیں کہ اس لفظ کے تثنیہ یعنی "ضعفان" یا "ضعفین" کا معنی دو گنا ہوتا ہے یا جس وقت اضافت کے ساتھ ہو تو تین گنا کا معنی ہوتا ہے مثلاً ہم کہیں "ضعف الواحد" (غور کیجئے گا)۔

۴۔ "اذا لاتخذوك خليلا" کی تفسیر : مفسرین میں اس کا یہ معنی مشہور ہے :

اگر تُو مشرکین کی خواہشات کی طرف مائل ہوتا تو وہ تجھے اپنا دوست قرار دیتے۔

لیکن بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ اس جملے کا معنی یہ ہے :

اگر تُو مشرکین کی خواہشات کی طرف مائل ہوتا تو وہ تجھے فقیر اور اپنا نیازمند قرار دیتے۔

پہلی صورت میں "خليل" "خله" (بروزن "قله") سے دوست کے معنی میں ہے۔

دوسری صورت میں "خليل" "خله" (بروزن "غله") نیازمند و فقیر کے معنی میں ہے۔

لیکن واضح ہے صحیح وہی پہلی تفسیر ہے۔

۵۔ خدایا! ہمیں ہمارے سپرد نہ کر : منابع اسلامی میں ہے کہ جس وقت زیر نظر آیات نازل ہوئیں تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا :

اللّٰهم لا تكلني الى نفسي طرفة عين ابدًا

خدایا! مجھے پلک جھپکنے کے برابر بھی میرے اپنے سپرد نہ کر۔

---

[1] تفسیر المیزان ج ۲ ص ۴۲۴ بحوالہ تفسیر عیاشی۔

Marfat.com

رسول اللہؐ کی یہ معنی خیز دعا ہم سب کو ایک اہم درس دیتی ہے اور وہ یہ کہ ہمیں ہر حالت میں خدا کی بارگاہ میں پناہ لینی چاہیئے اور اُس کے لطف و کرم کا سہارا لینا چاہیئے۔ کیونکہ معصوم انبیاً بھی اس کی مدد کے بغیر لغزشوں سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے چہ جائیکہ ہم کہ جو شیطانی وسوسوں میں گھرے رہتے ہیں۔

✧ ✧ ✧

(۷۶) وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ○

(۷۷) سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ○

ترجمہ

(۷۶) قریب تھا کہ وہ تجھے مکرو فریب اور شاطرانہ سازش کے ذریعے اس سرزمین سے باہر نکال دیتے لیکن اگر وہ ایسا کرتے تو (سخت عذابِ خدا میں گرفتار ہو جاتے اور) تیرے بعد زیادہ دیر باقی نہ رہتے۔

(۷۷) (ہماری) یہ سنت ان انبیاء کے بارے میں ہے کہ جنہیں ہم نے تجھ سے پہلے بھیجا ہے اور تو ہماری سنت میں ہرگز کوئی تغیر نہیں پائے گا۔

شانِ نزول

مشہور ہے کہ زیرِ نظر آیات اہلِ مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ انہوں نے رسول اللہؐ کو مکہ سے نکال دینے کے لیے آپس میں گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ بعد میں ان کا پروگرام بدل گیا۔ اب انہوں نے ارادہ کیا کہ رسول اللہؐ کو قتل کر دیں۔ انہوں نے آپؐ کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ آپؐ اس محاصرے میں سے اعجاز آمیز طریقے سے باہر آ گئے اور مدینہ کی طرف روانہ ہوئے ــــ یہاں سے آپؐ کی ہجرت

Marfat.com

کی ابتدا ہوتی ہے ۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ آیات مدینہ کے یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئیں جنہوں نے آپؐ کو مدینہ سے نکالنے کے لیے ایک سازش تیار کی ۔ اس کے تحت وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے : یہ سرزمین تو انبیاء کی سرزمین نہیں ہے ۔ انبیاء کا علاقہ تو شام ہے ۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپؐ کی دعوت ترقی کرے تو وہاں چلے جائیے ۔

لیکن ۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ سورت مکی ہے ، دوسری شانِ نزول درست معلوم نہیں ہوتی ۔ علاوہ ازیں جیسا کہ ہم تفسیر میں دیکھیں گے زیرِ نظر آیات کے الفاظ بھی اس شانِ نزول سے مناسبت نہیں رکھتے ۔

تفسیر

ایک اور منحوس سازش

گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ مشرکین طرح طرح کے وسوسوں کے ذریعے رسول اکرمؐ پر اثر انداز ہونا چاہتے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ آپؐ کو جادۂ مستقیم سے اِدھر اُدھر کر دیں لیکن لطفِ الٰہی نے نبی کریمؐ کی مدد کی اور مشرکوں کی سازشیں نقش بر آب ہوگئیں ۔

اس واقعہ کے بعد زیرِ بحث آیات بتاتی ہیں کہ انہوں نے رسول اللہؐ کی دعوت کو ناکام بنانے کے لیے ایک پلان تیار کیا ۔ اس کے مطابق ان کا پروگرام تھا کہ آپؐ کو آپؐ کے پیدائشی وطن سے دُور کسی ایسی جگہ جلاوطن کر دیں کہ جو ویران ، غیر متحرک اور دور افتادہ ہو ۔ ان کا یہ منصوبہ بھی لطفِ الٰہی سے ناکام ہوگیا ۔

زیرِ نظر پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے : قریب تھا کہ وہ ایک شاطرانہ سازش کے ذریعے تجھے اس سرزمین سے باہر نکال دیں (وان کادوا لیستفزونک من الارض لیخرجوک منھا) ۔

" یستفزون " کا مادہ " استفزاز " ہے یہ کبھی بیخ کنی کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی سرعت اور مہارت کے ساتھ کسی کو کسی کام پر ابھارنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔ اس مادہ کے ان معانی کی طرف توجہ کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین نے بڑی سوچ سمجھ کے ایک سازش تیار کی تھی کہ حالات ایسے پیدا کر دیئے جائیں کہ جنہیں رسول اللہؐ گوارا نہ کر سکیں یا سادہ لوح افراد کو رسول اللہؐ کے خلاف اس قدر بھڑکا دیا جائے کہ وہ آپؐ کو مکہ سے نکال کر دم لیں ۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی طاقت سے بالاتر خدائے بزرگ و برتر کی قدرت ہے اور وہ اس کے ارادے کے مقابلے میں بہت ہی ناتواں ہیں ۔

Marfat.com

اس کے بعد قرآن انہیں خبردار کرتا ہے کہ "اگر وہ اس قسم کا کام انجام دیتے تو تیرے بعد زیادہ دیر تک باقی نہ رہ سکتے (واذا لا یلبثون خلافک الا قلیلاً)۔

اور وہ بہت جلد نابود ہو جاتے کیونکہ یہ بہت ہی بڑا گناہ ہے کہ لوگ اپنے ہمدرد اور نجات بخش رہبر کو اپنے شہر سے نکال دیں اور اس طرح سے خدا کی سب سے بڑی نعمت کا کفران کریں۔ لوگ ایسے کام کے بعد زندہ رہنے کا حق نہیں رکھتے اور خدا کا نابود کن عذاب ان کے پاس آکے رہے گا۔

یہ بات صرف مشرکین عرب سے مربوط نہیں ہے "یہ اُن انبیاء کے ساتھ سنت رہی ہے جنہیں ہم نے تجھ سے پہلے بھیجا اور ہماری سنت کبھی نہیں بدلتی" (سنة من قد ارسلنا قبلک من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحویلاً)۔

اس سنت کا سرچشمہ ایک واضح منطق ہے اور وہ یہ کہ اس قسم کی ناشکری قوم کہ جو اپنے چراغ ہدایت کو خود بجھا دے جو اپنی نجات کے لنگر کو خود گنوا دے اور اپنے ایسے طبیب کو آزار پہنچائے جو ان کے جانکاہ امراض کا علاج کرنے والا ہو۔ یقیناً ایسی قوم رحمتِ الٰہی کے لائق نہیں اور اسے عذاب آ لے گا۔

ہم جانتے ہیں کہ ایسے نہیں ہو سکتا کہ خدا اپنے بندوں میں تبعیض و امتیاز کا قائل نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی ایک عمل پر بعض کو تو سزا دے اور بعض کو چھوڑ دے۔ ایک جیسے حالات میں ایک جیسے اعمال پر ایک جیسی سزا دیتا ہے ۔ یہ ہے پروردگار کی سنت کا تبدیل نہ ہونا۔ جبکہ خود غرض انسانوں کے طور طریقے اور اصول ہر روز ان کے مفادات کی روشنی میں بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ آج ایک چیز ان کے لیے سود مند ہے تو آج کی سنت اور ہے اور کل اگر ان کا مفاد کسی اور میں ہے تو کل ان کا اصول کوئی اور ہو گا، یہاں تک کہ ایک ہی سانس میں متضاد طور طریقے اختیار کر لیتے ہیں۔

انسانی معاشرے میں سنن اور طور طریقے یا تو مجہول معاملات کی وجہ سے بدل جاتے ہیں۔ اس طرح سے کہ مجہول معاملات وقت گزرنے کے ساتھ واضح ہو جاتے ہیں جس سے یہ کھلتا ہے کہ ماضی میں لوگ اشتباہات میں تھے یا پھر مخصوص مفادات اور حالات کے تقاضے بدل جاتے ہیں یا پھر ایسا خود غرضی کی بناء پر ہوتا ہے جبکہ خدا کی پاک ذات میں ان مسائل کی کوئی گنجائش نہیں اس نے حکمت کی بناء پر جو سنت مقرر کی ہوتی ہے ان حالات کے لیے وہ ہمیشہ جاری رہتی ہے۔

Marfat.com

۷۸ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيۡلِ وَ
قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ‌ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ كَانَ مَشۡهُوۡدًا ○
۷۹ وَمِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ‌ۖ عَسٰٓى اَنۡ يَّبۡعَثَكَ
رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ○
۸۰ وَقُلْ رَّبِّ اَدۡخِلۡنِىۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِىۡ مُخۡرَجَ
صِدۡقٍ وَّاجۡعَلۡ لِّىۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ سُلۡطٰنًا نَّصِيۡرًا ○
۸۱ وَقُلۡ جَآءَ الۡحَـقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ‌ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ
كَانَ زَهُوۡقًا ○

ترجمہ

۷۸ نماز قائم کر زوالِ خورشید سے لے کر (نصف) شب کی انتہائی تاریکی تک اور
اسی طرح قرآنِ فجر (نمازِ فجر) کیونکہ قرآنِ فجر کا (رات اور دن کے فرشتے) مشاہدہ
کرتے ہیں۔

۷۹ رات کے ایک حصے میں نیند سے اٹھ کھڑا ہو اور قرآن (نماز) پڑھ یہ تیرے
لیے ایک اضافی فریضہ ہے تاکہ تیرا پروردگار تجھے مقامِ محمود کی بلندی عطا کرے۔

۸۰ اور کہہ دے: پروردگار! مجھے (ہر کام میں) سچے طریقے سے داخل کر اور سچے
طریقے سے نکال اور اپنی طرف سے کسی کو میرا سلطان و مددگار قرار دے۔

۸۱ اور کہہ دے: حق آگیا اور باطل نابود ہوگا اور (اصولاً) باطل ہے ہی

Marfat.com

نابود ہونے والا۔

تفسیر

باطل کا انجام نابودی ہے

گزشتہ آیات میں توحید و شرک کے مسائل پر گفتگو تھی، مشرکوں کی سازشوں اور وسوسوں کا ذکر تھا۔ زیرنظر آیات میں نماز توجہ الی اللہ، عبادتِ خدا اور اس کے حضور میں تضرع و زاری کا ذکر ہے۔ یہ سب کچھ شرک کے مقابلے کے لیے مؤثر عامل ہے اور انسانی قلب و روح سے ہر قسم کے شیطانی وسوسے دور کرنے کا ذریعہ ہے۔

جی ہاں! نماز ہی ہے جو انسان کو خدا کی یاد دلاتی ہے، انسانی قلب و روح سے غبارِ گناہ کو صاف کرتی ہے اور شیطانی وسوسوں کو دُور کرتی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: زوالِ خورشید سے نصف شب تک نماز قائم کر اور اسی طرح قرآنِ فجر (یعنی نمازِ فجر) کیونکہ یہ وہ نماز ہے جس پر رات اور دن کے فرشتوں کی توجہ ہے (اقم الصلوٰة لدلوک الشمس الی غسق اللیل و قراٰن الفجر ان قراٰن الفجر کان مشهودًا)۔

"دلوک الشمس" کا معنی نصف النہار سے زوالِ آفتاب ہے کہ جو نمازِ ظہر کا وقت ہے۔ یہ "دلک" کے مادہ سے لیا گیا ہے اس کا معنی ہے "ملنا"، کیونکہ اس موقع پر سورج کی شدتِ تپش کے باعث انسان اپنی آنکھوں کو ملتا ہے یا پھر یہ ترکیب "دلك" سے مائل ہونے اور جھکنے کے معنی میں ہے چونکہ سورج اس موقع پر مقام نصف النہار سے مغرب کی طرف جھکتا ہے یا یہ کہ انسان اپنے ہاتھ کو سورج کے سامنے حائل کرتا ہے گویا اس کی روشنی کو اپنی آنکھوں سے دور کرتا ہے اور آنکھ کو دوسری طرف مائل کرتا ہے۔

بہرحال مصادرِ اہلِ بیتؑ سے پہنچنے والی روایت میں "دلوک" کا معنی زوالِ آفتاب ہی کیا گیا ہے۔ امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت مروی ہے۔ آپؑ سے عبید بن زرارہ نے اسی آیت کی تفسیر پوچھی تو امامؑ نے فرمایا:

> خدا نے مسلمانوں پر چار نمازیں واجب کی ہیں جن کی ابتداء زوالِ آفتاب ہے اور انتہا نصف شب ہے[1]۔

ایک اور روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ عظیم شیعہ محدث زرارہ نے اس آیت کی

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۱۱۵۔

Marfat.com

تفسیر کے متعلق سوال کیا تو امامؑ نے فرمایا :

دلوکھا زوالھا، غسق اللیل الی نصف اللیل ، ذٰلک اربع صلوات وضعھن رسول اللہ (ص) و وقتھن للناس و قراٰن الفجر صلوۃ الغداۃ

"دلوک الشمس" زوالِ آفتاب کے معنی میں ہے اور "غسق اللیل" آدھی رات کے معنی میں ہے۔ یہ چار نمازیں ہیں کہ جو رسول اللہؐ نے لوگوں کے لیے واجب قرار دی ہیں اور ان کا وقت معین کیا ہے اور "قراٰن الفجر" نمازِ صبح کی طرف اشارہ ہے [1]

البتہ بعض مفسرین نے "دلوک" کے معنی کے بارے میں کچھ اور احتمالات بھی ذکر کیے ہیں جو قابلِ ملاحظہ نہیں ہیں۔

باقی رہا "غسق اللیل" تو اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "غسق" کا معنی انتہائی تاریکی ہے اور رات کی انتہائی تاریکی نصف شب کے وقت ہوتی ہے، یہ آدھی رات کے معنی میں ہے۔

"قراٰن" کا معنی ہے "وہ چیز جسے پڑھا جائے" لہٰذا "قراٰن الفجر" بھی نتیجتاً نمازِ فجر کی طرف اشارہ ہے۔

ان مفاہیم کے پیشِ نظر زیر بحث آیت اُن آیات میں سے ہے جن میں پنجگانہ نمازوں کی طرف اجمالی طور پر اشارہ کیا گیا ہے۔ اسے دیگر متعلقہ آیات کے ساتھ باہم ملا کر دیکھا جائے تو اس سے نمازوں کے اوقات معین ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو بہت سی روایات مروی ہیں ان میں وضاحت سے پنجگانہ نماز کا وقت بتایا گیا ہے۔

یہاں اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ قرآن کی بعض آیات صرف ایک نماز کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مثلاً :

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلٰوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى

اپنی نماز کی حفاظت کرو اور نمازِ وسطیٰ کی (بقرہ - ۲۳۸)

صحیح تفسیر کے مطابق "صلوٰۃِ وسطیٰ" سے مراد نمازِ ظہر ہے۔

کبھی پنجگانہ نمازوں میں سے تین کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً :

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ (ہود - ۱۱۴)

اس آیت میں "طرفی النھار" نمازِ صبح اور نمازِ مغرب کی طرف اشارہ ہے اور "زلفاً من اللیل" نمازِ عشاء کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] نور الثقلین ج ۳ ص ۲۰۵۔

Marfat.com

کبھی قرآن میں پنجگانہ نمازوں کے اوقات اجمالی طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ اس کی مثال زیر بحث آیت ہے۔ (اس سلسلے میں مزید تفصیل ہم تفسیر نمونہ جلد نہم میں سورہ ہود کی آیہ ۱۱۴ کی تفسیر کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں)۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ ان آیات میں پنجگانہ نمازوں کے اوقات کی تفصیل بیان نہیں ہوئی بلکہ دیگر اسلامی احکام کی طرح صرف کلیات بیان کرنے پر اکتفاء کی گئی ہے۔ ان کی تشریح و تفصیل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے سچے جانشین آئمہ علیہم السلام کی سنت میں آئی ہے۔

ایک اور نکتہ جو اس جگہ باقی رہ جاتا ہے یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت کہتی ہے:

"ان قرآن الفجر کان مشهودا"

نمازِ صبح کو دیکھا جاتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کون اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔

آیت کے اس حصے کی تفسیر میں جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ان کے مطابق شب و روز کے فرشتے اس نماز کو دیکھتے ہیں کیونکہ ابتدائے صبح کے وقت رات کے فرشتے جو بندگانِ خدا کے نگران و محافظ ہوتے ہیں وہ دن کے فرشتوں کو اپنی جگہ سونپتے ہیں اور جب نمازِ صبح اسی طلوعِ سحر کے آغاز میں ادا کی جاتی ہے تو رات کو جانے والے اور دن کے آنے والے فرشتوں کے دونوں گروہ اس کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس پر گواہی دیتے ہیں۔ ایسی روایات شیعہ علماء نے بھی نقل کی ہیں اور سُنّی علماء نے بھی۔

تفسیر روح المعانی میں احمد، نسائی، ابن ماجہ، ترمذی اور حاکم کے حوالے سے ایک روایت رسولِ اکرمؐ سے نقل کی ہے۔ آپؐ نے اس جملے کی تفسیر میں فرمایا:

تشهده ملائكة الليل و ملائكة النهار

رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے اسے دیکھتے ہیں۔[1]

اہل سنت کے مشہور محدث بخاری اور مسلم نے بھی اپنی اپنی صحیح میں اس کا یہی معنی نقل کیا ہے۔[2]

اس تعبیر سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ نمازِ فجر کی ادائیگی کا بہترین موقع طلوعِ سحر کے ابتدائی لمحات ہیں۔

پنجگانہ واجب نمازوں کے ذکر کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: رات کے کچھ حصے میں نیند سے اٹھ کھڑا ہو اور قرآن پڑھ (ومن الليل فتهجد به)۔[3]

---

[1] و [2] تفسیر روح المعانی ج ۱۵ ص ۱۲۶۔

[3] جیسا کہ مفردات میں راغب نے کہا ہے "تہجد"، "ہجود" کے مادہ سے اصل میں نیند کے معنی میں ہے لیکن جب یہ لفظ باب تفعل میں استعمال ہوگا تو نیند اُڑ جانے اور بیداری کی حالت میں لوٹ آنے کے معنی دے گا۔ نیز "تهجد به" کی ضمیر قرآن کی طرف لوٹتی ہے۔ یعنی رات کے

(باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

مشہور اسلامی مفسرین نے اس تعبیر کو نوافلِ شب (نمازِ تہجد) کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ ان نوافل کی روایات میں بہت فضیلت بیان ہوئی ہے۔ آیت میں اگرچہ صراحت نہیں ہے لیکن ہمارے پاس موجود مختلف قرائن کے پیش نظر یہ تفسیر بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: تیرے لیے یہ واجب نمازوں کے علاوہ ایک اضافی ذمہ داری ہے (نافلۃً لک)۔

بہت سے علماء نے اس جملے کو اس امر کی دلیل جانا ہے کہ نمازِ شب رسول اللہؐ پر واجب ہے کیونکہ "نافلۃ" کا معنی ہے "زیادہ"۔ گویا یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ اضافی فریضہ صرف تجھ سے مربوط ہے۔

بعض دیگر علماء نے سورۂ مزمل کی آیات کے قرینے سے کہا ہے کہ نمازِ تہجد رسول اللہؐ پر پہلے سے واجب تھی البتہ زیرِ نظر آیت نے پہلے حکم کو منسوخ کرکے اس کے مستحب ہونے کا اعلان کیا ہے۔ لیکن یہ تفسیر کمزور معلوم ہوتی ہے کیونکہ لفظ "نافلہ" یہاں آج کے اصطلاحی معنی یعنی "مستحب نماز" کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اضافے کے معنی میں ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ نمازِ شب اگر رسول اللہؐ کے لیے واجب قرار دی گئی ہے تو یہ فرائضِ یومیہ پر اضافہ ہے۔

بہرحال آیت کے آخر میں اس الٰہی، روحانی اور قلب و روح کو پاک کرنے والے کام کا نتیجہ یوں بیان کیا گیا ہے: قریب ہے کہ اس عمل کے باعث خدا تجھے مقامِ محمود پر فائز کردے (عسیٰ ان یبعثک ربک مقامًا محمودًا)۔

اس میں شک نہیں کہ "مقامِ محمود" ایک بہت بڑا، اعلیٰ اور لائقِ ستائش مقام ہے کیونکہ "محمود" "حمد" کے مادہ سے ستائش و تعریف کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ یہاں چونکہ مطلق کے طور پر آیا ہے لہٰذا اشارہ ہے کہ اولین و آخرین سب تیرے مداح خواں ہیں۔

اسلامی روایات چاہے اہلِ بیتؑ سے مروی ہوں یا برادرانِ اہلِ سنت کی کتابوں میں، ان میں "مقامِ محمود" کی تفسیر "مقامِ شفاعتِ کبریٰ" کے طور پر کی گئی ہے کیونکہ پیغمبرِ اکرمؐ دوسرے جہان میں سب سے بڑے شفیع ہیں اور جو لوگ شفاعت کے لائق ہوں گے انہیں یہ عظیم شفاعت میسر آئے گی۔

بعد والی آیت میں اسلام کے ایک اصولی حکم کی طرف اشارہ ہے۔ ایسا اصولی حکم جس کا سرچشمہ روحِ ایمان و توحید ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کہہ دے: پروردگار! ہر کام میں ہمیں سچائی کے ساتھ داخل کر اور سچائی کے ساتھ نکال (وقل رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی

بقیہ گزشتہ صفحے کا حاشیہ: ایک حصہ میں بیدار رہ کر قرآن پڑھ۔ بعد ازاں یہ لفظ اہلِ شرع کی زبان میں نمازِ شب (نمازِ تہجد) کے لیے استعمال ہونے لگا اور "متہجد" نمازِ شب پڑھنے والے کو کہا جانے لگا۔

Marfat.com

مخرج صدق [۱] کوئی کام ایسا نہ ہو جسے میں سچائی اور صدق سے شروع نہ کروں اور اسی طرح کوئی کام ایسا نہ ہو جسے میں سچائی اور صدق پر تمام نہ کروں۔ سچائی، صداقت، راستی اور امانت ہی میرا اصل راستہ ہو اور ہر کام کا آغاز و انجام اسی سچائی کے ساتھ ہو۔

بعض مفسرین نے کوشش کی ہے کہ اس آیت کے وسیع مفہوم کو ایک یا کئی ایک مصادیق میں محدود کر دیا جائے، مگر پوری طرح واضح ہے کہ زیر بحث آیت کی یہ جامع تعبیر اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہر کام اور ہر پروگرام میں صادقانہ طور پر داخل ہوا جائے اور صادقانہ طور پر نکلا جائے۔

کامیابی کی اصل رمز درحقیقت اسی میں پوشیدہ ہے۔ انبیاء الٰہی اور اولیاء اللہ کی روش یہی تھی۔ ان کی فکر، ان کی گفتار اور ان کا عمل ہر قسم کی ملاوٹ، مکروفریب اور دھوکے سے پاک تھا۔ ہر وہ چیز جس میں صدق و راستی نہ ہو اس کا ان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اصولی طور پر وہ بہت سی بدبختیاں اور مسائل جو ہم آج دیکھ رہے ہیں اور جو افراد کو بھی دامن گیر ہیں اور اقوام و ملل کو بھی، اسی اصول سے انحراف کی وجہ سے ہیں۔ کہیں تو انہوں نے اپنے کام کی بنیاد ہی جھوٹ اور مکروفریب پر رکھی ہے اور کہیں وہ کاموں کا آغاز تو سچائی کے ساتھ کرتے ہیں لیکن آخر تک اس سچائی پر باقی نہیں رہتے۔ ان کی ناکامی کا یہی عامل ہے۔

دوسری بات جو آیت کے آخر میں بیان کی گئی ہے وہ دراصل شجرِ توحید کا ثمر ہے اور دوسرے حوالے سے کاموں میں سچائی کے ساتھ داخل ہونے اور نکلنے کا نتیجہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خداوندا! اپنی طرف سے سلطان و مددگار قرار دے (واجعل لی من لدنک سلطانًا نصیرًا)۔ کیونکہ میں اکیلا ہوں اور تنہا کوئی کام انجام نہیں دے سکتا۔ خود اپنی طاقت کے بھروسے پر ان مشکلات کے مقابلے میں کامیابی حاصل نہیں کر سکوں گا۔ تُو میری مدد کر اور تُو میرے لیے مددگار فراہم کر۔

اس راستے میں مجھے طاقتور منطق، دشمن کے مقابل دندان شکن دلائل، جانباز دوست، قوی ارادہ، روشن فکری اور رشاد عقل مرحمت فرما تاکہ یہ تمام چیزیں میری مددگار ہوں۔ تُو ہی یہ سب کچھ عطا فرما کیونکہ تیرے علاوہ یہ کام کسی کے بس کا نہیں۔

صدق و توکل کے بعد حتمی کامیابی کی امید بذاتِ خود کامیابی کا ایک عامل ہے لہٰذا زیر نظر آخری آیت میں خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر سے کہتا ہے: کہہ دے: حق آگیا اور باطل نابود ہوگیا (وقل جاء الحق وزهق الباطل) [۲]

---

[۱] "مدخل" اور "مخرج" یہاں داخل ہونے اور نکلنے کے مصدری معنی میں ہیں۔

[۲] "زهق"، "زھوق" کے مادہ سے ہلاکت و نابودی کے معنی میں ہے اور "زھوق" (بروزن "قبول") مبالغے کا صیغہ ہے اس کا معنی ہے ایسی چیز جو پوری طرح محو اور نابود ہوجائے۔

Marfat.com

اور اصولی طور پر باطل ہے ہی نابود ہونے والا (ان الباطل کان زھوقا)۔
باطل بہت زور دکھاتا ہے لیکن اس کے لیے دوام و بقا نہیں ہے۔ کامیابی آخر کار حق اور اہل حق کے لیے ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ نمازِ تہجد ایک عظیم روحانی عبادت ہے: دن بھر کا شور مختلف حوالوں سے انسان کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے اور انسانی افکار کو طرح طرح کی وادیوں میں لیے پھرتا ہے۔ ایسے میں دل جمعی اور حضورِ قلب بہت مشکل ہوتا ہے ــ لیکن ــ رات کی تاریکی میں وقت سحر جب مادی زندگی کا ہنگامہ نہیں ہوتا اور کچھ دیر سو جانے کے بعد جب انسانی جسم و روح کو سکون ملتا ہے۔ اس وقت انسان نشاط اور توجہ کی ایک خاص بے مثل کیفیت میں ہوتا ہے۔ ریا سے پاک، خود نمائی سے دور اور حضورِ قلب کے اس ماحول میں انسانی آمادگی کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو بہت زیادہ روح پرور اور کمال آفریں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دوستانِ خدا اور محبانِ خدا ہمیشہ رات کے پچھلے پہر عبادت کے ذریعے روح کی پاکیزگی، دل کی زندگی، ارادے کی تقویت اور خلوص کی تکمیل کے لیے قوت حاصل کرتے ہیں۔

ابتدائے اسلام میں بھی پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی روحانی طریقہ سے استفادہ کرتے ہوئے مسلمانوں کی تربیت کی اور ان کی شخصیت کو اتنا بلند کر دیا کہ وہ پہلے والے انسان معلوم ہی نہ ہوتے تھے گویا آپؐ نے ان کے اندر سے نئے انسان پیدا کر دیئے۔ وہ انسان جن کا ارادہ پختہ تھا۔ جو بہادر، باایمان، پاکباز اور باخلوص تھے اور شاید "مقامِ محمود" کہ جس کا ذکر زیرِ بحث آیات میں نمازِ شب کے نتیجے کے طور پر ہے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہو۔

نمازِ تہجد کی فضیلت میں مروی روایات بھی اسی حقیقت کو واضح کرتی ہیں۔ ہم ذیل میں چند مثالیں ذکر کرتے ہیں:

(۱) پیغمبرِ اسلامؐ فرماتے ہیں:

خیرکم من اطاب الکلام واطعم الطعام وصلی باللیل والناس نیام

تم میں سے بہترین وہ شخص ہے جو بات بڑے ادب سے اور پاکیزگی سے کرے بھوکوں کو کھانا کھلائے اور رات جب لوگ سو رہے ہوں وہ اٹھ کر نماز پڑھے۔[۱]

(۲) امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[۱] بحار الانوار ج ۸۷ ص ۱۴۲ تا ص ۱۴۸۔

Marfat.com

قیام اللیل مصحة للبدن و مرضاة للرب عزوجل و تعرض للرحمة و تمسك باخلاق النبیین

رات کو اٹھ کر تہجد پڑھنا صحت بدن اور خوشنودیٔ خدا اور اس کی رحمت کا وسیلہ ہے اِس عبادت سے انسان نبیوں کے اخلاق سے وابستہ ہوجاتا ہے[۱]

(۳) امام صادق علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا:

لاتدع قیام اللیل فان المغبون من حرم قیام اللیل

نمازِشب کے لیے اٹھنا ترک نہ کرو۔ وہ شخص خسارے میں ہے جو قیامِ شب سے محروم ہے[۲]

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں:

من صلی باللیل حسن وجهه بالنهار

جو شخص نمازِشب پڑھتا ہے دن کے وقت اس کی صورت (وسیرت) اچھی ہوگی[۳]

(۵) ایک شخص حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کی خدمت میں آیا۔
اس نے عرض کی: مَیں نمازِشب سے محروم ہوگیا ہوں۔
آپؑ نے فرمایا:

انت رجل قد قیدتک ذنوبک

تجھے تیرے گناہوں نے گرفتار کر لیا ہے[۴]

(۶) امام صادق علیہ السلام سے ایک حدیث ان الفاظ میں منقول ہے:

ان الرجل لیکذب الکذبة و یحرم بها صلٰوة اللیل فاذا حرم بها صلٰوة اللیل حرم بها الرزق

انسان کبھی ایسا جھوٹ بولتا ہے کہ اس کی وجہ سے نمازِ تہجد سے محروم ہوجاتا ہے اور جب نمازِشب سے محروم ہوتا ہے تو روزی (اور مادی و روحانی نعمتوں) سے بھی محروم ہوجاتا ہے[۵]

(۷) ہم جانتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کبھی نمازِشب ترک نہیں کرتے تھے لیکن اس نماز کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے باوجود پیغمبر اکرمؐ نے اپنی وصیتوں میں ان سے فرمایا:

اوصیك فی نفسی بخصال فاحفظها

ثم قال: اللّٰهم اعنه ..... وعلیك بالصلٰوة اللیل، وعلیك بالصلٰوة

۱، ۲، ۳ بحارالانوار ج ۸۰ ص ۱۴۲ تا ص ۱۴۸۔

۴، ۵ بحارالانوار ج ۸۰ ص ۱۴۲ تا ص ۱۴۸۔

Marfat.com

اللیل ، وعلیك بالصلوة اللیل

میں تمہیں چند امور کی وصیت کرتا ہوں ان کی حفاظت کرنا

....

یہاں تک کہ فرمایا :

تیرے لیے نمازِ شب ضروری ہے ، تیرے لیے نمازِ شب ضروری ہے ، تیرے لیے نمازِ شب ضروری ہے [1]

(۸) پیغمبرِ اسلامؐ نے جبریل سے فرمایا کہ مجھے کوئی نصیحت کرو تو انہوں نے کہا :

یا محمد عش ماشئت فانک میت ، واحبب ماشئت فانك مفارقه ، واعمل ماشئت فانك ملاقیه ، واعلم ان شرف المؤمن صلوته باللیل ، وعزّه کفه عن اعراض الناس

یا محمدؐ ! جتنا چاہو جی لو آخر مرنا ہے ، جس سے چاہو محبت کرلو آخر اس سے بچھڑنا ہے ، جو کام چاہو کرلو آخر اپنے عمل کو دیکھنا ہے اور یہ بھی جان لو کہ مومن کا شرف اس کی نمازِ شب میں ہے اور اس کی دوسروں کو بے عزت کرنے سے بچنے میں ہے [2]

جبریلؑ کی یہ ملکوتی نصیحتیں کہ جو بہت سوچی سمجھی اور جچی تُلی ہیں ، نشاندہی کرتی ہیں کہ نمازِ تہجد انسان کی تربیت ، روحانیت اور ایمان افروزی میں اس قدر پُر تاثیر ہے کہ اس کے شرف اور اس کی آبرو کا سرمایہ بن جاتی ہے جیسا کہ لوگوں کی آبرو سے مزاحم نہ ہونا اُس کی عزت کا سبب بنتا ہے ۔

(۹) امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

ثلاثة هن فخر المؤمن و زینة فی الدنیا والاٰخرة ، الصلوة فی اٰخر اللیل ویأسه مما فی ایدی الناس و ولایة الامام من اٰل محمد

تین چیزیں مومن کے لیے باعثِ افتخار ہیں اور دنیا و آخرت کی زینت ہیں :

۱۔ آخرِ شب کی نماز

۲۔ لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے اعتنائی کرنا اور

۳۔ آلِ محمدؐ میں سے امام برحق کی حکومت و ولایت ۔

(۱۰) امام صادق علیہ السلام ہی سے منقول ہے ، فرمایا :

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۵ ص ۲۶۸ ۔

[2] وسائل الشیعہ ج ۵ ص ۲۶۹ ۔

Marfat.com

ایک با ایمان شخص جو کوئی بھی نیک کام انجام دیتا ہے، اس کی جزا و ثواب کا قرآن میں صراحت سے ذکر ہے، سوائے نمازِ تہجد کے۔ کیونکہ اس کی انتہائی زیادہ اہمیت کے پیشِ نظر اس کا ثواب صراحت سے بیان نہیں کیا گیا اور صرف اسی قدر فرمایا گیا ہے:

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۖ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (السجدہ-۱۶،۱۷)

وہ رات کے وقت اپنے بستروں سے اٹھتے ہیں اور اپنے رب کو خوف و امید کی ملی جلی کیفیت میں پکارتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں لیکن کوئی شخص نہیں جانتا کہ خدا نے ان کے لیے کیسی کیسی جزاء رکھی ہے۔ ایسی جزاء کہ جو اُن کی آنکھوں کو ٹھنڈا کر دے گی۔[1]

البتہ۔ نمازِ شب کے بہت سے آداب ہیں۔ مناسب ہوگا اس کی اجمالی کیفیت ہم یہاں بیان کریں تاکہ اس روحانی عمل کے سچے عاشق اس سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔

انتہائی سادہ شکل میں نمازِ تہجد کی گیارہ رکعتیں ہیں، ان کے مندرجہ ذیل تین حصے ہیں:

ا۔ دو دو کر کے آٹھ رکعتیں۔ انہیں نافلۂ شب کہتے ہیں۔

ب۔ دو رکعت "نافلۂ شفع"

ج۔ ایک رکعت جسے "نافلۂ وتر" کہتے ہیں۔

انہیں بالکل نمازِ صبح کی طرح ادا کرنا ہے۔ البتہ ان میں اذان و اقامت نہیں ہے نیز نمازِ وتر کے قنوت کو جتنا طول دیا جا سکے بہتر ہے۔[2]

۲۔ **"مقامِ محمود" کیا ہے؟** : جیسا کہ الفاظ بتا رہے ہیں "مقامِ محمود" ایک وسیع معنی رکھتا ہے۔ اس میں ہر وہ مقام شامل ہے جو لائقِ تعریف و ستائش ہے لیکن مسلّم ہے کہ یہاں ایسے ممتاز اور انتہائی اعلیٰ مقام کی طرف اشارہ ہے کہ جو پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عبادتِ شب، آہِ سحرگاہی اور دعائے نیم شب سے حاصل ہوا۔

مفسرین میں مشہور ہے اور ہم بھی پہلے کہہ چکے ہیں یہ آپؐ کے لیے مقامِ شفاعتِ کبریٰ ہے۔

متعدد روایات میں بھی یہ تفسیر بیان ہوئی ہے۔ تفسیر عیاشی میں ہے کہ امام باقر علیہ السلام یا امام صادق علیہ السلام نے اس آیت "عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محمودًا" کی تفسیر میں فرمایا:

---

[1] بحار الانوار ج ۸۷ صفحہ ۱۴۰۔

[2] کچھ فقہاء نے یہ احتیاط بیان کی ہے کہ شفع میں قنوت نہ پڑھا جائے یا پھر قصد رجاء سے پڑھا جائے۔

Marfat.com

هي الشفاعة
یہ شفاعت ہی ہے۔

بعض مفسرین نے کوشش کی ہے کہ خود آیت کے مفہوم سے یہ حقیقت اخذ کریں۔ ان کا خیال ہے "عسٰی ان یبعثك" اس بات کی دلیل ہے کہ یہ وہ مقام ہے جو خدا تجھے عطا کرے گا ایسا مقام کہ جو سب کو تعریف پر ابھارے گا کیونکہ سب کو اس سے فائدہ پہنچے گا (کیونکہ زیر بحث جملے میں لفظ "محمود" مطلق طور پر آیا ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی قید یا شرط نہیں ہے)۔

علاوہ ازیں تعریف و ثنا ایک اختیاری عمل پر ہوتی ہے اور ان صفات کی حامل چیز رسول اللہؐ کے عمومی مقام شفاعت کے سوا اور کوئی نہیں ہے[1]

یہ احتمال بھی ہے کہ مقام محمود پروردگار کے انتہائی قرب کا نام ہو کہ جس کے آثار میں سے ایک شفاعت کرنا بھی ہے (غور کیجئے گا)۔

اس آیت میں اگرچہ ظاہراً رسول اللہؐ مخاطب ہیں لیکن اس حکم کو ایک لحاظ سے عمومیت دی جا سکتی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ تمام باایمان افراد کو جو تلاوتِ شب اور نمازِ شب کے الٰہی روحانی کام کو انجام دیتے ہیں "مقام محمود" سے اپنا حصہ لیں گے اور اپنے ایمان و عمل کے حساب سے بارگاہِ قربِ الٰہی تک رسائی حاصل کریں گے اور اسی نسبت سے راستے بھولے بھٹکوں کے شفیع اور دستگیر ہوں گے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر مومن اپنے ایمان کی شعاع کے اعتبار سے مقام شفاعت سے ہمکنار ہو گا لیکن اس آیت کا اتم و اکمل مصداق پیغمبر اکرمؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔

۳۔ کامیابی کے تین عوامل: حق و باطل کے معرکوں میں باطل کا لشکر عام طور پر مقدار اور ساز و سامان کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود کم تعداد اور کم وسائل کے ہوتے ہوئے حق کا لشکر حیران کن کامیابیاں حاصل کرتا ہے۔ بدر، احزاب اور حنین کی جنگیں اس کی مثالیں ہیں۔ خود ہمارے زمانے میں ہم نے دیکھا کہ مستضعف حلقوں نے سُوپر طاقتوں کے خلاف اپنی انقلابی جدوجہد میں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

یہ اس لیے ہے کہ حامیانِ حق خاص روحانی طاقت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہی طاقت ایک "انسان" سے ایک "امت" بناتی ہے۔

زیر بحث آیات میں کامیابی کے تین اہم عوامل بتائے گئے ہیں۔ مسلمانوں نے آج کل ان عوامل سے زیادہ تر دُوری اختیار کر رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مستکبر دشمنوں سے مسلسل ہزیمتیں اٹھا رہے ہیں۔

---

[1] المیزان ج ۱ صفحہ ۱۷۵۔

Marfat.com

یہ تین عوامل یہ ہیں :

۱ و ۲ : کاموں میں سچائی کے ساتھ داخل ہونا اور نکلنا اور یہ طرزِ عمل مسلسل اختیار کیے رکھنا :

رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق

۳ ۔ قدرتِ الٰہی پر بھروسہ اور خود اعتمادی نیز دوسروں سے ہر قسم کی وابستگی اور انحصار کا خاتمہ :

واجعل لی من لدنک سلطانًا نصیرًا

لہٰذا کامیابی کے لیے سچائی کی سیاست سے زیادہ مؤثر کوئی چیز نہیں اور استقلال، غیر پر عدم انحصار اور توکل علی اللہ سے بہتر و برتر کوئی سہارا نہیں۔ مسلمان ان دشمنوں کے خلاف کیونکر کامیابی حاصل کر سکتے ہیں جنہوں نے ان کے وسائلِ حیات لوٹ لیے ہیں جبکہ وہ فوجی، اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے خود انہی دشمنوں سے وابستہ ہیں۔ اور انہی پر انحصار کرتے ہیں۔ وہ ہتھیار جو ہم نے ایک دشمن سے خریدا ہے اس کی مدد سے اس دشمن پر ہم کیسے کامیابی حاصل کر سکتے ہیں — یہ کیسا خام خیال اور غلط اندازِ فکر ہے۔

۴ ۔ کامیابی حق کے لیے اور نابودی باطل کے لیے : مندرجہ بالا آیات میں ایک اور کلی اور بنیادی اصول اور خدا کی ایک دائمی سنت کا تذکرہ ہے۔ یہ وہ اصول اور سنت ہے جو حق کے تمام پیروکاروں کے لیے ولولہ انگیز ہے۔ وہ یہ ہے کہ آخر کار حق کامیاب اور باطل قطعی طور پر نابود ہونے والا ہے۔

باطل صولت و دولت کا مظاہرہ کرتا ہے، کرّ و فرّ دکھاتا ہے، کڑکتا اور گرجتا ہے لیکن اس کی عمر مختصر ہے اور آخر کار نابودی کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔

یا پھر قرآن کے بقول — باطل پانی کے اوپر کی جھاگ کی مانند ہے، آنکھ مچولی کرتا ہے، شور و غوغا برپا کرتا ہے اور پھر خاموش ہو جاتا ہے اور پانی کہ جو سببِ حیات ہے باقی رہ جاتا ہے — قرآنی الفاظ میں :

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ ؕ (رعد - ۱۷)

اس بات کی دلیل خود لفظ "باطل" میں پنہاں ہے کیونکہ باطل سے مراد ایسی چیز ہے جو عالمِ خلقت کے قوانین سے ہم آہنگ نہیں ہے اور جس کا واقعیت اور حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا وجود بناوٹی، پُرفریب، بے اصل اور بے بنیاد ہے۔ یہ اندر سے کھوکھلا ہے۔ مسلّم ہے جس چیز کی یہ صفات ہوں وہ زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتی۔

لیکن — "حق" عین واقعیت ہے، راستی و درستی پر مبنی ہے، اس کی اصل اور بنیاد ہے، اس میں گہرائی ہے اور یہ قوانینِ آفرینش سے ہم آہنگ ہے۔

اور ایسی چیز کو بہرحال باقی رہنا چاہیے۔

حق کے پیروکار ایمان کے ہتھیار سے لیس ہوتے ہیں۔ وہ ایفائے عہد کی منطق پر یقین رکھتے ہیں، صدقِ حدیث، فداکاری اور سرفروشی ان کی خصوصیات ہیں۔ وہ شہادت تک جانبازی دکھاتے رہنے پر آمادہ ہوتے

Marfat.com

ہیں۔ علم و آگہی کے نور نے ان کا دل روشن کر رکھا ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور اس کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کرتے۔ یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔

۵۔ آیت "جاء الحق ..." اور قیام مہدیؑ: بعض روایات میں "جاء الحق وزھق الباطل" کے جملے کی تفسیر قیام حضرت مہدی علیہ السلام کے حوالے سے کی گئی ہے۔

امام باقر علیہ السلام نے فرمایا:

خدا کے اس کلام کا مفہوم یہ ہے کہ:

اذا قام القائم ذھبت دولة الباطل

جس وقت امام قائم قیام کریں گے باطل کی حکومت ختم ہو جائے گی[1]

ایک اور روایت میں:

جب مہدی پیدا ہوئے تو ان کے بازو پر کندہ تھا:

جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا[2]

مسلّم ہے کہ ان احادیث کا مطلب یہ نہیں کہ آیت کا مفہوم اسی ایک مصداق میں منحصر ہے بلکہ ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قیامِ مہدی اس آیت کے واضح ترین مصادیق میں سے ہے کہ جب پوری دنیا میں باطل پر حق کو آخری فتح حاصل ہو گی۔

پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات میں ہے کہ فتح مکّہ کے روز آپؐ مسجد الحرام میں داخل ہوئے وہاں عرب قبائل کے ۳۶۰ بُت خانۂ کعبہ کے گرد رکھے ہوئے تھے۔ آپؐ اپنے عصائے مبارک سے ہر ایک کو یکے بعد دیگرے سرنگوں کرتے تھے اور مسلسل فرما رہے تھے:

جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقًا

آگیا حق اور مٹ گیا باطل

باطل کو تو مٹنا ہی تھا۔

مختصر یہ کہ یہ اللہ کا ایک کلّی قانون اور خلقت کا غیر متبدل اصول ہے۔ ہر دَور میں اس کا اپنا مصداق ہے۔ پیغمبرِ اکرمؐ کے قیام اور شرک و بُت پرستی کے لشکر پر آپؐ کی کامیابی اس کا ایک روشن رُخ ہے اور اسی طرح عالمی ستمگروں اور جابروں کے خلاف قیام مہدیؑ (ارواحنا له الفداء) اس کا ایک اور تابناک مصداق ہے۔

اسی طرح قانونِ الٰہی ہے کہ وہ راہِ حق کے راہیوں کو مشکلات میں پُرامید، قوی اور پُر استقامت رکھتا ہے اور اسلام کے لیے ہماری کاوشوں پر ہمیں نشاط اور قوت بخشتا ہے۔

---

[1] و [2] نور الثقلین ج ۳ ص ۲۱۲ و ص ۲۱۳۔

Marfat.com

(۸۲) وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ○

ترجمہ

(۸۲) ہم قرآن نازل کرتے ہیں کہ جو مومنین کے لیے شفاء اور رحمت ہے اور اس سے ستمگروں کے لیے نقصان و زیان کے سوا کچھ اضافہ نہیں ہوتا۔

تفسیر

قرآن شفابخش نسخہ ہے

گزشتہ آیات میں توحید اور حق کے بارے میں گفتگو تھی نیز شرک اور باطل کے خلاف جدوجہد کے بارے میں بات تھی۔ زیر بحث آیت میں قرآن کی انتہائی اثر انگیزی اور تعمیری تاثیر کے بارے میں بات کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم قرآن نازل کرتے ہیں کہ جو مومنین کے لیے شفا اور رحمت کا سبب ہے (وننزل من القراٰن ما ھو شفاء و رحمة للمؤمنین)۔ لیکن ظالم (جیسا کہ ان کا ہمیشہ سے وطیرہ ہے اس وسیلۂ ہدایت سے فائدہ اٹھانے کی بجائے) اس سے اپنی زیاں کاری میں اضافے کے سوا کچھ نہ پائیں گے (ولا یزید الظالمین الّا خسارًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ "من القراٰن" میں لفظ "من" کا مفہوم: ہم جانتے ہیں کہ لفظ "من" ایسے مواقع پر ایک حصّہ کے مفہوم میں آتا ہے لیکن چونکہ شفا اور رحمت ہونا قرآن کے کسی ایک حصے سے مخصوص نہیں ہے یہ تمام آیاتِ قرآن کا قطعی اثر ہے لہٰذا بزرگ مفسرین نے لفظ "من" کو یہاں تبعیضیہ کی بجائے بیانیہ سمجھا ہے۔

لیکن بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ "من" یہاں بھی تبعیض کے مفہوم میں ہے اور یہ قرآن کے تدریجی نزول کی طرف اشارہ ہے (خصوصاً جبکہ "ننزل" فعل مضارع ہے) اس صورت میں جملے کا معنی تقریباً یہ ہوگا:

Marfat.com

ہم قرآن نازل کرتے ہیں اور اس کا جو حصہ بھی نازل ہو وہ خود سے شفاء اور رحمت کا سبب ہے۔ (غور کیجئے گا)۔

۲۔ "شفاء" اور "رحمت" میں فرق: ہم جانتے ہیں کہ شفاء عام طور پر امراض، عیوب اور نقائص کے مقابلے میں ہوتی ہے۔ لہٰذا انسانوں کے لیے قرآن کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ فرد اور معاشرے کو فکری و اخلاقی ہر طرح کی بیماریوں سے پاک کرتا ہے۔

اس کے بعد "رحمت" کا مرحلہ آتا ہے۔ یہ دراصل انسانی اخلاق کو اخلاق الٰہی کے سانچے میں ڈھالنے کا مرحلہ ہے۔ اس مرحلے میں قرآن انسانی وجود میں اعلیٰ انسانی فضائل کے شگوفوں کی پیوندکاری کرتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں "شفاء" پاکسازی کی طرف اور "رحمت" تعمیر نو کی طرف اشارہ ہے یا فلاسفہ اور عرفاء کی اصطلاح میں پہلے مقام "تخلیہ" اور پھر مقام "تحلیہ" کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔ ظالموں پر اُلٹا اثر کیوں ہوتا ہے؟: صرف اسی آیت میں نہیں بلکہ قرآن کی بہت سی دوسری آیات میں بھی ہم پڑھتے ہیں کہ دشمنانِ حق نورِ آیاتِ الٰہی سے اپنا قلب و روح منور کرنے کی بجائے اور اپنی تاریکیاں کم کرنے کی بجائے ان پر الٹا اثر لیتے ہیں۔ ان سے ان کی جہالت اور شقاوت میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔

یہ اس لیے ہے چونکہ کفر، ظلم اور نفاق کے باعث ان کا ضمیر ہی دوسری شکل اختیار کر چکا ہوتا ہے لہٰذا جہاں کہیں وہ نورِ حق دیکھتے ہیں اس سے جنگ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور حق کے خلاف ان کی یہ معرکہ آرائی ان کی ناپاکیوں اور غلاظتوں میں اضافہ ہی کرتی ہے اور ان کے سرکشی کے جذبے اور قوی ہو جاتے ہیں۔

ایک مقوی غذا اگر کسی عالم مجاہد اور دانشمند مبارز کو دی جائے تو وہ اس سے تعلیم و تربیت یا راہِ خدا میں جہاد کے لیے قوت حاصل کرے گا لیکن یہی مقوی غذا اگر کسی ظالم کو دیں تو وہ زیادہ ظلم کے لیے اس سے استفادہ کرے گا۔ یہاں غذا میں فرق نہیں بلکہ مزاج اور طرزِ فکر میں اختلاف ہے۔

قرآنی آیات بارش کے قطروں کی مانند ہیں۔ باغ میں یہ قطرے گل و لالہ اگاتے ہیں اور شور زمین میں خس و خاشاک۔

لہٰذا قرآن سے استفادہ کے لیے پہلے آمادگی کی ضرورت ہے، استعداد و قبولیت کی حاجت ہے اصطلاح میں کہتے ہیں فاعل کی فاعلیت کے ساتھ ساتھ محل کی قابلیت بھی شرط ہے۔

اسی بحث سے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ قرآن کہ جو سبب ہدایت ہے وہ ان افراد کو ہدایت کیوں نہیں کرتا — کیونکہ — قرآن بلاشبہ گمراہوں کی ہدایت کا باعث ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ

Marfat.com

حق کی تلاش میں ہوں — لہٰذا وہ اسی جذبے سے دعوتِ قرآن کی طرف آئیں گے اور حق فہمی کے لیے اپنی عقل و فکر استعمال کریں گے۔

لیکن ہٹ دھرم، متعصب اور سوگند کھائے ہوئے حق کے دشمن قرآن کی طرف سو فیصد منفی حالت میں آئیں گے۔ ظاہر ہے اس طرح وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھائیں گے بلکہ ان کے عناد اور کفر میں اضافہ ہوگا کیونکہ غلط عمل کے تکرار سے انسانی روح میں یہ اور گہرا ہو جاتا ہے۔

۴۔ معاشرتی اور اخلاقی بیماریوں کے لیے ایک مؤثر دوا: اس میں شک نہیں کہ انسان کی روحانی و اخلاقی بیماریاں اس کی جسمانی بیماریوں سے بہت مشابہت رکھتی ہیں۔ دونوں طرح کی بیماریاں انسان کی دشمن ہیں دونوں کے لیے طبیب، علاج اور پرہیز کی ضرورت ہے۔ دونوں طرح کی بیماریاں ایک سے دوسرے کو لگ سکتی ہیں۔ دونوں کا بنیادی سبب جاننا چاہیئے اور دونوں کی اصل جڑ کو معلوم کر کے علاج کرنا چاہیئے۔

دونوں طرح کی بیماریاں بعض اوقات ایسے مرحلے پر پہنچ جاتی ہیں کہ انسان کو لاعلاج کر دیتی ہیں البتہ اکثر مواقع پر یہ قابلِ علاج ہوتی ہیں۔

یہ کیسی جاذب، عمدہ اور معنی آفرین تشبیہ ہے۔

★ جی ہاں! قرآن حیات بخش نسخہ ہے —

ان کے لیے جو جہالت، تکبر، حسد اور نفاق کے خلاف جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔

★ جی ہاں! قرآن شفا بخش دوا ہے —

زبوں حالیوں، پس ماندگیوں، بے اتفاقیوں اور بے بنیاد خطرات کے علاج کے لیے۔

★ جی ہاں! قرآن شفا بخش علاج ہے —

اس کے لیے جو دنیا کے عشق میں مبتلا ہو، جو مادیات میں گھر گیا ہو اور جو شہوتوں کے سامنے بے بس ہو گیا ہو۔

★ جی ہاں! قرآن آرام بخش نسخہ ہے —

اس دنیا کے لیے کہ جس کے ہر طرف جنگوں کی آگ بھڑک رہی ہے، اسلحے کے انباروں تلے جس کی کمر جھک گئی ہے۔ جس کے سب سے زیادہ اقتصادی و انسانی سرمائے کو جنگ اور اسلحے کے دیو اپنے قدموں تلے پامال کر رہے ہیں۔

★ جی ہاں! قرآن شفا بخش نسخہ ہے —

اس کے لیے جس کی خواہشوں اور ہوا و ہوس کے تاریک پردے اس کے لیے قربِ الٰہی کے راستے میں حائل ہو گئے ہوں۔

Marfat.com

سورہ یونس کی آیت ۵۷ میں ہے :

قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ

یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی شفا بن کر آیا ہے ۔

سورہ فصلت کی آیت ۴۴ میں بھی ہے :

قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ

ان سیاہ دل ہٹ دھرموں سے کہو کہ یہ قرآن اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور شفا کا سرچشمہ ہے ۔

حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں اپنی ایک گفتگو میں اس حقیقت کو انتہائی خوبصورتی سے بیان فرمایا ہے :

فاستشفوہ من ادوائکم واستعینوا بہ علی لاوائکم، فان فیہ شفاء من اکبر الداء ، وھو الکفر والنفاق والغی والضلال

اس عظیم آسمانی کتاب سے اپنی بیماریوں کی شفا حاصل کرو ۔ اپنی مشکلات حل کرنے کے لیے اس سے مدد لو کیونکہ یہ وہ کتاب ہے جس میں سب سے بڑی بیماری کی شفا ہے ۔ وہی بیماری جسے کفر، نفاق، گمراہی اور ضلالت کہتے ہیں [1]

قرآن کے بارے میں ایک اور عبارت حضرت علی علیہ السلام ہی سے منقول ہے ۔ آپؑ فرماتے ہیں :

الا ان فیہ علم ما یأتی والحدیث عن الماضی و دواء دائکم و نظم ما بینکم ۔

آگاہ رہو کہ اس میں آئندہ کی خبریں اور علم ہے ۔ اس میں گزشتہ قوموں کا ذکر ہے ۔ اس میں تمہارے درد کی دوا ہے اور یہ تمہاری اجتماعی زندگی کو منظم کرنے کا پروگرام ہے [2]

ایک اور مقام پر اسی بزرگ امامؑ سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا :

وعلیکم بکتاب اللہ فانہ الحبل المتین والنور المبین والشفاء النافع، والرّیّ الناقع ، والعصمة للمتمسك والنجاة للمتعلق، لا یعوج فیقام ، ولا یزیغ فیستعتب ، ولا تخلقہ کثرة الردو ولوج السمع ، من قال بہ صدق ومن عمل بہ سبق ۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶ ۔

[2] نہج البلاغہ ، خطبہ ۱۵۸ ۔

Marfat.com

کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھام لو کیونکہ یہ محکم رسّی ہے، نورِ مبین ہے، شفابخش اور بابرکت دوا ہے اور یہ وہ آبِ حیات ہے جو تشنگانِ حق کی پیاس بجھاتی ہے۔ جو شخص اس سے وابستہ ہو جائے یہ اس کی حفاظت کرتی ہے۔ جو اس کا دامن تھام لے اسے نجات بخشتی ہے۔ اس میں انحراف کے لیے کوئی راہ نہیں کہ اسے سیدھا کرنے کی ضرورت پڑے۔ یہ کبھی خطا نہیں کرتی کہ اسے اپنے قاریوں سے عذر خواہی کرنا پڑے۔ اس کے تکرار سے کہنگی نہیں ہوتی اور اسے بار بار سُن کر کان ناراحت نہیں ہوتے (اسے جس قدر پڑھتے جائیں اس کی شیرینی اور دلپذیری اس قدر ہی بڑھتی رہتی ہے)۔ قرآن سے بات کرنے والے کو سچا جواب ملتا ہے اور اس پر عمل کرنے والا سب پر سبقت لے جائے گا۔[1]

یہ رسا اور منہ بولتی تعبیریں کہ جن کی نظیر پیغمبرِ اکرمؐ، حضرت علیؑ اور دیگر آئمہ ہدیٰؑ کے ارشادات میں کم نہیں، اچھی طرح ثابت کرتی ہیں کہ قرآن ایسا نسخہ ہے کہ جس کے ذریعے تمام تر بدحالیاں دور ہو سکتی ہیں۔ یہ فرد اور معاشرے کو ہر طرح کی اخلاقی اور اجتماعی بیماریوں سے نجات دلانے کے لیے آیا ہے۔

اس حقیقت کے اثبات کے لیے بہترین دلیل زمانۂ جاہلیت کے عربوں کا ابتدائے اسلام میں مکتبِ رسالت کے تربیت یافتگان سے موازنہ ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ خونخوار، جاہل اور نادان قوم کہ جسے سرتاپا طرح طرح کی اجتماعی اور اخلاقی بیماریوں نے گھیر رکھا تھا اس شفابخش نسخے کی بدولت نہ صرف اس کا علاج ہو گیا بلکہ وہ اتنی بڑی طاقت بن کر ابھری کہ عالمی جابروں اور سُوپر طاقتوں نے ان کے سامنے گھُٹنے ٹیک دیئے۔

یہ وہ حقیقت ہے جسے دَورِ حاضر کے مسلمان فراموش کر چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ موجودہ حالات میں گرفتار ہیں کہ جس کے ہم اور آپ شاہد ہیں۔ آج مسلمان تفرقہ بازی اور اختلاف کا شکار ہیں، عالمی غارت گر طاقتیں ان کے وسائل اور دولت پر مسلط ہو چکی ہیں۔ آج ان کی تقدیر کا فیصلہ دوسرے کرتے ہیں۔ مختلف حوالوں سے غیروں سے ان کی وابستگیاں اور عدمِ استقلال نے انہیں کمزوری، زبوں حالی اور ذلت سے دوچار کر دیا ہے۔

وہ لوگ جن کے گھر میں شفابخش نسخہ موجود ہو وہ اپنے علاج کے لیے ایسے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں کہ جو ان سے زیادہ بیمار ہوں۔ ان کا انجام ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

قرآن نہ صرف شفا بخشتا ہے بلکہ صحت یابی کے بعد نقاہت کے زمانے میں انہیں مختلف پیغامات کے ذریعے تقویت عطا کرتا ہے۔ کیونکہ قرآن "شفا" اور "رحمت" ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵۶۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ جسمانی بیماریوں کی دوائیں عموماً اعضاء بدن پر ناپسندیدہ اثرات چھوڑتی ہیں یہاں تک کہ ایک مشہور حدیث میں ہے :

ما من دواء الا و یھیج داء

کوئی ایسی دوائی نہیں کہ جو کسی دوسری بیماری کا سرچشمہ نہ ہو[1]

لیکن قرآن ۔ وہ شفا بخش دوا ہے جو انسانی روح و فکر اور قلب و نظر پر ہرگز کوئی غیر مطلوب اثر مرتب نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ سارے کا سارا خیر و برکت ہے ۔

نہج البلاغہ کی ایک عبارت میں ہے :

شفاء لاتخشی اسقامہ

قرآن ایسی شفا بخش دوا ہے کہ جس سے کوئی بیماری پیدا نہیں ہوتی[2]

اگر ہم ایک ماہ کے لیے بھی اس شفا بخش نسخے پر عمل کرنے کا عہد کریں اور اس عہد کی پاسداری کریں، اس کے حکم کو علم و آگہی ، عدل و انصاف ، تقویٰ و پرہیزگاری ، اتحاد و اخلاص اور فداکاری و جانبازی میں اپنائیں تو ہم دیکھیں گے ہماری بدحالیاں خوشیوں میں بدل جائیں گی ۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ یہ نسخہ ۔ دوسرے نسخوں کی طرح اسی وقت مؤثر ہو سکتا ہے جب اس پر عمل کیا جائے ورنہ کسی بہترین شفا بخش نسخے کو ہم ہزار بار پڑھیں ، سر پہ رکھیں ، آنکھوں سے لگائیں اور اس کے بوسے لیں ، اس پر عمل نہ کریں تو اس سے ہمیں کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا ۔

---

[1] سفینۃ البحار ۔

[2] نہج البلاغہ ، خطبہ ۱۹۸ ۔

Marfat.com

(۸۳) وَاِذَآ اَنۡعَمۡنَا عَلَى الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ‌ۚ
وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوۡسًا ○
(۸۴) قُلۡ كُلٌّ يَّعۡمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖؕ فَرَبُّكُمۡ اَعۡلَمُ بِمَنۡ
هُوَ اَهۡدٰى سَبِيۡلًا ○

ترجمہ

(۸۳) جس وقت ہم انسان کو کوئی نعمت بخشتے ہیں تو وہ (حق سے) منہ پھیر لیتا ہے اور تکبر کے عالم میں دور ہو جاتا ہے لیکن اگر اُسے کوئی چھوٹی سی بُرائی پہنچتی ہے تو (ہر چیز سے) مایوس ہو جاتا ہے۔

(۸۴) کہہ دو: ہر شخص اپنی روش (اور خُلق وعادت) کے مطابق عمل کرتا ہے جن کی روش زیادہ اچھی ہے تمہارا پروردگار انہیں بہتر طور پر پہچانتا ہے۔

تفسیر

ہر شخص اپنی فطرت کی راہ لیتا ہے

زیرِ نظر آیات سے غیر تربیت یافتہ انسانوں کی ایک نہایت گہری اخلاقی بیماری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جس وقت ہم انسان کو کوئی نعمت بخشتے ہیں تو (اس میں نخوت و غرور پیدا ہو جاتا ہے اور) وہ اپنے پروردگار سے منہ موڑ لیتا ہے اور عالم تکبر میں اس سے دور ہو جاتا ہے (واذا انعمنا علی الانسان اعرض و نا بجانبہ)۔

لیکن جب اس سے نعمت سلب کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ اُسے چھوٹی سی پریشانی لاحق ہو جاتی ہے تو سرتاپا اُس پر ناامیدی چھا جاتی ہے (واذا مسّه الشر کان یئوسا)۔

"اعرض" "اعراض" کے مادہ سے منہ پھیرنے کے معنی میں ہے۔ یہاں مراد اللہ اور حق سے

Marfat.com

منہ پھیرنا ہے ۔

"نا"، "نأی" (بروزن "رأی") کے مادہ سے دور ہونے کے معنی میں ہے۔ لفظ "بجانبہ" کا اضافہ غرور و تکبر اور دشمنی کی وجہ سے ایک طرف ہو جانے کے معنی دیتا ہے ۔

اس پورے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ بے ایمان یا کمزور ایمان کے انسانوں کو جب نعمتیں میسر آتی ہیں تو ایسے مغرور ہوتے ہیں کہ منعم کو بالکل بھول جاتے ہیں، نہ فقط بھول جاتے ہیں اس سے بے اعتنائی کرتے ہیں اس سے منہ موڑ لیتے ہیں اور عالم تکبر میں آجاتے ہیں ۔

"مسّہ الشر" تھوڑی سی تکلیف اور پریشانی کی طرف اشارہ ہے یعنی وہ اس قدر کم ظرف ہیں کہ ذرہ بھر پریشانی کی صورت میں ہمت ہار بیٹھتے ہیں اور سوچنے سمجھنے سے عاری ہو جاتے ہیں اور یاس و ناامیدی کے سائے ان کے پورے وجود پر چھا جاتے ہیں ۔

دوسری آیت میں رسول اللہؐ کی طرف روئے سخن ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے: کہہ دو: ہر شخص اپنی روش، خُلق اور عادت کے مطابق عمل کرتا ہے (قل کل یعمل علیٰ شاکلتہ) ۔

مومنین آیاتِ قرآن سے شفا طلب کرتے ہیں اور رحمت کسب کرتے ہیں جبکہ ظالم و ستمگر سوائے نقصان کے ان سے کچھ نہیں پاتے ۔ کم ظرف انسان کہ جنہیں نعمت ملے تو مغرور ہو جاتے ہیں اور مشکل پڑے تو مایوس و بدحال ہو جاتے ہیں ۔ یہ سب کچھ اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق کرتے ہیں ۔ یہ طبیعت اور مزاج انسان کے بار بار کے عمل کے زیر اثر بنتا ہے ۔

ایسی حالت میں خدا سب کے حالات پر شاہد و ناظر ہے ۔ جی ہاں! تمہارا رب ان لوگوں کی کیفیت سے زیادہ آگاہ ہے جن کی روش بہتر اور ہدایت کے اعتبار سے زیادہ پُر بار ہے (فربکم اعلم بمن ھو اھدیٰ سبیلاً) ۔

چند اہم نکات

۱۔ تکبّر اور مایوسی ۔ دو خطرناک اخلاقی بیماریاں: ہم نے یہ جملہ بار بار دوسروں سے سُنا ہے یا ہم خود دوسروں سے کہتے ہیں:

فلاں شخص اب خدا کا بندہ نہیں رہا کیونکہ اب وہ دولت مند ہو گیا ہے ۔

نیز ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ جنہیں نئی نئی دولت ملتی ہے وہ خدا کو بھول جاتے ہیں لیکن جب یہ دولت جاتی رہتی ہے یا وہ مشکلات میں پھنستے ہیں تو ایسے مضطرب اور مایوس ہوتے ہیں کہ انسان کو یقین نہیں آتا کہ یہ وہی پہلے والے آدمی ہیں ۔

جی ہاں! تمام کوتاہ فکر، بے ایمان اور کم ظرف لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے جبکہ اس کے برعکس دوستانِ خدا

Marfat.com

اور اولیاء اللہ کو حوادث در پیش ہوں تو وہ ان سے نمٹنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں فرمانِ الٰہی کے سامنے ان کی حالت تنکے کی سی ہوتی ہے۔ انہیں ساری دنیا دے دیں تو وہ کھو نہیں جاتے اور ساری دنیا ان سے لے لو تو ان کے ماتھے پر شکن نہیں پڑتی۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ خود باختہ اور کم ظرف لوگ مشکل کے عالم میں خدا پرست بن جاتے ہیں اور فطرتِ الٰہی ان میں جاگ اٹھتی ہے اور وہ اپنے آپ میں واپس آجاتے ہیں لیکن ادھر طوفانِ مصیبت تھمتا ہے اور ادھر یہ ایسے بدلتے ہیں گویا انہوں نے ہرگز کبھی خدا کا نام سنا تک نہیں۔ قرآن نے انسان کی یہ حالت متعدد مقامات پر بیان کی ہے (مثلاً یونس۔ ۱۲، لقمان۔ ۳۲، فجر۔ ۱۴ و ۱۵ حٰمٓ السجدہ۔ ۴۸ و ۴۹)

یہ ایک بہت بڑی مصیبت ہے کیونکہ اس کے سبب انسان زندگی میں کبھی صحیح مقام حاصل نہیں کرسکتا۔ اس بیماری کا واحد علاج یہ ہے کہ انسان علم اور ایمان کے ذریعے اپنی سطحِ فکر بلند کرے، اپنے آپ کو مادیات کے چنگل سے نکالے اور اصلاحی و تعمیری زہد اختیار کرے۔

ضمنی طور پر اس بیان سے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ زیرِ بحث آیات میں ایسے افراد کو مشکلات میں ناامید کہا گیا ہے جبکہ دوسری آیات (مثلاً۔ عنکبوت ۔ ۶۵) میں انہیں "مخلصین له الدین" کہا گیا ہے اور یہ جملہ تو خدا کی طرف انتہائی توجہ کی حکایت کرتا ہے، یہ فرق کیوں ہے؟

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں آپس میں کوئی تضاد نہیں رکھتیں بلکہ ان میں سے ایک دوسری کی تمہید ہے۔ ایسے افراد کو جب مشکلات کا سامنا ہوتا ہے تو وہ اپنی زندگی سے بالکل مایوس ہو جاتے ہیں اور یہی ناامیدی سبب بنتی ہے کہ ان کے چہرۂ فطرت سے پردے ہٹ جاتے ہیں اور وہ بارگاہِ خداوندی کا رُخ کرتے ہیں لیکن یہ اضطراری توجہ نہ ان کے لیے عزّ و شرف کا باعث ہے اور نہ ان کی بیداری کی دلیل ہے کیونکہ اُدھر یہ مشکلات دُور ہوتی ہیں اور ادھر یہ اپنی پہلی حالت پر لوٹ آتے ہیں وہی حالت جو اَب ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہوتی ہے۔

لیکن۔ اولیائے حق اور خدا کے سچے بندے مشکلات کا چہرہ دیکھ کر مایوس نہیں ہوجاتے بلکہ حوادث تو ان کی استقامت اور پامردی میں اضافہ کرتے ہیں۔ وہ خدا پر بھروسے اور اپنی خود اعتمادی کے باعث مشکلات پر گویا حملہ آور ہوتے ہیں کیونکہ یاس و ناامیدی کے لیے ان کے وجود میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ وہ خدا کو صرف مشکلات میں نہیں پہچانتے بلکہ ہر حالت میں اس کی یاد میں بسر کرتے ہیں اس کی پاک ذات پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس کا نورِ رحمت ان کے دل پر سایہ فگن رہتا ہے۔

۲۔ "شاکلة" سے کیا مراد ہے؟ : "شاکلة" دراصل "شکل" کے مادہ سے جانور کو لگام دینے کے معنی میں ہے۔ "شکال" خود مہار کو کہتے ہیں اور چونکہ ہر انسان کو اس کی طبیعت، جذبات اور عادتیں کسی خاص رویے میں مقید کر دیتے ہیں لہٰذا اسے "شاکلہ" کہتے ہیں۔ سوالات، ضروریات اور تمام مسائل

Marfat.com

کے لیے یہ جو لفظ "اشکال" بولا جاتا ہے یہ بھی اس لحاظ سے ہے کہ یہ ایک لحاظ سے انسان کو مقید کر دیتے ہیں۔[1]

اس گفتگو سے ظاہر ہوا کہ "شاکلۃ" کا مفہوم انسان کی ذاتی طبیعت کے لیے مخصوص نہیں۔ اسی لیے علامہ طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں اس کے دو معانی ذکر کیے ہیں :

۱۔ طبیعت و خلقت

۲۔ طریقہ، مذہب اور سنت

کیونکہ ان میں سے ہر ایک انسان کو عمل کے لحاظ سے کسی طرح مقید کرتا ہے۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ کس قدر اشتباہ اور غلط فہمی میں مبتلا ہیں جو زیر بحث آیت کو صفات ذات کی انسان پر حکومت اور جبر و اکراہ کی دلیل خیال کرتے ہیں اور یہاں تک کہ تربیت و تزکیہ پر اعتقاد نہیں رکھتے۔

یہ طرزِ فکر مختلف سیاسی، معاشرتی اور نفسیاتی اسباب کے باعث پیدا ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے جبر و اختیار کی بحثوں میں وضاحت کی ہے۔ بہت سی قوموں کے ادب میں یہ فکر غالب نظر آتی ہے۔ لوگ اپنی کوتاہ اور غلط باتوں کی توجیہ کے لیے اس کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ وہ خطرناک ترین نظریہ ہے جو معاشرے کو ذلت و خواری اور پسماندگی کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اور سالہا سال یا صدیوں تک کے لیے اسے اس پسماندگی کے گڑھے میں ڈالے رکھتا ہے۔

ذیل کے اشعار اس طرزِ فکر کی کامل نمائندگی کرتے ہیں :

درختی کہ تلخ است اندر سرشت   گرش برنشانی بہ باغ بہشت
وازجوی خلدش بہ ہنگام آب   بہ بیخ انگبین ریزی وشہد ناب
سرانجام گوہر بہ کار آورد   ہمان میوۂ تلخ بار آورد

یعنی ـ

جس درخت کی سرشت میں ہی تلخی ہے اگر اسے جنت میں بھی لگا دیا جائے۔
اور جنت سے اسے پانی دیتے وقت اس میں شہد ملا دیا جائے۔
لیکن آخرکار اس کی سرشت اپنا کام دکھائے گی اور وہ جو پھل دے گا وہ کڑوا ہی ہوگا۔

اگر تربیتی اور اجتماعی مسائل کی بنیاد واقعاً اس منطق کو قرار دیا جائے تو تعلیم و تربیت کو لازمی طور پر فضول ماننا پڑے گا۔

اسی بناء پر ہمارا عقیدہ ہے کہ مسلک جبر ہمیشہ استعماری حکومتوں کے ہاتھ میں ایک دستاویز اور حربے کے طور پر رہا ہے تاکہ وہ اس ذریعے سے کسی انقلابی تحریک کو روک سکیں اور جواں مرد انقلابیوں

---

[1] مفردات از راغب ، مادہ "شکل"۔

Marfat.com

کو بیڑیاں پہنا سکیں ۔

مشہور جملہ ہے :

الجبر والتشبیہ امویان والعدل والتوحید علویان

عقیدۂ جبر اور خدا کو موجودات کے ساتھ تشبیہ دینا بنی امیہ کے عقائد میں سے ہے اور عدل و توحید کا عقیدہ مکتب علوی کی بنیاد ہے ۔

یہ جملہ بھی اسی حقیقت کو بیان کرتا ہے :

خلاصہ یہ کہ "شاکلہ" ہرگز ذاتی طبیعت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی عادت، طریقہ، روش اور مذہب انسان کی زندگی کو ایک جہت اور سمت دے دے اسے "شاکلہ" کہتے ہیں۔ اسی بنا پر عادات وسنن جنہیں اختیاری عمل کے تکرار سے انسان اپنا لیتا ہے اور اسی طرح عقائد و نظریات جو استدلال یا تعصب کی وجہ سے قبول کرلیتا ہے یہ سب انسانی زندگی پر گہرا اثر مرتب کرتے ہیں اور انہیں "شاکلہ" کہا جاتا ہے ۔

اصولی طور پر انسانی ملکات وجذبات عموماً اختیاری ہوتے ہیں کیونکہ جب انسان کسی عمل کا تکرار کرتا ہے تو اس کی پہلی اسٹیج کو "حالت" کہتے ہیں، دوسری کو "عادت" اور تیسری کو "ملکہ"۔ یہ عمل آہستہ آہستہ تدریجی طور پر ہوتا ہے ۔ یہی ملکات ہیں جو انسان کے اعمال کو ایک خاص شکل دیتے ہیں اور اس کی راہِ حیات کو معین کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ملکات اختیاری عوامل سے پیدا ہوتے ہیں اور اختیاری عوامل ہی انہیں پروان چڑھاتے ہیں ۔

بعض روایات میں "شاکلة" سے "نیت" مراد لیا گیا ہے ۔ اصول کافی میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت ہے، آپؑ فرماتے ہیں :

النیة افضل من العمل الا وان النیة هی العمل، ثم تلا قوله عزوجل:
"قل کل یعمل علیٰ شاکلته" یعنی علیٰ نیته ۔

نیت عمل سے افضل ہے بلکہ اصلاً نیت ہی عمل ہے ۔

اس کے بعد آپؑ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی :

قل کل یعمل علیٰ شاکلته

اور ساتھ ہی فرمایا :

"شاکلہ" سے مراد نیت ہے [1]

---

[1] نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۱۴ ۔

Marfat.com

اس تفسیر میں ایک جاذب نظر اور عمدہ نکتہ پنہاں ہے اور وہ یہ کہ انسان کی نیت کہ جو اس کے عقائد و نظریات سے ابھرتی ہے اسی سے اس کا عمل جنم لیتا ہے اور اصولاً خود نیّت " شاکلہ " کی ایک قسم ہے یعنی مقید کرنے والا امر ہے۔ اسی لیے بعض اوقات نیت ہی کو عمل قرار دیا گیا ہے اور کبھی اسے عمل سے برتر گردانا گیا ہے۔ کیونکہ بہرحال عمل وہی راستہ اختیار کرتا ہے جو نیّت کی روشن ہوتی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ امام صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا؛

کیا یہودیوں کی عبادت گاہوں اور نصاریٰ کے گرجوں میں نماز پڑھی جا سکتی ہے؟

آپؑ نے فرمایا:

ہاں تم ان میں نماز پڑھ سکتے ہو۔

کسی نے پوچھا:

اگر وہ ان میں نماز پڑھ رہے ہوں ہم پھر بھی ان میں نماز پڑھ لیں؟

فرمایا:

ہاں ۔ کیا تم نے قرآن میں نہیں پڑھا کہ اللہ فرماتا ہے:

قل کل یعمل علیٰ شاکلتہ فربکم اعلم بمن ھو اھدیٰ سبیلاً

اس کے بعد مزید فرمایا:

تم اپنے قبلہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھو اور انہیں رہنے دو (وہ جو بھی کر رہے ہوں)[1]

---

[1] نورالثقلین، ج ۳ ص ۱۱۳

Marfat.com

(۸۵) وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ط قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّىْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ○

ترجمہ

(۸۵) تجھ سے "روح" کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو: "روح" میرے رب کے امر میں سے ہے اور تمہیں تو بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔

تفسیر

رُوح کیا ہے؟

گزشتہ آیات کے بعد۔ اب مشرکین یا اہلِ کتاب کے بعض اہم سوالات کے جوابات دیئے جارہے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: تجھ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو: روح میرے رب کے فرمان میں سے ہے اور تمہیں بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے (ویسئلونك عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الّا قلیلًا)۔

گزشتہ اور موجودہ دَور کے عظیم مفسّرین نے "روح" کے معنی اور اس آیت کی تفسیر کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔ ہم پہلے لغت کے حوالے سے "روح" کے معنی کے بارے میں بات کریں گے۔ اس کے بعد قرآن میں یہ لفظ جہاں جہاں آیا ہے اسے دیکھیں گے اور اس سلسلے میں وارد شدہ روایات بیان کریں گے۔

۱۔ **لغت کے حوالے سے:** لُغت کے لحاظ سے "روح" دراصل "نفس" اور "دوڑنے" کے معنی میں ہے۔ بعض نے تصریح کی ہے کہ "روح" اور "ریح" (ہَوا) ایک ہی معنی سے مشتق ہیں اور روحِ انسان کہ جو مستقل اور مجرد گوہر ہے اسے اس نام سے اس لیے موسوم کیا گیا ہے کہ یہ تحرّک، حیات آفرینی اور ظاہر نہ ہونے کے لحاظ سے نفس اور ہَوا کی طرح ہے۔

۲۔ **قرآنی آیات کے حوالے سے:** قرآن حکیم میں یہ لفظ مختلف اور متنوع صورتوں میں آیا ہے۔ کبھی یہ لفظ انبیاء و مرسلین کو ان کی رسالت کی انجام دہی میں تقویت پہنچانے والی روحِ مقدس کے معنی میں آیا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ کی آیہ ۲۵۳ میں ہے:

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط

ہم نے عیسیٰ کو واضح دلائل دیئے اور روح القدس کے ذریعے اسے تقویت بخشی۔

کبھی یہ لفظ مومنین کو تقویت بخشنے والی اللہ کی روحانی و معنوی قوت کے مفہوم میں آیا ہے

Marfat.com

جیسا کہ سورہ مجادلہ کی آیت ۲۲ میں ہے :

اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ

وہ ایسے لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ہے اور روح کے ذریعے انہیں تقویت بخشی ہے۔

اور کبھی وحی کے خاص فرشتے کے مفہوم میں یہ لفظ استعمال ہوئے :

"امین" کے لفظ سے اس کی توصیف کی گئی ہے۔ مثلاً سورہ شعراء کی آیہ ۱۹۳-۱۹۴ میں ہے :

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ۙ عَلٰی قَلْبِکَ لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ۝

یہ قرآن روح الامین نے تیرے دل پر اتارا تاکہ تُو ڈرانے والوں میں سے ہو۔

کبھی یہ لفظ خدا کے خاص فرشتوں میں سے ایک عظیم فرشتے یا فرشتوں سے برتر ایک مخلوق کے معنی میں آیا ہے۔ مثلاً :

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِکَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ کُلِّ اَمْرٍ ۝

شب قدر میں ملائکہ اور روح اپنے پروردگار کے امر کے ساتھ تقدیر امور کے لیے نازل ہوتے ہیں۔ (قدر - ۴)

نیز سورہ نباء کی آیہ ۳۸ میں بھی ہے :

یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَةُ صَفًّا

روز قیامت روح اور ملائکہ ایک ہی صف میں قیام کریں گے۔

کبھی یہ لفظ قرآن اور وحیِ آسمانی کے معنی میں آیا ہے۔ مثلاً :

وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا

اور اس طرح ہم نے تیری طرف روح کو وحی کیا کہ جو ہمارے امر میں سے ہے (شوریٰ - ۵۲)۔

کبھی یہ لفظ روحِ انسانی کے معنی میں آیا ہے جیسا کہ خلقتِ آدم سے متعلقہ آیات میں ہے :

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ

اس کے بعد خلقتِ آدم کو نظام بخشا اور اس میں اپنی روح پھونکی۔ (سجدہ - ۹)

اسی طرح سورہ حجر آیہ ۲۹ میں ہے :

فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝

پس ہم نے خلقتِ آدم کو عملی صورت دے دی اور اس میں اپنی روح پھونک دی تو اس کیلئے سجدہ کرو۔[1]

[1] ہم کہہ چکے ہیں کہ یہاں روح کی اضافت خدا کی طرف اظہارِ عظمت کے لیے ہے اور مراد یہ ہے کہ خدا نے انسانوں کو ایک عظیم اور الٰہی مقدس روح بخشی ہے۔

Marfat.com

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ زیرِ بحث آیت میں روح سے کیا مراد ہے۔ یہ کس روح کا تذکرہ ہے کہ جس کے بارے میں کچھ لوگوں نے رسولِ اکرمؐ سے سوال کیا ہے اور آپؐ نے ان کے جواب میں فرمایا ہے کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تمہیں تھوڑے سے علم کے سوا کچھ پتہ نہیں۔

آیت کے داخلی و خارجی قرائن سے ایسا لگتا ہے کہ سوال کرنے والوں نے انسان کی روح سے متعلق سوال کیا ہے۔ وہی عظیم روح کہ جو انسان کو حیوانات سے جُدا کرتی ہے۔ جو ہمارا افضل ترین شرف ہے اور جو ہماری تمام تر طاقت اور فعالیت کا سرچشمہ ہے۔ جس کی مدد سے ہم زمین و آسمان کو اپنی جولان گاہ بنائے ہوئے ہیں۔ جس کے ذریعے ہم علمی اسرار کی گتھیاں سلجھاتے ہیں۔ جس کے ذریعے ہم موجودات کی گہرائیوں تک پہنچنے کا راستہ پاتے ہیں۔ چاہتے تھے کہ عالمِ آفرینش کے اس عجوبہ کی حقیقت معلوم کریں۔

روح کی ساخت مادہ کی ساخت سے مختلف ہے۔ وہ اصول جو اس پر حاکم ہیں وہ مادہ پر حاکم اصولوں اور طبیعیاتی اور کیمیائی خواص سے مختلف ہیں لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایک مختصر اور پُرمعنی جملہ کہیں کہ۔ روح عالمِ اَمر میں سے ہے۔ یعنی اس کی خلقت اسرار آمیز ہے۔

اس کے بعد اِس بنا پر کہ انہیں اس جواب پر تعجب نہ ہو مزید فرمایا کہ تمہارا علم بہت ہی کم ہے۔ لہٰذا کون سے تعجب کی بات ہے کہ تم روح کے اسرار نہ جان سکو اگرچہ وہ ہر چیز کی نسبت تم سے زیادہ قریب ہے۔

دس روایات کے حوالے سے : تفسیر عیاشی میں امام باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے آیہ "یسئلونك عن الروح" کی تفسیر کے سلسلے میں فرمایا:

انما الروح خلق من خلقه، له بصر و قوة و تأیید، یجعله فی قلوب الرسل والمؤمنین

روح مخلوقاتِ خدا میں سے ہے اور یہ بینائی قوت رکھتی ہے۔ خدا اسے انبیاؑ اور مومنین کے دلوں میں قرار دیتا ہے[1]

ایک اور حدیث انہی دو بزرگوار آئمہ میں سے ایک سے منقول ہے، اس میں ہے:

هی من الملکوت من القدرة

روح عالمِ ملکوت اور خدا کی قدرت میں سے ہے[2]

شیعہ اور سُنی کتب کی متعدد روایات میں ہے کہ مشرکین قریش نے یہ سوال علماءِ اہلِ کتاب سے حاصل کیا۔ وہ اس کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آزمانا چاہتے تھے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ اگر (محمدؐ) نے روح کے بارے میں تمہیں بہت کچھ بتا دیا تو یہ اس کی عدم صداقت کی دلیل ہوگا۔ جبکہ آپؐ نے ایک مختصر

---

۱ و ۲۔ نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۱۶

Marfat.com

اور پُرمعنی جواب دے کر انہیں حیران کر دیا۔

لیکن کچھ اور روایات جو طرقِ اہل بیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں ان میں روح کو ایک ایسی مخلوق بتایا گیا ہے کہ جو جبرائیل اور میکائیل سے افضل ہے اور جو انبیاء اور آئمہ کے ساتھ ہوتی ہے اور انہیں ان کے کام میں انحراف سے باز رکھتی ہے۔[1]

آیت کی تفسیر کے بارے میں جو کچھ ہم نے کہا ہے یہ روایات نہ فقط اس کے منافی نہیں ہیں بلکہ اس سے ہم آہنگ ہیں کیونکہ انسانی روح کے مختلف درجے اور مراتب ہیں۔ انبیاء اور آئمہ کی روح کا مرتبہ غیر معمولی اور بہت بلند ہے اور گناہ خطا سے معصوم ہونا جس کے آثار میں سے ہے۔ نیز بہت زیادہ علم و آگاہی بھی اس کے آثار میں سے ہے اور مسلّم ہے کہ روح کا یہ مرتبہ تمام فرشتوں سے افضل ہوگا، یہاں تک کہ جبریل اور میکائیل سے بھی (غور کیجئے گا)۔

رُوح کی اصالت و استقلال

علمِ انسان کی تاریخ شاہد ہے کہ روح، اس کی ساخت اور اس کی اسرار آمیز خصوصیات کا مسئلہ ہمیشہ علماء کے غور و فکر کا عنوان رہا ہے۔ ہر عالم نے اپنی بساط بھر کوشش کی ہے کہ روح کی وادیٔ اسرار میں قدم رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ روح کے بارے میں علماء کے نظریات بہت زیادہ اور متنوع ہیں۔ ہو سکتا ہے ہمارا آج کا علم بلکہ آئندہ آنے والوں کا علم بھی روح کے تمام اسرار و رموز تک پہنچنے کے لیے کافی نہ ہو اگرچہ ہماری روح اس دنیا کی ہر چیز سے ہمارے قریب تر ہے اگرچہ اس کا گوہر ہر چیز سے بالکل مختلف ہے جس سے ہمیں اس عالم مادہ میں سابقہ پڑتا ہے۔

اس پر زیادہ تعجب بھی نہیں کرنا چاہیئے کہ ہم اس عجوبۂ روزگار اور مافوقِ مادہ مخلوق کے اسرار اور حقیقت تک نہیں پہنچ سکے۔ بہرحال یہ صورتِ حال اس سے مانع نہیں کہ ہم روح کے دور سے نظر آنے والے منظر کو عقل کی تیز بین نگاہ سے دیکھ سکیں۔ اس پر حکم فرما اصول اور عمومی نظام سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ اس سلسلے میں اہم ترین روح کی اصالت و استقلال کا مسئلہ، جسے جاننا چاہیئے۔

مادہ پرست روح کو مادی اور دماغ کے مادی خواص اور نسوں کے خلیوں Nerve Cells میں سے سمجھتے ہیں ان کی نظر میں روح اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہم یہاں زیادہ تر اسی نکتے پر بحث کریں گے بقائے روح کی بحث اور تجرد کامل یا تجرد مکتبی کی گفتگو کا انحصار اسی مسئلے پر ہے۔ لیکن پہلے اس نکتے کا ذکر ضروری ہے کہ انسانی بدن سے روح کا تعلق ایسا نہیں جیسا بعض نے گمان کر رکھا ہے۔ روح نے بدن میں

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۳ صـ ۲۱۵

Marfat.com

حلول نہیں کر رکھا اور نہ یہ مشک میں ہوا کی طرح انسانی جسم میں موجود ہے بلکہ بدن اور روح کے مابین ایک قسم کا ارتباط ہے اور یہ ارتباط روح کی بدن پر حاکمیت، تصرف اور اس کی تدبیر کی بنیاد پر ہے۔ بعض نے اس ارتباط کو لفظ اور معنی کے مابین تعلق سے تشبیہ دی ہے۔ جب ہم استقلالِ روح کے مسئلہ پر بحث کریں گے، یہ بات بھی واضح ہو جائے گی۔

اب ہم اصل گفتگو کی طرف آتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان پتھر اور لکڑی سے مختلف ہے کیونکہ ہم اچھی طرح سے محسوس کرتے ہیں کہ ہم بے جان موجودات بلکہ نباتات سے بھی مختلف ہیں۔ ہم سوچتے ہیں، ارادہ کرتے ہیں، محبت اور نفرت کرتے ہیں وغیرہ۔

لیکن پتھر اور نباتات میں یہ احساسات نہیں ہیں۔ لہٰذا ہمارے اور ان کے درمیان ایک اصولی فرق موجود ہے اور اس کی وجہ روحِ انسانی ہے۔

مادہ پرست یا کوئی اور نفس اور روح کے وجود کے منکر نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علم نفسیات Psychology اور Psychoanalism کو ایک مثبت علم سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں علم اگرچہ کئی ایک جہات سے اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہے ہیں تاہم دنیا کی بڑی سے بڑی یونیورسٹیوں میں اساتذہ اور طلبہ اس کے بارے میں مطالعہ و تحقیق میں مصروف ہیں۔

جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ نفس اور روح دو الگ حقائق نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو مختلف مراحل ہیں۔ جہاں جسم سے روح کے ارتباط کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے اور ان دونوں کی متقابل تاثیر بیان ہوتی ہے وہاں "نفس" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور جہاں جسم سے الگ روح سے ظاہر ہونے والے اثرات پر گفتگو ہوتی ہے وہاں لفظ "روح" استعمال ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ کوئی شخص انکار نہیں کرتا کہ ہم میں روح اور نفس کے نام کی ایک حقیقت موجود نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مادہ پرستوں (Materialists) اور ماوراء الطبیعت کے فلاسفہ اور روحیوں Spirtulists کے درمیان جنگ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ علماء الہیون اور فلاسفہ روحیوں کا نظریہ ہے کہ جس مواد سے انسانی جسم بنتا ہے اس کے علاوہ اس میں ایک اور حقیقت اور گوہر مخفی ہے کہ جو مادہ نہیں ہے لیکن انسانی بدن بلاواسطہ اس کے زیرِ اثر ہے۔ دوسرے لفظوں میں روح ایک ماوراء الطبیعاتی Metaphysical حقیقت ہے۔ اس کی ساخت اور فعالیت مادی دنیا کی ساخت اور فعالیت سے مختلف ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ ہمیشہ مادی دنیا سے مربوط رہتی ہے لیکن یہ خود مادہ یا خاصیتِ مادہ نہیں ہے۔

ان کے مدِمقابل مادیت کے فلاسفہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے وجود میں روح نام کا مادہ کے علاوہ

Marfat.com

کوئی مستقل وجود نہیں اور مادہ سے ہٹ کر روح نام کی کوئی چیز نہیں جو کچھ ہے یہی مادہ جسمانی ہے اور یا اس کے طبیعاتی اور کیمیائی Physical and Chemical آثار ہیں۔ ہمارے اندر دماغ اور اعصاب نام کی ایک مشینری ہے کہ جو ہماری زندگی کے اعمال کا ایک اہم حصّہ ہے اور یہ بھی باقی مادی بدن کی مشینریوں کی طرح ہے اور مادی قوانین کے تحت کام کرتی ہے۔

ہماری زبان کے نیچے کچھ غدودیں ہیں جنہیں غدود ہائے بزاق Sliva Glands[1] کہا جاتا ہے یہ طبیعاتی عمل بھی کرتی ہیں اور کیمیائی بھی۔ جس وقت غذا منہ میں جاتی ہے تو یہ خود کار کنوئیں[2] خود بخود کام شروع کر دیتے ہیں۔ یہ حساب کے اس قدر ماہر ہیں کہ پانی کی بالکل اتنی مقدار جتنی غذا کو چبانے اور نرم کرنے کے لیے ضروری ہے اس پر چھڑکتے ہیں۔ پانی والی غذا، کم پانی والی غذا یا خشک غذا، ہر ایک اپنی ضرورت کے مطابق آبِ دہان سے اپنا حصہ لیتی ہے۔

تیزابی مواد، خصوصاً جس وقت زیادہ سخت ہو ان غدودوں کی کارکردگی بڑھا دیتا ہے تاکہ اسے زیادہ مقدار میں پانی ملے اور یہ خوب پتلا ہو جائے اور معدے کی دیواروں کو نقصان نہ پہنچے۔

جس وقت انسان غذا کو نگل لیتا ہے ان کنوؤں کا عمل خود بخود رُک جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ان ابلنے والے چشموں پر ایک عجیب و غریب نظام حکم فرما ہے۔ ایسا نظام کہ اگر اس کا توازن بگڑ جائے یا ہمیشہ لعابِ دہن ہمارے منہ سے گرتا رہے یا پھر ہماری زبان اور حلق کسی قدر خشک ہو جائے تو لقمہ ہمارے حلق میں پھنس جائے۔

یہ لعابِ دہن کا طبیعاتی کام ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کا زیادہ اہم کام کیمیائی ہے۔ اس میں مختلف طرح کا مواد مخلوط ہوتا ہے اور یہ غذا سے مل کر نئی ترکیب کو جنم دیتا ہے جس سے معدے کی زحمت کم ہو جاتی ہے۔

مادہ پرست (Materialists) کہتے ہیں کہ ہمارے اعصاب اور مغز کا سلسلہ لعابِ دہن کے غدودوں کی مانند ہے اور یہ اسی طرح کے طبیعاتی اور کیمیائی عمل کا حامل ہے کہ جسے مجموعی طور پر طبیعاتی کیمیائی Physico Chemical کہا جاتا ہے اور یہی طبیعاتی کیمیائی فعالیتیں ہیں جنہیں ہم آثارِ روح یا رُوح کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ہم سوچ رہے ہوتے ہیں تو ایک خاص برقی سلسلہ ہمارے دماغ سے اٹھتا ہے۔ دورِ حاضر میں مشینوں کے ذریعے ان لہروں کو کاغذ پر ثبت کر دیا جاتا ہے خصوصاً نفسیاتی بیماریوں کے ہسپتالوں میں ان لہروں کے مطالعے سے نفسیاتی بیماریوں کی تشخیص اور علاج کیا جاتا ہے۔ یہ ہمارے دماغ کی فیزیکل Physical فعالیت ہے۔

---

[1] لعابِ دہن کی غدودیں۔

[2] Artesiens۔

Marfat.com

اس کے علاوہ غور و فکر کرتے وقت اور نفسیاتی فعالیت کے موقع پر ہمارے دماغ کے سیل Cells ایک کیمیائی فعالیت بھی کرتے ہیں لہٰذا روح اور آثار روح ہمارے دماغ اور اعصاب کے خلیوں کے کیمیائی فعل و انفعالات کے طبیعیاتی خواص کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔

اس بحث سے مادیین یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

(۱) جیسے لعاب دہن کی غدودوں کی فعالیت اور ان کے مختصر اثرات بدن سے پہلے نہ تھے اور نہ اس کے بعد ہوں گے اسی طرح ہماری روح کی کارکردگی بھی دماغ اور اعصاب کی مشینری کے پیدا ہونے سے وجود میں آتی ہے اور اس کے مرنے سے مر جاتی ہے۔

(۲) روح جسم کے خواص میں سے ہے۔ لہٰذا وہ مادی شے ہے اور ماورائے طبیعت کا پہلو نہیں رکھتی۔

(۳) روح پر بھی وہی قوانین حکم فرما ہیں جو جسم پر حکومت کرتے ہیں۔

(۴) روح بدن کے بغیر کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی اور نہ ہی رکھ سکتی ہے۔

روح کے عدم استقلال پر مادیین کے دلائل: مادیین کا نظریہ ہے کہ روح و فکر اور روح کے تمام آثار مادی ہیں یعنی دماغ اور اعصاب کے خلیوں کے طبیعیاتی اور کیمیائی خواص ہیں۔ انہوں نے اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے کچھ شواہد پیش کیے ہیں، مثلاً:

(۱) آسانی سے نشاندہی کی جا سکتی ہے کہ مراکز کا ایک حصہ یا اعصاب کا ایک سلسلہ بیکار ہو جائے تو آثار روح کا ایک حصہ معطل ہو جاتا ہے[1] مثلاً تجربہ کیا گیا ہے کہ کبوتر کے مغز کا ایک خاص حصہ الگ کر لیا جائے تو کبوتر مرتا نہیں لیکن اس کی معلومات کا بہت سا حصہ ختم ہو جاتا ہے۔ اگر اسے غذا کھلائیں تو کھاتا اور ہضم کرتا ہے اور اگر کھلائیں نہیں صرف دانہ اس کے سامنے ڈال دیں تو نہیں کھاتا اور بھوک سے مر جاتا ہے۔

اسی طرح اگر انسان کے دماغ پر کچھ ضربیں لگائی جائیں یا بعض بیماریوں کی وجہ سے اس کے دماغ کا کچھ حصہ بیکار ہو جائے تو دیکھا گیا ہے کہ انسان کو بہت سی چیزیں بھول جاتی ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا ہم نے جرائد اور اخبارات میں پڑھا کہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان کو اہواز کے قریب ایک حادثہ پیش آیا۔ اس حادثے میں اس کے دماغ پر ضرب آئی۔ وہ اپنی زندگی کے تمام گزشتہ واقعات بھول گیا یہاں تک کہ وہ اپنے ماں باپ تک کو نہیں پہچانتا تھا۔ اسے اس کے گھر لے جایا گیا۔ وہ اسی گھر میں پلا بڑھا تھا مگر وہ وہاں اپنے آپ کو بالکل اجنبی محسوس کر رہا تھا۔

ایسے واقعات نشاندہی کرتے ہیں کہ دماغ کے خلیوں کی فعالیت اور آثار روح کے درمیان ایک قریبی ربط ہے۔

---

[1] Phychology از ڈاکٹر ارانی ص۲۳

(۲) غور و فکر کرتے وقت دماغ کی سطح پر مادی تغیرات زیادہ ہوتے ہیں، دماغ زیادہ غذا لیتا ہے اور فاسفورس Phuphorus واپس کرتا ہے۔ سوتے وقت جبکہ دماغ فکری کام نہیں کرتا تھوڑی غذا لیتا ہے۔ یہ امر آثارِ فکری کے مادی ہونے کی دلیل ہے[1]

(۳) مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ غور و فکر کرنے والوں کے دماغ کا وزن عام لوگوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ اوسطاً مُردوں کے دماغ کا وزن ۱۴۰۰ گرام ہے اور عورتوں کے دماغ کا وزن اوسطاً اس سے کچھ کم ہوتا ہے۔ یہ امر بھی نشاندہی کرتا ہے کہ روح مادی شے ہے۔

(۴) اگر قوائے فکری اور مظاہر روح، روح کے ایک مستقل وجود ہونے کی دلیل ہیں تو یہ بات ہمیں حیوانات کے لیے بھی ماننا چاہیئے کیونکہ وہ بھی اپنی حد تک ادراک رکھتے ہیں۔

مختصر یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہماری روح موجودِ مستقل نہیں ہے اور انسان شناسی کے علم نے جو ترقی کی ہے وہ بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہے۔

ان دلائل سے یہ مجموعی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسانی اور حیوانی فزیالوجی Human and Physcology کی ترقی اور وسعت روز بروز اس حقیقت کو زیادہ واضح کر رہی ہے کہ آثار روح اور دماغی خلیوں کے درمیان قریبی تعلق ہے۔

مادی استدلال کے کمزور پہلو : اس استدلال میں مادیین کو ایک بہت بڑا اشتباہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے آلات کار کو کام کا فاعل سمجھ لیا ہے۔

یہ واضح کرنے کے لیے کہ انہوں نے آلات کو فاعل کیسے سمجھ لیا ہے اجازت دیجئے کہ ہم ایک مثال پیش کریں۔ اس مثال پر غور کیجئے گا:

گیلیلیو کے بعد آسمانوں کی وضع و کیفیت کے مطالعہ میں ایک انقلاب پیدا ہوا ہے۔ اطالوی گیلیلیو ایک عینک ساز کی مدد سے ایک چھوٹی سی دُور بین بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ اس پر بہت خوش ہُوا جب اُس نے رات کے وقت اس کی مدد سے آسمانی ستاروں کا مطالعہ شروع کیا تو اسے حیرت انگیز منظر معلوم ہُوا۔ ایسا منظر اس سے پہلے کسی انسان نے نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے سمجھا کہ مَیں نے ایک اہم انکشاف کیا ہے۔ اس طرح اس دن کے بعد انسان عالم بالا کے اسرار کا مطالعہ کرنے کے قابل ہوگیا۔

اس وقت تک انسان ایک ایسے پروانے کی طرح تھا کہ جس نے فقط اپنے اردگرد کی چند شاخیں دیکھی تھیں لیکن جب اس نے دُور بین کے ذریعے جھانکا تو اسے فطرت کا ایک عظیم جنگل دکھائی دیا۔

اس سلسلے میں ترقی و کمال جاری رہا یہاں تک کہ ستاروں کو دیکھنے کے لیے بڑی بڑی دُور بینیں ایجاد ہو

---

[1] کتاب "بشر از نظر مادی" از ڈاکٹر ارانی صـ۲۔

Marfat.com

گئیں کہ جن کے عدسں کا قطر پانچ میٹر یا اس سے بھی زیادہ تھا۔ انہیں پہاڑوں کی ایسی بلند چوٹیوں پر نصب کیا گیا کہ جو صاف و شفاف ہوا کے اعتبار سے مناسب تھیں۔ ایسی ایسی دُوربینیں بنیں کہ جو کئی منزلہ عمارت کے برابر تھیں۔ ان کے ذریعے انسان کو عالم بالا میں کئی جہان دکھائی دیئے، ایسے ایسے جہان کہ عام نظر سے انسان کو ہزارواں حصہ بھی نظر نہ آتا تھا۔

اب آپ سوچیں کہ اگر ایک دن ٹیکنالوجی اتنی ترقی کر جائے کہ انسان ایسی دُوربین بنا لے کہ جس کے عدسں کا قطر ایک سو میٹر کے برابر ہو اور جس کا سازو سامان اور وسعت ایک شہر کی مانند ہو تو ہم پر کتنے جہان منکشف ہو جائیں گے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ دُوربینیں ہم سے لے لی جائیں تو یقینی طور پر آسمان کے بارے میں ہماری معلومات اور مشاہدات کا ایک حصہ معطل ہو جائے گا لیکن کیا حقیقی طور پر دیکھنے والے ہم ہیں یا دُوربین؟

کیا ٹیلی سکوپ ہمارے لیے آلاتِ کار ہے یا خود فاعل کار اور خود دیکھنے والی؟

دماغ کے بارے میں بھی کوئی شخص انکار نہیں کرتا کہ دماغ کے سیل Cells کے بغیر غور و فکر نہیں کیا جا سکتا لیکن کیا دماغ روح کے کام کا آلہ ہے یا خود روح؟؟

مختصر یہ کہ مادیین نے جو تمام تر دلائل پیش کیے ہیں وہ صرف یہ ثابت کرتے ہیں کہ دماغ کے سیل اور ہمارے ادراک کے درمیان ربط موجود ہے لیکن ان میں سے کوئی دلیل یہ ثابت نہیں کرتی کہ دماغ خود غور و فکر کرتا ہے نہ کہ ادراک کا آلہ ہے (غور کیجئے گا)۔

یہاں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مُردے اگر کچھ نہیں سمجھتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ روح کا بدن سے ربط ختم ہو گیا ہے نہ یہ کہ روح فنا ہو گئی ہے۔ یہ بات بالکل اسی طرح ہے جیسے کسی بحری یا ہوائی جہاز کا وائرلیس خراب ہو جائے اور وہ ساحل یا ایئرپورٹ سے رابطہ نہ کر سکے کیونکہ رابطے کا ذریعہ منقطع ہو گیا ہے۔

استقلالِ رُوح کے دلائل

بات یہ ہو رہی تھی کہ مادیین کا اصرار ہے کہ روح سے ظاہر ہونے والے آثار و افعال دماغی سیلوں کے خواص سمجھنا چاہیئے اور فکر، حافظہ، ایجاد، محبت، نفرت، غصہ اور علم و دانش سب کو ایسے امور میں سے سمجھنا چاہیئے جنہیں تجربہ گاہ میں دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے اور انہیں بھی عالم مادہ کے قوانین کے تحت سمجھنا چاہیئے اس کے برعکس استقلالِ روح کے فلاسفہ اس کی نفی پر زوردار دلائل رکھتے ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ **روح کے کام خارجی پہلو رکھتے ہیں:** پہلا سوال جو مادیین سے کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ

Marfat.com

روح کے افکار و آثار دماغ کے طبیعیاتی کیمیائی Physico Chemical خواص ہیں تو پھر دماغ، معدہ، دل اور جگر وغیرہ کے کاموں میں کوئی اصولی فرق نہیں ہونا چاہیئے۔

مثلاً معدے کا کام طبیعیاتی اور کیمیائی کارکردگی کا مرکب ہے۔ معدہ اپنی خاص حرکات کے ذریعے اور تیزابوں کے ترشح سے غذا کو ہضم اور بدن میں اس کے جذب کے لیے تیار کرتا ہے۔ اسی طرح جیسا کہ کہا گیا ہے لعاب دہن کا کام طبیعیاتی اور کیمیائی عمل کی ترکیب ہے حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ روح کے کام ان سب سے مختلف ہیں۔

بدن کی تمام مشینریوں کے کام ایک دوسرے سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتے ہیں لیکن دماغ کی کیفیت استثنائی ہے۔ تمام مشینریوں کے کام داخلی پہلو رکھتے ہیں جبکہ روح سے ظاہر ہونے والے کام خارجی پہلو رکھتے ہیں اور ہمیں ہمارے وجود سے باہر کی کیفیت سے آگاہ کرتے ہیں۔

اس گفتگو کی وضاحت کے لیے چند نکات کی طرف توجہ کرنا چاہیئے:

پہلا یہ کہ کیا ہمارے وجود سے باہر کوئی جہان ہے یا نہیں؟ مسلّم ہے کہ باہر بھی ایک جہان ہے۔ آیڈیلسٹ حضرات Idealists خارجی جہان کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے بس ہم ہی ہیں۔ اور ہمارے تصورات اور خارجی جہان بالکل ان مناظر کی طرح ہیں کہ جنہیں ہم عالم خواب میں دیکھتے ہیں اور سب کچھ تصورات ہی ہیں اور کچھ نہیں۔

یہ لوگ سخت غلطی پر ہیں۔ ہم نے متعلقہ بحث میں ان کے اشتباہ کو ثابت کیا ہے کہ کس طرح سے آیڈیالسٹ عمل میں رئیلسٹ (Realists) ہو جاتے ہیں اور جو کچھ وہ کتابی دنیا میں سوچتے ہیں اسے کوچہ و بازار اور عام زندگی کے ماحول میں قدم رکھتے ہی بھول جاتے ہیں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کیا ہم اپنے وجود سے باہر کے جہان سے آگاہ ہیں یا نہیں؟ یقیناً اس سوال کا جواب بھی مثبت ہے کیونکہ ہم اپنے وجود سے باہر کے جہان کے بارے میں بہت سا علم اور آگاہی رکھتے ہیں اور اُن موجودات کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں کہ جو ہمارے آس پاس سے بہت دُور ہیں۔

اس وقت یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا خارجی جہان ہمارے وجود میں آسکتا ہے؟ مسلّم ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا نقشہ ہمارے پاس ہے اور ہم واقع نمائی کی خاصیت سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے وجود سے باہر کے جہان کو معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ واقع نمائی دماغ کے صرف طبیعیاتی کیمیائی Physico Chemical عمل کے خواص نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ خواص بیرونی دنیا کے بارے میں ہمارے تاثرات کی پیداوار ہیں یعنی ان کے معلول ہیں۔ جیسے غذا ہمارے معدے پر اثرات چھوڑتی ہے تو کیا غذا کی معدے پر تاثیر اس کا طبیعیاتی و کیمیائی فعل و انفعال سبب بن سکتا ہے کہ معدہ غذا کے بارے میں آگاہی رکھتا ہو؟ تو پھر کس طرح ہمارا دماغ اپنے سے باہر کی دنیا سے باخبر ہو سکتا ہے؟

Marfat.com

دوسرے لفظوں میں خارجی اور عینی موجودات سے آگاہی کے لیے ان پر ایک قسم کا احاطہ ضروری ہے اور یہ احاطہ کرنا دماغ کے سیلوں کا کام نہیں ہے۔ دماغ کے سیل تو صرف خارج سے متاثر ہوتے ہیں اور یہ تاثر بدن کی مشینوں کی طرح ہے کہ جو خارجی کیفیت سے ان پر مرتب ہوتا ہے۔ یہ بات ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

اگر خارجی جہان سے متاثر ہونا خارج کے بارے میں آگاہی کی دلیل ہوتا تو پھر ضروری تھا کہ ہم اپنے معدے اور زبان کے ذریعے بھی آگاہی حاصل کرتے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ ہمارے ادراکات کی استثنائی کیفیت اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں کوئی اور حقیقت چھپی ہوئی ہے کہ جس کا نظام طبیعیاتی اور کیمیائی نظام سے بالکل مختلف ہے (غور کیجئے گا)۔

۲۔ وحدتِ شخصیت: استقلالِ روح کے بارے میں جو دوسری دلیل ذکر کی جا سکتی ہے وہ انسان کی پوری زندگی میں وحدتِ شخصیت کا مسئلہ ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہم ہر چیز میں شک و تردد رکھتے ہیں تب بھی اس بات میں شک نہیں رکھتے کہ "ہم وجود رکھتے ہیں"۔

"مَیں ہوں" اور اپنی ہستی کے بارے میں مجھے کوئی شک نہیں ہے اور اپنے وجود کے بارے میں میرا علم حضوری ہے حصولی نہیں یعنی مَیں اپنے آپ کے سامنے حاضر ہوں اور اپنے آپ سے جدا نہیں ہوں۔

بہرحال اپنے آپ سے آگاہی ہماری واضح ترین معلومات میں سے ہے اور اس کے لیے کسی استدلال کی احتیاج نہیں۔ مشہور فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ نے اپنے وجود کے لیے جو معروف استدلال کیا ہے وہ یہ ہے:

مَیں سوچ رہا ہوں پس مَیں ہوں۔

یہ ایک اضافی اور غیر صحیح استدلال نظر آتا ہے کیونکہ اس نے اپنے وجود کو ثابت کرنے سے پہلے دو مرتبہ اپنے وجود کا اعتراف کیا ہے۔ ایک مرتبہ "مَیں" کہہ کر اور دوسری مرتبہ "رہا ہوں" کہہ کر۔

دوسری طرف دیکھا جائے تو یہ "مَیں" ابتدائے عمر سے آخر عمر تک ایک اکائی سے زیادہ نہیں ہے۔ آج کا "مَیں" وہی کل کا "مَیں"، وہی بیس سال پہلے کا "مَیں"۔ بچپن سے لے کر اب تک ایک شخص سے زیادہ کچھ نہیں ہوں۔ "مَیں" وہی شخص ہوں کہ جو پہلے تھا اور آخر عمر تک یہی شخص رہوں گا نہ کہ کوئی اور شخص۔ البتہ "مَیں" نے تعلیم حاصل کی اور "مَیں" پڑھا لکھا ہو گیا، "مَیں" نے کمال و ترقی کی منزل طے کی اور پھر بھی کروں گا لیکن "مَیں" کوئی دوسرا آدمی نہیں ہو گیا۔ لہٰذا سب لوگ ابتدائے عمر سے لے کر آخر عمر تک مجھے ایک ہی آدمی جانتے ہیں میرا ایک ہی نام ہے اور وہی اسی شخص کا شناختی کارڈ وغیرہ۔

اب ہم سوچیں اور دیکھیں کہ یہ موجود واحد کہ جس میں ہماری ساری عمر پوشیدہ ہے، کیا ہے؟ کیا یہ ہمارے بدن کے ذرات اور خلیوں یا دماغی سیلوں اور ان کے فعل و انفعالات کا مجموعہ ہے؟ یہ تو ہماری زندگی میں بارہا

Marfat.com

بدلتے رہتے ہیں اور تقریباً ہر سات سال کے بعد ایک مرتبہ تمام سیل بدل جاتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ایک روز و شب میں ہمارے بدن کے لاکھوں سیل مرتے ہیں اور ان کی جگہ نئے سیل لے لیتے ہیں ۔ جیسے کسی پرانی عمارت کی پرانی اینٹیں نکالتے رہیں اور ان کی جگہ نئی اینٹیں لگاتے رہیں تو ایک عرصے بعد یہ عمارت بالکل بدل جائے گی اگرچہ عام لوگوں کو اس کا اندازہ نہ ہو ۔ جیسے کسی ایک بڑے تالاب کا پانی ایک تالاب سے نکلتا رہتا ہے اور دوسری طرف سے تازہ پانی داخل ہوتا رہتا ہے ۔ واضح ہے کچھ عرصے بعد سارا پانی بدل جائے گا اگرچہ ظاہر بیں افراد توجہ نہ کریں اور اسے پہلے والا ہی سمجھتے رہیں ۔

کُلی طور پر ہر موجود جو غذا حاصل کرتا ہے اور غذا کا مصرف رکھتا ہے اس کی تعمیرِ نو کا سلسلہ جاری رہے گا اور وہ بدل جائے گا ۔

لہٰذا ایک ستر سالہ انسان کے تمام اجزائے بدن تقریباً دس مرتبہ بدل چکے ہوتے ہیں ۔ اگر ہم مادیین کی طرح انسان کو وہی جسم اور وہی دماغ و اعصاب اور وہی اس کے طبیعاتی و کیمیائی خواص سمجھیں تو یہ "میں" تو ستر سال کی عمر میں دس مرتبہ بدل چکا ہوگا اور یہ وہی پہلے والا شخص نہیں ہوگا حالانکہ کوئی عقل اس بات کو قبول نہیں کرے گی ۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مادی اجزاء کی بجائے کوئی اور ایک واحدِ ثابت حقیقت ہے جو ساری عمر میں موجود رہتی ہے کہ جو مادی اجزاء کی طرح بدلتی نہیں اور وہی در اصل بنیادِ وجود ہے ۔ وہی ہماری شخصیت کی وحدت کا عامل و باعث ہے ۔

ایک اشتباہ سے اجتناب

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دماغ کے سیل نہیں بدلتے ۔ وہ کہتے ہیں کہ فزیالوجی کی کتابوں کے مطابق دماغ کے سیلوں کی تعداد آغازِ عمر سے آخرِ عمر تک ایک ہی رہتی ہے یعنی وہ بالکل کم یا زیادہ نہیں ہوتے البتہ بڑے ہو جاتے ہیں لیکن یہ نہیں ہوتا کہ اُن جیسے اور سیل پیدا ہوتے ہوں ۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں کوئی نقصان پہنچے تو ان کی جگہ نئے سیل پیدا نہیں ہوتے ۔ لہٰذا ہمارے بدن میں ایک "واحدِ ثابت" موجود رہتا ہے اور یہ دماغ کے سیل ہیں ۔ یہی ہماری شخصیت کی وحدت کے محافظ ہیں ۔

یہ خیال ایک بہت بڑا اشتباہ ہے کیونکہ یہ بات کرنے والوں نے دو مسئلوں کو آپس میں خلط ملط کر دیا ہے ۔ دَورِ حاضر کی سائنس نے جو کچھ ثابت کیا ہے یہ ہے کہ دماغ کے سیل آغاز سے آخر تک تعداد کے لحاظ سے اتنے ہی رہتے ہیں اور ان کی تعداد میں کمی بیشی نہیں ہوتی نہ یہ کہ ان سیلوں کے ذرات نہیں بدلتے ۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ انسانی بدن کے تمام سیلوں کو ہمیشہ غذا کی احتیاج رہتی ہے نیز پرانے سیل مرتے رہتے ہیں ، جیسے کوئی شخص ایک طرف کماتا رہتا ہے اور دوسری طرف خرچ کرتا رہتا ہے ۔ مسلّم ہے

Marfat.com

کہ اس شخص کا سرمایہ آہستہ آہستہ بدل جائے گا اگرچہ اس کی مقدار نہ بدلے۔ جیسے کسی تالاب سے ایک طرف پانی نکلتا رہے اور دوسری طرف سے نیا پانی آتا رہے۔ ایک عرصے بعد اس کا سارا پانی بدل جائے گا اگرچہ اس کی مقدار اتنی ہی رہے۔

(فزیالوجی کی کتابوں میں بھی اس بات کا ذکر موجود ہے۔ نمونے کے طور پر کتاب "ہورمونہا" ص۱۱۱ اور کتاب "فیزیولوژی حیوانی" از ڈاکٹر محمود بہزاد اور ان کے ہمکار ص۳۲ کی طرف رجوع کریں)۔

لہٰذا دماغ کے سیل بھی باقی نہیں رہتے اور دیگر سیلوں کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔

۲۔ بڑے کو چھوٹے پر منطبق نہیں کیا جا سکتا : فرض کریں کہ ـــ ہم دریا کے ایک خوبصورت کنارے پر بیٹھیں ہیں۔ چند چھوٹی چھوٹی کشتیاں پانی کی موجوں پر تیر رہی ہیں۔ ایک بڑی کشتی بھی ہے۔ ایک طرف سورج غروب ہو رہا ہے اور دوسری طرف چاند طلوع ہو رہا ہے۔ خوبصورت آبی پرندے پانی پر آکر بیٹھتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔ ایک طرف بہت بڑا پہاڑ ہے۔ اس کی چوٹی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔

ہم ساحل پر بیٹھے چند لمحوں کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ جو کچھ دیکھا ہے اسے اپنے ذہن پر مجسم کر لیتے ہیں۔ وہی بڑا سا پہاڑ، دریا کی وہی وسعت، وہی بڑی سی کشتی ـــ سب ہمارے صفحۂ ذہن پر ابھر آتے ہیں یعنی جیسے ایک بہت بڑا منظر ہماری روح کے سامنے یا ہماری روح کے اندر موجود ہو۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس منظر کی جگہ کہاں ہے۔ کیا چھوٹے سے دماغ کے سیلوں میں اتنا بڑا نقشہ سما جاتا ہے۔ یقیناً نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے وجود کا ایک اور حصّہ ہو کہ جو اس جسمانی مادہ سے ماوراء ہو اور اس قدر وسیع ہو کہ یہ تمام مناظر اور نقشے اس میں سما سکیں۔

کیا ایک ۵۰۰ مربع میٹر عمارت کا نقشہ اسی لمبائی چوڑائی کے ساتھ چند مربع ملی میٹر زمین پر بنایا جا سکتا ہے؟ مسلّم ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے کیونکہ کوئی بہت بڑا موجود اپنی اسی وسعت کے ساتھ کسی چھوٹے سے موجود پر منطبق نہیں ہو سکتا۔ انطباق کے لیے ضروری ہے کہ جسے منطبق کرنا ہے وہ، اس کے مساوی ہو یا اس سے چھوٹا۔

لہٰذا ہم انتہائی بڑے بڑے ذہنی نقشوں کو اپنے دماغ کے چھوٹے چھوٹے خلیوں میں جگہ کیسے دے سکتے ہیں۔ کرۂ زمین تقریباً چار کروڑ مربع میٹر ہے اس کی ہم اپنے ذہن میں ترسیم کر سکتے ہیں۔ کرۂ آفتاب زمین سے بارہ لاکھ گنا ہے اور کہکشائیں ہمارے آفتاب کی نسبت کئی ملین گنا ہیں، انہیں ہم اپنی فکر میں تصویر کشی کر سکتے ہیں لیکن اگر ہم چاہیں کہ اپنے دماغ کے چھوٹے چھوٹے خلیوں میں یہ نقشے اسی وسعت کے ساتھ بنائیں تو بڑے کے چھوٹے پر منطبق نہ ہو سکنے کے قانون کے مطابق ممکن نہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اس جسم سے مافوق ایک وجود کا اعتراف کریں کہ جس میں یہ بڑے بڑے نقشے سما سکیں۔

Marfat.com

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

ہو سکتا ہے کہا جائے کہ ہمارے ذہنی نقشے مائیکرو فلم یا جغرافیائی نقشوں کی طرح ہیں مثلاً ......۱/۱ یا ......۱/۱۰۰ (یعنی ایک سنٹی میٹر برابر ہے ۱۰ لاکھ سنٹی میٹر وغیرہ) ۔جغرافیائی نقشوں یا مائیکرو فلموں میں ہم اس طرح کا تناسب معین کر لیتے ہیں۔ یہ سکیل Scale ہمیں بتاتی ہے کہ اس نقشے کو ہم اسی نسبت کے ساتھ بڑا کریں گے تو اصل پیمائش ہمیں میسر آجائیں گی۔ نیز ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ کسی دیو پیکر جہاز کی ایک تصویر سے ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کتنا بڑا ہے لہٰذا اس کی تصویر کھینچنے سے پہلے کسی انسان کو اس کے عرشے پر کھڑا کر کے دونوں کی تصویر کھینچتے ہیں تاکہ موازنے سے اندازہ ہو جائے کہ جہاز کتنا بڑا ہے۔

ہو سکتا ہے کہا جائے کہ ہمارے ذہنی نقشے بھی چھوٹی چھوٹی تصویریں ہیں جنہیں معین سکیل کے تحت چھوٹا کیا گیا ہے اور اگر انہیں اسی نسبت سے بڑا کر دیا جائے تو ایک حقیقی نقشہ مل جائے گا اور مسلم ہے کہ یہ چھوٹے نقشے دماغ کے سیلوں میں بن سکتے ہیں (غور کیجئے گا)۔

اب ہم اس سوال کے جواب کی طرف آتے ہیں۔

اہم بات یہی ہے کہ مائیکرو فلموں کو عام طور پر پروجیکٹروں کے ذریعے بڑا کر کے پردۂ سکرین پر منعکس کرتے ہیں۔ اسی طرح جغرافیائی نقشوں میں دی گئی سکیل کے مطابق ہم نقشے کو ضرب دے کر اپنے ذہن میں منعکس کرتے ہیں۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بڑا پردہ جس پر ہماری بڑی بڑی ذہنی فلمیں منعکس ہوتی ہیں، کہاں ہے؟

کیا وہ بڑا پردہ دماغ کے خلیے ہیں؟ وہ تو قطعاً نہیں اور وہ چھوٹا جغرافیائی نقشہ کہ جسے ہم بڑے عدد سے ضرب دے کر بڑے نقشے میں تبدیل کرتے ہیں یقیناً اس کے لیے کوئی جگہ چاہیئے۔کیا دماغ کے چھوٹے چھوٹے خلیے اس کی جگہ بن سکتے ہیں؟

زیادہ واضح عبارت میں ــ مائیکرو فلم اور جغرافیائی نقشے میں جو کچھ خارج میں ہے وہ تو وہی چھوٹی فلم اور نقشہ ہے لیکن ہمارے ذہنی نقشوں میں تو بعینہ وہ نقشے اپنے خارجی وجود کی مقدار کے مطابق ہیں۔ لہٰذا انہیں تو جگہ چاہیئے خود انہیں کے برابر اور انہی کی مقدار کے مطابق۔اور ہم جانتے ہیں کہ دماغ کے خلیے اس سے کہیں چھوٹے ہیں کہ انہیں اسی مقدار کے مطابق ان پر منعکس کیا جا سکے۔ مختصر یہ کہ ان ذہنی نقشوں کو ہم ان کے خارجی وجود کے مطابق تصور کرتے ہیں اور یہ بڑی تصویر چھوٹے سے خلیوں میں منعکس نہیں ہو سکتی لہٰذا ان کے لیے کسی جگہ کی ضرورت ہے۔یہیں سے ہم سیلوں سے مافوق ایک حقیقی وجود کا سراغ پاتے ہیں۔

۴۔ روح کے مظاہر مادی کیفیات کی مانند نہیں: ایک اور دلیل جو ہمیں استقلالِ روح اور اس کے غیر مادی ہونے کی طرف رہنمائی کر سکتی ہے یہ ہے کہ مظاہرِ روح میں کچھ خواص و کیفیات ایسی دکھائی دیتی ہیں جو مادی موجودات کے خواص و کیفیات سے کوئی مشابہت نہیں رکھتیں ــ کیونکہ:

Marfat.com

اولاً موجودات کے لیے زمانہ درکار ہے اور وہ تدریجی پہلو رکھتے ہیں۔
ثانیاً وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ وہ کہنہ اور فرسودہ ہو جاتے ہیں۔
ثالثاً ان کا متعدد اجزاء میں تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔

لیکن — ذہنی موجودات اور اس میں پیدا ہونے والی چیزوں میں یہ آثار و خواص نہیں ہیں۔ ہم موجود جہان جیسا ایک جہان اپنے ذہن میں ترسیم کر سکتے ہیں، بغیر اس کے کہ زمانہ گزرے اور اس کے لیے تدریجی پہلو کی ضرورت ہو۔

اس سے قطع نظر، وہ مناظر کہ مثلاً جو بچپن میں ہمارے صفحۂ ذہن پر نقش ہو گئے تھے زمانہ گزرنے کے باوجود پرانے اور فرسودہ نہیں ہوتے اور ان کی شکل اسی طرح محفوظ ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے انسان کا دماغ کہنہ ہو گیا ہو لیکن اس کہنگی سے وہ گھر کہ جس کا نقشہ بیس سال قبل ہمارے ذہن میں ثبت ہوا تھا اسی طرح رہتا ہے۔ اس میں ایک طرح کا ثبات رہتا ہے کہ جو ماورائے مادہ جہان کی خاصیت ہے۔

نقشوں اور تصویروں کے بارے میں ہماری روح عجیب و غریب صلاحیت رکھتی ہے۔ ہم لحہ بھر میں کسی تمہید کے بغیر ہر قسم کا نقشہ اپنے ذہن میں کھینچ سکتے ہیں۔ مثلاً آسمانی کرّے، کہکشائیں یا زمینی موجودات دریا، پہاڑ وغیرہ ان سب کا تصور ہمارے ذہن میں آن واحد میں ابھر سکتا ہے۔ یہ خاصیت ایک مادی موجود کی نہیں ہے بلکہ مافوق مادہ موجود کی نشانی ہے۔

اس کے علاوہ ہم جانتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ ۲ × ۲ = ۴ کی مساوات میں مساوات کی ہر طرف کو ہم جزو جزو کر سکتے ہیں یعنی ۲ کا تجزیہ کریں یا ۴ کا لیکن اس مساوات کا تجزیہ نہیں کر سکتے اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ مساوات دو آدھے رکھتی ہے اور ہر آدھا دوسرے آدھے کے غیر ہے۔ مساوات کا ایک ہی مفہوم ہے کہ جو قابل تجزیہ نہیں ہے۔ یعنی ۲ × ۲ = ۴ یا ہے یا نہیں ہے اسے دو نیم ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس قسم کے ذہنی مفاہیم قابل تقسیم و تجزیہ نہیں ہیں اسی بناء پر وہ مادی نہیں ہو سکتے کیونکہ اگر وہ مادی ہوتے تو ان کا تجزیہ ہو سکتا اور انہیں تقسیم کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری روح کہ جو ایسے غیر مادی مفاہیم کا مرکز ہے مادی نہیں ہو سکتی اس لیے وہ مافوق مادہ ہے (غور کیجئے گا)[1]

---

[1] کتاب "معاد و جہان پس از مرگ" کے حصہ "استقلال روح" کی تلخیص۔

Marfat.com

(۸۶) وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ثُمَّ
لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا ۝
(۸۷) اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ
عَلَیْكَ كَبِیْرًا ۝

ترجمہ

(۸۶) اور اگر ہم چاہیں تو جو کچھ وحی کی صورت میں تجھے دیا گیا ہے وہ تجھ سے لے لیں۔ پھر تو ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی نہ پائے گا۔

(۸۷) مگر یہ کہ تیرے رب کی رحمت (تیرے شامل حال) ہو کیونکہ تیرے رب کا فضل تجھ پر بہت زیادہ ہے۔

تفسیر

تجھے جو کچھ حاصل ہے اُس کی رحمت سے ہے

گزشتہ آیات میں قرآن کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیرِ نظر دو آیات میں بھی اسی سلسلے میں بات کی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے: ہم اگر چاہیں تو جو کچھ وحی کی صورت میں تجھے دیا گیا ہے وہ تجھ سے لے لیں (ولئن شئنا لنذهبن بالذی اوحینا الیك)۔ اور ایسا ہو جائے تو پھر تو ہمارے مقابلے میں، کوئی حمایتی نہ پائے گا (ثم لا تجد لك به علینا وكیلاً)۔

ہم ہی نے تجھے یہ علوم بخشے ہیں تاکہ تُو لوگوں کا ہادی و رہبر بنے اور ہم ہی اگر مصلحت سمجھیں تو یہ تجھ سے واپس لے لیں اور اس میں کسی شخص کو کوئی دخل اور تصرف نہیں ہے۔

گزشتہ آیات سے ان آیات کے ربط کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کے علاوہ یہ احتمال بھی ہے کہ گزشتہ بحث کے آخری جملے میں ہے:

تمہیں صرف تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔

Marfat.com

زیر بحث آیت میں ہے کہ خدا نے علم کا جو حصہ پیغمبر کو دیا ہے اگر چاہے تو وہ بھی واپس لے سکتا ہے لہٰذا تمہاری ہر چیز یہاں تک کہ تمہارا علم اور آگہی بھی اُسی کی طرف سے ہے۔

بعد والی آیت استثناء کی صورت میں آئی ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے: اگر یہ علم ہم تجھ سے واپس نہیں لیتے تو یہ تیرے رب کی رحمت ہے (الا رحمة من ربك)۔ خود تیری ہدایت و نجات کیلئے بھی رحمت ہے اور عالم بشریت کی ہدایت و نجات کے لیے بھی۔ یہ رحمت درحقیقت اسی رحمتِ خلقت کا تسلسل ہے۔

وہ خدا کہ جس نے اپنی عام اور خاص رحمت کے تقاضے کے مطابق انسانوں کو پیدا کیا اور انہیں لباسِ ہستی عطا کیا، کیا وہ لباس کہ جو تکامل و ارتقاء کے لیے بہترین ہے، اسی خدا نے راہِ حیات طے کرنے کے لیے اپنی رحمت کے تقاضے پر اُن کو نہیں دیا۔ آگاہ، معصوم، انتھک، ہمدرد، مہربان اور با استقامت رہبران کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے۔ یہی رحمت ہے کہ جس کا تقاضا ہے کہ روئے زمین کبھی حجتِ خدا سے خالی نہ رہے۔

آیت کے آخر میں تاکید کے طور پر یا گزشتہ بات کی دلیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے: تیرے رب کا فضل تجھ پر بہت زیادہ ہے (ان فضله کان علیك کبیرًا)۔

ایک طرف تو تیری عبادت، تہذیبِ نفس اور جہاد نے تیرے دل کی آبیاری کی اور یہ اس کے فضل کا سبب بنی اور دوسری طرف ایک رہبر کے لیے انسانوں کی ناگزیر احتیاج کے تقاضے پر تجھ پر خدا کا انتہائی فضل ہوا۔ اس نے علم کے دروازے تیرے لیے وا کیے، تجھے انسانی ہدایت کے اسرار سے آگاہ کیا اور تجھے خطاؤں سے محفوظ رکھا تاکہ تُو اختتامِ جہان تک لوگوں کے لیے اسوہ نمونہ بن جائے۔

ضمناً اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ مندرجہ بالا جملہ استثنائیہ قبل کی آیت سے مربوط ہے اور مستثنیٰ و مستثنیٰ منہ کا مفہوم اسی طرح ہے:

اگر ہم چاہیں تو تجھ پر بھیجی گئی وحی واپس لے لیں لیکن ہم ایسا نہیں کریں گے کیونکہ رحمتِ الٰہی تیرے اور لوگوں کے شاملِ حال ہے[1]

واضح ہے کہ ایسا استثناء اس امر کی دلیل نہیں کہ ہو سکتا ہے خدا عملی طور پر کسی دن یہ رحمت اپنے پیغمبر سے واپس لے لے بلکہ اس بات کی دلیل ہے کہ پیغمبر کے پاس بھی اپنی طرف سے کچھ نہیں ہے اس کا علم اور آسمانی وحی سب خدا کی طرف سے ہیں اور اس کی مشیئت سے وابستہ ہیں۔

---

[1] درحقیقت جملے کا مفہوم اس طرح ہے:

ولکن لا نشاء ان نذهب بالذی اوحینا الیك رحمة من ربك

لیکن ہم نہیں چاہتے کہ تیری طرف جو کچھ وحی کیا گیا ہے اسے واپس لے لیں کیونکہ یہ تیرے رب کی رحمت ہے۔

Marfat.com

(۸۸) قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ عَلٰۤی اَنۡ یَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا یَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِهٖ وَلَوۡ کَانَ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ ظَهِیۡرًا ○

(۸۹) وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا لِلنَّاسِ فِیۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ مِنۡ کُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰۤی اَکۡثَرُ النَّاسِ اِلَّا کُفُوۡرًا ○

ترجمہ

(۸۸) کہہ دو : اگر انسان اور جن مل کر اس قرآن کی مثل لانا چاہیں تو اس کی مثل نہیں لاسکیں گے اگرچہ اس کام میں وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں ۔

(۸۹) اس قرآن میں ہم نے لوگوں کے سامنے طرح طرح کی مثالیں اور نمونے پیش کیے ہیں لیکن لوگ انکارِ حق کے سوا کچھ نہیں کرتے ۔

تفسیر

قرآن کی مثل کبھی نہیں لائی جاسکتی

قبل اور بعد کی آیات قرآن کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں جبکہ زیرِ بحث آیات صراحت کے ساتھ اعجازِ قرآن کے متعلق بات کر رہی ہیں ۔ اس لحاظ سے زیرِ نظر آیات کا گزشتہ اور بعد کی آیات سے ربط محتاجِ بیان نہیں ہے ۔

علاوہ ازیں آئندہ آیات میں مشرکین کی بہانہ تراشیوں کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے کہ وہ طرح طرح من پسند معجزات کا تقاضا کرتے تھے ۔ اس حوالے سے زیرِ نظر آیات آئندہ کی بحث کے لیے مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان بہانہ تراش لوگوں پر واضح کرتی ہیں کہ پیغمبرِ اسلام کی حقانیت کا اعلیٰ ترین، زندہ اور جاوداں معجزہ یہی قرآن ہے کہ جو تاریخ میں ہمیشہ چمکتا رہے گا اور اس کے ہوتے ہوئے بہانہ سازیاں بے جا ہیں ۔

بعض نے ان آیات کا تعلق گزشتہ آیات سے اس پہلو سے بیان کیا ہے کہ روح کے اسرار آمیز ہونے

Marfat.com

کا موازنہ قرآن کے اسرار آمیز ہونے سے کیا گیا ہے [1] البتہ جس ربط کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ واضح نظر آتا ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ یہاں روئے سخن اپنے رسول کی جانب کرتے ہوئے کہتا ہے: ان سے کہو: اگر تمام انسان اور جن بل کر قرآن کی مثل لانا چاہیں تو بھی وہ اس جیسا کلام لانے پر قادر نہیں ہو سکتے اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں (قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یأتوا بمثل ھذا القراٰن لا یأتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرًا)۔

یہ آیت پوری صراحت کے ساتھ پورے عالم کو چیلنج کرتی ہے۔ سب لوگ چاہے چھوٹے ہوں یا بڑے عرب ہوں یا غیر عرب حتیٰ کہ انسان ہوں یا غیر انسان ذوی العقول موجودات، علماء، فلاسفہ، ادباء، مؤرخین نوابغ یا غیر نوابغ غرض یہ کہ قرآن بلا استثناء سب کو مقابلے کی دعوت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر تمہارا خیال ہے کہ قرآن خدا کا کلام نہیں ہے اور انسانی دماغ کی ایجاد ہے تو تم بھی انسان ہو، اس کی مثل لے آؤ اور اگر مشترکہ کاوش کے باوجود اپنے آپ کو ناتواں پاؤ تو یہ اعجازِ قرآن کی بہترین دلیل ہے۔

عقائد اور کلام کے علماء مقابلے کی اس دعوت کو "تحدی" (چیلنج) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ تحدی ہر معجزے کا ایک رکن ہے، جہاں کہیں اس قسم کی تعبیر آئے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ امر معجزات میں سے ہے۔

آیت کے چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ یہ چیلنج عام ہے اور سب انسانوں اور دیگر ذوی العقول موجودات پر محیط ہے۔

۲۔ یہ تحدی اور دعوت دائمی ہے کیونکہ اس میں زمانے کی شرط نہیں۔ اس طرح سے یہ دعوت جس طرح رسول اللہؐ کے زمانے میں تھی آج بھی ہے اور کل بھی ہوگی۔

۳۔ "اجتمعت" کی تعبیر مل جل کر، ہم فکر ہو کر اور باہمی تعاون سے مقابلے کے لیے آنے کی دعوت کا اظہار کر رہی ہے! اور یہ بات مسلّم ہے کہ اس طرح سے قوت میں سینکڑوں گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔

۴۔ "ولو کان بعضھم لبعض ظھیرًا" (اگرچہ ایک گروہ دوسرے کی مدد کرے) یہ جملہ ہم فکر ہونے اور باہمی تعاون کے لیے تاکید مزید ہے نیز ضمناً یہ مقاصد و اہداف کی پیش رفت میں ہم فکری و تعاون کی اہمیت و تاثیر کے لیے ایک سربستہ اشارہ ہے۔

۵۔ "مثل ھذا القراٰن" — یہ ایک جامع تعبیر ہے جو ہر لحاظ سے مثل و مشابہ ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے، مضامین و مفاہیم کے لحاظ سے، انسان سازی کے حوالے سے،

---

[1] فی ظلال القرآن ج ۵ ص ۳۵۵، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

علمی مباحث کے پہلو سے، حیات بخش معاشرتی قانون کے لحاظ سے، خرافات سے پاک تاریخ کے اعتبار سے، پیش گوئیوں کے لحاظ سے اور دیگر تمام پہلوؤں کے اعتبار سے۔ اس کی مثل ہو۔

۶۔ سب انسانوں کو دعوت دینا اس بات کی دلیل ہے کہ مسئلہ اعجاز میں صرف الفاظِ قرآن اور فصاحت و بلاغت کا پہلو ملحوظِ نظر نہیں ہے کیونکہ ایسا ہوتا تو عربی زبان سے ناآشنا لوگوں کو دعوت دینا بے فائدہ تھا۔

۷۔ ایک منہ بولتا اور رسا معجزہ وہ ہے جس کے لانے والا مخالفین کو نہ صرف مقابلے کی دعوت دے بلکہ مختلف طریقوں سے اس کام کی تحریک کرے اور تشویق دلائے۔ بالفاظِ دیگر غیرت دلائے تاکہ اس کام کے لیے جو کچھ ان کے بس میں ہو وہ کریں۔ پھر جب وہ ایسا نہ کرسکیں تو اعجاز کی عظمت اور گہرائی واضح ہو جائے زیرِ بحث آیت میں عملی طور پر بالکل ایسا ہی کیا گیا ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو سب انسانوں کو دعوت دی گئی ہے اور "لا یأتون بمثلہ" کہہ کر ان کے عجز کی تصریح کی گئی ہے اور اس طرح انہیں اکسایا گیا ہے اور دوسری طرف " ولو کان بعضھم لبعض ظہیرًا" کہہ کر مزید تحریک دلائی گئی ہے۔

بعد والی آیت درحقیقت اعجازِ قرآن کے ایک اور پہلو کو بیان کرتی ہے اور وہ ہے اس کی جامعیت۔ ارشاد ہوتا ہے: اس قرآن میں ہم نے تمام طرح کے معارف کا نمونہ بیان کیا ہے (ولقد صرفنا للناس فی ھذا القراٰن من کل مثل) لیکن اس کے باوجود اکثر جاہل و نادان لوگوں نے نہ صرف انکارِ حق ہی کیا ہے بلکہ ان کا ردِعمل ایسا ہے گویا انہوں نے دلائلِ ہدایت کو دیکھا تک نہیں (فابی اکثر الناس الا کفورًا)۔

"صرفنا" "تصریف" کے مادہ سے ہے۔ یہ تغیّر یا تبدّل اور ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنے کے معنی میں آیا ہے۔

"کفور" انکارِ حق کے معنی میں آیا ہے۔

واقعاً مضامینِ قرآن کا یہ تنوّع اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے ذریعے کہ جس نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا ہو، عجیب و غریب ہے کیونکہ اس آسمانی کتاب میں عقائد کے بارے میں متین اور پختہ عقلی دلائل بھی ہیں اور نوعِ بشر کی تمام ضروریات کی بنیاد پر متین و استوار احکام بھی ہیں۔ تاریخ کے بارے میں بھی اس کی گفتگو بے نظیر، جذبوں کو ابھارنے والی، بیدارکن، دلچسپ، ہلا دینے والی خرافات سے پاک ہے۔ نیز اس کی اخلاقی مباحث بھی دلوں پر وہی تاثرات مرتب کرتی ہیں جو ابرِ بہار بے جان زمین پر۔ اسی طرح اس کے علمی مسائل ایسے حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں جن کی کم از کم اُس زمانے میں علماء کو خبر نہ تھی۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کی ہر وادی حسین ترین اور عالی ترین ہے۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ انسان کی معلومات محدود ہیں، جیسا کہ گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے

Marfat.com

اور خصوصاً اُس ماحول پر نظر کریں کہ جس میں پیغمبرِ اسلامؐ پروان چڑھے کہ جب اس محدود علم کی بھی لوگوں کو خبر نہ تھی اس کے باوجود قرآن نے توحید، اخلاق، معاشرت، سیاست اور انتظامی امور پر ایسے متنوع مضامین پیش کیے ہیں، کیا یہ امر اس بات کی دلیل نہیں کہ اسے انسانی دماغ نے نہیں تراشا بلکہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر جن وانس مل کر اس کی مثل لانا چاہیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

فرض کریں کہ دورِ حاضر کے علماء، دانشور اور مختلف علوم کے ماہرین جمع ہو جائیں اور وہ ایک انسائیکلوپیڈیا تیار کریں اور اسے بہترین قالب میں ڈھالیں تو ہو سکتا ہے کہ یہ آج کے زمانے کے لحاظ سے تو جامعیت رکھتا ہو لیکن مسلّم ہے کہ پچاس سال بعد نہ صرف یہ ناقص اور نارسا معلوم ہو گا بلکہ اس کی کہنگی کے آثار بھی نمایاں ہوں گے جبکہ قرآن جس زمانے میں بھی پڑھا جائے گا خصوصاً ہم نے اسے دورِ حاضر کے حوالے سے دیکھا تو ایسا لگتا ہے جیسے آج ہی اور آج کے لیے نازل ہوا ہے اس پر مرورِ زمانہ کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔

Marfat.com

(۹۰) وَقَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ
الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝
(۹۱) اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ
خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝
(۹۲) اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ
بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝
(۹۳) اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ
وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ
سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝

ترجمہ

(۹۰) اور انہوں نے کہا کہ ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک تُو ہمارے لیے اس (خشک اور بنجر) زمین سے ایک چشمہ جاری نہ کر دے۔

(۹۱) یا تیرے لیے کھجور اور انگور کا باغ پیدا ہو اور تُو اس میں نہریں جاری کر دے۔

(۹۲) یا جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے تُو آسمان سے (پتھروں کے) ٹکڑے ہمارے سروں پر گرا دے یا اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آ۔

(۹۳) یا تیرے لیے سونے کا ایک مزیّن گھر ہو یا تُو آسمان پر چڑھ جائے (لیکن) ہم

Marfat.com

تیرے آسمان پر چڑھ جانے پر بھی ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک تُو ہمارے لیے کوئی ایسا نامہ نہ لے آئے جسے ہم پڑھیں ۔ ان سے کہہ دے میرا رب (ان بے قیمت مہمل باتوں سے) پاک ہے جبکہ میں اس کے فرستادہ ایک انسان کے سوا کچھ نہیں ہوں ۔

شانِ نزول

اسلامی روایات میں اور مختلف مفسرین کی تفسیروں میں مندرجہ بالا آیات کے بارے میں مختلف عبارتوں میں شانِ نزول نقل ہوئی ہے ۔ ان کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے :

بعض مشرکین مکہ کہ جن میں ولید بن مغیرہ اور ابوجہل بھی تھا خانہ کعبہ کے پاس جمع ہوتے ۔ انہوں نے ایک دوسرے سے رسول اللہ (ص) کے بارے میں گفتگو کی ۔ آخرکار نتیجۂ بحث یہ نکلا کہ کوئی محمد (ص) کے پاس بھیجا جائے جو یہ پیغام دے کہ تیرے قبیلہ قریش کے اشراف جمع ہوئے ہیں ، وہ تجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں لہٰذا تم ہمارے پاس آؤ ۔

پیغمبرِ اکرم (ص) کو امید ہوئی کہ شاید نورِ ایمان ان کے دلوں میں چمک اٹھا ہو اور وہ حق کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوئے ہوں لہٰذا وہ فوراً ان کے پاس تشریف لے گئے ۔

جب آپ (ص) اُن کے پاس پہنچے تو انہوں نے ایسی باتیں کیں :

"اے محمد ! ہم نے تمہیں اتمامِ حجت کے لیے بلایا ہے ۔ ہم کسی ایسے شخص کو نہیں جانتے کہ جس نے اپنے قوم و قبیلہ کو اتنی تکلیف پہنچائی ہو جتنی تم نے پہنچائی ہے ۔ تم نے ہمارے خداؤں کو گالیاں دیں ، ہمارے دین کا مذاق اڑایا ، ہماری عقل کو حماقت قرار دیا اور اتحاد میں نفاق کا بیج بویا ۔ ہمیں بتاؤ آخر تم چاہتے کیا ہو ۔ تمہیں دولت کی ضرورت ہے تو ہم اتنی دولت دیں گے کہ تم بے نیاز ہو جاؤ گے ۔ مقام و منصب چاہتے ہو تو ہم تمہیں بہت بڑا منصب دینے کو تیار ہیں ۔ تم بیمار ہو (اور تمہیں کوئی نفسیاتی تکلیف ہے) تو ہم تیرے علاج کے لیے بہترین طبیب لے آتے ہیں ۔

پیغمبرِ اکرم (ص) نے فرمایا :

ان میں سے کوئی بھی مسئلہ نہیں ۔ خدا نے مجھے تمہاری طرف بھیجا ہے اور آسمانی کتاب مجھے دی ہے ۔ اگر اسے قبول کر لو تو اس میں تمہاری دنیا و آخرت کی بھلائی ہے اور اگر تم قبول نہ کرو

Marfat.com

گے تو میں صبر کروں گا یہاں تک کہ خدا تمہارے اور میرے درمیان فیصلہ کر دے۔
وہ کہنے لگے:

بہت اچھا، یہ بات ہے تو ہمارے شہر جیسا تنگ کوئی اور شہر نہیں ہے (مکہ کے اطراف میں پہاڑیاں ہیں) اپنے پروردگار سے سوال کرو کہ ان پہاڑوں کو پیچھے کر دے اور شام و عراق کی طرح یہاں دریا جاری کر دے تاکہ یہ خشک و بے آب و گیاہ زمین سیراب ہو جائے نیز اس سے یہ بھی تقاضا کرو کہ ہمارے بڑوں کو زندہ کر دے۔ البتہ ان میں قصی بن کلاب ضرور ہو کیونکہ وہ راست گو بزرگ تھا، تاکہ ہم اس سے پوچھیں کہ تُو جو کچھ کہتا ہے وہ حق ہے یا باطل۔

رسول اللہؐ نے بے اعتنائی سے فرمایا:

مَیں ان کاموں پر مامور نہیں ہوں۔

وہ کہنے لگے:

اگر ایسا نہیں کرتے تو کم از کم اپنے خدا سے کہو کہ کوئی فرشتہ بھیج دے کہ جو تیری تصدیق کرے۔ علاوہ ازیں ہمیں باغات، خزانے اور سونے کے محلات دے دے۔

آپؐ نے فرمایا:

مَیں ان امور کے لیے مبعوث نہیں ہُوا۔ مَیں خدا کی طرف سے ایک دعوت لے کر آیا ہوں۔ اگر قبول کرتے ہو تو خوب ورنہ خدا میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے گا۔

وہ کہنے لگے:

پھر جیسا کہ تیرا گمان ہے کہ تیرا خدا جب چاہے ہمارے سروں پر پتھر گرا سکتا ہے، یہ آسمانی پتھر ہمارے سروں پر برسا۔

آپؐ نے فرمایا:

یہ کام خدا سے متعلق ہے۔ وہ چاہے گا تو کرے گا۔

ان میں سے ایک کہنے لگا:

تُو یہ کام کر بھی دکھائے تب بھی ہم ایمان نہیں لائیں گے، ہم تو اس وقت ایمان لائیں گے جب تُو خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آئے گا۔

رسول اللہؐ نے یہ فضول باتیں سُنیں تو اٹھ کھڑے ہوئے اور اس مجلس سے جانے لگے اور ان میں سے بعض افراد آپؐ کے پیچھے آئے اور کہنے لگے:

اے محمدؐ! تیری قوم نے تیرے سامنے جو بھی تجویز رکھی ہے تُو نے قبول نہیں کی۔ پھر انہوں نے کچھ امور کہ جو ان سے متعلق تھے ان کی خواہش کی، تُو نے وہ بھی پوری نہیں کی۔ آخر کار

Marfat.com

انہوں نے تجھ سے اس عذاب کی خواہش کی ہے کہ جس کی تُو دھمکی دیتا رہتا ہے کہ ان پر لائے گا۔ خدا کی قسم! ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ تُو یہ نہ کرے کہ آسمان کی طرف ایک سیڑھی لگائے اور اس کے ذریعے تُو ہمارے سامنے اوپر جائے اور واپسی پر اپنے ساتھ چند فرشتے لے کر آئے اور ساتھ ہی تیرے پاس ایک خط بھی ہو کہ جو تیرے دعویٰ کی صداقت کی گواہی دے۔

ابوجہل کہنے لگا:

چھوڑو اسے۔ یہ تو ہمارے بُتوں کو گالیاں دینے کے علاوہ کچھ نہیں جانتا اور میں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ جس وقت یہ سجدے میں ہو گا ایک بہت بڑا پتھر اٹھا کر اس کے دماغ پر دے ماروں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں سے اس حالت میں لوٹے۔ اس قوم کی جہالت، ہٹ دھرمی اور غرور کے باعث آپ کا دل غم و اندوہ سے معمور تھا۔ اس موقع پر زیرِ نظر آیات نازل ہوئیں [1]

تفسیر

طرح طرح کے بہانے

گزشتہ آیات میں قرآن حکیم کی عظمت اور اعجاز کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ اب زیرِ نظر آیات میں مشرکین کے کچھ بہانوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ ایسی بہانہ تراشیاں کرتے تھے کہ جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کافروں کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ رسول اللہؐ کی حیات آفریں دعوت کے جواب میں ہٹ دھرمی، عناد، سرکشی اور غرور کا مظاہرہ کریں کیونکہ وہ پیغمبرِ اکرمؐ کی منطقی بات اور زندہ سند کے جواب میں نہایت نامعقول تقاضے کرتے تھے۔

مندرجہ بالا آیات میں ان کے چھ مختلف تقاضے بیان ہوئے ہیں:

۱۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: اور انہوں نے کہا کہ ہم اس وقت تک تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک تُو اس زمین سے پانی کا چشمہ نہ جاری کر دکھائے (وقالوا لن نؤمن لک حتّٰی تفجر لنا من الارض ینبوعًا)۔

"فجور" اور "تفجیر" شگافتہ کرنے اور چیرنے کے معنی میں ہے، چاہے زمین کو چشمہ کے ذریعے شگافتہ کیا جائے یا نورِ سحر کے ذریعے افق کو۔ البتہ "تفجیر" "فجور" کی نسبت زیادہ

---

[1] تفسیر مجمع البیان زیرِ نظر آیات کے ذیل میں، درالمنثور میں بھی ان آیات کے ذیل میں کچھ اختلاف کے ساتھ شانِ نزول بیان ہوئی ہے۔

Marfat.com

مبالغے کو ظاہر کرتا ہے۔
"ینبوع" "نبع" کے مادہ سے ہے۔ یہ پانی کے جوش مارنے اور پھوٹنے کی جگہ کے معنی میں ہے بعض کہتے ہیں کہ "ینبوع" پانی کے اس چشمے کو کہتے ہیں کہ جو کبھی خشک نہ ہوتا ہو۔
۲۔ یا تمہارے پاس کھجور اور انگور کا باغ ہو کہ جس کے درختوں کے درمیان تو نہریں جاری کردے (او تکون لك جنة من نخیل و عنب فتفجر الانهار خلالها تفجیرًا)۔
۳۔ یا جیسا کہ تُو کہتا ہے آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے سروں پر گرا دے (او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفًا)۔
۴۔ یا اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آ (او تأتی باللہ والملائکة قبیلًا)۔
"قبیل" کا معنی بعض اوقات کفیل اور ضامن کیا گیا ہے اور کبھی یہ اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے سامنے ہو۔ بعض نے اسے "قبیلة" کی جمع سمجھا ہے جس کا معنی ہے جماعت۔
پہلے معنی کے مطابق آیت کی تفسیر اس طرح ہوگی:
تُو اللہ اور فرشتوں کو اپنی بات کی صداقت کے ضامن کے طور پر لے آ۔
دوسرے معنی کے مطابق تفسیر یوں ہوگی:
تُو اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آ۔
تیسرے معنی کے مطابق آیت کا مفہوم یہ ہوگا:
گروہ گروہ کر کے ہمارے پاس لے آ۔
توجہ رہے کہ اِن تینوں مفاہیم کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب مفاہیم آیت میں جمع ہوں کیونکہ ہمارے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایک لفظ ایک سے زیادہ معانی کے ساتھ استعمال ہو۔
۵۔ یا پھر تیرے پاس سونے کا گھر ہو، نقش و نگار اور مزین گھر (او یکون لك بیت من زخرف)۔
"زخرف" اصل میں زینت کے معنی میں ہے اور چونکہ سونا مشہور زینت بخش دھاتوں میں سے ہے لہٰذا اسے "زخرف" کہا جاتا ہے۔ نقش و نگار سے مزین گھروں کو بھی "زخرف" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح دلفریب اور پُرفریب باتوں کو بھی "مزخرف" کہتے ہیں۔
۶۔ یا پھر آسمان پر چڑھ کر دکھاؤ لیکن ہم تمہارے صرف آسمان پر چڑھنے سے ایمان نہیں لائیں گے بلکہ اپنے ساتھ واپسی پر کوئی خط بھی لے کر آؤ جسے ہم پڑھیں (او ترقی فی السماء ولن نؤمن لرقیك حتّٰی تنزل علینا کتابًا نقرؤہ)۔
ان آیات کے آخر میں ہے کہ خدا نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ ان ایک دوسرے کی ضد، مہمل اور

Marfat.com

مضحکہ خیز تجاویز کے جواب میں کہو: میرا پروردگار ان اوہام سے پاک اور منزہ ہے (قل سبحان ربی)۔ کیا میں خدا کے فرستادہ ایک انسان کے سوا کچھ اور ہوں؟ (ھل کنت الا بشرًا رسولًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ بہانہ تراشیوں کا جواب: جیسا کہ شانِ نزول کے علاوہ خود مندرجہ بالا آیات کا لب و لہجہ گواہی دیتا ہے کہ مشرکین کے ان عجیب و غریب تقاضوں کی بنیاد حق جوئی نہ تھی بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ بُت پرستی اور شرک کا مذہب باقی رہ جائے کیونکہ اس مذہب سے مکّہ کے رؤسا کی قدرت و طاقت وابستہ تھی اور وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح رسول اللہ کو راہِ توحید کا سفر جاری رکھنے سے روک سکیں۔

لیکن رسولِ اکرمؐ نے انہیں دو منطقی، واضح اور مختصر جوابات دیئے۔

پہلا یہ کہ میرا پروردگار ان امور سے منزہ ہے۔ وہ اس سے منزہ ہے کہ کبھی اُس کا حکم مانے اور کبھی اِس کا۔ وہ فضول بہمل اور بے بنیاد تقاضوں کے سامنے سر جھکانے سے منزہ ہے (سبحان ربی)۔

دوسرا یہ کہ اس سے قطع ـ اصولی طور پر معجزات بھیجنا اس کا کام ہے اور معجزات اسی کے ارادے اور فرمان کے تحت انجام پاتے ہیں، مَیں تو یہاں تک بھی حق نہیں رکھتا کہ ان کا خود تقاضا ہی کروں۔ وہ جس وقت ضروری سمجھے گا اپنے رسول کی دعوت کی صداقت کے لیے جو معجزہ ضروری ہوگا بھیج دے گا (ھل کنت الا بشرًا رسولًا)۔

یہ صحیح ہے کہ یہ دونوں جواب ایک دوسرے سے مربوط ہیں تاہم دو جواب شمار ہوتے ہیں۔ ایک یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ کام انسان کے بس کا نہیں اور دوسرا انسان کے خدا کا ان من پسند کے معجزات کی خواہش قبول کرنے سے منزہ ہونا ثابت کرتا ہے۔

اصولی طور پر رسول کوئی معجزہ گھڑنے والا انسان نہیں ہے کہ وہ کسی جگہ بیٹھ جائے اور جو شخص بھی آئے اور اپنی پسند کا کوئی بھی معجزہ طلب کرلے اور یہ پسند نہ ہو تو کوئی دوسری تجویز پیش کردے یعنی خلقت کے قوانین اور سنتیں کھیل تماشہ بن جائیں اور پھر بھی دل چاہے تو معجزہ طلب کرنے والے قبول کرلیں اور نہ چاہے تو انکار کردیں۔

نبی کی ذمہ داری ہے کہ معجزے کے ذریعے خدا سے اپنا تعلق ثابت کرے اور جب درکار ضرورت کے مطابق معجزہ پیش کردے تو پھر اس ضمن میں اس کی کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہتی۔ ممکن ہے وہ نزولِ معجزہ کا وقت بھی نہ بتا سکے۔ وہ خدا سے صرف اس موقع پر معجزے کا تقاضا کرتا ہے جب اسے معلوم ہو کہ خدا اس امر پر راضی ہے۔

۲۔ کوتاہ فکری اور نامعقول تقاضے: ہر شخص اپنی فکر کی حد تک بات کرتا ہے یہی وجہ

Marfat.com

ہے کہ ہر شخص کی باتیں اس کی سطح فکر کی غماز ہوتی ہیں۔ وہ لوگ کہ جنہیں مال و مقام کے علاوہ کسی اور چیز کا خیال ہی نہیں وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ہر شخص اسی فکر میں غلطاں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قریش کے کوتاہ فکر سردار بعض اوقات رسول اکرمؐ کو مال کی پیش کش کرتے تھے اور کبھی مقام و منصب کی تاکہ آپؐ اپنی دعوت سے دستبردار ہو جائیں۔ وہ پیغمبر اکرمؐ کی حکیم روح کو اپنی فکر کے محدود پیمانے سے ماپتے تھے۔

یہاں تک کہ ان کا خیال تھا کہ اگر کسی شخص کی کوشش مال و مقام کے لیے نہیں تو وہ پاگل ہے اور اس کے علاوہ کوئی چوتھی چیز نہیں ہے۔

لہٰذا انہوں نے کہا کہ اگر نہ تُو مال چاہتا ہے اور نہ مقام تو پھر تیسری بات مان لے اور ہمیں اجازت دے کہ ہم تیرے لیے طبیب لے آئیں۔

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے کہ جو بہت چھوٹے سے کمرے میں قید ہو۔ اس نے کھلے وسیع آسمان، چمکتے سورج، پہاڑوں، دریاؤں اور صحراؤں کو نہ دیکھا ہو اور اسے عالم ہستی کی عظمت کا اندازہ نہ ہو۔

وہ رسول اللہؐ کی عظیم اور ناپیدا کنار روح کو اپنے پیمانوں سے ماپنا چاہتے تھے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر وہ رسول اللہؐ سے کونسی ایسی چیز کی خواہش کرتے تھے کہ جو اسلام میں نہ تھی۔ وہ سرسبز زمینوں، پانی سے لبریز چشموں، کھجور اور انگور کے باغوں اور مزین و خوشحال گھروں کی فرمائش کرتے تھے اور ہم جانتے ہیں کہ اپنی پیش رفت کے پروگرام میں اسلام ہر چیز سے مالا مال تمدن کا حامل تھا۔ ایسا تمدن کہ جس میں ہر قسم کی اقتصادی ترقی کا امکان تھا۔ اور ہم نے دیکھا کہ مسلمان اسی قرآن اور پروگرام کے سائے میں اس سے کہیں آگے بڑھ گئے کہ جس کی مشرکینِ عرب اپنی ناقص فکر سے تمنا کرتے تھے۔

اگر ان کی آنکھ حقیقت بیں ہوتی تو وہ اس دین میں روحانی کمال بھی دیکھتے، مادی ارتقا بھی۔ کیونکہ ہر دو کے لیے سعادت کا ضامن ہے۔

ہم ان بچگانہ یا احمقانہ تقاضوں سے صرفِ نظر کرتے ہیں کہ — وہ کبھی کہتے کہ ہمارے لیے خدا کا عذاب لے آؤ اور آسمانی پتھر ہمارے سروں پر برساؤ۔ یا یہ کہ سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جاؤ اور تجھ پر قربان، وہاں سے کوئی خط ہمارے لیے لے آؤ یا یہ کہ خدا اور فرشتوں کو ٹولیوں میں ہمارے سامنے لے آؤ۔

یہاں تک کہ یہ نہیں کہا کہ ہمیں ان کے پاس لے جا۔

یہ انسان عجیب جہالت، غرور اور تکبر کے مظاہرے کرتا ہے۔

۳۔ معجزے کے منکرین کی ایک اور دستاویز: زیر بحث آیات کا مفہوم کوئی پیچیدہ نہیں

Marfat.com

ہے اور یہ واضح ہے کہ مشرکین مکہ رسول اللہؐ سے کیوں اور کس طرح کے تقاضے کرتے تھے اور یہ بھی واضح ہے کہ رسول اکرمؐ نے انہیں منفی جواب کیوں دیا مگر اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے بعض ہمعصر عذر تراش افراد کا اصرار ہے کہ یہ آیات پیغمبر اسلامؐ سے ہر قسم کے معجزے کی نفی کرتی ہیں۔ وہ ان آیات کو پیغمبر اکرمؐ سے معجزے کی نفی کرنے والی بہت واضح آیات شمار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان آیات کے مطابق مخالفین نے آپؐ سے چھ قسم کے معجزوں کا مطالبہ کیا۔ ان میں زمین و آسمان سے کچھ فوائد کے حصول سے متعلق معجزوں کا تقاضا بھی ہے اور مرگ آمرین معجزات کا بھی۔ لیکن آپؐ نے ان میں سے کوئی تجویز بھی قبول نہ کی اور صرف یہی جواب دیا:

میرا خدا پاک ہے۔ میں تو خدا کے فرستادہ ایک بشر کے علاوہ کچھ نہیں ہوں۔

ہمارے زمانے کے یہ بہانہ ساز عہد پیغمبرؐ کے اپنے بہانہ ساز دوستوں کی طرح نہ ہوں تو انہیں ان کا جواب خود انہی آیات میں مل جائے گا۔ کیونکہ:

۱۔ ان چھ تقاضوں میں سے بعض اصولی طور پر مضحکہ خیز اور نامعقول تھے۔ مثلاً خدا اور فرشتوں کو حاضر کرنا یا آسمان پر سے ان کے نام پر خصوصی نامہ لے کر آنا۔

بعض دوسرے تقاضے بے سوچے سمجھے تھے، ایسے کہ اگر ان پر عمل کیا جاتا تو خود تقاضا کرنے والوں کا نام و نشان ہی باقی نہ رہتا، تو وہ ایمان کہاں لاتے۔ مثلاً ان پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسنا۔

ان کے باقی تقاضے تو دنیاوی عیش و عشرت اور مال و دولت سے متعلق تھے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ انبیاء ان کاموں کے لیے نہیں آتے۔

بالفرض اگر ان تقاضوں میں یہ اشکالات نہ بھی ہوتے تو وہ تو بہانہ سازی ہی کر رہے تھے جیسا کہ ان آیات میں موجود قرینوں سے ظاہر ہو رہا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ نبی کا فریضہ یہ نہیں ہے کہ وہ بہانہ تراش لوگوں کے تقاضوں کے سامنے سر جھکا دے بلکہ ان کی ذمہ داری معجزہ دکھانا ہے، صرف اس قدر کہ ان کی دعوت ثابت ہو جائے، اس سے زیادہ ان کے ذمہ نہیں ہے۔

۲۔ ان ہی آیات کی کچھ تعبیرات صراحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ یہ تقاضے کرنے والے کس قدر بہانہ ساز اور ہٹ دھرم تھے۔ جب انہوں نے رسول اللہؐ سے آسمان پر چڑھ کے دکھانے کا تقاضا کیا تو ساتھ ہی کھل کر کہا کہ اگر تم آسمان پر چڑھ بھی جاؤ تو بھی ہم ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ آسمان سے ہمارے نام کوئی خط لے کر نہ آؤ۔

اگر واقعاً انہیں معجزے کی طلب تھی تو کیوں کہتے تھے کہ تمہارا آسمان پر چڑھنا بھی ہمارے لیے کافی نہیں۔ ان کے غیر منطقی ہونے پر کیا اس سے زیادہ واضح کوئی قرینہ ہو سکتا ہے؟

۳۔ ان سب چیزوں سے قطع نظر ہم جانتے ہیں کہ معجزہ فعل خدا ہے نہ کہ فعل نبی جبکہ ان بہانہ تراشوں

Marfat.com

کا لب و لہجہ واضح کر رہا ہے کہ وہ معجزے کو فعلِ پیغمبر سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام افعال کی نسبت پیغمبر کی طرف دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے:

تم اسے چیر کر دکھاؤ۔

تم اس میں نہریں جاری کرو۔

تم آسمان کے پتھر ہمارے سروں پر برساؤ۔

تم خدا اور فرشتوں کو ہمارے پاس لے آؤ۔

حالانکہ نبی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ذہن میں یہ خیال نہ ہو اور وہ ان پر ثابت کرے کہ "میں نہ خدا ہوں اور نہ اس کا شریک، معجزہ صرف اسی کا کام ہے، میں تو دیگر انسانوں کی طرح بشر ہوں فرق یہ ہے کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے اور جس قدر معجزے کی ضرورت ہے وہ خدا مجھے عطا کر چکا ہے اس سے بڑھ کر میں کچھ نہیں کر سکتا"۔

خصوصاً "سبحان ربی" کا جملہ اسی معنی کا شاہد ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقامِ پروردگار ہر قسم کے شریک اور شبیہ سے پاک ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اگرچہ متعدد معجزات کی حضرت عیسیٰؑ کی طرف نسبت دی گئی ہے، مثلاً مُردوں کو زندہ کرنا، ناقابلِ علاج بیماروں کو شفا دینا یا مادر زاد اندھوں کو بینا کرنا وغیرہ لیکن اس کے باوجود تمام مواقع پر "باذنی" یا "باذن اللہ" آیا ہے جو واضح کرتا ہے کہ یہ کام صرف حکم خدا سے ہوئے ہیں اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ معجزات اگرچہ حضرتِ عیسیٰؑ کے دستِ مبارک پر ظاہر ہوئے لیکن یہ خود حضرت عیسیٰؑ کی طرف سے نہیں تھے بلکہ سارے کے سارے حکم خدا سے ظہور میں آئے تھے[1]

۴۔ کونسی عقل باور کرتی ہے کہ ایک انسان نبوت کا دعویٰ کرے، یہاں تک کہ اپنے آپ کو خاتم الانبیاء اور خاتم المرسلین سمجھے اور اپنی کتابِ آسمانی میں گزشتہ انبیاء کے معجزات کا ذکر کرے لیکن خود کسی قسم کا معجزہ پیش کرنے سے قاصر ہو؟ کیا لوگ اس سے کہیں گے نہیں کہ تم کس قسم کے نبی ہو کہ کوئی ایسا معجزہ پیش نہیں کر سکتے کہ جو دوسروں کو قائل کر سکے جبکہ تمہیں تو دعویٰ ہے کہ تم سب گزشتہ انبیاء سے برتر ہو اور ان کے سردار ہو اور حالت یہ ہے کہ ان کا شاگرد ہونے کا ثبوت بھی پیش نہیں کر سکتے ہو۔

ان کا یہ نہ کہنا خود اس امر کی دلیل ہے کہ آپؐ ضروری مواقع پر معجزات پیش کرتے تھے لہٰذا واضح ہو جاتا ہے کہ اگر رسول اللہؐ نے ان آیات میں بیان کیے گئے ان کے تقاضوں کو نہیں مانا تو یقیناً یا یہ تقاضے بے بنیاد ہیں یا پھر عذر تراشی پر مبنی ہیں ورنہ آپؐ منطقی اور معقول بات تو تسلیم کرتے تھے۔

---

[1] مائدہ - ۱۱۰ اور آل عمران ۴۹ کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

(۹۴) وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ
قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ○
(۹۵) قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا
عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ○

ترجمہ

(۹۴) ہدایت آنے کے بعد وہ تنہا چیز جس نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا
یہ تھی کہ (نادانی اور جہالت کی بناء پر) انہوں نے کہا کہ کیا اللہ نے ایک بشر
کو رسول بنا کر بھیج دیا ہے۔
(۹۵) کہہ دو اگر روئے زمین پر فرشتے (بھی زندگی بسر کر رہے ہوتے) اور اطمینان
سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم آسمان سے فرشتے کو رسول بنا کر ان کے پاس بھیجتے
(کیونکہ ہر نوع کا رہبر انہی کی نوع سے ہونا چاہیئے)۔

تفسیر

پھر وہی بہانے

گزشتہ آیات میں توحید کے بارے مشرکین کی بہانہ تراشیوں کے حوالے سے گفتگو کی گئی تھی۔ زیر بحث آیات میں بھی ان سے ملتے جلتے ایک بہانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہدایت آجانے کے بعد وہ تنہا چیز جو لوگوں کے ایمان لانے میں حائل ہوئی یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ خدا نے انسان کو نبی بنا کر کیوں بھیجا ہے (وما منع الناس ان یؤمنوا اذ جاءھم الھدٰی الا ان قالوا ابعث اللہ بشرًا رّسولًا)۔

وہ کہتے کہ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ بلند مقام اور بہت اہم منصب کسی انسان کے سپرد

Marfat.com

کیا جائے۔ یہ عظیم رسالت کسی افضل مخلوق مثلاً فرشتوں کے سپرد کیوں نہ ہو تاکہ وہ اس سے اچھی طرح سے عہدہ برآ ہوں۔ خاکی انسان کہاں اور رسالتِ الٰہی کہاں۔ اس مقام کے اہل افلاک کے باسی ہیں نہ کہ خاکی انسان۔

یہ کمزور سی منطق کسی ایک یا دو گروہوں نے ہی پیش نہیں کی بلکہ پوری تاریخ میں اکثر بے ایمان افراد نے انبیاء کے سامنے یہی بات کی۔

قوم نوح، اس عظیم پیغمبر کی مخالفت میں کہتی تھی:

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ

یہ تو ہماری طرح کا ایک انسان ہے۔ (مومنون۔ ۲۴)

حضرت ہود علیہ السلام کی بے ایمان قوم کہتی تھی:

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ○

یہ تو تمہاری طرح کا ایک انسان ہے جو کچھ تم کھاتے ہو یہ بھی کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو یہ بھی پیتا ہے۔ (مومنون۔ ۳۳)

یہاں تک کہ وہ یہ بھی کہہ گزرتے:

وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ○

اگر تم نے اپنے جیسے بشر کی اطاعت کی تو نقصان اٹھاؤ گے۔ (مومنون۔ ۳۴)

بعینہ یہی اعتراض پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی کیا جاتا تھا۔ مخالفین کہتے تھے:

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ○

یہ رسول کھاتا پیتا کیوں ہے اور بازاروں میں کیوں چلتا پھرتا ہے۔ کم از کم اس کے ساتھ ایک فرشتہ کیوں نازل نہیں ہوا کہ جو اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا۔ (فرقان۔ ۷)

قرآن ایک نہایت مختصر سا معنی خیز اور واضح جواب دیتا ہے: کہہ دو! اگر روئے زمین پر فرشتے ہوتے کہ جو آرام و سکون سے رہ رہے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے فرشتے کو پیغمبر کے طور پر نازل کرتے (قل لوکان فی الارض ملائکۃ یمشون مطمئنین لنزلنا علیھم من السماء ملکا رسولا)۔

یعنی رہبر ہمیشہ اس نوع میں سے ہونا چاہیئے جس میں اس کے پیروکار ہوں۔ انسان انسانوں کے لیے اور فرشتہ فرشتوں کے لیے۔ رہبر اور پیروکاروں کے ایک جیسے ہونے کی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ کسی رہبر کی تبلیغ کا اہم ترین حصہ اس کی عملی تبلیغ ہے۔ اسی کو نمونہ اور اُسوہ ہونا چاہیئے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ وہی احساسات و جذبات اور طبیعت و فطرت رکھتا ہو اور اس کی جسمانی و روحانی ساخت

Marfat.com

بھی وہی ہو۔ ایک فرشتہ کہ جو شہوتِ جنسی سے پاک ہوتا ہے۔ جسے مکان کی ضرورت ہے نہ لباس کی اور جو غذا کی احتیاج بھی نہیں رکھتا اور جس میں انسانی مزاج اور غرائض کی باقی چیزیں بھی موجود نہیں وہ انسانوں کے لیے نمونہ اور اسوہ کیسے بن سکتا ہے بلکہ وہ رہبر ہو تو لوگ کہیں کہ اسے ہمارے دل کی کیا خبر؟ اسے کیا معلوم کہ ہماری روح پر شہوت اور غضب کس طرح سے اثرانداز ہوتے ہیں۔ وہ تو صرف اپنے دل کی بات کرتا ہے۔ اس کے احساسات و جذبات ہماری طرح کے ہوتے تو وہ ہم جیسا ہی ہوتا یا ہم سے بھی برتر۔ لہٰذا اس کی باتوں کی کیا اہمیت ہے۔

لیکن جب حضرت علیؑ جیسا ہادی کہے:

انما ھی نفسی اروضھا بالتقوی لتاتی اٰمنة یوم الخوف الاکبر[1]

میرا نفس بھی تمہاری طرح کا ہے لیکن میں نے اسے تقویٰ کی لگام دی ہے تاکہ روزِ قیامت امن میں رہے۔

دوسری طرف رہبر ایسا ہونا چاہیئے کہ جو اپنے پیروکاروں کی مشکلات، احتیاجات اور خواہشات کو اچھی طرح سے سمجھ سکے تاکہ ان کے حل اور انہیں پورا کرنے کے لیے آمادہ رہے۔ اور اس مصرعے کا مصداق نہ بنے:

آگہ نئی از حال من مشکل ہمین است

مشکل یہ ہے کہ تجھے میری حالت کی خبر ہی نہیں۔

خاص طور پر یہی وجہ ہے کہ انبیاء عام انسانوں میں سے تھے اور انہوں نے عموماً نہایت مشکل اور کٹھن زندگی گزاری ہوتی تھی۔ یہ اس لیے تھا تاکہ وہ زندگی کی تمام تلخیوں کو چکھیں اور دردناک حقیقتوں کو چھوئیں اور ان کے حل کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں۔

چند اہم نکات

۱۔ **"وما منع الناس" کا مفہوم:** یہ جملہ کہتا ہے کہ ان کے ایمان کے لیے واحد رکاوٹ ان کی یہی بہانہ جوئی تھی البتہ یہ تعبیر انحصار کی دلیل نہیں ہے بلکہ مسئلے کی اہمیت کے اظہار کے لیے اور تاکید کے طور پر ہے۔

۲۔ **"ملائکة یمشون مطمئنین" کا مفہوم:** اس کے بارے میں مفسرین نے بحث کی ہے اور انہوں نے اس کی متعدد تفسیریں بیان کی ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ، نامہ ۴۵۔

Marfat.com

بعض نے اسے زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی گفتگو کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم اس جزیرہ میں رہتے تھے اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ محمدؐ (ص) آیا اس نے ہمارا امن و سکون تباہ کر دیا۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر فرشتے بھی اس طرح کے امن و سکون سے زمین میں رہ رہے ہوتے تو ہم انہی کی نوع میں سے ان کے لیے پیغمبر بھیجتے۔

بعض دیگر نے کہا ہے کہ اس سے مراد دنیا اور اس کی لذات پر مطمئن ہونا ہر دین و مذہب سے لاتعلق ہونا ہے۔

بعض نے اس سے زمین میں "سکونت و توطن" مراد لیا ہے۔

البتہ یہ احتمال قوی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر فرشتے بھی زمین میں بس رہے ہوتے اور زندگی تصادم، دشمنی اور کشمکش سے پاک ہوتی پھر بھی ان کی اپنی نوع سے ایک رہبر کی ضرورت ہوتی کیونکہ انبیاء کو فقط بے سکونی اور بے اطمینانی ختم کرنے کے لیے اور آرام و سکون پیدا کرنے کے لیے نہیں بھیجا جاتا بلکہ یہ سب کچھ تو تکامل و ارتقاء کا مقدمہ ہے اور مختلف پہلوؤں سے روحانی و انسانی تربیت کی تمہید ہے اصل اس کام کے لیے خدائی رہبر کی ضرورت ہے۔

۳۔ لفظ "ارض" سے ایک استفادہ: زیر نظر آیت میں جو لفظ "ارض" آیا ہے اس سے استفادہ کرتے ہوئے علامہ طباطبائی تفسیر المیزان میں لکھتے ہیں:

> روئے زمین پر مادی زندگی کا مزاج وجودِ پیغمبر کا محتاج ہے اور اس کے بغیر زندگی ہرگز پنپ نہیں سکتی۔

علاوہ ازیں علامہ طباطبائی اس لفظ کو زمین کی کشش ثقل کی طرف ایک لطیف اشارہ سمجھتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر امن سکون و اطمینان سے چلا پھرا نہیں جا سکتا۔

Marfat.com

(۹۶) قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا ○

(۹۷) وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ○

ترجمہ

(۹۶) کہہ دو: یہی کافی ہے کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں کے بارے میں آگاہ اور بینا ہے۔

(۹۷) جسے خدا ہدایت دے وہی حقیقی ہدایت یافتہ ہے اور جس شخص کو (اس کے اعمال کے باعث) وہ گمراہی میں ڈال دے، ایسے لوگوں کے لیے تو اللہ کے سوا کسی کو ہادی و سرپرست نہیں پائے گا اور روزِ قیامت ان لوگوں کو ہم اوندھے منہ محشور کریں گے اس حال میں کہ وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور جس وقت اس کی آگ بجھنے لگے گی ہم اسے اور بھڑکا دیں گے۔

تفسیر

حقیقی ہدایت یافتہ

قبل ازیں آیات توحید و نبوت اور مخالفین سے گفتگو کے بارے میں تھیں۔ زیرِ بحث آیات میں

Marfat.com

ان گزشتہ مباحث کا ایک طرح سے اختتام ہو رہا ہے اور نتیجۂ بحث پیش کیا جا رہا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: اگر وہ توحید و نبوت اور معاد و قیامت کے بارے میں تیرے واضح دلائل قبول نہیں کرتے تو انہیں بتا دو اور "کہو کہ یہی کافی ہے کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں کے حالات سے آگاہ ہے اور ان کے کام کو دیکھتا ہے (قل کفی باللّٰہ شہیدًا بینی و بینکم انہ کان بعبادہ خبیرًا بصیرًا) [1]

یہ بات کہتے ہوئے دراصل دو مقصد پیش نظر تھے۔ پہلا یہ کہ متعصب اور ہٹ دھرم مخالفین کو تہدید کی جائے کہ خدا آگاہ و بینا ہے اور ہمارے تمہارے اعمال پر گواہ ہے۔ یہ خیال نہ کرو کہ تم اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نکل جاؤ گے یا تمہارے اعمال میں سے کوئی چیز اس پر مخفی رہ جائے گی۔

دوسرا یہ کہ یہ بات کہہ کر رسول اللہؐ خدا کے بارے میں اپنے ایمانِ قاطع کا اظہار کر دیں کیونکہ کہنے والے کی اپنی بات میں قاطعیت سننے والے پر گہرا نفسیاتی اثر مرتب کرتی ہے۔ ہو سکتا تھا کہ یہ محکم اور قاطع تعبیر کہ جس میں ایک قسم کی تہدید چھپی ہوئی ہے ان پر اثرانداز ہوتی، انکے دل اور فکر کو بیدار کرتی اور انہیں راہِ مستقیم کی طرف دعوت دیتی۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: وہی شخص ہدایت پاتا ہے کہ جس کے دل میں اللہ نورِ ہدایت ڈال دے (ومن یھد اللّٰہ فھو المھتد) لیکن جنہیں وہ (ان کے اعمال کے باعث) گمراہ کر دے تو ان کے لیے تو خدا کے علاوہ کوئی سرپرست و راہنما نہیں پائے گا (ومن یضلل فلن تجد لھم اولیاء من دونہ)۔

لوٹ آنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ وہ خدا کی طرف رجوع کریں اور اس سے نورِ ہدایت طلب کریں۔

یہ دو جملے درحقیقت اس طرف اشارہ ہیں کہ قوی اور زبردست دلائل ہی ایمان لانے کے لیے کافی نہیں ہیں بلکہ جب تک کسی میں توفیقِ الٰہی شاملِ حال نہ ہو اور ہدایت کے لیے اہلیت پیدا نہ ہو، محال ہے کہ وہ ایمان لائے۔

اس کی مثال یوں ہے کہ ہم چند لوگوں کو ایک اہم کارِ خیر انجام دینے کی دعوت دیتے ہیں اور اس کی اہمیت کے لیے بہت دلائل دیتے ہیں لیکن ان میں سے بعض قبول کر لیتے ہیں اور بعض مخالفت کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ سب لوگ اس کام کی اہلیت نہیں رکھتے۔

---

[1] ترکیب کے لحاظ سے "کفی باللّٰہ" میں "با" زائدہ ہے اور "اللّٰہ" "کفی" کا فاعل ہے اور "شہیدًا" تمیز ہے جبکہ بعض کے بقول حال ہے۔

Marfat.com

نطفۂ پاک بباید کہ شود قابلِ فیض　　ورنہ ہر سنگ و گلی لؤلؤ و مرجان نشود

پاک مٹی ہی فیض دے سکتی ہے ورنہ، ورنہ ہر پتھر اور مٹی موتی اور مونگے نہیں ہوتے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر دل نورِ حق کی لیاقت نہیں رکھتا اور ہر دل میں اس کا عشق پیدا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں تحریک کرنے والے کے اندازِ بیان کا اثر سننے والے پر ہوتا ہے اور بسا ایسا ہوتا ہے کہ سننے والا اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لیے ہٹ دھرمی چھوڑ کر حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیتا ہے۔

یہ بات بھی ہم نے بارہا کہی ہے کہ خدا کی طرف سے کبھی بھی جبری ہدایت یا گمراہی نہیں ہوتی بلکہ یہ خود انسان کے اعمال کا براہِ راست اثر ہوتی ہے۔

وہ لوگ کہ جو اس کی راہ میں جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور حصولِ حق کے لیے ہر قسم کی قربانی پیش کریں یقیناً اس بات کے لائق ہیں کہ ہدایت ان کے شاملِ حال ہو۔ لہٰذا قرآن فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

جو لوگ ہماری خاطر جہاد کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ (عنکبوت-۶۹)

لیکن وہ لوگ کہ جو عناد، ہٹ دھرمی، گناہ، ظلم اور فساد کی راہ اپنائے ہوئے ہیں انہوں نے اپنی اہلیت کو خود ذبح کر دیا ہے اور وہ سلبِ توفیق اور گمراہی کے مستحق ہوتے ہیں۔ مسلّم ہے کہ ایسے افراد کو وہ گمراہی میں سرگرداں کرے گا۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظَّالِمِيْنَ

اللہ ظالموں کو گمراہ کرتا ہے۔ (ابراہیم-۲۷)

یہ بھی ارشاد ہے:

وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفَاسِقِيْنَ

وہ تو صرف فاسقوں کو بھٹکاتا ہے۔ (بقرہ-۲۶)

یہ بھی فرمایا گیا ہے:

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ

جو حد سے گزر جانے والا شاکی ہو خدا اسے یونہی گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔ (مومن-۳۴)

رہا یہ مسئلہ کہ "اولیاء" جمع کی صورت میں کیوں ذکر ہوا ہے، تو ہو سکتا ہے یہ فرضی خداؤں کے تعدد کی طرف اشارہ ہو یا ان وسائل و اسباب کے تنوع کی طرف کہ جن کی وہ پناہ لیتے تھے۔ یعنی ان وسائل و اسباب سے انسانوں اور غیر انسانوں میں سے اور خیالی و فرضی خداؤں میں سے کوئی ان کی فریاد کو نہیں پہنچ سکتا۔ ان میں سے کوئی انہیں گمراہی اور بدبختی سے نجات نہیں دے سکتا۔

اس کے بعد ایک قاطع اور شدید تہدید کے انداز میں قیامت کے ایک منظر کی نشاندہی کی گئی ہے

Marfat.com

وہ منظر کہ جو ان کے اعمال کا قطعی نتیجہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: روزِ قیامت ہم انہیں اوندھے منہ محشور کریں گے (ونحشرھم یوم القیامة علیٰ وجوھھم)۔ اس روز وہ سیدھے نہیں چل رہے ہوں گے بلکہ عذاب کے فرشتے انہیں اوندھے منہ زمین پر کھینچیں گے۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ان گنہگاروں میں چونکہ وہاں چلنے کی طاقت نہیں ہوگی لہٰذا بے دست و پا جانوروں کی مانند اوندھے منہ گھسٹتے ہوئے جائیں گے اور انتہائی دردناک اور ذلت آمیز حالت میں آگے بڑھیں گے۔

جی ہاں! وہ پاؤں سے چلنے کی سی عظیم نعمتوں سے محروم ہوں گے کیونکہ اس دنیا میں انہوں نے ان چیزوں سے راہِ سعادت کے لیے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ راہِ گناہ میں انہیں استعمال کیا۔ نیز اللہ کی عظیم عدالت میں اس حالت میں پیش ہوں گے کہ وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے (عمیًا وبکمًا وصمًا)۔

اس مقام پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مجرمین اور اہلِ جہنم دیکھیں گے، سُنیں گے اور باتیں کریں گے[1] تو پھر زیرِ نظر آیت کیونکر کہتی ہے کہ وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے۔ اس سوال کے جواب میں مفسرین نے متعدد تفاسیر کی ہیں۔ ان میں سے ذیل کی دو تفاسیر بہتر ہیں:

۱۔ قیامت کے مختلف مراحل ہیں۔ ان میں سے بعض مراحل میں وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے اور یہ بجائے خود ان کے لیے ایک قسم کی سزا اور عذاب ہے (کیونکہ انہوں نے دنیا میں اللہ کی ان عظیم نعمتوں سے صحیح استفادہ نہیں کیا)۔ لیکن بعض دیگر مراحل میں ان کی آنکھ دیکھتی ہوگی،

---

[1] سورہ کہف کی آیہ ۵۳ میں ہے:

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ

مجرمین آتشِ جہنم کو دیکھیں گے۔

سورہ فرقان کی آیہ ۱۳ میں ہے:

دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا

دوزخی ہلاکت کے مارے چیخیں گے۔

نیز سورہ فرقان ہی کی آیہ ۱۲ میں ہے:

سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا

مجرمین اس آگ کی آواز سنیں گے کہ جو بہت وحشت ناک ہوگی۔

Marfat.com

ان کے کان سنتے ہوں گے اور زبان باتیں کرتی ہوگی تاکہ وہ عذاب کے مناظر دیکھیں، ملامت کرنے والوں کی آواز سُنیں۔ اور پھر اپنی بے بسی پر واویلا کریں اور یہ بھی بجائے خود ایک عذاب و سزا ہے۔

۲۔ مجرمین ایسی چیز نہ دیکھ سکیں گے جس سے انہیں سرور و راحت ملے، ایسی آواز نہیں سن سکیں گے کہ جو ان کے لیے باعثِ نشاط و سکون ہو اور ایسی بات نہیں کرسکیں گے کہ جو باعثِ نجات ہو۔ اس کے برعکس وہ ایسی چیز دیکھیں گے جو اُن کے لیے باعثِ رنج ہو۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ان کا دائمی ٹھکانا جہنم ہے (مأوٰهم جهنم)۔ لیکن یہ گمان نہ کرنا کہ آتشِ جہنم دنیا کی آگ کی طرح آخرکار بجھ جائے گی۔ نہیں بلکہ "جب اس کی تپش کم ہوگی تو پھر سے اسے بھڑکا دیا جائے گا اور اس کی تپش میں اضافہ کردیا جائے گا (كلما خبت زدناهم سعيرًا)۔

Marfat.com

۹۸ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا
عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝
۹۹ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ
عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ
فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ۝
۱۰۰ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ
خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۝

ترجمہ

۹۸ یہ ان کی سزا ہے کیونکہ وہ ہماری آیات کے منکر ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں اور پراگندہ خاک ہو جائیں گے کیا اس وقت ہماری تخلیق نو ہو گی ؟

۹۹ کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ ان جیسے اور بھی پیدا کرنے پر قادر ہے (اور انہیں حیاتِ نو عطا کر سکتا ہے) اور اس نے ان کے لیے قطعی مدت مقرر کی ہے لیکن اہل ستم سوائے کفر و انکار کے کچھ نہیں کرتے ۔

۱۰۰ ان سے کہہ دو : اگر تمہارے پاس میرے رب کی رحمت کے خزانے بھی ہوتے تو بھی تنگ دلی کی وجہ سے تم انہیں روکے رکھتے اس خوف سے

Marfat.com

کہ کہیں خرچ کرنے سے تم تنگ دست نہ ہو جاؤ اور انسان ہے ہی
بہت تنگ دل ۔

تفسیر

معاد کیونکر ممکن ہے؟

گزشتہ آیات میں بتایا گیا ہے کہ دوسرے جہان میں کیسا بُرا انجام مجرموں کے انتظار میں ہے، ایسا انجام کہ جو ہر عقلمند انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ زیر نظر آیات میں اس کی علت کو ایک اور حوالے سے واضح کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: یہ ان کی سزا ہے، کیونکہ انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا کہ جس وقت ہم بوسیدہ ہڈیوں میں بدل چکے ہوں گے اور ہمارا جسم پراگندہ مٹی کی صورت اختیار کر چکا ہوگا کیا اس وقت ہماری خلقتِ نو ہوگی (ذلك جزاؤهم بانهم كفروا بأياتنا وقالوا ءاذا كنا عظامًا ورفاتًا ءانّا لمبعوثون خلقًا جديدًا)۔

جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے "رفات" گھاس کے تنکوں کو کہتے ہیں جو ٹوٹتے نہیں اور بکھر جاتے ہیں۔

بنا کسے واضح ہے کہ تہ زمین پہلے انسان بوسیدہ ہڈیوں میں تبدیل ہوتا ہے اور پھر خاک میں بدل جاتا ہے اور خاک کے یہ ذرے بھی بکھر جاتے ہیں۔

جو لوگ معادِ جسمانی کے مسئلہ پر تعجب کرتے ہیں یا اسے ناممکن سمجھتے ہیں قرآنِ حکیم نے فوراً ہی انہیں جواب دیا ہے: کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ ان کی نظیر بھی پیدا کر سکتا ہے (اولم یروا ان الله الذی خلق السموات والارض قادر علیٰ ان یخلق مثلهم)۔

لیکن انہیں جلدی نہیں کرنا چاہیئے، قیامت اگرچہ دیر سے آئے مگر آ کے رہے گی۔ "خدا نے ان کے لیے ایک قطعی مدت مقرر کی ہے اور جب تک وہ وقت معین نہ آجائے قیامت برپا نہیں ہوگی (وجعل لهم اجلًا لا ریب فیه)۔ لیکن اہل ستم یہ باتیں سننے کے باوجود اپنی کج روی پر باقی رہتے ہیں اور کفر و انکار کے سوا کوئی راستہ اختیار نہیں کرتے (فابی الظالمون الّا کفورًا)۔

انہیں اصرار تھا کہ رسول کو نوعِ بشر میں سے نہیں ہونا چاہیئے لہٰذا یہ باور کرنے میں انہیں کچھ حسد اور کم ظرفی مانع تھی کہ ہو سکتا ہے خدا یہ نعمت کسی انسان کو عطا کرے، لہٰذا زیر بحث آخری آیت

Marfat.com

میں فرمایا گیا ہے : ان سے کہہ دو : اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے بھی تمہارے ہاتھ میں ہوتے تو بھی اپنی تنگ دلی کی وجہ سے تم انہیں روکے رکھتے کہ انہیں خرچ کرنے میں تم تنگ دست نہ ہو جاؤ (قل لو انتم تملکون خزائن رحمة ربی اذاً لامسکتم خشیة الانفاق)۔ اور انسان طبعاً بخیل ہے (وکان الانسان قتورًا)۔

"قتور" کا مادہ "قتر" (بروزن "قتل") ہے۔ یہ خرچ کرنے میں بخل سے کام لینے کے معنی میں ہے اور "قتور" چونکہ مبالغہ کا صیغہ ہے لہٰذا سخت تنگ دلی کا معنی دیتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ معادِ جسمانی : زیرِ نظر آیات معادِ جسمانی کے اثبات کے لیے نہایت واضح آیات میں سے ہیں کیونکہ مشرکین اس بات پر تعجب کرتے تھے کہ کیسے ممکن ہے کہ خدا بوسیدہ اور خاک شدہ ہڈیوں کو پھر حیاتِ نو سے آراستہ کرے۔ قرآن جواب بھی اسی حوالے سے دیتا ہے اور کہتا ہے :

وہ خدا کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے یہ قدرت رکھتا ہے کہ انسان کے منتشر اجزاء کو جمع کر کے اسے حیاتِ نو عطا فرمادے۔

معلوم نہیں کہ ان واضح آیات کے باوجود اور ان جیسی اور بہت سی آیات کے ہوتے ہوئے اسلام کے بعض دعویدار معاد کو معادِ روحانی میں کیوں منحصر سمجھتے ہیں۔

ضمناً مسئلۂ معاد کے اثبات کے لیے اللہ کی ہمہ گیر قدرت کے حوالے سے قرآن نے بارہا استدلال کیا ہے۔ سورۂ یٰسین کے آخر میں معادِ جسمانی کے لیے جو چند دلیلیں پیش کی گئی ہیں ان میں سے بھی ایک یہی اللہ کی ہمہ گیر قدرت ہے[1]

۲۔ "آیات" سے مراد : اس سلسلے میں کہ "کفروا بآیاتنا" میں "آیات" سے مراد آیاتِ توحید ہیں یا دلائلِ نبوت یا معاد سے مربوط آیات ؟ اس بارے میں مختلف احتمالات ذکر کیے گئے ہیں لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ جملہ معاد کی بحث میں آیا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ معاد کی آیات کی طرف اشارہ ہے اور درحقیقت منکرینِ معاد کو جواب دینے کے لیے تمہید کے طور پر آیا ہے۔

۳۔ "مثلھم" کا مفہوم : قاعدتاً کہنا چاہیئے کہ اللہ اپنی قدرت کے ذریعے ان انسانوں کو روزِ قیامت پھر سے زندگی عطا کر سکتا ہے جبکہ زیرِ بحث آیات میں ہے کہ وہ ان کی "مثل" خلق کرے گا۔ اس تعبیر سے بعض لوگوں کو اشتباہ ہوتا ہے یا کم از کم ان کے ذہن میں سوال ابھرتا ہے کہ کیا قیامت والے

---

[1] مزید تشریح کے لیے اس سلسلے کی کتاب "معاد و جہان پس از مرگ" کا مطالعہ کیجئے۔

Marfat.com

انسان یہی نہیں ہوں گے ؟

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "مثل" سے یہاں "عین" مراد ہے کیونکہ بعض اوقات ہم کہتے ہیں :

تیری مثل (تجھ جیسے) کو یہ کام نہیں کرنا چاہیئے ۔

حالانکہ ہماری مراد یہ ہے کہ "تجھے یہ کام نہیں کرنا چاہیئے"۔

لیکن یہ تفسیر بہت ہی بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ ایسے جملے ہم اور مواقع پر استعمال کرتے ہیں کہ جو ہمارے زیر بحث موقع سے مناسبت نہیں رکھتے ۔

ظاہری مفہوم کے اعتبار سے زیرِ بحث آیت میں "مثل" سے مراد وہی اعادہ اور تجدیدِ حیات ہے کیونکہ دوسری خلقت مسلماً پہلی خلقت کا "عین" نہیں ہے کیونکہ اور نہیں تو کم از کم دوسرے زمانے اور دوسرے حالات میں وجود میں آئی ہے اگرچہ مادہ وہی پرانا پہلے والا ہے ۔ جیسے ہم کسی ریزہ ریزہ ہوجانے والی اینٹ کو نئے سرے سے نئے قالب میں ڈھالیں ، کہ جو پہلے قالب کی طرح ہو تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ بعینہٖ وہی اینٹ ہے اگرچہ اس کی غیر بھی نہیں ہے ۔ بلکہ اس کی "مثل" ہے ۔

یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ قرآن کی تعبیرات کس قدر گہری اور دقیق ہیں ۔ (غور کیجئے گا)

البتہ تسلیم شدہ ہے کہ انسان کی شخصیت اس کی روح کے ساتھ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہی پہلی روح روزِ قیامت قبروں سے اٹھنے کے وقت پلٹ آئے گی لیکن معادِ جسمانی کا تقاضا ہے کہ روح اسی پہلے قالب میں ہوگی یعنی وہی بکھرے ہوئے اجزائے مادہ جمع ہو کر وجودِ نو پائیں گے اور روح اس کے ساتھ ہم آہنگ ہوگی ۔ معاد کی بحث میں ہم نے یہ بات ثابت کی ہے کہ اصولی طور پر انسانی روح کسی ایک شکل میں متشکل ہونے کے بعد کسی اور بدن کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوسکتی سوائے اپنے اصلی بدن کے کہ جس کے ساتھ اس نے پرورش پائی ہے ۔ قبا صرف اسی بدن پر فٹ آتی ہے اور اسی کے لیے موزوں ہے اور یہ بدن اسی قبا کے لیے موزوں ہے ۔ جسم اور روح کے اکٹھا اٹھنے کے ضروری ہونے کا یہی راز ہے (اسی سے معادِ جسمانی و روحانی ثابت ہوتی ہے) ۔

۴ ۔ اجل کیا ہے؟ : ہم جانتے ہیں کہ "اجل" کسی چیز کی عمر کی حد کو کہتے ہیں لیکن کیا زیرِ بحث آیات میں "اجل" انسان کی عمر کے خاتمے کی طرف اشارہ ہے یا دنیا کی عمر کے خاتمے اور قیامت کی ابتدا کی طرف اشارہ ہے ؟

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گفتگو معاد کے بارے میں ہے دوسری بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ۔

بعض بزرگ مفسرین نے کہا ہے کہ یہ بات "لاریب فیہ" سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ معاد کے منکرین مسلماً معاد کے بارے میں شک رکھتے ہیں ۔ ہمیں یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ ایسی تعبیرات

Marfat.com

کا مفہوم یہ ہے کہ اس قسم کے مسئلہ میں شک نہیں کرنا چاہیئے اور اصولی طور پر اس میں جائے تردّد نہیں ہے۔ نہ یہ کہ اس میں کسی کو شک نہیں ہے۔

لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ خدا کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے یقیناً انسانوں کو دوبارہ لباسِ حیات عطا کر سکتا ہے البتہ اگر یہ کام جلدی نہ ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سنتِ الٰہی نے اس کیلئے ایک قطعی وقت مقرر کیا ہے کہ جس میں جائے تردّد نہیں ہے۔ نتیجہ گفتگو یہ ہے کہ یہاں منکرینِ معاد کے سامنے وہی قدرتِ الٰہی کے حوالے سے دلیل پیش کی گئی ہے۔

باقی رہا "جعل لھم اجلاً لاریب فیہ" کا جملہ تو یہ ایک سوال کا جواب ہے کہ جو تاخیرِ قیامت کے بارے میں کیا جاتا تھا (غور کیجئے گا)۔

۵۔ زیرِ نظر آیات کا باہمی ربط: زیرِ نظر آیات کے مطالعے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخری زیرِ بحث آیت میں انسان کے بخیل ہونے کا ذکر آیا ہے۔ اس بات کا گزشتہ مباحث سے کیا تعلق ہے؟

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ جملہ ایک مطلب کی طرف اشارہ ہے جو قبل کی چند آیات میں بت پرستوں کے حوالے سے ذکر کیا گیا تھا اور وہ یہ کہ ان کا تقاضا تھا کہ رسولِ اسلامؐ سرزمینِ مکہ کو چشموں اور باغات سے مالا مال کر دیں۔ قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے کہ اگر تمہیں تمام خدائی خزانے بھی دے دیئے جائیں پھر بھی تم بخل کو ترک نہیں کرو گے۔

لیکن یہ تفسیر بہت بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہ ان باغوں اور چشموں کی ملکیت کے بارے میں بات نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ معجزے کا تقاضا کر رہے تھے۔

مفسرین نے اس ارتباط کے بارے میں ایک تفسیر اور بھی کی ہے اور وہ صحیح بھی معلوم ہوتی ہے اور وہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے سطورِ بالا میں اشارہ کیا ہے۔ یعنی بخل اور تنگ دلی کی بناء پر انہیں اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ کسی انسان کو نبوت عطا کی گئی ہے۔ یہ آیت درحقیقت انہیں جواب دیتی ہے کہ تمہاری تنگ دلی تو ایسی ہے کہ اگر تم سارے جہان کے بھی مالک بن جاؤ تو بھی اپنی بُری روش کو ترک نہیں کرو گے۔

۶۔ کیا سب انسان بخیل ہیں: ہم نے بارہا کہا کہ قرآن کی بہت سی آیات میں مطلق طور پر انسان کی مختلف حوالے سے ملامت کی گئی ہے۔ اس کے لیے بخل، جہل، ظلم، عجلت اور ان جیسی کئی صفات بیان کی گئی ہیں لیکن یہ تعبیر اس بات کے منافی نہیں کہ مومنین اور تربیت یافتہ افراد ان صفات کی بالکل مخالف جہت میں ہیں۔ یہ تعبیرات اس طرف اشارہ ہیں کہ انسان کی طبیعت ایسی ہوتی ہے۔ اگر انسان ہادیانِ الٰہی سے تربیت حاصل نہ کرے اور گھاس پھونس کی طرح اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو انسان

Marfat.com

یہ تمام منفی صفات قبول کرسکتا ہے نہ یہ کہ وہ ذاتاً اس طرح پیدا کیا گیا ہے اور نہ یہ کہ سب کا انجام یہی ہوگا۔[1]

۷۔ "خشیۃ الانفاق" کا مفہوم: یہ تعبیر فقر سے خوف کے معنی میں ہے، وہ فقر کہ جو ان کے خیال میں کثرتِ انفاق کا نتیجہ ہوگا۔

(۱۰۱) وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ○

(۱۰۲) قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ○

(۱۰۳) فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ○

(۱۰۴) وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ○

ترجمہ

(۱۰۱) ہم نے موسٰی کو نو واضح معجزات عطا کیے۔ اب تم بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ جس وقت یہ (نو معجزات) ان کی مدد کے لیے آئے (تو ان کی کیا حالت تھی) اور فرعون کہنے لگا: اے موسٰی! مجھے تو یہ گمان ہے کہ تو پاگل ہے (یا ساحر ہے)۔

---

[1] گزشتہ مباحث میں بھی اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔

Marfat.com

(۱۰۲) اس نے جواب دیا : دلوں کو روشن کرنے کے لیے یہ معجزات رب السماوات والارض کے سوا کسی نے نہیں بھیجے اور اے فرعون ! مَیں سمجھتا ہوں کہ تُو نابود ہو جائے گا ۔

(۱۰۳) اس (فرعون نے) ارادہ کر لیا کہ زمین سے ان سب کی بیخ کنی کر دے گا لیکن ہم نے اسے اور اس کے سب ساتھیوں کو غرق کر دیا ۔

(۱۰۴) اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا : (مصر و شام کے) اس علاقے میں رہو سہو لیکن جب وعدہ آخرت کا وقت پورا ہو جائے گا ہم تم سب کو اکٹھا (اس عدالت میں) لا کھڑا کریں گے ۔

تفسیر

ان نشانیوں کے باوجود وہ ایمان نہ لائے

پہلے کی چند آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ مشرکین، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کیسے عجیب و غریب تقاضے کرتے تھے ۔ خود ان کی اپنی باتوں سے ظاہر تھا کہ ان کا مقصد تلاش حق نہیں ہے بلکہ وہ رسول اللہؐ کے سامنے ہٹ دھرمی اور عذر تراشی کا مظاہرہ کرتے تھے ۔

زیر بحث آیات میں درحقیقت گزشتہ امتوں کی تاریخ سے اسی صورت حال کا ایک نمونہ پیش کیا گیا ہے ۔ ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے کیسے کیسے معجزات دیکھے مگر پھر بھی بہانے تراشے اور انکار کا راستہ ترک نہ کیا ۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے : ہم نے موسٰی کو نو آیات اور واضح نشانیاں دیں (ولقد اٰتینا موسٰی تسع اٰیات بینٰت) ۔

یہ نو آیتیں کیا تھیں — اس سلسلے میں ہم اسی بحث کے آخر میں گفتگو کریں گے ۔

مزید تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے : تیرے مخالفین اگر اس بات کا بھی انکار کر دیں تو اتمام حجت کے لیے "بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ جب یہ نشانیاں ان کے پاس آئیں تو کیا صورت حال تھی" (فسئل بنی اسرائیل اذ جاءھم) ۔

Marfat.com

لیکن مغرور سرکش اور جابر فرعون نے نہ صرف ان کے سامنے سرِتسلیم خم نہ کیا بلکہ موسیٰ کو جادوگر یا دیوانہ ہونے کا الزام دیا اور کہا: اے موسیٰ! میرا گمان ہے کہ تو جادوگر ہے یا دیوانہ (فقال لہ فرعون انی لاظنّک یا موسیٰ مسحورًا)۔

"مسحور" کے معنی کے حوالے سے مفسرین نے دو تفسیریں کی ہیں۔

بعض نے اسے ساحر جادوگر کے معنی میں لیا ہے اور اس کے لیے قرآن حکیم کی ان آیات کو شاہد کے طور پر پیش کیا ہے جو کہتی ہیں کہ فرعون اور اس کے حواری ہرکہیں انہیں ساحر ہونے کا الزام دیا کرتے تھے۔ اور اسم مفعول کہ جو فاعل کے معنی میں آیا ہے لغتِ عرب میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً "مشئوم" "شائم" کے معنی میں (یعنی وہ شخص جو بدبختی کا باعث ہو)۔ اور "میمون" "یامن" کے معنی میں (یعنی وہ شخص جو خوش بختی کا باعث ہو)۔

جبکہ بعض دیگر مفسرین نے "مسحور" کو اسی مفعول کے معنی میں لیا ہے یعنی وہ شخص جس پر جادو نے اثر کیا ہو۔ جیسا کہ سورہ ذاریات کی آیہ ۳۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ کو جادو کا الزام بھی دیا اور جنون کا بھی۔

بہرحال مستکبرین کا ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ نظام بدلنے کے لیے مردانِ حق کی جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کے لیے اس طرح کا پراپیگنڈا کیا کرتے تھے۔ مردانِ حق جب فاسد معاشرے کے خلاف قیام کرتے اور معجزات پیش کرتے تو یہ لوگ کبھی انہیں جادوگر کہتے اور کبھی دیوانہ تاکہ سادہ لوح لوگوں کو بھٹکا سکیں اور انہیں انبیاء کے پاس سے دور کرسکیں۔

اس ناروا تہمت پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سکوت نہیں کیا اور پورے اعتماد اور یقین سے کہا: اے فرعون! تُو خوب جانتا ہے کہ ان نوربخش آیات کو آسمانوں اور زمین کے رب کے علاوہ کسی نے نازل نہیں کیا (قال لقد علمت ما انزل ھٰؤلاء الّا رب السمٰوات والارض بصائر)۔

لہٰذا تُو علم و آگہی کے باوجود حقائق کا انکار کرتا ہے۔ تُو اچھی طرح سے جانتا ہے کہ یہ معجزات و آیات خدا کی طرف سے ہیں اور مجھے بھی علم ہے کہ تُو جانتا ہے۔ یہ "بصائر" ہیں، آشکار و واضح دلائل — کہ جن کے ذریعے لوگ راہِ حق تلاش کرلیتے ہیں اور جادۂ حق کو طے کرنے کے لیے جن سے بصیرت حاصل کرتے ہیں لہٰذا تُو چونکہ شناختِ حق کے باوجود انکار کرتا ہے "اے فرعون! میں سمجھتا ہوں کہ آخرکار تُو ہلاک ہوکر رہے گا (وانی لاظنّک یا فرعون مثبورًا)۔

"مثبور" "ثبور" کے مادہ سے ہلاکت کے معنی میں ہے۔

فرعون چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دندان شکن دلائل کی تاب نہیں لاسکتا تھا لہٰذا اس نے اسی چیز کا سہارا لیا کہ جس کا ہر دور میں بے منطق طاغوت سہارا لیتے آئے ہیں۔ "اس نے ارادہ کرلیا کہ

Marfat.com

انہیں اس علاقے سے باہر نکال دے گا لیکن ہم نے اسے اور اس کے سب ساتھیوں کو غرق کر دیا" (فاراد ان یستفزھم من الارض فاغرقناہ ومن معہ جیعًا)۔

"یستفز" "استفزاز" کے مادہ سے زور اور سختی کے ساتھ باہر دھکیلنے کے معنی میں ہے۔

اس عظیم کامیابی کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا: (مصر و شام کے) اس علاقے میں رہو سہو (و قلنا من بعدہ لبنی اسرائیل اسکنوا الارض)۔

لیکن جب وعدہ آخرت کا وقت آ پہنچے گا تو ہم تم سب کو میزان حساب کے پاس اکٹھا حاضر کریں گے (فاذا جاء وعد الاٰخرۃ جئنا بکم لفیفًا)۔

"لفیف" "لف" کے مادہ سے پیچ و خم دینے کے معنی میں ہے اور یہاں وہ لوگ مراد ہیں کہ جو ایک دوسرے کے ساتھ بالکل اس طرح گھلے ملے ہوں کہ ان کی انفرادیت اور قبیلہ نہ پہچانا جاتا ہو۔

چند اہم نکات

۱۔ حضرت موسیٰ کے نو معجزات: قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بہت سے معجزوں کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً:

۱۔ آپ کا عصا بہت بڑے اژدھا میں تبدیل ہوگیا اور اس نے جادوگروں کے آلات کو نگل لیا۔ جیسا کہ سورہ طٰہٰ کی آیت ۲۰ میں ہے:

فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰی

۲۔ آپ کا دوسرا بڑا معجزہ "ید بیضاء" کا تھا۔ آپ کا ہاتھ اس طرح سے چمک اٹھا کہ جیسے کوئی منبع نور ہو۔

وَاضْمُمْ یَدَكَ اِلٰی جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ اٰیَةً اُخْرٰی۔

اور اپنا ہاتھ اپنی بغل میں لے جا کر نکالو تو تم دیکھو گے کہ کسی خرابی کے بغیر کیسا چمکتا دمکتا نکلتا ہے اور یہ دوسرا معجزہ ہوگا۔ (طٰہٰ۔ ۲۲)

۳۔ تباہ کن طوفان۔ آپ کا تیسرا اہم معجزہ تھا۔ سورہ اعراف کی آیت ۱۳۳ میں ہے:

فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الطُّوْفَانَ

پس ان پر ہم نے طوفان بھیجا۔

۴۔ ٹڈی دل کہ جو ان کی فصلوں اور درختوں پر مسلط ہو گیا اور ان کے لیے آفت و مصیبت

Marfat.com

بن گیا۔

وَالْجَرَادَ (اعراف۔ ۱۳۳)

۵۔ نباتات پر آنے والی جوؤں کی آفت کہ جو غلّوں کو نابود کر دیتی تھی:

وَالْقُمَّلَ (اعراف۔ ۱۳۳)

۶۔ دریائے نیل سے نکلنے والے مینڈک کہ جن کی نسل اتنی بڑھی کہ فرعونیوں کی زندگی اجیرن ہوگئی:

وَالضَّفَادِعَ (اعراف۔ ۱۳۳)

۷۔ "دم" یعنی خون کی مصیبت۔ انہیں خون کی نکسیر پھوٹنے لگی یا دریائے نیل کا پانی خون رنگ ہوگیا اور اس کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ پینے کے قابل رہا نہ کھیتی باڑی کے۔

وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ (اعراف۔ ۱۳۳)

۸۔ دریا میں راستے بن گئے اور بنی اسرائیل ان میں سے گزر کر پار اتر گئے:

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ (بقرہ۔ ۵۰)

۹۔ بنی اسرائیل پر من وسلویٰ نازل ہوا۔ اس کی تفصیل سورہ بقرہ کی آیہ ۵۷ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ قرآنی الفاظ میں:

وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى (بقرہ۔ ۵۷)

۱۰۔ پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ارشادِ قرآنی ہے:

فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا

ہم نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا عصا پتھر پر مارو۔ پس اس میں سے بارہ چشمے جاری ہوگئے۔ (بقرہ۔ ۶۰)

۱۱۔ پہاڑ کا ایک حصہ الگ ہو کر سائبان کی طرح ان کے سروں پر آکھڑا ہوگیا۔

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ

اور جب ہم نے ان کے سروں پر پہاڑ کو اس طرح سے لٹکا دیا کہ جیسے سائبان ہو۔ (اعراف۔ ۱۷۱)

۱۲۔ آلِ فرعون کو قحط اور خشک سالی نے آلیا۔ یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں سے تھا۔ قرآن کہتا ہے:

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ

اور بے شک ہم نے آلِ فرعون کو برسوں تک قحط اور پھلوں کی کمی کے عذاب میں گرفتار کیے رکھا۔ (اعراف۔ ۱۳۰)

۱۳۔ اس مقتول کو پھر سے زندگی مل گئی کہ جس کا قتل بنی اسرائیل میں اختلاف کا باعث بن گیا تھا۔

Marfat.com

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى

پس ہم نے کہا : اس گائے کا کوئی ٹکڑا لے کر اس کی لاش پر مارو۔ یوں خدا مُردے کو زندہ کرتا ہے۔ (بقرہ - ۷۳)

۱۴۔ بیابان میں بنی اسرائیل سخت گرمی میں مبتلا تھے تو اللہ تعالٰے نے انہیں بادلوں کا سائبان عطا فرمادیا۔ یہ بھی ایک معجزہ تھا۔ ارشادِ الٰہی ہے :

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ

اور ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کر دیا۔ (بقرہ - ۵۷)

لیکن زیرِ نظر آیت میں تو نو آیات کا ذکر ہے۔ اس سے پھر کون سے نو معجزات مراد ہیں ؟

ان آیات میں جو تعبیرات آئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں وہ معجزات مراد ہیں کہ جو فرعون اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں ظہور پذیر ہوئے نہ وہ کہ جو صرف بنی اسرائیل پر مربوط ہیں، مثلاً من و سلویٰ کا نزول، پتھر سے چشموں کا پھوٹنا وغیرہ۔

اگر غور کیا جائے تو سورہ اعراف میں بیان کیے گئے پانچ معجزات یعنی طوفان، نباتاتی آفت، ٹڈی دَل، مینڈک اور خون ہی خون نظر آنا، ان نو معجزات میں شامل ہیں۔ اسی طرح حضرت موسٰی علیہ السلام کے دو مشہور معجزے یعنی عصا، اور یدِ بیضا بھی یقیناً ان میں شامل ہیں خصوصاً جبکہ سورہ نمل کی آیت ۱۰ تا ۱۲ میں ان دو عظیم معجزوں کے ذکر کے بعد تسع آیات (نو آیات) کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔ اس طرح یہ کُل سات معجزے ہوئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اور دو کون سے معجزات ہیں ؟

اس میں شک نہیں کہ فرعونیوں کی غرقابی اور اس قسم کے دیگر امور ان معجزات میں شامل نہیں ہو سکتے کیونکہ یہاں جن نو معجزات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان کا مقصد فرعونیوں کی ہدایت ہے نہ کہ ان کی نابودی۔

سورۂ اعراف میں بہت سے معجزات کا ذکر ہے۔ ان میں غور و خوض کیا جائے تو یہ دو معجزات خشک سالی اور مختلف پھلوں کا قحط ہے کیونکہ عصا اور یدِ بیضا کے معجزے کا ذکر کرنے کے بعد اور ٹڈی دَل وغیرہ مذکورہ پانچ معجزات سے پہلے فرمایا گیا ہے :

ولقد اخذنا اٰل فرعون بالسنین ونقص من الثمرات لعلھم یذکرون

ہم نے بنی اسرائیل کو خشک سالی اور مختلف قسم کے پھلوں کی کمی میں مبتلا کیا کہ شاید وہ بیدار ہو جائیں۔ (اعراف - ۱۳۰)

ممکن ہے بعض یہ خیال کریں کہ خشک سالی پھلوں کی کمی سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ اس طرح یہ ایک ہی "آیت" شمار ہوگی لیکن جیسا کہ ہم سورہ اعراف کی اس آیت کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ ہو سکتا

Marfat.com

ہے محدود خشک سالی سے درختوں پر تھوڑا اثر مرتب ہو لیکن خشک سالی جب طول کھینچ جائے تو اس سے درخت تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا پھلوں کی تباہی صرف خشک سالی سے نہیں ہوتی۔
اس ساری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ جن نو معجزات کی طرف زیر بحث آیت میں اشارہ ہوا ہے وہ یہ ہیں:
(i) عصا
(ii) ید بیضاء
(iii) طوفان
(iv) ٹڈی دل
(v) "قمل" نامی ایک نباتاتی آفت
(vi) مینڈکوں کی کثرت
(vii) خون
(viii) خشک سالی
(ix) پھلوں میں کمی
سورہ اعراف کی مذکورہ آیات میں ان نو معجزات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:
یہ نو آیات دیکھ کر بھی جب وہ ایمان نہ لائے تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور انہیں غرق دریا کر دیا کیونکہ انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی اور ان سے غفلت برتی تھی۔" (اعراف - ۱۳۶)
ہمارے منابع حدیث میں اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں کچھ روایات نقل ہوئی ہیں لیکن ان روایات میں آپس میں اختلاف ہے — لہٰذا انہیں فیصلے کے لیے معیار قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ ان سے اطمینان ہو سکتا ہے۔
۲۔ کیا سوال کرنے والے پیغمبر اکرمؐ تھے؟ زیر بحث آیات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل سے حضرت موسیٰؑ کے نو معجزات کے بارے میں سوال کریں کہ آل فرعون نے کس طرح سے معجزات دیکھنے کے باوجود بہانے بنائے اور حضرت موسیٰؑ کی حقانیت قبول نہ کی۔
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جیسی صاحب علم و عقل ہستی کو ایسے سوال کی ضرورت نہ تھی، سمجھتے ہیں کہ سوال کرنے کے لیے دوسرے مخاطبین کو حکم دیا گیا تھا۔
لیکن۔ اگر ہم اس امر کی طرف توجہ کریں کہ پیغمبر اکرمؐ کو یہ سوال اپنے لیے نہیں کرنا تھا بلکہ اس لیے تھا کہ مشرکین یہ بات مان لیں لہٰذا اس میں کوئی مانع نہیں کہ سوال خود نبی کریم صلی اللہ

Marfat.com

علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ہو تاکہ مشرکین جان لیں کہ اگر پیغمبر اکرمؐ ان کے طرح طرح کے تقاضے قبول نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تقاضے حق طلبی کے لیے نہ تھے بلکہ ہٹ دھرمی، تعصب اور عناد پر مبنی تھے جس کی مثال حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے واقعے میں موجود ہے۔

۳۔ آیت میں "ارض" سے کیا مراد ہے؟ زیرِ نظر آیات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ دشمن پر کامیابی کے بعد اب تم اس زمین پر رہو سہو جس کے بارے میں تم سے عہد لیا گیا ہے۔

کیا اس سے مراد مصر کی سرزمین ہے؟

(قبل کی آیت میں یہی لفظ مصر کی سرزمین کے لیے آیا ہے۔ مذکورہ آیت کہتی ہے کہ فرعون انہیں اس سرزمین سے نکالنا چاہتا تھا اور دوسری آیات بھی کہتی ہیں کہ بنی اسرائیل فرعونیوں کے وارث ہوتے)۔

یا پھر کیا "ارض" یہاں فلسطین کی مقدس سرزمین کی طرف اشارہ ہے؟

کیونکہ — اس واقعے کے بعد بنی اسرائیل فلسطین کی طرف گئے اور انہیں حکم دیا گیا کہ وہ اس سرزمین میں داخل ہوں۔

ہم بعید نہیں سمجھتے کہ یہاں دونوں علاقے مراد ہوں کیونکہ قرآن کے مطابق بنی اسرائیل آلِ فرعون کی زمینوں کے بھی وارث ہوئے اور سرزمینِ فلسطین کے بھی مالک بنے۔

۴۔ "وعد الاٰخرۃ" سے کیا مراد ہے؟ کیا "وعد الاٰخرۃ" زیرِ بحث آیات میں دارِ آخرت کے معنی میں ہے؟

اس سوال کا جواب ظاہراً مثبت ہے کیونکہ "جئنا بکم لفیفا" (یعنی۔ ہم تمہیں اکٹھے ایک دوسرے سے ملے جلے ہوئے لائیں گے) اس امر کے لیے قرینہ ہے۔

لیکن بعض بزرگ مفسرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ "وعد الاٰخرۃ" اس سورہ کے آغاز کی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ:

اللہ نے تم بنی اسرائیل سے دو کامیابیوں اور دو شکستوں کا وعدہ کیا تھا۔

ایک کو "وعد اولیٰ" اور دوسری کو "وعد الاٰخرۃ" کہا گیا ہے۔

مگر — "جئنا بکم لفیفا" کی طرف توجہ کی جائے تو یہ احتمال بہت ہی بعید معلوم ہوتا ہے (غور کیجئے گا)۔

Marfat.com

(۱۰۵) وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ
اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۟
(۱۰۶) وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ
وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۟
(۱۰۷) قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ
مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۟ۙ
(۱۰۸) وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۟
(۱۰۹) وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۟

ترجمہ

(۱۰۵) اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے اور تجھے ہم نے سوائے اِس کے کسی کام کے لیے نہیں بھیجا کہ تُو بشارت دینے والا اور متنبہ کرنے والا ہو۔

(۱۰۶) ہم نے قرآن تجھ پر جُدا جُدا آیتوں کی صورت میں اتارا ہے تاکہ تُو اسے لوگوں کے سامنے تدریجاً اور سکون کے ساتھ پڑھے (اور یہ دلوں میں اُتر جائے) اور یقیناً یہ قرآن ہم ہی نے نازل کیا ہے۔

(۱۰۷) ان سے کہہ دو، تم مانو یا نہ مانو جنہیں قبل ازیں علم عطا کیا گیا ہے یہ آیات جب ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں وہ زمین پر سجدے میں جاگرتے ہیں۔

Marfat.com

(۱۰۸) اور کہتے ہیں: پاک ہے ہمارا رب کہ جس کے وعدے حتماً پورے ہو کے رہتے ہیں۔

(۱۰۹) وہ (بے اختیار) زمین پر گر جاتے ہیں (اور سجدہ ریز ہو جاتے ہیں) اشک بہاتے ہیں اور ہر لحمہ ان کا خشوع و خضوع بڑھتا ہی رہتا ہے۔

تفسیر

عاشقانِ حق

ان آیات میں ایک مرتبہ پھر قرآن کی عظمت و اہمیت واضح کی گئی ہے اور مخالفین کے بعض اعتراضات اور بہانہ سازیوں کا جواب دیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: ہم نے قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے (و بالحق انزلناہ)۔

ساتھ ہی مزید فرمایا گیا ہے: اور یہ حق ہی کے ساتھ نازل ہوا ہے (و بالحق نزل) اور تجھے ہم نے صرف بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ (وما ارسلناك الامبشرًا و نذیرًا)۔

یہ جو پہلے فرمایا گیا ہے "و بالحق انزلناہ" اور ساتھ ہی فرمایا گیا ہے "و بالحق نزل" ان دونوں جملوں میں کیا فرق ہے؟

اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں، مثلاً:

۱۔ پہلے جملے سے مراد یہ ہے کہ ہم نے مقدر کیا ہے کہ قرآن حق کے ساتھ نازل ہو اور دوسرا جملہ کہتا ہے کہ اس فیصلے پر عمل درآمد ہو گیا ہے۔ اس بنا پر ایک جملہ تقدیر کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا اس پر عملدرآمد کی طرف[1]

۲۔ پہلے جملے سے مراد یہ ہے کہ قرآن کا مواد، مضمون اور مفہوم حق ہے اور دوسرے جملے سے مراد یہ ہے کہ اس کا نتیجہ اور ثمرہ بھی حق ہے[2]

۳۔ پہلے جملے سے مراد یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا اور دوسرا جملہ کہتا ہے کہ رسول اللہ چونکہ اس میں دخل و تصرف کا حق نہیں رکھتے تھے لہٰذا یہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے۔

---

[1] تفسیر قرطبی، ج ۶ صفحہ ۳۹۵۵۔

[2] تفسیر فی ظلال القرآن، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

لیکن — یہاں ایک اور احتمال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جو مذکورہ بالا تفاسیر کی نسبت واضح تر ہے اور وہ یہ کہ بعض اوقات انسان ایک کام شروع کرتا ہے لیکن اس کی طاقت چونکہ محدود ہے اس لیے وہ اسے آخر تک اسی صحیح طریقے سے نبھا نہیں سکتا مگر جو تمام چیزوں سے آگاہ ہے اور تمام چیزوں پر قدرت رکھتا ہے وہ ابتداء بھی صحیح طریقے سے کرتا ہے اور اختتام پر بھی اس کام کو مکمل طور پر اور صحیح طرح انجام دیتا ہے۔

مثلاً کوئی شخص کسی ایک مقام سے صاف و شفاف پانی جاری کرتا ہے لیکن اسے راستے کی آلودگیوں سے محفوظ نہیں رکھ پاتا لہٰذا استعمال کرنے والوں کو وہ صاف و شفاف پانی میسّر نہیں آتا لیکن جو اپنے کام پر پوری گرفت رکھتا ہے وہ ابتدائی طور پر بھی پاک و صاف پانی نکالتا ہے اور اسے پیاسوں کے برتنوں تک بھی پاک و صاف حالت میں پہنچا دیتا ہے۔

قرآن بھی بالکل ایک ایسی کتاب ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے اور ابلاغ کے سارے راستے میں صحیح اور محفوظ رہی ہے۔ اُس مرحلے میں بھی کہ جب جبرائیل اس کا واسطہ تھے اور اس مرحلے میں بھی کہ جب رسول اللہؐ اسے لینے والے تھے، یہاں تک کہ زمانہ گزرنے کے باوجود ہر قسم کی تحریف سے پاک اور محفوظ رہی ہے جیسا کہ اس آیت کا تقاضا ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ

یقیناً ہم ہی نے اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ (الحجر-۹)

یہ کتاب ہر لحاظ سے محفوظ ہے کیونکہ اس کی حفاظت اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے۔ لہٰذا یہ وحی الٰہی کا صاف و شفاف پانی دورِ نبوی سے لے کر اختتامِ عالم تک محفوظ ہے اور ہر قسم کی دست اندازی سے پاک دلوں کی تشنگی کو سیراب کرتا ہے۔

اگلی آیت میں مخالفین کی بہانہ سازیوں میں سے ایک کا جواب دیا گیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ قرآن ایک ہی مقام پر سارے کا سارا رسول اللہؐ پر کیوں نازل نہیں ہو گیا اور اس کی روش بالکل تدریجی کیوں ہے؟ (جیسا کہ سورہ فرقان کی آیہ ۳۲ میں اس اعتراض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے)۔

ارشاد ہوتا ہے: "ہم نے الگ الگ آیتوں کی صورت میں تجھ پر قرآن نازل کیا ہے تاکہ تُو اسے لوگوں کے سامنے اطمینان کے ساتھ تدریجی طور پر پڑھے" اور یہ دل و دماغ میں اچھی طرح سے اتر جائے اور پوری طرح عملی شکل بھی اختیار کرلے (وقرآنا فرقناه لتقراه علی الناس علیٰ مکثٍ) [۱]

---

[۱] بہت سے مفسرین کے مطابق "قرآناً" کہ جو مندرجہ بالا آیت میں منصوب صورت میں آیا ہے ایک فعل مقدر کے ذریعے ہیں۔ "فرقناہ" اس کی تفسیر کر رہا ہے اور تقدیر میں یوں تھا:

"وفرقنا قرآنا"

Marfat.com

مزید تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یقیناً یہ سارا کا سارا قرآن ہم نے نازل کیا ہے (و نزلناہ تنزیلاً)۔

سطحی نظر رکھنے والے خصوصاً بہانہ ساز لوگوں کی نظر میں بے شک نزولِ قرآن کی یہ کیفیت قابلِ اعتراض ہوگی۔ وہ کہیں گے کہ یہ کتاب کہ جو بنیادِ اسلام ہے، ساری انسانیت کی راہنما ہے مسلمانوں کے لیے تمام معاشرتی حقوق اور سیاسی و عبادتی قوانین کا سرچشمہ ہے ایک ہی مرتبہ ساری کی ساری رسول اللہؐ پر نازل کیوں نہیں ہوگئی تاکہ لوگ ہمیشہ اسے شروع سے آخر تک پڑھ کر ان امور سے باخبر ہو جائیں۔

لیکن ـــ تھوڑا سا غور کیا جائے تو اس اعتراض کا کافی و وافی جواب مل جاتا ہے۔ کیونکہ:

اولاً: قرآن اگرچہ ایک کتاب ہے لیکن یہ انسانوں کی کسی تالیف کی مانند نہیں ہے کہ جو کسی ایک موضوع پر کتاب لکھنے بیٹھتے ہیں تو اسے پیشِ نظر رکھ کر اس کے ابواب کی تقسیم و تنظیم کرتے ہیں اور پھر اسے ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں۔ یہ تو ایسی کتاب ہے کہ جس کا پیغمبرِ اسلامؐ کے تئیس سالہ دورِ نبوت کے واقعات سے نہ ٹوٹنے والا تعلق ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ جو کتاب ۲۳ سالہ واقعات سے مربوط ہو اکٹھی ایک ہی روز میں نازل ہو جائے۔ کیا ۲۳ سال کے واقعات ایک دن میں جمع ہو سکتے ہیں؟

قرآنِ حکیم کے بہت سے حصے اسلامی غزوات سے مربوط ہیں۔ اس کا کچھ حصہ منافقین کی دسیسہ کاریوں سے متعلق ہے۔ اس کے کچھ مسائل ان وفود سے متعلق ہیں کہ جو مختلف قوموں کی طرف سے رسولِ اکرمؐ کے پاس آئے تھے اور آپؐ حکمِ الٰہی کے مطابق ان کے جواب کے لیے عملی اقدام کرتے تھے۔

کیا ممکن ہے کہ یہ سب امور پہلے ہی دن لکھ لیے جائیں؟

ثانیاً: قرآن صرف تعلیمی کتاب نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ ہر آیت کے نزول کے بعد اس کا اجراء ہو اور اس پر عملدرآمد ہو۔ لہٰذا سارا قرآن یکجا نازل ہوتا تو یکجا اس کا اجراء بھی ہونا چاہیئے تھا جبکہ ہم جانتے ہیں کہ اس کا یکجا اور اکٹھا اجراء ایک امرِ محال تھا کیونکہ جو معاشرہ سرتاپا فاسد تھا ایک ہی دن میں اس کی اصلاح نہیں ہوسکتی تھی۔ ایک اَن پڑھ بچے کو ایک ہی دن میں پہلی کلاس سے ڈاکٹریٹ تک نہیں پہنچایا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن تدریجاً نازل ہُوا ہے تاکہ اس کا اجراء اچھے طریقے سے ہو سکے اور یہ پوری طرح معاشرے میں اپنا مقام بنا سکے، کسی تزلزل کا شکار نہ ہو اور معاشرہ اسے قبول و محفوظ رکھنے کے قابل ہو سکے۔

ثالثاً: خود رسول اللہؐ جو اس عظیم انقلاب کے رہبر تھے اگر سارے قرآن کے نافذ کرنے کیلئے تقسیم کرنا چاہتے تو اس کی نسبت تدریجی اجراء کا طریقہ ان کے لیے قوی تر تھا اور آمادگی پیدا کرنے کے لحاظ سے بہتر تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے تھے اور بے نظیر عقل و توانائی کے حامل تھے۔

Marfat.com

تاہم زیادہ بہتر اور اکمل تر تدریجی قبولیت اور تدریجی اجراء ہی کی صورت تھی۔
رابعاً: تدریجی نزول کا مفہوم یہ ہے کہ مبداءِ وحی کے ساتھ پیغمبر کا ارتباط دائمی ہے جبکہ یکجا اور یک بار نزول ایک سے زیادہ مرتبہ سرچشمۂ وحی سے ارتباط کی ضمانت نہیں دیتا۔
سورہ فرقان کی آیہ ۳۲ میں ہے:

كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا

ہم نے قرآن کو تجھ پر اس طرح سے نازل کیا ہے کہ تیرا دل مضبوط ہو اور ہم نے تیرے لیے آہستہ آہستہ اور تدریجاً پڑھا ہے۔
یہ آیت تدریجی نزول کے تیسرے فلسفے کی طرف اشارہ کرتی ہے جبکہ ہماری زیر بحث آیت زیادہ تر دوسرے فلسفے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔
بہرحال یہ تمام عوامل قرآن کے تدریجی نزول کی حکمت و فلسفہ کے لیے روشن دلیل ہیں۔
اگلی آیت نادان مخالفین کا عذر ختم کرنے کے لیے کہتی ہے: چاہے ایمان لاؤ یا نہ لاؤ جنہیں اس سے پہلے علم دیا گیا ہے ان کے سامنے جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ منہ کے بل خاک پر گر پڑتے ہیں اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں (قل اٰمنوا بہ اولا تؤمنوا ان الذین اوتوا العلم من قبلہ اذا یتلیٰ علیھم یخرون للاذقان سجدًا)

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ "اٰمنوا بہ اولا تؤمنوا" کا تسلسل: عام طور پر مفسرین کا نظریہ ہے کہ "اٰمنوا بہ اولا تؤمنوا" کا ایک تسلسل ہے جو محذوف ہے اور کلام کے قرینے سے وہ واضح ہوتا ہے۔
مفسرین نے اسے کئی طرح سے ذکر کیا ہے:
بعض کہتے ہیں مراد یہ ہے کہ تم مانو یا نہ مانو، اعجازِ قرآن اور اس کا منزل من اللہ ہونا واضح ہے۔
بعض دیگر کہتے ہیں اس جملے کی تکمیل یہ ہے کہ تم مانو یا نہ مانو، اس کا فائدہ یا نقصان تو تمہیں ہی پہنچے گا۔
یہ احتمال بھی ہے کہ بعد والا جملہ پہلے جملے کی تکمیل کرتا ہو۔ اس کی نظیر اردو زبان میں بھی ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں:

تُو میری بات مانے یا نہ مانے، جو اہلِ علم و دانش اور صاحبِ علم و فراست ہیں وہ مانتے ہیں۔

یہ جملہ اس امر کی طرف کنایہ ہے کہ تیرے نہ ماننے کی وجہ تیری عدم آگاہی اور بے علمی ہے اگر

Marfat.com

تو صاحبِ علم و دانش ہوتا تو مان لیتا۔ دوسرے لفظوں میں :

اگر تو ایمان نہ لائے تو آگاہ اور دانشمند افراد ایمان لے آئیں گے۔

۲۔ "الذین اوتوا العلم من قبلہ" سے کون مراد ہیں؟ اس سے مراد وہ یہودی اور عیسائی علماء ہیں جنہوں نے قرآنی آیات سنیں اور تورات و انجیل کے مطابق علامات پائیں تو ایمان لے آئے اور حقیقی مومنین کی صف میں شامل ہو گئے اور علماء اسلام میں سے شمار ہونے لگے۔

قرآن پاک کی کچھ دیگر آیات میں بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً :

لَیْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَهُمْ یَسْجُدُوْنَ ۝

وہ سب برابر نہیں ہیں۔ اہلِ کتاب میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو (حق اور ایمان کے ساتھ) قیام کرتے ہیں اور رات کے وقت ہمیشہ آیاتِ خدا کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدے بجا لاتے ہیں۔ (آلِ عمران - ۱۱۳)

۳۔ "یخرّون" کا مفہوم : اس کا معنی ہے "وہ بے اختیار زمین پر گر پڑتے ہیں" یہ تعبیر "یسجدون" (وہ سجدہ کرتے ہیں) کی بجائے آئی ہے۔ یہاں اس کا استعمال ایک لطیف نکتے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ جن افراد کے دل بیدار و آگاہ ہوتے ہیں آیاتِ الٰہی سنتے ہی وہ خدائی باتوں کے ایسے شیفتہ ہوتے ہیں کہ دیوانہ وار بے اختیار سجدہ ریز ہو جاتے ہیں گویا دل و جان اس کی نذر کر دیتے ہیں [۱]

۴۔ "اذقان" کا مطلب : "اذقان" "ذقن" کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے "ٹھوڑی" ہم جانتے ہیں کہ کوئی شخص بھی سجدہ کرتے وقت اپنی ٹھوڑی زمین پر نہیں رکھتا لیکن آیت کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ وہ بارگاہِ الٰہی میں پورا چہرہ زمین پر رکھ دیتے ہیں یہاں تک کہ ٹھوڑی جو اس سلسلے میں چہرے کا آخری حصہ ہو سکتا ہے وہ بھی زمین پر لگ جاتا ہے اور اس طرح وہ اس کی بارگاہ کی عظمت کا اظہار کرتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ سجدے میں عموماً انسان پہلے اپنی پیشانی خاک پر رکھتا

---

[۱] راغب نے مفردات میں کہا ہے :

"یخرّون" دراصل "خریر" کے مادہ سے ہے کہ جو پانی یا اس جیسی چیز بلندی سے گر رہی ہو تو اس کی آواز کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ سجدہ کرنے والوں کے لیے اس تعبیر کا استعمال اس چیز کی نشانی ہے کہ وہ اپنے رب کے حضور زمین پر اس عالم میں گرتے ہیں کہ ان کی تسبیح کی آواز بلند ہوتی ہے۔

Marfat.com

ہے لیکن جو شخص مدہوشی کے عالم میں بے اختیار زمین پر گرتا ہے اس کی زمین پر پہلے ٹھوڑی لگتی ہے۔
یہ تعبیر آیت میں "یخرون" کے مفہوم کی تاکید کرتی ہے [1]

اگلی آیت میں ان کی اس گفتگو کا ذکر ہے جو وہ سجدہ ریز ہوتے ہوئے کرتے ہیں : وہ کہتے ہیں : پاک ہے ہمارا رب، یقیناً ہمارے رب کے وعدے پورے ہو کے رہیں گے (ویقولون سبحان ربنا ان کان وعد ربنا لمفعولاً) [2]

وہ اپنے ان الفاظ میں پروردگار کی ربوبیت، اس کی پاکیزہ صفات اور اس کے وعدوں کی سچائی کے بارے میں اپنے حقیقی ایمان اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ وہ گفتگو ہے جس میں توحید پر ایمان، حق تعالیٰ کی صفات اور اس کی عدالت سب کچھ موجود ہے۔ اس میں پیغمبر کی نبوت اور معاد کا عقیدہ بھی موجود ہے گویا انہوں نے اصولِ دین کو ایک ہی جملے میں جمع کر دیا ہے۔

ان آیاتِ الٰہی اور اس عاشقانہ سجدے کی تاثیر کا ذکر اگلی آیت میں بھی جاری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : وہ پورے چہرے کے بل خاک پر گر پڑتے ہیں، ان کے اشک رواں ہوتے ہیں اور پروردگار کے حضور ان کے خشوع و خضوع میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے (ویخرون للاذقان یبکون ویزیدھم خشوعاً)۔

"یخرون للاذقان" کا تکرار تاکید کی دلیل بھی ہے اور ہمیشگی کی بھی۔ اسی طرح "یبکون" فعل مضارع کا استعمال عشق و مستی میں ان کے دائمی گریے کی دلیل ہے۔ نیز "یزیدھم خشوعاً" (ان کا خشوع بڑھتا ہے) میں فعل مضارع کا استعمال اس امر کی ایک اور دلیل ہے کہ ان کی حالت ایک سی نہیں رہتی بلکہ وہ ہمیشہ رشد و کمال کی بلندیوں کی طرف پیش قدمی کرتے رہتے ہیں اور ان کا خشوع و خضوع ہر لمحہ بڑھتا رہتا ہے۔

خشوع ۔ جسمانی و روحانی انکساری، ادب اور تواضع کی ایک کیفیت ہے جو کسی شخصیت یا حقیقت کے سامنے ہوتی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **تعلیمی و تربیتی پروگرام :** زیر بحث آیات سے ایک اہم درس جو حاصل ہو رہا ہے یہ ہے کہ ثقافتی، تمدنی، فکری اور ہر قسم کے اجتماعی انقلاب کے لیے تربیتی پروگرام ضروری ہے کیونکہ اگر ایسا مرتب و منظم پروگرام نہ ہو اور پھر ہر مرحلے میں اس پر عملدرآمد نہ ہو تو شکست یقینی ہے۔ یہاں تک کہ قرآن مجید یکجا

[1] روح المعانی، ج ۱۵ ص ۱۷۵۔

[2] "ان کان وعد ربنا" میں "ان" شرطیہ نہیں بلکہ تاکید کے طور پر اور مثقلہ سے مخففہ ہے۔

Marfat.com

اور یکبار رسول اللہؐ پر نازل نہیں ہوا اگرچہ علمِ خدا میں وہ یکجا ہی تھا اور رسولِ اکرم کے سامنے شبِ قدر میں مجموعی صورت میں پیش ہوا تھا لیکن اس کا نزولِ اجرائی مختلف اوقات میں دقیق پروگرام کے تحت ۲۳ سال کی مدت میں مکمل ہوا۔

لہٰذا جب خدا اپنی بے پایاں قدرت و علم کے باوجود اس طرح کرتا ہے تو انسانوں کی ذمہ داری اس سے واضح ہو جاتی ہے۔

اصولی طور پر یہ ایک قانون و سنتِ الٰہی ہے کہ جو نہ فقط عالمِ تشریع میں بلکہ عالمِ تکوین میں بھی جاری و ساری ہے۔ کیا کبھی آپ نے سُنا ہے کہ کوئی بچہ ایک ہی رات میں ماں کے بطن سے پیدا ہو گیا ہو یا کوئی پھل درخت پر گھنٹے بھر میں پک کر میٹھا ہو گیا ہو۔ لہٰذا یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ کسی معاشرے کی فکری، ثقافتی، تمدنی یا اقتصادی و سیاسی لحاظ سے رات بھر میں ساری اصلاح ہو جائے۔

اس بات سے یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ اگر ہم مختصر مدت میں اپنی مسائل کا کوئی نتیجہ نہ دیکھ پائیں تو ہمیں مایوس نہیں ہو جانا چاہیئے اور کوشش جاری رکھنا چاہیئے اور ہمیں اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہیئے کہ حقیقی اور مکمل کامیابیاں ہمیشہ طویل عرصے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہیں۔

۲۔ **علم و ایمان کا ربط**: مندرجہ بالا آیات سے جو دوسرا واضح سبق حاصل کیا جا سکتا ہے وہ ہے علم اور ایمان کا باہمی ربط۔ قرآن کہتا ہے:

> تم ان آیات پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ جو صاحبانِ علم ہیں وہ نہ صرف ان پر ایمان لائے ہیں بلکہ عشقِ الٰہی اس طرح سے ان کے دل میں بھڑک رہا ہے کہ وہ بے اختیار اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ اشکوں کا ایک سیلاب ان کے رخساروں پر جاری ہو جاتا ہے اور ہر لحظہ ان کا خضوع و خشوع بڑھتا رہتا ہے اور ان کے دل میں ان آیات کا احترام فزوں تر ہوتا رہتا ہے۔

یعنی۔ یہ تو جاہل ہیں کہ جو حقائق کو دیکھتے ہیں تو کبھی ان کے سامنے سے بے اعتنائی سے گزر جاتے ہیں اور کبھی ان کا تمسخر اڑاتے ہیں اور ایسے افراد اگر کبھی ایمان کی طرف راغب بھی ہوں تو ان کا ایمان کمزور ناپائیدار ہوگا اور عشق، جذبہ اور حرارت سے خالی ہوگا۔

علاوہ ازیں یہ ان کے بیہودہ مفروضے کی پھر تردید ہے کہ جن کا خیال ہے دین انسان کی جہالت کی وجہ سے ہے۔ قرآن مجید اس دعویٰ کے برخلاف مختلف مواقع پر تاکید کرتا ہے کہ علم و ایمان ہر جگہ اکٹھے ہوتے ہیں اور گہرا مستحکم ایمان سایۂ علم کے بغیر ممکن نہیں اور علم بھی اعلیٰ تر اور بالاتر مراحل میں ایمان سے کمک حاصل کرتا ہے (غور کیجئے گا)۔

Marfat.com

(۱۱۰) قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا
فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ
بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝
(۱۱۱) وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ
يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ
الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۝

ترجمہ

(۱۱۰) کہہ دو: اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو جسے بھی پکارو (اس کی پاک ذات ایک ہی ہے اور) اس کے اچھے اچھے نام ہیں اور اپنی نماز نہ زیادہ بلند پڑھ اور نہ بہت آہستہ بلکہ درمیانی (معتدل) راہ اختیار کر۔

(۱۱۱) اور کہہ دو: حمد و ستائش اس اللہ کے لیے ہے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا ہے اور نہ جس کی حکومت میں کوئی شریک ہے اور نہ وہ کمزور و عاجز ہے کہ کوئی اس کا ولی و حامی ہے اور اس کی کبریائی بیان کرو، کمال درجے کی کبریائی۔

شانِ نزول

مفسرین نے زیرِ نظر پہلی آیت کی شانِ نزول کے بارے میں ابن عباس کے حوالے سے یوں نقل کیا ہے:

مکہ میں ایک رات پیغمبر اکرمؐ سجدے میں تھے۔ آپؐ خدا کو "یا رحمٰن" اور "یا رحیم" کہہ کر پکار رہے تھے کہ عذر تراش مشرکوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا: دیکھو!

Marfat.com

یہ شخص ہمیں تو سرزنش کرتا ہے کہ ہم کئی خدا کیوں مانتے ہیں لیکن) خود دو خداؤں کی پرستش کرتا ہے حالانکہ اس کا خیال ہے کہ یہ موحد ہے اور اس کا ایک سے زیادہ معبود نہیں۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا (کہ یہ متعدد نام ایک ہی ذات پاک کی خبر دیتے ہیں) [1]

تفسیر

آخری بہانے

گزشتہ آیات میں مشرکین کے کمزور اور بے بنیاد بہانوں کا ذکر تھا اور ان کا جواب دیا گیا تھا۔ زیرِ نظر آیات میں ان کے آخری بہانوں کا ذکر ہے۔ وہ کہتے تھے کہ پیغمبر، خدا کو مختلف ناموں سے کیوں پکارتے ہیں جبکہ یہ توحید کے مدعی ہیں۔ قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: کہہ دو: تم اسے "اللہ" کے نام سے پکارو یا "رحمٰن" کے نام سے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس کے کئی اچھے اچھے نام ہیں (قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن ایا ما تدعوا فله الاسماء الحسنیٰ)۔

دل کے یہ اندھے اپنی روزمرہ کی زندگی پر بھی نظر نہیں کرتے تھے۔ خود ان کے ہاں ایک شخص، ایک جگہ یا ایک چیز کے لیے کئی کئی نام ہوتے تھے اور یہ مختلف پہلوؤں کے حوالے سے رکھے جاتے تھے۔ تو کیا ان حالات میں باعثِ تعجب ہے کہ جس خدا کا وجود لامتناہی ہے، جو تمام کمالات، نعمات اور اچھائیوں کا سرچشمہ ہے، اس جہان کی ہر گردش جس کے ہاتھ میں ہے۔ اس ذاتِ مقدس کے ہر کمال اور ہر کام کی مناسبت سے کوئی خاص نام نہ ہو۔

اصولی طور پر اللہ کو صرف ایک نام سے نہ پکارا جا سکتا ہے اور نہ پہچانا جا سکتا ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس کے نام اس کی صفات کی طرح لامتناہی ہوں تاکہ اس ذات کے ترجمان ہوں لیکن ہمارے الفاظ چونکہ ہماری ہر چیز کی طرح محدود ہیں۔ لہٰذا ہمارے پاس اس کے نام بھی محدود ہی ہیں۔ اس لیے اللہ کے بارے میں ہماری جتنی بھی معرفت ہو محدود ہے۔ یہاں تک کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی روح کی عظیم وسعت کے باوجود فرماتے ہیں:

ما عرفناك حق معرفتك

تیری معرفت کا جو حق ہے اتنا ہم تجھے پہچان نہیں پائے۔

---

[1] مجمع البیان، زیرِ نظر آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ ہماری جتنی عقل اور شعور ہے اتنا اسے نہ پہچانیں خصوصاً جبکہ وہ اپنی ذات کی معرفت کے لیے خود ہماری مدد بھی بہت کرتا ہے اور اپنی کتاب میں مختلف ناموں سے اپنا ذکر کرتا ہے اور اس کے اولیاء دین کے بیانات میں اس کے ایک ہزار کے قریب اسماٗ ہم تک پہنچے ہیں۔

واضح ہے کہ یہ سب "اسم" ہیں اور "اسم" کا ایک معنی علامت اور نشانی ہے لہٰذا یہ سب اس کی پاک ذات کی نشانیاں ہیں اور یہ سب خطوط ایک ہی نقطے تک جا پہنچتے ہیں اور اس سے اس کی ذات وصفات کی توحید ووحدت پر کوئی فرق نہیں آتا۔ ان اسماء میں سے بعض زیادہ اہمیت وعظمت کے حامل ہیں کیونکہ ان کے توسط سے ہمیں زیادہ معرفت وآگہی نصیب ہوتی ہے۔ ان اسماء کو قرآن حکیم اور اسلامی روایات میں "اسماء الحسنیٰ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک مشہور روایت میں ہے:

اللہ کے ننانوے نام ہیں جو شخص انہیں شمار کرے گا جنت میں داخل ہوگا۔

اسماء حسنیٰ کے مفہوم اور ان ننانوے ناموں کے بارے میں ہم ساتویں جلد میں سورہ اعراف کی آیہ ۱۸۰ کی تفسیر میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ آیت یوں ہے:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا

اور اللہ کے اچھے اچھے نام ہیں۔ اُسے ان ناموں سے پکارا کرو۔

لیکن اہم بات یہ ہے کہ ہم سمجھیں کہ ان ناموں کو شمار کرنے کا یہ معنی نہیں کہ ان ناموں کو صرف زبان پر جاری کرلیں اور اللہ کو ان ناموں سے پکاریں تاکہ جنتی یا مستجاب الدعوۃ ہو جائیں۔ مقصد یہ ہے کہ ان اسماء کو عملی طور پر اپنایا جائے۔ عالم، رحمان، رحیم، جواد، کریم ..... جیسے ناموں کا پَرتو اپنے وجود پر ڈالا جائے اور عملی زندگی میں انہیں اپنایا جائے تاکہ ہم جنتی بھی ہو جائیں اور ہماری دعا بھی ہر حالت میں مستجاب ہو۔

مرحوم صدوق نے اپنی کتاب توحید میں ہشام بن حکم سے ایک حدیث نقل کی ہے۔ اس میں ہے:

ہشام کہتا ہے: مَیں نے امامؑ سے اللہ کے ناموں کے بارے میں پوچھا اور یہ بھی پوچھا کہ ان کی بنیاد کیا ہے۔ نیز مَیں نے کہا کہ "اللہ" کس سے مشتق ہے۔ تو امامؑ نے فرمایا:

اے ہشام! یہ لفظ "الٰہ" سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے "تحیّر" اور "الٰہ" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کوئی "مألوہ" رکھتا ہو (وہ ذات کہ کوئی شخص جس کی ذات کی حقیقت اور کنہ کی شناخت کے لیے حیران وسرگرداں ہو)۔

لیکن اس بات کو جانو کہ اسم مسمّیٰ کا غیر ہے لہٰذا جو صرف نام کی پرستش کرتا ہے بغیر

Marfat.com

مفہوم و مطلوب کے، وہ کافر ہے اور درحقیقت اس نے کسی چیز کی پرستش نہیں کی اور جو اسم اور مسمیٰ دونوں کی پرستش کرتا ہے وہ بھی کافر ہے کیونکہ وہ دو کی پرستش کرتا ہے لیکن جو صرف مسمیٰ کی عبادت کرتا ہے نہ کہ اسم کی (بلکہ اسم کو اس معنی تک پہنچنے کے لیے علامت سمجھے) تو یہ سچی توحید کی حقیقت ہے۔

اے ہشام! سمجھ۔

ہشام کہتا ہے: مَیں نے عرض کیا کہ کچھ سمجھا ہوں۔ میرے لیے کچھ وضاحت اور کیجئے۔

آپؑ نے فرمایا:

خدائے بزرگ و برتر کے ننانوے نام ہیں۔ ہر اسم کا اگر ایک مسمیٰ ہو تو ننانوے خدا ہونے چاہئیں لیکن "اللہ" ایک نام ہے کہ جو ان صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور بہرحال اس کے تمام نام اس کی ذات کے غیر ہیں۔

اے ہشام: روٹی نام ہے ایک چیز کا جسے کھایا جاتا ہے اور پانی نام ہے ایک چیز کا جسے پیا جاتا ہے اور لباس نام ہے ایک چیز کا جسے پہنا جاتا ہے اور آگ نام ہے اس چیز کا جو جلاتی ہے (لیکن یہ سب نام ہیں اور وہ چیز کہ جسے ہم کھاتے ہیں، پیتے ہیں، پہنتے ہیں اور جس کے جلانے سے ڈرتے ہیں وہ نام نہیں ہیں بلکہ عینیت خارجی ہے)[1]

مشرکین مکہ رسول اللہؐ پر ایک اعتراض اور کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ اپنی نماز بلند آواز سے پڑھتا ہے اور ہمیں بے آرام کرتا ہے، یہ کیسی عبادت ہے اور کیا طرزِ عمل ہے؟

قرآن رسول اللہؐ کو حکم دیتا ہے: اپنی نماز نہ زیادہ بلند آواز سے پڑھو اور نہ بہت آہستہ بلکہ درمیانی راہ اپناؤ (ولا تجهر بصلاتك ولا تخافت بها وابتغ بين ذٰلك سبيلاً)۔

لہٰذا مذکورہ بالا آیت مشہور فقہی اصطلاح کے مطابق جہریہ اور اخفاتیہ نمازوں سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کے پیشِ نظر بلند یا آہستہ پڑھنے میں افراط و تفریط کا مسئلہ ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ نہ زیادہ بلند پڑھو کہ شور معلوم ہو اور نہ اتنا آہستہ کہ صرف جنبشِ لب باقی رہ جائے اور کان تک آواز ہی نہ آئے۔

اکثر مفسرین نے آیت کی جو شانِ نزول ابن عباس سے نقل کی ہے وہ بھی اسی معنی کی مؤید ہے۔

نیز امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے مروی جو متعدد روایات طرقِ اہل بیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں وہ بھی اسی تفسیر کی طرف اشارہ کرتی ہیں[2]

---

[1] تفسیر المیزان، زیر بحث آیت کے ذیل میں، بحوالہ توحید صدوق۔

[2] تفسیر نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۳۳۔

Marfat.com

مندرجہ بالا گفتگو کے پیشِ نظر اس آیت کے بارے میں جو دیگر تفاسیر بیان ہوئی ہیں وہ سب اصل مطلب سے دور معلوم ہوتی ہیں۔

البتہ یہاں حدِ اعتدال سے کیا مراد ہے اور جس جہر و اخفات سے منع کیا گیا ہے، وہ کیا ہے؟ اس سلسلے میں ظاہر یہ ہے کہ "جہر" شور مچانے کے معنی میں ہے اور "اخفات" اس قدر آہستہ پڑھنے کے معنی میں کہ انسان خود بھی نہ سُن سکے۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

الجهر بها رفع الصوت، والتخافت بها مالم تسمع نفسك، واقرأ بين ذلك۔

"جہر" آواز زیادہ بلند کرنے کو کہتے ہیں اور "اخفات" یہ ہے کہ تم خود بھی نہ سن سکو۔ ان دو میں سے کسی کو انجام نہ دو بلکہ ان دونوں کے درمیان حدِ وسط اختیار کرو[1]

رہا دن اور رات کی نمازوں میں جہر و اخفات کا مسئلہ، تو جیسے ہم سطورِ بالا میں اشارہ کر چکے ہیں یہ ایک الگ حکم ہے، اس کا مفہوم اور دلائل مختلف ہیں۔ ہمارے فقہاء (رضوان اللہ علیہم) نے ان کے مدارک کتاب الصلوٰۃ میں بیان کیے ہیں۔

جہر و اخفات میں اعتدال کے دو پہلو

جہر و اخفات میں اعتدال کا یہ اسلامی حکم ہمیں دو لحاظ سے متوجہ کرتا ہے:

پہلے اس نظر سے کہ ہم اپنی عبادات اس طرح سے انجام نہ دیں کہ دشمنوں کے ہاتھ بہانہ آ جائے۔ وہ تمسخر اڑانے لگیں، یا اعتراض کرنے لگیں۔ کیا ہی اچھا ہے کہ عبادت، متانت، سکون اور ادب کے ساتھ ہو کہ جس پر نہ صرف اعتراض نہ کیا جا سکے بلکہ اپنے شکوہ، آداب اور عظمت کے لحاظ سے بھی نمونہ ہو۔

کچھ لوگ یہ کوشش کرتے ہیں کہ جب لوگ آرام کر رہے ہیں اپنے جلسوں میں ایسے لاؤڈ سپیکر لگائیں کہ جن کی آواز کان پھاڑنے والی ہو اور اس طرح اپنے جلسوں کے وجود کی خبر دیں۔ یہ لوگ اپنے خیالِ خام میں اس عمل کے ذریعے اسلام کی آواز دوسروں تک پہنچاتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف یہ اسلام کی آواز نہیں ہے بلکہ اسلام سے لوگوں کی دُوری کا باعث ہے اور اس طرزِ عمل سے نتیجتاً دینی

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۳۴۔

Marfat.com

تبلیغات پر ضرب لگتی ہے۔

اس حکم کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ عبادت ہمارے دوسرے اعمال کے لیے نمونہ بن جائے۔ ہمارے تمام سماجی، سیاسی اور اقتصادی امور اسی آئینے میں انجام پائیں۔ ان امور میں ہمیں ہر طرح کے افراط و تفریط اور تند روی و سہل انگاری سے بچنا چاہیئے اور " وابتغ بین ذٰلک سبیلاً (درمیانی راہ اختیار کرو) کو اصول ہر کہیں کار فرما ہونا چاہیئے۔

اب ہم سورہ بنی اسرائیل کی آخری آیت پر پہنچتے ہیں۔ اس میں حمد کے ساتھ سورہ کا اختتام ہوتا ہے جیسے اس کی ذاتِ پاک کی تسبیح کے ساتھ اس سورہ کی ابتدا ہوئی تھی۔ درحقیقت یہ آخری آیت اس سورہ کے تمام توحیدی مباحث اور مفاہیم کا نتیجہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کہہ دو: حمد مخصوص ہے اُس خدا کے لیے جس کا کوئی بیٹا ہے نہ عالمِ ہستی کی حکومت و مالکیت میں جس کا کوئی شریک ہے اور نہ ناتوانائی کے لیے اس کا کوئی سرپرست ہے (وقل الحمد للّٰہ الذی لم یتخذ ولدًا ولم یکن له شریك فی الملك ولم یکن له ولی من الذل)۔ اور وہ ایسی صفات کا حامل خدا ہے کہ ہر لحاظ سے تمہاری فکر سے برتر و بالاتر ہے لہٰذا اس کی بڑائی اور کبریائی کو سمجھو اور اس کی لامتناہی عظمت سے آشنائی حاصل کرو (وکبرہ تکبیرًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ **تین صفات کا باہمی ربط :** زیرِ نظر آیت میں خدا کی تین قسم کی صفات کی طرف اشارہ ہوا ہے نیز آیت کے ذیل کی طرف توجہ کی جائے تو کُل چار صفات ہو جاتی ہیں :

پہلی صفت ۔ یہ ہے کہ اُس کی کوئی اولاد نہیں ۔ کیونکہ اولاد کا ہونا نیاز و احتیاج کی دلیل ہے جسمانی ہونے کی دلیل اور شبیہ و نظیر رکھنے کی دلیل ہے جبکہ اس کا جسم ہے نہ وہ احتیاج رکھتا ہے اور نہ شبیہ و نظیر۔

دوسری صفت ۔ یہ ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں کیونکہ شریک کا وجود قدرت و حکومت کی محدودیت یا عجز و ناتوانائی یا شبیہ و نظیر ہونے کی دلیل ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خدا ایسی سب صفات سے پاک ہے۔ اُس کی قدرت اس کی حکومت کی طرح غیر محدود ہے اور اس کی کوئی شبیہ و نظیر بھی نہیں ہے۔

تیسری صفت ۔ یہ ہے کہ مشکلات اور ناتوانیوں کے لیے اس کا کوئی ولی نہیں کیونکہ اس خدائے عظیم و لامتناہی سے اس صفت کی نفی بھی واضح ہے۔

Marfat.com

دوسرے لفظوں میں یہ آیت اللہ سے ہر قسم کے مددگار اور شبیہ کی نفی کرتی ہے چاہے وہ اس سے کم تر ہو مثلاً اولاد یا اس جیسا ہو مثلاً شریک یا اس سے بالاتر ہو مثلاً ولی۔

مرحوم طبرسی نے بعض مفسرین سے کہ جن کے نام انہوں نے نہیں لکھے ، نقل کیا ہے کہ یہ آیت تین انحرافی گروہوں کے اعتقاد کی نفی کرتی ہے۔ پہلے عیسائی اور یہودی کہ جو خدا کے بیٹے کے قائل تھے۔ دوسرے مشرکین عرب جو اس کے لیے شریک خیال کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ صبح کے وقت اپنے مراسم عبادت میں کہتے تھے :

لبيك لاشريك لك الاشريكا هو لك

تیسرے ستارہ پرست اور مجوسی کہ جو خدا کے لیے ولی اور مددگار کے قائل تھے۔

۲۔ **تکبیر کیا ہے ؟** یہ جو قرآن نے یہاں رسول اکرم کو بڑی تاکید سے حکم دیا ہے کہ خدا کی بڑائی شمار کرو — یقیناً اس کا مفہوم یہ ہے کہ پروردگار کی بزرگی اور بڑائی کا اعتقاد رکھا جائے نہ کہ صرف زبان سے "اللہ اکبر" کہا جائے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ خدا کی بزرگی کا اعتقاد رکھنے کا یہ معنی نہیں کہ دوسرے موجودات کے مقابلے میں اسے برتر و بالاتر سمجھا جائے بلکہ ایسا موازنہ اصلاً ہے ہی غلط۔ چاہیئے کہ ہم اسے کسی چیز کے موازنہ سے برتر سمجھیں جیسا کہ امام صادق علیہ السلام نے ایک مختصر اور معنی خیز حدیث میں ہمیں تعلیم دی ہے :

کسی نے آپؑ کے پاس کہا : اللہ اکبر

امامؑ نے فرمایا : اللہ کس چیز سے زیادہ بڑا ہے ؟

اُس نے عرض کیا : ہر چیز سے۔

امامؑ نے فرمایا : یہ کہہ کر تُو نے اللہ کو محدود کر دیا (کیونکہ دیگر موجودات سے اس کا موازنہ کیا ہے اور ان سے برتر سمجھا ہے)۔

اُس نے عرض کی : پھر ہم کیا کہیں :

فرمایا ، کہو : اللہ اکبر من ان یوصف

یعنی ۔ خدا اس سے بڑا ہے کہ اُس کی توصیف کی جا سکے [1]

ای برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
واز آنچہ دیدہ ایم و نوشتیم و خواندہ ایم

[1] نور الثقلین ، ج ۳ صـ ۲۳۹ ۔

Marfat.com

مجلس تمام گشت و بہ آخر رسید عمر
ما ہمچناں در اوّل وصفت تو ماندہ ایم

اے ! خیال، قیاس، گمان اور وہم سے بالا !
اور اس سے بالا کہ جو ہم نے دیکھا، لکھا اور پڑھا ہے
مجلس تمام ہوگئی اور عمر آخر کو پہنچ گئی
لیکن ہم تیری پہلی صفت پر کھڑے ہیں۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ ایک اور حدیث جو امام صادق علیہ السلام ہی سے نقل ہوئی ہے اس میں آپؑ نے فرمایا :

وکان ثم شیء فیکون اکبر منه

کیا اصولی طور پر ذاتِ خدا کے مقابلے میں کوئی وجود ہے کہ جس سے وہ بڑا ہو ؟
اس صحابی نے عرض کیا : تو پھر ہم کیا کہیں ؟
فرمایا : کہو :- اکبر من ان یوصف
وہ اس سے برتر ہے کہ اس کی توصیف کی جا سکے [1]

۳۔ ایک سوال کا جواب : یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ زیر بحث آیات میں صفات سلبیہ کے ساتھ خدا کی حمد کیونکر آئی ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ حمد صفاتِ ثبوتیہ یعنی علم و قدرت وغیرہ کے ساتھ آنی چاہیئے۔ ولد، شریک اور ولی کی نفی جیسی صفات کے ساتھ تسبیح مطابقت رکھتی ہے نہ کہ حمد۔

اس سوال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ صفاتِ ثبوتیہ اور صفاتِ سلبیہ کا مقام اگرچہ ایک دوسرے سے جُدا ہے اور صفاتِ ثبوتیہ حمد کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں اور صفاتِ سلبیہ تسبیح کے ساتھ لیکن عینیتِ خارجی میں یہ ایک دوسرے کی لازم و ملزوم ہیں۔ خدا سے جہل کی نفی اثباتِ علم کے ساتھ ہے جیسا کہ اس کی ذاتِ پاک کے لیے اثباتِ علم، جہل کی نفی کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ لہٰذا کوئی مانع نہیں کہ کبھی لازم کو بیان کیا جائے اور کبھی ملزوم کو۔ جیسا کہ اس سورہ کی ابتداء میں ایک اثباتی امر کیلئے تسبیح آئی ہے :

سُبْحَانَ الَّذِيٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَى

منزہ ہے وہ خدا کہ جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کی طرف لے گیا۔

[1] نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۳۹۔

Marfat.com

پروردگارا ! ہمارے دل کو نورِ علم و ایمان سے سرشار کردے تاکہ ہم تیری عظمت کے سامنے ہمیشہ جھکے رہیں، تیرے وعدوں پر ایمان رکھیں اور تیرے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کردیں، تیرے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں اور تیرے غیر کا سہارا نہ لیں۔

بارالہا ! ہمیں توفیق دے کہ ہم زندگی بھر کبھی اعتدال سے باہر نہ نکلیں اور ہر قسم کی افراط و تفریط سے پرہیز کریں۔

خداوندا ! ہم تیری حمد کرتے ہیں۔ تجھے یگانہ و یکتا سمجھتے ہیں تجھے برتر سمجھتے ہیں، اس سے برتر کہ تیری توصیف کی جا سکے۔ تو ہی ہمیں بخش دے۔ ہمارے قدم اپنی راہ میں استوار کر اور داخلی و خارجی دشمنوں پر ہمیں کامیاب فرما اور ہماری کامیابیوں کو قیام مہدی موعود (ہماری جانیں ان پر فدا) کی آخری کامیابی کے ساتھ متصل کردے اور اس تفسیر کی ایسی تکمیل کی توفیق دے کہ جس سے تو راضی و خوشنود ہو۔

سورہ بنی اسرائیل اختتام کو پہنچی

۳ر محرم الحرام ۱۴۰۲ ہجری قمری
بمطابق
۹ر آبان ماہ ۱۳۶۰ ہجری شمسی

Marfat.com

سورۂ کہف

اس سورہ کی
۱۱۰-آیتیں ہیں
آیت ۲۸ کے سوا سب مکّی ہیں

Marfat.com

سورۂ کہف کی فضیلت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے اس سورہ کی فضیلت کے بارے میں بہت سی روایات مروی ہیں۔ان روایات سے اس سورہ کے مضامین کی بہت زیادہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔چند ایک روایات ذیل میں درج کی جا رہی ہیں :

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

کیا تمہیں ایسی سورہ کا تعارف کراؤں کہ جو نازل ہوئی تو ستر ہزار فرشتے اس کی نگرانی کر رہے تھے اور اس کی عظمت سے زمین و آسمان معمور تھے۔

صحابہ نے عرض کی :

جی ہاں۔

آپؐ نے فرمایا :

وہ سورہ کہف ہے۔جو شخص جمعہ کے روز اس کی تلاوت کرے گا آئندہ جمعہ تک اللہ اسے بخش دے گا (ایک اور روایت کے مطابق آئندہ جمعہ تک اللہ اسے گناہ سے محفوظ رکھے گا)۔۔۔۔ اور اسے ایسا نور عطا کرے گا کہ جو آسمان تک ضوفشاں ہوگا اور وہ شخص دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔[1]

۲۔ایک اور روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے منقول ہے۔آپؐ نے فرمایا :

جو شخص سورہ کہف کی دس آیات حفظ کرے گا اسے دجال نقصان نہیں پہنچا سکے گا اور جو شخص اس سورہ کی آخری آیات حفظ کرے گا روزِ قیامت یہ اس کیلئے روشنی بن جائیں گی۔[2]

۳۔امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے :

جو شخص ہر شب جمعہ سورہ کہف کی تلاوت کرے گا دنیا سے وہ شہید جائے گا اور شہدا کے ساتھ مبعوث ہوگا اور روزِ قیامت شہدا کی صف میں شمار ہوگا۔[3]

ہم نے بارہا کہا ہے کہ قرآنی سورتوں کی عظمت، ان کے روحانی اثرات اور اخلاقی برکات ان کے مضامین و مفاہیم کے لحاظ سے ہیں یعنی ان اثرات و برکات کے حصول کے لیے ان مفاہیم پر ایمان لانا اور ان پر عمل کرنا ہوگا۔

---

[1]، [2]، [3]۔ مجمع البیان۔

Marfat.com

اس سورہ کے مضامین کا ایک نہایت اہم حصہ چند باعظمت نوجوانوں کی داستان پر مشتمل ہے۔ ان نوجوانوں نے اپنے زمانے کے طاغوت اور دجال کے خلاف قیام کیا۔ نتیجتاً ان کی جان خطرے میں پڑ گئی اور وہ گویا موت کی سرحد تک آ پہنچے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کی۔ اس سچی داستان کی طرف توجہ کی جائے تو ہو سکتا ہے وہ دل جو آمادہ ہو ان میں نورِ ایمان چمک اٹھے اور انہیں گناہوں، دجالوں اور فاسد ماحول کی برائیوں سے بچا لے۔

اس سورہ میں عذابِ دوزخ کا ایسا تذکرہ ہے کہ انسان لرز کے رہ جاتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کیسا بُرا انجام متکبرین کے انتظار میں ہے۔

اسی طرح اس سورہ میں ایک نہایت عمدہ مثال کے ذریعے علم الٰہی کی وسعت بیان کی گئی ہے۔

اگر انسان ان تمام امور کی طرف توجہ کرے تو ہو سکتا ہے شیاطین کے فتنوں سے محفوظ رہے۔ اس کے دل میں ایک روشنی چمک اٹھے اور وہ عصیاں و گناہ سے بچ جائے جس کے نتیجے میں آخر کار شہداء کے ساتھ محشور ہو۔

سورہ کہف کے مضامین

یہ سورہ اللہ کی حمد و ستائش سے شروع ہوتی ہے اور توحید، ایمان اور عمل صالح کے ذکر پر تمام ہوتی ہے۔

دیگر مکی سورتوں کی طرح اس سورہ کے مضامین بھی زیادہ تر مبداء و معاد اور بشارت و انذار پر مشتمل ہیں۔ نیز اس میں ایک اہم مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کی ان سخت دنوں میں مسلمانوں کو ضرورت تھی۔ مسلمانوں کو سمجھایا گیا ہے کہ حق پرست اگرچہ کتنے کم کیوں نہ ہوں انہیں اکثریت کے سامنے نہیں جھکنا چاہیئے۔ اگرچہ اکثریت ظاہراً کتنی ہی قوی اور طاقتور کیوں نہ ہو اور حق پرستوں کو ماحول کی خرابی میں مخل نہیں ہو جانا چاہیئے بلکہ اصحاب کہف کے چھوٹے سے گروہ کی طرح اپنا الگ راستہ انتخاب کرنا چاہیئے اور اس بُرے ماحول کے خلاف قیام کرنا چاہیئے۔ ان تھوڑے افراد میں جب تک طاقت ہو مقابلہ کریں اور طاقت نہ ہونے کی صورت میں انہیں چاہیئے کہ ہجرت کر جائیں۔

اس میں دو افراد کی ایک اور داستان بھی ہے۔ ان میں سے ایک بہت زیادہ خوشحال اور دولت مند تھا لیکن ایمان کی دولت سے محروم تھا جبکہ دوسرا تہی دست تھا مگر مومن تھا۔ یہ تہی دست اپنی عزت و وقار کو برقرار رکھتے ہوئے ہمیشہ اس امیر شخص کو نصیحت و ارشاد کیا کرتا تھا لیکن جب اس پر کوئی اثر نہ ہوا تو اس سے بیزاری کا اعلان کر دیا اور کامیابی کا راستہ بھی یہی ہے۔

یہ واقعہ بیان کرنے کا ایک مقصد یہ تھا کہ وہ مسلمان جو رسول اللہؐ کے ساتھ ابتدائی حالات کی مشکلات سے

Marfat.com

دوچار ہیں یا آئندہ کبھی جن مسلمانوں کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑے وہ جان لیں کہ سرمایہ داروں کا جوش و خروش وقتی ہوتا ہے، جیسے ایک باایمان شخص کی تنگدستی۔

اس سورہ میں اگرچہ حضرت خضرؑ کا نام نہیں آیا تاہم اس میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا ایک واقعہ مذکور ہے۔ اس واقعے کے مطابق بعض کام ایسے تھے جو ظاہراً تو ٹھیک نہ معلوم ہوتے تھے مگر باطناً مصلحت پر مبنی تھے، حضرت موسیٰؑ ان پر صبر نہ کر سکے لیکن حضرت خضرؑ نے وضاحت کی تو انہیں ان کی گہرائی کا پورا علم ہوا اور پھر اپنی بے تابی پر پشیمان ہوئے۔

اس واقعے میں بھی سب کے لیے یہ درس ہے کہ واقعات کو صرف ظاہری نظر سے نہ دیکھا کریں بلکہ ان کی گہرائی پر نظر کریں۔

اس سورہ میں حضرت ذوالقرنین کی داستان بھی مذکور ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے کیسے دنیا کے مشرق و مغرب کی سیر کی۔ دنیا کی مختلف قوموں سے ملے کہ جن کے رسم و رواج مختلف تھے۔ آخر کار وہ کچھ لوگوں کی مدد سے یاجوج و ماجوج کی سازش کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے راستے میں آہنی دیوار کھڑی کر کے ان کے نفوذ کو ختم کر دیا۔ (اس واقعے کی پوری تفصیل انشاء اللہ سورت کے ذیل میں آئے گی)۔

یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان دنیا کے مشرق و مغرب میں نفوذ کے لیے پوری بصیرت کے ساتھ اپنے آپ کو تیار کریں اور ہر طرح کے یاجوج و ماجوج کا مقابلہ کرنے کے لیے آپس میں متحد ہو جائیں۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ اصحابِ کہف، موسیٰؑ و خضرؑ کا واقعہ اور حضرت ذوالقرنین کی داستان کہ جس کا اس سورہ میں ذکر ہے دیگر قرآنی واقعات کے برخلاف ان کا قرآن میں کسی اور جگہ کوئی ذکر نہیں آیا۔ صرف سورہ انبیاء کی آیہ ۹۶ میں یاجوج و ماجوج کے مسئلے کی طرف اشارہ ہوا ہے تاہم حضرت ذوالقرنین کا نام اس میں نہیں آیا۔ بہرحال یہ بات اس سورہ کی خصوصیات میں سے ہے۔

بہرکیف اس سورہ کے مضامین ہر لحاظ سے ثمر بخش اور تربیت کنندہ ہیں۔

٭ ٭ ٭

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

(۱) اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِهِ الۡكِتٰبَ وَلَمۡ
يَجۡعَلۡ لَّهٗ عِوَجًا ۞
(۲) قَيِّمًا لِّيُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِيۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡهُ وَيُبَشِّرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ
الَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمۡ اَجۡرًا حَسَنًا ۞
(۳) مَّاكِثِيۡنَ فِيۡهِ اَبَدًا ۞
(۴) وَّيُنۡذِرَ الَّذِيۡنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۞
(۵) مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمۡ‌ ؕ كَبُرَتۡ كَلِمَةً
تَخۡرُجُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ‌ ؕ اِنۡ يَّقُوۡلُوۡنَ اِلَّا كَذِبًا ۞

ترجمہ

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے۔

(۱) حمد مخصوص ہے اللہ کے لیے جس نے اپنے (برگزیدہ) بندے پر یہ (آسمانی) کتاب نازل کی اور اس میں کسی قسم کی کوئی کجی نہ رکھی۔

(۲) وہ کتاب کہ جو ثابت، مستقیم اور دوسری کتب کی نگہبان ہے تاکہ (برے کام انجام دینے والوں کو) اس کے شدید عذاب سے ڈرائے اور نیک عمل انجام دینے والے مومنین کو بشارت دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے۔

(۳) (وہی بہشت بریں کہ) جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

Marfat.com

(۴) اور (نیز) انہیں ڈرائے کہ جو کہتے ہیں کہ خدا نے (اپنے لیے) بیٹا انتخاب کیا ہے۔

(۵) نہ انہیں (ہرگز) اس بات پر یقین ہے نہ ان کے آباؤ اجداد کو، یہ بہت بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ یقیناً وہ جھوٹ کہتے ہیں۔

تفسیر

اللہ اور قرآن کے ذکر سے آغاز

سورہ کہف قرآن کی بعض دیگر سورتوں کی مانند اللہ کی حمد و ثنا سے شروع ہوتی ہے اور حمد چونکہ کسی اہم اور لائق تعریف کام پر ہوتی ہے لہٰذا ساتھ ہی نزولِ قرآن کا ذکر کیا گیا ہے، وہ قرآن کہ جو ہر قسم کی کجی سے پاک ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تعریف ہے اُس خدا کی جس نے اپنے بندے پر یہ آسمانی کتاب نازل کی کہ جس میں کسی قسم کا ٹیڑھ پن نہیں ہے (الحمد للّٰہ الذی انزل علٰی عبدہ الکتاب ولم یجعل لہ عوجًا)۔ ایسی کتاب ہے کہ جو ثابت و مستحکم ہے، جو معتدل و مستقیم ہے، جو حقیقی انسانی معاشرے کے قیام کے لیے ہے اور جو تمام آسمانی کتب کی پاسدار ہے (قیمًا)۔ تاکہ بُرے کام انجام دینے والوں اور دل کے اندھوں کو اللہ کے عذابِ شدید سے ڈرائے (لینذر بأسًا شدیدًا من لدنہ)۔ اور سچے مومنین کہ جو ہمیشہ عملِ صالح انجام دیتے ہیں انہیں بشارت دے کہ عظیم اور عمدہ جزا ان کے انتظار میں ہے (ویبشر المؤمنین الذین یعملون الصالحات ان لھم اجرًا حسنًا)۔ ایسی جزا کہ جو جاودانی ہے اور جس میں وہ تا ابد رہیں گے (ماکثین فیہ ابدًا)۔

اس کے بعد یہودی ہوں، عیسائی ہوں یا مشرکین ہر قسم کے مخالفین کے ایک عمومی انحراف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس آسمانی کتاب کا ایک ہدف یہ ہے کہ پیغمبر اُن لوگوں کو ڈرائے کہ جو خدا کے لیے بیٹے کے قائل ہیں (وینذر الذین قالوا اتخذ اللّٰہ ولدًا)۔

یعنی ــ عیسائیوں کو ڈرائے چونکہ اُن کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں اور یہودیوں کو ڈرائے چونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور مشرکین کو ڈرائے کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔

اس کے بعد اس قسم کے بے بنیاد عقائد کی اساس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: انہیں اپنے اس عقیدے کے بارے میں کوئی علم و یقین نہیں ہے اور اگر یہ اپنے آباؤ اجداد کی تقلید کرتے ہیں تو ان کے آباؤ اجداد کا بھی یہی عالم تھا (مالھم بہ من علم ولا لاٰبائھم)۔ تاہم یہ منہ سے بہت بڑی اور وحشتناک

Marfat.com

بات نکالتے ہیں (کبرت کلمة تخرج من افواھھم)۔

خدا کا جسم ہونا، خدا کی اولاد ہونا، خدا کو مادی احتیاجات ہونا۔ مختصر یہ کہ خدا کا محدود ہونا۔ یہ کیسی وحشت ناک باتیں ہیں۔

جی ہاں۔ یہ صرف جھوٹ بولتے ہیں (ان یقولون الا کذبًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ حمدِ الٰہی سے سورہ کی ابتداء: قرآن مجید کی پانچ سورتیں "الحمد للہ" سے شروع ہوتی ہیں۔ ان پانچ سورتوں میں حمدِ الٰہی کے بعد زمین و آسمان کی خلقت (یا مالکیت) یا عالمین کی پرورش کا ذکر آیا ہے سوائے زیر بحث سورت کے۔ یہاں حمدِ الٰہی کے بعد رسول اللہؐ پر قرآن نازل ہونے کا ذکر آیا ہے۔

درحقیقت سورہ انعام، سبا، فاطر اور فاتحہ میں "کتابِ تکوین" کی بات کی گئی ہے لیکن سورہ کہف میں "کتاب تدوین" کا ذکر کیا گیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ دو کتابوں یعنی عالم خلقت اور قرآن میں سے ہر ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے اور یہ بات اس امر کو واضح کرتی ہے کہ قرآن سارے عالم خلقت جتنا وزن رکھتا ہے اور یہ بھی جہانِ ہستی کی سی نعمت ہے اور اصولی طور پر عالمین کی پرورش و تربیت کا مسئلہ کہ جو "الحمد للہ رب العالمین" کے جملے میں آیا ہے، اس عظیم آسمانی کتاب سے فائدہ اٹھائے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۲۔ مستحکم، مستقیم اور نگہبان۔ کتاب: "قیّم" (بروزن "سیّد") "قیام" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ یہاں یہ لفظ مستحکم، ثابت اور استوار کے معنی میں ہے۔ علاوہ ازیں یہاں اس سے مراد ایسی کتاب ہے جو دوسری کتب کی محافظ و پاسدار ہو نیز ایسی کتاب کہ جو اعتدال و استقامت کی حامل ہو اور ہر قسم کی کجی اور ٹیڑھ پن سے پاک ہو۔

پہلے قرآن کو ہر قسم کی کجی سے پاک کہنے کے بعد اس لفظ سے قرآن کی توصیف کی گئی۔ گویا یہ قرآن کی استقامت، اس کے اعتدال ——— اور ہر قسم کے تضاد سے پاک ہونے پر تاکید بھی ہے، اس عظیم کتاب کے جاودانی ہونے پر دلالت بھی ہے اور اصالتوں کی محافظ ہونے کا مفہوم بھی دیتا ہے۔ نیز یہ ہر قسم کی کج روی سے اصلاح کرنے والی کتاب کا معنی بھی دیتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ کتاب احکام الٰہی اور انسانی عدالت و فضیلت کی نگہبانی کے لیے نمونہ بھی ہے۔

یہ صفت "قیّم" دراصل اللہ کی صفت "قیومیت" سے مشتق ہے جس کے مطابق خدا تمام موجودات اور اشیاءِ عالم کا محافظ و نگہبان ہے۔

~ ما بہ تو قائم چو تو قائم بذات

Marfat.com

ہم تجھ سے قائم ہیں چونکہ تُو قائم بالذات ہے۔

قرآن چونکہ خدا کا کلام ہے اس کی بھی یہی حالت ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن کی آیات میں لفظ "قیّم" دینِ اسلام کی صفت کے طور پر کئی مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ

اپنے آپ کو قیّم، پاک اور مستقیم دین کے ساتھ ہم آہنگ کرو۔ (روم - ۴۳)

سطورِ بالا میں "قیّم" کی جو تفسیر بیان کی گئی ہے، یہ در اصل تمام تفاسیر کا ایک جامع مفہوم ہے جو اس سلسلے میں مفسّرین نے بیان کی ہیں۔ کیونکہ بعض نے اسے اس کتاب کے معنی میں لیا ہے جو کبھی منسوخ نہیں ہو گی۔ بعض نے گزشتہ کتب کی محافظ کے معنی میں لیا ہے۔ بعض نے امورِ دین کو برپا کرنے والی کتاب کے مفہوم میں لیا ہے اور بعض نے ایسی کتاب کے معنی میں لیا ہے جس میں اختلاف و تضاد نہیں ہے۔ لیکن یہ تمام معانی اس جامع مفہوم میں جمع ہیں جو ہم نے بیان کیا ہے۔

بعض مفسّرین نے "لم یجعل له عوجًا" کو الفاظِ قرآن کی فصاحت کے معنی میں لیا ہے جبکہ "قیّمًا" کو بلاغت اور مفہوم کی استقامت کے معنی میں لیا ہے[1] البتہ اس فرق کے لیے کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے اور زیادہ تر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے تاکید کی مانند ہے۔ فرق یہ ہے کہ "قیّم" کا مفہوم زیادہ وسیع ہے یعنی ذاتی استقامت کے مفہوم کے علاوہ دوسروں کی پاسداری، اصلاح اور حفاظت بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے[2]

۳۔ خدا کے لیے اولاد کے قائل افراد کو خصوصی تنبیہ: مندرجہ بالا آیات میں وسیع اور مطلق طور پر انذار کے بعد ان لوگوں کو بالخصوص ڈرایا گیا ہے کہ جو خدا کے لیے اولاد کے قائل ہیں۔ یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ یہ انحراف خاص اہمیت رکھتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ اعتقادی انحراف عیسائیوں ہی سے مخصوص نہیں بلکہ یہود و مشرکین بھی اس میں شریک تھے اور جب یہ قرآن نازل ہو رہا تھا تو یہ ایک طرح کا عمومی اعتقاد تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ ایسا عقیدہ روحِ توحید کو بالکل ختم کر دیتا ہے اور خدا کو مادی و جسمانی موجودات کی صف میں لے آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس کے لیے انسانی جذبات و احساسات کا قائل ہوا جائے، اس کے لیے شبیہ و شریک مانا جائے اور اسے حاجتمند شمار کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بات کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ روح المعانی، ج ۱۵، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۔ "قیّم" ترکیبِ نحوی کے لحاظ سے حال ہے اور اس میں عامل "انزل" ہے۔

Marfat.com

سورہ یونس کی آیہ ۶۸ میں ہے :

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحَانَهٗ هُوَ الْغَنِيُّ

انہوں نے کہا کہ خدا کا بیٹا ہے، حالانکہ وہ غنی و بے نیاز ہے۔

سورہ مریم کی آیہ ۸۸ تا ۹۱ میں ہے :

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝

انہوں نے کہا کہ رحمٰن کا بیٹا ہے۔ تمہاری یہ بات بہت ہی ناموزوں اور سنگین ہے قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑے، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر پڑیں کیونکہ تم خدا کے لیے بیٹے کے قائل ہو۔

یہ انتہائی سخت اندازِ کلام اس بات کی دلیل ہے کہ غلط اعتقاد کا نتیجہ اور انجام بہت ہی بُرا ہے۔ اس کے منحوس اثرات بہت وسیع ہیں اور درحقیقت ہے بھی ایسا ہی کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ کو اوجِ عظمت سے نیچے لے آیا جائے اور اسے پست مادی موجودات کی صف میں لا کھڑا کیا جائے[1]

۴۔ دعویٰ، بلا دلیل : انحرافی عقائد کا مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے زیادہ تر دعویٰ بلا دلیل کے مترادف ہیں۔ بعض اوقات یہ جھوٹے نعروں کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ کوئی نعرہ بلند کرتا ہے اور دوسرے اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ یا بڑے بوڑھوں کے رسم و رواج کی صورت میں کوئی عقیدہ ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

ضمنی طور پر قرآن ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ہر صورت میں ہم بے دلیل دعووں سے پرہیز کریں چاہے وہ کسی طرف سے اور کسی شخص کی جانب سے ہوں۔

مندرجہ بالا آیات میں اس قسم کے کام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بہت بڑی اور وحشتناک بات ہے اور ایسی بات کو جھوٹ کا سرچشمہ قرار دیتا ہے۔

یہ ایک ایسی بنیادی بات ہے کہ اگر مسلمان اپنی ساری زندگی میں اس کی پیروی کریں یعنی بلا دلیل نہ کچھ کہیں اور نہ کوئی بات قبول کریں اور پراپیگنڈا و دلیل سے عاری دعووں کی پرواہ نہ کریں تو ان کی بہت سی پریشانیاں اور مشکلات دور ہو جائیں۔

۵۔ عمل صالح ۔ ایک مسلسل طرزِ عمل : مندرجہ بالا آیات میں مومنین کے بارے میں

---

[1] تثلیث اور خدا کی اولاد ہونے کے مسئلہ کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۴ صفحہ ۱۷۹ پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ (اردو ترجمہ)

Marfat.com

گفتگو کرتے ہوئے "عمل صالح" کو اس کا مسلسل اور دائمی طرزِ عمل قرار دیا گیا ہے کیونکہ "یعملون الصالحات" فعل مضارع ہے اور ہم جانتے ہیں کہ فعل مضارع تسلسل اور دوام پر دلالت کرتا ہے۔

حقیقت میں ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے کیونکہ چند ایک نیک کام تو ہو سکتا ہے اتفاقاً یا بعض وجوہ کی بناء پر انجام پا جائیں لہٰذا وہ ہرگز حقیقی ایمان کے لیے دلیل نہیں ہو سکتے۔ حقیقی ایمان کی دلیل تو ایسا عمل صالح ہے جس میں تسلسل اور دوام ہو۔

۶۔ جس نے اپنے "بندہ" پر کتاب نازل کی: زیرِ نظر آیات میں آسمانی کتاب کے نازل ہونے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

شکر ہے اس خدا کا جس نے اپنے "بندہ" پر کتاب نازل فرمائی ہے۔

یہ اس امر کی دلیل ہے کہ "بندہ" کی تعبیر انتہائی فخریہ اور باعظمت ہے۔ یہ وصف اسی انسان کا ہو سکتا ہے جو واقعاً اللہ کا بندہ ہو۔ جو اپنی ہر چیز کو اُس سے وابستہ سمجھے۔ جس کی آنکھ اور کان اُس کے حکم پر لگے ہوں۔ جو اس کے غیر کا تصور بھی نہ کرے۔ جو اس کی راہ کے علاوہ کسی راہ پر نہ چلے ـــ ایسے شخص ہی کو یہ افتخار اور اعزاز حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ اس کا پاکباز بندہ ہو۔

Marfat.com

(۶) فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا
بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝

(۷) اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ
اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝

(۸) وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝

ترجمہ

(۶) اگر یہ لوگ اس بات پر ایمان نہ لائیں تو شاید تم غم کے مارے اپنی جان دے بیٹھو گے۔

(۷) جو کچھ رُوئے زمین پر ہے اسے ہم نے اس کی زینت قرار دیا ہے تاکہ ہم لوگوں کو آزمائیں کہ بہتر عمل ان میں کون کرتا ہے۔

(۸) (لیکن یہ زیب و زینت پائیدار نہیں ہے) اور آخر کار ہم رُوئے زمین کو چٹیل میدان بنا دیں گے۔

تفسیر

غم نہ کرو - یہ دنیا آزمائش گاہ ہے

گزشتہ آیات میں رسولِ اکرمؐ کی رسالت اور رہبری کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیرِ نظر پہلی آیت میں رہبری کی ایک نہایت اہم شرط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے ہمدردی اور غمخواری۔ ارشاد ہوتا ہے: گویا تُو اس شدت غم میں اپنی جان دے بیٹھے گا کہ یہ لوگ آسمانی کتاب پر ایمان نہیں لاتے

Marfat.com

(فلعلك باخع نفسك علیٰ اٰثارھم ان لم یؤمنوا بھٰذا الحدیث اسفًا) ۔

چند توجہ طلب نکات

۱۔ "باخع" کا مفہوم : "باخع" "بخع" (بروزن "نخل") کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے اپنے آپ کو شدتِ غم سے مار ڈالنا۔

۲۔ "اسفًا" کا مطلب : "اسفا" غم و اندوہ کی شدت ظاہر کرتا ہے۔ یہ لفظ یہاں اس امر کی تاکید کے لیے ہے۔

۳۔ "اٰثار" کا معنی : "اٰثار" "اثر" کی جمع ہے۔ یہ دراصل نشان پا کے معنی میں ہے لیکن کسی چیز کی جو علامت باقی رہ جائے اسے بھی "اثر" کہتے ہیں۔ یہاں اس لفظ کا استعمال ایک لطیف نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ یہ کہ کبھی انسان ایک جگہ سے چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر تو اس کے آثار باقی رہتے ہیں لیکن زیادہ وقت گزر جائے تو آثار بھی محو ہو جاتے ہیں یعنی تُو ان کے ایمان نہ لانے سے اس قدر پریشان ہے کہ تُو چاہتا ہے کہ ان کے آثار محو ہونے سے پہلے تُو اپنے آپ کو غم و اندوہ سے مار ڈالے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "آثار" سے مراد ان کے آثار و کردار ہوں۔

۴۔ قرآن کے لیے لفظ "حدیث" : قرآن کو "حدیث" کہنا اس کتاب کے تازہ نزول کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی وہ اتنی زحمت بھی نہیں کرتے کہ اس کتاب کا مطالعہ کریں کہ جو تازہ نازل شدہ ہے اور جس کے مضامین نئے ہیں۔ یہ انتہائی بے خبری کی دلیل ہے کہ انسان کسی نئی چیز کے پاس سے لاپرواہی سے گزر جائے۔

۵۔ غمخوار ہادی : آیاتِ قرآن اور تاریخ سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ الٰہی رہبر لوگوں کی گمراہی پر کسی کے تصور سے زیادہ دکھی ہوتے تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ لوگ ایمان لے آئیں چونکہ وہ دیکھ رہے ہوتے تھے کہ لوگ پیاسے ہیں، صاف و شفاف چشمے کے پاس بیٹھے ہیں اور پھر بھی پیاس کی شدت سے فریاد کناں ہیں۔ ہادیانِ برحق اس حالت پر پریشان ہوتے، آنسو بہاتے، دعا کرتے اور رات دن کوشش کرتے تھے۔ چھپ چھپا کر بھی تبلیغ کرتے۔ کھلے بندوں بھی پیغامِ حق پہنچاتے۔ خلوت و جلوت میں فرد اور اجتماع کو دعوت دیتے۔ اس بات پر بہت ملول ہوتے کہ لوگوں نے سیدھی راہ کو چھوڑ کر ٹیڑھا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ ان کے اندوہ کا یہ عالم ہوتا کہ کبھی ایسا لگتا کہ وہ اس غم میں جان دے بیٹھیں گے۔

واقعاً رہبر جب تک ایسا غمخوار نہ ہو رہبری کا عمیق مفہوم عملی جامہ نہیں پہن سکتا۔

Marfat.com

بعض اوقات غم کی یہ حالت اس قدر شدید ہو جاتی کہ خود رسول اللہ کی جان خطرے میں پڑ جاتی اور ایسے میں اللہ تعالیٰ ان کی دلجوئی کرتا ہے اور انہیں تسلی دیتا۔

سورہ شعراء کی آیہ ۳ اور ۴ میں ہے :

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ۝

تُو تو گویا اپنی جان دے ڈالے گا کہ وہ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ غم نہ کر، ہم نے انہیں فاعل مختار بنایا ہے اگر ہم چاہیں تو آسمان سے ان کو ایسی آیت بھیجتے کہ ان کی گردن بلا اختیار اس کے سامنے جھک جاتی۔

اگلی آیت میں اس عالم کی کیفیت بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ دنیا انسانوں کے لیے میدان آزمائش ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : جو کچھ روئے زمین پر ہے اسے ہم نے اس کی زینت قرار دیا ہے (انا جعلنا ما علی الارض زینة لها)۔ ہم نے دنیا کو حسین بنایا ہے۔ اس کا ہر گوشہ دل کو کھینچتا ہے لگا ہوں کو دعوت دیدار دیتا ہے اور انسان میں مختلف احساسات کو ابھارتا ہے۔ جذبات کی یہ کشاکش خوبصورت چیزوں کی یہ چمک دمک اور دلربا چہروں کی یہ جاذبیت انسان کے لیے آزمائش ہے۔ انسان کا ایمان، ارادے کی قوت اور معنویت و فضیلت ہر چیز کا امتحان ہو جاتا ہے۔

لہٰذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے : تاکہ انہیں آزمائیں کہ ان میں سے بہتر عمل کون انجام دیتا ہے (لنبلوهم ایهم احسن عملا)۔

بعض مفسرین نے "ما علی الارض" کا مفہوم علماء میں محدود کرنا چاہا ہے۔ بعض نے اس سے صرف مرد مراد لیے ہیں اور کہا ہے کہ زمین کی زینت یہی ہیں لیکن اس لفظ کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں روئے زمین کی تمام موجودات شامل ہیں۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ یہاں "احسن عملا" کی تعبیر استعمال ہوئی ہے نہ کہ "اکثر عملا" کی۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں حسن عمل اور عمل کی اعلیٰ کیفیت کی قدر و قیمت ہے نہ کہ کثرت و کمیت کی۔

بہر حال یہ تمام انسانوں بالخصوص تمام مسلمانوں کے لیے ایک تنبیہ اور صدائے بیدار باش ہے اور انہیں متوجہ کیا جا رہا ہے کہ دنیا کی دلربائیوں سے ضرب نہ کھائیں کیونکہ یہ دنیا تو میدان آزمائش ہے۔ ان دلفریب مظاہر سے دل لگانے کی بجائے حُسن عمل کے بارے میں سوچیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے : یہ پائدار نہیں ہے اور آخر کار نابود ہو جائے گی اور ہم روئے زمین کی تمام چیزوں کو ختم کر دیں گے "اور صفحۂ ارض کو چٹیل میدان میں بدل کے رکھ دیں گے" (وانا لجاعلون

Marfat.com

ما علیھا صعیدًا جرزًا)۔

" صعید " " صعود " کے مادہ سے ہے۔ یہاں سطح زمین کے معنی میں ہے ۔ وہ سطح کہ جس میں مٹی پوری طرح نمایاں ہو۔ " جرز" اس زمین کو کہتے ہیں جس میں گھاس نہ اُگتی ہو، گویا وہ اپنی گھاس کو کھا جاتی ہو۔ دوسرے لفظوں میں " جرز" اس زمین کو کہتے ہیں کہ خشک سالی کی وجہ سے جس کے پودے ختم ہو گئے ہوں۔

جی ہاں ! یہ حسین اور دل انگیز مناظر کہ جو فصلِ بہار میں صحراؤں اور کوہساروں کے دامن میں دکھائی دیتے ہیں، پھولوں کی مسکراہٹیں، جھومتے ہوئے شجر، سرگوشیاں کرتے ہوئے پتے، ندی نالوں کے زمزمے۔ سب فصلِ خزاں میں ختم ہو جاتے ہیں۔ درختوں کی شاخیں قربان ہو جاتی ہیں۔ ندی نالے خاموش ہو جاتے ہیں۔ غنچے خشک ہو جاتے ہیں، پتے مرجھا جاتے ہیں اور زندگی کی آواز چُپ ہو جاتی ہے۔

انسانوں کی رنگین زندگی کا بھی یہی عالم ہے۔ یہ محل اور یہ فلک بوس عمارتیں، یہ رنگا رنگ لباس یہ گوناں گوں نعمتیں، یہ خدام اور یہ مقام و منصب سب ختم ہو جانے والی چیزیں ہیں۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ خشک و خاموش قبرستان کے سوا کچھ باقی نہیں ہوگا، اور یہ ایک بہت بڑا درسِ عبرت ہے۔

Marfat.com

(۹) اَمۡ حَسِبۡتَ اَنَّ اَصۡحٰبَ الۡكَهۡفِ وَالرَّقِيۡمِۙ كَانُوۡا
مِنۡ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ○

(۱۰) اِذۡ اَوَى الۡفِتۡيَةُ اِلَى الۡكَهۡفِ فَقَالُوۡا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ
رَحۡمَةً وَّهَيِّئۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا ○

(۱۱) فَضَرَبۡنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمۡ فِى الۡكَهۡفِ سِنِيۡنَ عَدَدًاۙ ○

(۱۲) ثُمَّ بَعَثۡنٰهُمۡ لِنَعۡلَمَ اَىُّ الۡحِزۡبَيۡنِ اَحۡصٰى لِمَا
لَبِثُوۡۤا اَمَدًا ○

ترجمہ

(۹) کیا تم خیال کرتے ہو کہ اصحاب کہف و رقیم ہماری عجیب نشانیوں میں سے تھے۔

(۱۰) وہ وقت یاد کرو جب جوانوں کے اس گروہ نے غار میں جا پناہ لی اور کہا:
پروردگارا! ہمیں اپنی رحمت سے نواز اور ہمیں راہ نجات فراہم کر۔

(۱۱) ان کے کانوں پر ہم نے (نیند کا) پردہ ڈال دیا اور وہ سالہا سال سوئے رہے۔

(۱۲) پھر ہم نے اٹھایا تاکہ واضح ہو جائے کہ ان دو گروہوں میں سے کسے اپنی نیند کی مدت خوب یاد ہے۔

شانِ نزول

مندرجہ بالا آیات کی مفسرین نے ایک شانِ نزول نقل کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قریش کے سرداروں نے اپنے دو ساتھی پیغمبر اسلام کی دعوت کی تحقیق کے لیے علماء یہود کے پاس مدینہ بھیجے۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا گزشتہ کتب میں اس سلسلے میں کوئی چیز ملتی ہے۔

Marfat.com

انہوں نے مدینہ پہنچ کر علماء یہود سے رابطہ کیا۔ اُن سے ملے اور قریش کی بات بیان کی، تو یہودی علماء نے کہا: تم محمد (ص) سے تین مسائل کے بارے میں سوال کرو۔ اگر اس نے سب کا کافی و وافی جواب دے دیا تو وہ خدا کی طرف سے رسول ہے۔

(بعض روایات میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ اگر محمد (ص) نے دو سوالوں کا جواب کافی و وافی اور ایک سوال کا جواب اجمالی دیا تو پھر وہ رسول ہے)۔

انہوں نے بات جاری رکھی: سب سے پہلے پوچھنا کہ بہت مدت پہلے جو چند جوان اپنی قوم سے جُدا ہو گئے تھے، وہ کون تھے؟ کیونکہ ان کی داستان اور جو اُن کے ساتھ گزری بہت عجیب و غریب ہے۔

علماء یہود کہنے لگے: پھر سوال کرنا کہ وہ کون ہے جس نے پوری زمین کا چکر لگایا اور زمین کے مشرق و مغرب تک جا پہنچا۔ اس کا واقعہ کس طرح ہے۔

انہوں نے کہا: نیز یہ بھی پوچھنا کہ رُوح کی حقیقت کیا ہے؟

قریش کے نمائندے واپس مکہ سرداران قریش کے پاس پہنچ گئے اور کہا: ہم نے محمد (ص) کے سچ اور جھوٹ کی پہچان کا معیار پا لیا ہے۔

پھر انہوں نے اپنا سارا واقعہ سنایا۔

اس کے بعد وہ رسول اللہؐ کی خدمت میں پہنچے اور اپنے سوالات آپؐ کی خدمت میں پیش کیے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: مَیں تمہیں کل جواب دوں گا۔

لیکن آپؐ نے انشاء اللہ نہ کہا۔ پندرہ دن گزر گئے لیکن اللہ کی طرف سے رسول اللہؐ پر کوئی وحی نازل نہ ہوئی اور جبرائیلؑ آپؐ کے پاس نہ آئے۔ اس پر اہل مکہ پراپیگنڈا کرنے لگے اور طرح طرح کی غلط باتیں بنانے لگے۔

رسول اللہؐ پر یہ بات بہت گراں گزری۔ آخر کار جبرائیل آئے اور خدا کی طرف سے سورہ کہف لائے۔ اس میں ان جوانوں کی داستان بھی تھی اُس سیاح عالم کا واقعہ بھی تھا۔ علاوہ ازیں آپؐ پر آیہ "ویسئلونك عن الروح ۔۔۔" بھی نازل ہوئی۔

آنحضرتؐ نے جبرائیلؑ سے پوچھا: اتنی تاخیر کیوں کی؟

انہوں نے کہا: مَیں آپؐ کے رب کے حکم کے علاوہ نازل نہیں ہو سکتا۔ مجھے اجازت نہیں دی گئی۔

یاد دہانی ضروری ہے کہ مذکورہ تین سوالوں میں سے دو کے جواب اسی سورہ میں آئے ہیں لیکن رُوح سے متعلقہ آیت سورہ بنی اسرائیل میں گزر چکی ہے۔ اور ایسی مثالیں قرآن میں اور بھی ہیں کہ ایک آیت

Marfat.com

ایک خاص مطلب کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور رسول اللہؐ کے حکم پر اسے کسی خاص سورت میں خاص مقام پر جگہ دی گئی۔

تفسیر

اصحابِ کہف کا واقعہ شروع ہوتا ہے

گزشتہ آیات میں اس دنیا کی زندگی کے بارے میں بتایا گیا تھا اور یہ واضح کیا گیا تھا کہ یہ دُنیا انسان کے لیے آزمائش ہے۔ قرآن چونکہ عمومی حساس مسائل کے لیے کئی ایک مثالیں پیش کرتا ہے یا گزشتہ تاریخ سے نمونے پیش کرتا ہے لہٰذا یہاں بھی پہلے اصحابِ کہف کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور ان کا ذکر ایک نمونۂ عمل کے طور پر کیا گیا ہے۔

چند بیدار فکر اور با ایمان نوجوان تھے۔ وہ ناز و نعمت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے عقیدے کی حفاظت اور اپنے زمانے کے طاغوت سے مقابلے کے لیے ان سب نعمتوں کو ٹھوکر مار دی پہاڑ کے ایک غار میں جا پناہ لی۔ وہ غار کہ جس میں کچھ بھی نہ تھا۔ یہ اقدام کر کے انہوں نے راہِ ایمان میں اپنی استقامت اور پامردی ثابت کر دی۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ اس مقام پر قرآن فنِ فصاحت و بلاغت کے ایک اصول سے کام لیتے ہوئے پہلے ان افراد کی سرگزشت کو اجمالی طور پر بیان کرتا ہے تاکہ سننے والوں کا ذہن مائل ہو جائے۔ اس سلسلے میں چار آیات میں واقعہ بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد چودہ آیات میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کیا تم سمجھتے ہو کہ اصحابِ کہف و رقیم ہماری عجیب آیات میں سے تھے (ام حسبت ان اصحاب الکھف والرقیم کانوا من اٰیاتنا عجبًا)۔

زمین و آسمان میں ہماری بہت سی عجیب آیات ہیں کہ جن میں سے ہر ایک عظمتِ تخلیق کا ایک نمونہ ہے۔ خود تمہاری زندگی میں عجیب اسرار موجود ہیں کہ جن میں سے ہر ایک تمہاری دعوت کی حقانیت کی نشانی ہے اور اصحابِ کہف کی داستان مسلماً ان سے عجیب تر نہیں ہے۔

"اصحابِ کہف" (اصحابِ غار) کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے اپنی جان بچانے کیلئے غار میں پناہ لی تھی جس کی تفصیل ان کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے آئے گی۔

لیکن "رقیم" دراصل "رقم" کے مادہ سے لکھنے کے معنی میں ہے۔[1] زیادہ تر مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ

---

[1] مفردات میں راغب کہتا ہے کہ "رقم" (بروزن "زخم") سخت اور رنگ آلود راستے کو کہتے ہیں اور بعض اسے خط پر نقطے لگنے کے معنی میں سمجھتے ہیں۔

(بہرحال "رقیم" کتاب، تختی یا نامہ کو کہتے ہیں کہ جس پر کچھ لکھا گیا ہو)۔

Marfat.com

اصحاب کہف کا دوسرا نام ہے کیونکہ آخر کار اُس کا نام ایک تختی پر لکھا گیا اور اسے غار کے دروازے پر نصب کیا گیا۔

بعض اسے اس پہاڑ کا نام سمجھتے ہیں کہ جس میں یہ غار تھی اور بعض اس زمین کا نام سمجھتے ہیں کہ جس میں وہ پہاڑ تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ اُس شہر کا نام ہے جس سے اصحابِ کہف نکلے تھے لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

رہا بعض کا یہ احتمال کہ اصحاب کہف اور تھے اور اصحابِ رقیم اور تھے بعض روایات میں ان کے بارے میں ایک داستان بھی نقل کی گئی ہے، یہ ظاہر آیت سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ زیرِ نظر آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اصحابِ کہف و رقیم ایک ہی گروہ کا نام ہے یہی وجہ ہے کہ ان دو الفاظ کے استعمال کے بعد صرف "اصحابِ کہف" کہہ کر داستان شروع کی گئی ہے اور ان کے علاوہ ہرگز کسی دوسرے گروہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ یہ صورتِ حال خود ایک ہی گروہ ہونے کی دلیل ہے۔

جو افراد غار میں بند ہو گئے تھے ان میں سے تین کے بارے میں تفسیر نور الثقلین میں مشہور روایات ذکر ہوئی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے خدا کو اپنے ایک خالص عمل کا واسطہ دیا جس کی وجہ سے انہیں اس تنگ و تاریک مقام سے رہائی ملی۔ ان روایات میں "اصحابِ رقیم" کے نام کی کوئی بات نہیں ہے اگرچہ بعض کتبِ تفسیر میں اس عنوان کے تحت بات کی گئی ہے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کرنا چاہیئے کہ "اصحابِ کہف و رقیم" ایک ہی گروہ کی طرف اشارہ ہے اور آیات کی شانِ نزول بھی اسی حقیقت کی تائید کرتی ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اس وقت کا سوچو جب چند جوانوں نے ایک غار میں جا پناہ لی (اذ اَوی الفتیۃ الی الکھف)۔

جب وہ ہر طرف سے مایوس تھے، انہوں نے بارگاہِ خدا کا رُخ کیا" اور عرض کی: پروردگارا! ہمیں اپنی رحمت سے بہرہ ور کر" (فقالوا ربنا اٰتنا من لدنک رحمۃ) اور ہمارے لیے راہِ نجات پیدا کردے (وھیء لنا من امرنا رشدًا)۔

ایسی راہ کہ جس سے ہمیں اس تاریک مقام سے چھٹکارا مل جائے اور تیری رضا کے قریب کر دے۔ ایسی راہ کہ جس میں خیر و سعادت ہو اور ذمہ داری ادا ہو جائے۔

ہم نے ان کی دُعا قبول کی۔ ان کے کانوں پر خواب کے پردے ڈال دیئے اور وہ سالہا سال تک غار میں سوئے رہے (فضربنا علیٰ اٰذانھم فی الکھف سنین عددًا)۔

پھر ہم نے انہیں اٹھایا اور بیدار کیا تاکہ ہم دیکھیں کہ ان میں سے کون لوگ اپنی نیند کی مدت کا بہتر حساب لگاتے ہیں (ثم بعثناھم لنعلم ای الحزبین احصٰی لما لبثوا امدًا)۔

Marfat.com

چند اہم نکات

۱۔ "اوی الفتیۃ" کا مفہوم : "اوی" "مأوی" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ اس کا معنی ہے "امن وامان کی جگہ"۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ فاسد اور بُرے ماحول سے بھاگ کر یہ جوان جب غار میں پہنچے تو انہیں سکون و آرام محسوس ہوا۔

۲۔ "فتیۃ" "فتی" کی جمع ہے۔ دراصل یہ نوخیز و سرشار جوان کے معنی میں ہے البتہ کبھی کبھار بڑی عمر والے ان افراد کے لیے بھی بولا جاتا ہے کہ جن کے جذبے جوان اور سرشار ہوں۔ اس لفظ میں عام طور پر جوانمردی حق کے لیے ڈٹ جانے اور حق کے حضور تسلیم خم کرنے کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔

اس امر کی شاہد وہ حدیث ہے جو امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی۔

امامؑ نے اپنے ایک صحابی سے پوچھا: "فتی" کس شخص کو کہتے ہیں؟

اُس نے جواباً عرض کیا: "فتی" نوجوان کو کہتے ہیں۔

امامؑ نے فرمایا:

اما علمت ان اصحاب الکهف کانوا کلهم کهولا، فسماهم الله فتیة بایمانهم

کیا تجھے نہیں پتہ کہ اصحاب کہف پکی عمر کے آدمی تھے لیکن اللہ نے انہیں "فتیہ" کہا ہے اس لیے کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا:

من اٰمن بالله واتقی فهو الفتیٰ

جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو اور تقویٰ اختیار کیے ہو وہ "فتیٰ" (جوانمرد) ہے[1]

روضۃ الکافی میں امام صادقؑ سے ایسی ہی ایک اور حدیث بھی منقول ہے[2]

۳۔ "من لدنك رحمة" کا مفہوم : اس کا معنی ہے: "تیری طرف سے رحمت" یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ جب انہوں نے غار میں پناہ لی تو دیکھا کہ کچھ ان کے بس میں نہیں رہا اور تمام ظاہری اسباب بے کار ہو گئے ہیں۔ ایسے میں انہیں صرف رحمتِ الٰہی کی امید تھی۔

۴۔ "ضربنا علیٰ اٰذانهم" کا مطلب : "ہم نے ان کے کانوں پر پردہ ڈال دیا" عربی میں یہ سُلانے کے لیے ایک لطیف کنایہ ہے کسی شخص کے کان پر پردہ ڈالنا۔ گویا وہ کسی کی بات نہ

---

[1] و [2] نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۴۴ و ص ۲۴۵۔

Marfat.com

سُننے اور اس پردے سے مراد نیند ہی کا پردہ ہے۔

اسی بناء پر حقیقی نیند وہی ہے جو انسان کے کانوں کو گویا بے کار کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ سوئے ہوئے کسی انسان کو بیدار کرنا ہو تو اسے آواز دیتے ہیں تاکہ اس کی قوتِ شنوائی پر اثر ہو اور وہ بیدار ہو جائے۔

۵۔ "سنین عددا" **کا مطلب**: اس کا معنی ہے "متعدد سال"۔ یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ وہ سالہا سال سوتے رہے جیسا کہ اس واقعے کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ آیات کی تفسیر میں آئے گی۔

۶۔ "بعثناھم" **کا مفہوم**: یہ تعبیر ان کے بیدار ہونے کے بارے میں آئی ہے۔ شاید یہ لفظ اس لیے آیا ہے کہ ان کی نیند اتنی لمبی ہو گئی تھی کہ گویا موت کی طرح تھی اور ان کی بیداری قیامت اور بعد از موت اٹھنے کی مانند تھی۔

۷۔ "لنعلم" **کا مطلب**: اس کا معنی ہے: "تاکہ ہم جان لیں"۔ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ خدا کوئی نیا علم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایسی تعبیریں قرآن میں بہت آئی ہیں۔ ان کا مطلب ہے کہ خدا کو جو کچھ معلوم ہے وہ عملاً رونما ہو جائے یعنی ہم نے انہیں نیند سے بیدار کیا تاکہ یہ معنی عملی صورت اختیار کرے کہ وہ اپنی نیند کے بارے میں ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔

۸۔ "ای الحزبین" **کا مفہوم**: اس سلسلے کی وضاحت آئندہ آیات سے ہو جائے گی۔ بات یہ ہے کہ جب وہ جاگے تو انہوں نے اپنے سونے کی مقدار کے بارے میں اختلاف کیا۔ بعض سمجھتے تھے کہ وہ ایک دن سوئے ہیں۔ بعض کا خیال تھا کہ وہ آدھا دن سوئے ہیں حالانکہ وہ سالہا سال تک سوئے رہے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ "اصحابِ رقیم" اور تھے اور "اصحابِ کہف" اور تھے۔ یہ خیال بہت بعید ہے۔ اس کے بارے میں زیادہ گفتگو کی ضرورت نہیں۔[1]

---

[1] یہ نظریہ "اعلام القرآن" کے صفحہ ۱۰۹ پر ذکر کیا گیا ہے۔

Marfat.com

(١٣) نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُمْ بِالْحَقِّ ۚ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا
بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى ۝
(١٤) وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَدْعُوَ مِنْ دُونِهِ إِلَٰهًا لَقَدْ
قُلْنَا إِذًا شَطَطًا ۝
(١٥) هَٰؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً ۖ لَوْلَا يَأْتُونَ
عَلَيْهِمْ بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ ۖ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ
عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۝
(١٦) وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأْوُوا
إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ
لَكُمْ مِنْ أَمْرِكُمْ مِرْفَقًا ۝

ترجمہ

(١٣) ہم تجھ سے ان کا صحیح واقعہ بیان کرتے ہیں۔ وہ ایسے جوانمرد تھے کہ جو
اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے اور ہم نے انہیں مزید ہدایت فرمائی۔

(١٤) ہم نے ان کے دل مضبوط کیے جبکہ انہوں نے قیام کیا اور کہا؛ ہمارا رب
آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے۔ ہم اس کے علاوہ ہرگز کسی کی پرستش نہیں
کریں گے۔ اگر ہم ایسی بات کریں تو ہم نے بیہودہ بات کی۔

Marfat.com

(۱۵) ہماری اس قوم نے اس کی بجائے اوروں کو معبود بنا رکھا ہے۔ یہ لوگ ان معبودوں کے لیے کوئی واضح دلیل کیوں پیش نہیں کرتے۔ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوسکتا ہے کہ جو خدا پر جھوٹ باندھے۔

(۱۶) اور جس وقت ان لوگوں سے اور ان سے کہ اللہ کی بجائے جن کی یہ پرستش کرتے ہیں، تم کنارہ کشی اختیار کرلو تو غار میں جا پناہ لو کہ تمہارا رب تم پر اپنی رحمت (کا سایہ) کرے گا اور تمہارے لیے آسائش و نجات کی راہ کھول دے گا۔

تفسیر

داستانِ اصحابِ کہف کی تفصیل

جیسا کہ ہم نے کہا ہے اجمالی طور پر واقعہ بیان کرنے کے بعد چودہ آیتوں میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ گفتگو کا آغاز یوں کیا گیا ہے: ان کی داستان، جیسا کہ ہے، ہم تجھ سے بیان کرتے ہیں (نحن نقص علیك نبأھم بالحق)۔ ہم اس طرح سے واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ہر قسم کی فضول بات، بے بنیاد چیزوں اور غلط باتوں سے پاک ہوگا۔

وہ چند جوانمرد تھے کہ جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت اور بڑھا دی تھی (انھم فتیۃ اٰمنوا بربھم وزدناھم ھدی)۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں "فتیہ"، "فتیٰ" کی جمع ہے کہ جو نوخیز و سرشار جوان کے معنی میں ہے لیکن چونکہ جوانی میں انسان کا بدن قوی ہوتا ہے اس کے جذبات میں جوش و خروش ہوتا ہے۔ روحانی اعتبار سے دل نورِ حق قبول کرنے اور محبت، سخاوت اور عفو و درگزر کے جذبوں کے لیے زیادہ آمادہ ہوتا ہے لہٰذا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ "فتیٰ" اور "فتوت" اگر بڑی عمر والوں کے لیے بولا جائے تو مجموعی طور پر ان صفات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے لفظ "جوانمردی" اور "فتوت"۔ فارسی زبان میں بھی انہیں معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

آیاتِ قرآن سے اجمالی طور پر اور تاریخ سے تفصیلی طور پر یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ اصحابِ کہف جس دور اور ماحول میں رہتے تھے اس میں کفر و بت پرستی کا دور دورہ تھا۔ ایک ظالم حکومت کہ جو عام طور پر شرک، کفر، جہالت، غارت گری اور ظلم کی محافظ تھی لوگوں کے سروں پر مسلط تھی۔ لیکن یہ جوانمرد کہ جو ہوش و

Marfat.com

صداقت کے حامل تھے آخر کار اس دین کی خرابی کو جان گئے۔ انہوں نے اس کے خلاف قیام کا مصمم ارادہ کر لیا اور فیصلہ کیا کہ اگر اس دین کے خاتمے کی طاقت نہ ہوئی تو ہجرت کر جائیں گے۔ اسی لیے گزشتہ بحث کے بعد قرآن کہتا ہے: جب انہوں نے قیام کیا اور کہا کہ ہمارا رب آسمان و زمین کا پروردگار ہے، ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا (و ربطنا علیٰ قلوبھم اذ قاموا فقالوا ربنا رب السماوات والارض)۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس کے علاوہ کسی معبود کی ہرگز پرستش نہیں کریں گے (لن ندعوا من دونہ الٰھًا)۔ اگر ہم ایسی بات کریں اور اس کے علاوہ کسی کو معبود سمجھیں تو ہم نے بے ہودہ اور حق سے دُور بات کہی (لقد قلنا اذًا شططًا)۔

"ربطنا علیٰ قلوبھم" سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان کے دل میں توحید کی فکر پیدا ہوئی لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ خدا نے ان کے دلوں کو ڈھارس دی اور انہیں یہ طاقت بخشی کہ وہ اٹھ کھڑے ہوں اور علی الاعلان صدائے توحید بلند کریں۔

کیا انہوں نے یہ اعلان سب سے پہلے اس دَور کے ظالم بادشاہ دقیانوس کے سامنے کیا یا عام لوگوں کے سامنے یا دونوں کے سامنے یا آپس میں ایک دوسرے کے سامنے؟ یہ بات صحیح طور پر واضح نہیں ہے لیکن "قاموا" کی تعبیر کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے یہ اعلان ظالم بادشاہ کے سامنے کیا۔

"شطط" (بروزن "وسط") حد سے نکل جانے اور بہت دور چلے جانے کے معنی میں ہے۔ لہٰذا وہ باتیں کہ جو حق سے بہت دور ہوں انہیں "شطط" کہا جاتا ہے اور یہ جو بڑے دریاؤں کے ساحل کو "شط" کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پانی سے دُور اور بلند ہوتا ہے۔

ان باایمان جوانمردوں نے واقعاً توحید کے اثبات اور "الٰھہ" کی نفی کے لیے واضح دلیل کا سہارا لیا اور وہ یہ کہ ہم واضح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ آسمان و زمین کا کوئی مالک اور پروردگار ہے کہ وجود نظام خلقت جس کے وجود کی دلیل ہے اور ہم بھی اس عالم ہستی کا ایک حصہ ہیں لہٰذا ہمارا پروردگار بھی وہی آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے۔

اس کے بعد وہ ایک اور دلیل سے متوسل ہوئے اور وہ یہ کہ "ہماری اس قوم نے خدا کے علاوہ معبود بنا رکھے ہیں" (ھٰؤلاء قومنا اتخذوا من دونہ اٰلھة)۔ تو کیا دلیل و برہان کے بغیر بھی اعتقاد رکھا جا سکتا ہے" وہ ان کی الوہیت کے بارے میں کوئی واضح دلیل پیش کیوں نہیں کرتے (لولا یأتون علیھم بسلطان بیّن)۔ کیا تصور، خیال یا اندھی تقلید کی بنا پر یہ ایسا عقیدہ اختیار کیا جا سکتا ہے؟ یہ کیسا کھلا ظلم اور عظیم انحراف ہے؟ "اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے کہ جو خدا پر جھوٹ باندھے (فمن اظلم ممن افترٰی علی اللّٰہ کذبًا)۔

یہ افترا اپنے اوپر بھی ظلم ہے اور معاشرے پر بھی۔ اپنے اوپر اس طرح کہ وہ اپنے آپ کو اس طرح

Marfat.com

بدبختی اور تباہی کے سپرد کر دیتا ہے اور معاشرے پر اس طرح کہ یہی عقیدہ وہ اس میں پیش کرتا ہے اور اسے بھی انحراف کی طرف کھینچتا ہے اور یہ ساحت قدس پروردگار میں بھی ظلم ہے اور اس کے مقام بزرگ کی اہانت ہے۔

ان توحید پرست جواں مردوں نے بہت کوشش کی کہ لوگوں کے دلوں سے شرک کا زنگ اتر جائے اور ان کے دلوں میں توحید کی کونپل پھوٹ پڑے لیکن وہاں تو بتوں اور بُت پرستی کا ایسا شور تھا اور ظالم بادشاہ کے ظلم و بے داد کا ایسا خوف تھا کہ گویا سانس مخلوقِ خدا کے سینے میں گھٹ کے رہ گئی تھی اور نغمۂ توحید ان کے حلق میں ہی اٹک کر رہ گیا تھا۔

لہٰذا انہوں نے مجبوراً اپنی نجات کے لیے اور بہتر ماحول کی تلاش کے لیے ہجرت کا عزم کیا۔ لہٰذا باہمی مشورے ہونے لگے کہ کہاں جائیں، کس طرف کو کوچ کریں۔ آپس میں کہنے لگے: "جب اس بت پرست قوم سے کنارہ کشی اختیار کر لو اور خدا کو چھوڑ کر جنہیں یہ پُوجتے ہیں ان سے الگ ہو جاؤ اور اپنا حساب کتاب ان سے جدا کر لو تو غار میں جا پناہ لو" (واذ اعتزلتموھم وما یعبدون الا اللہ فأوا الی الکھف) تاکہ تمہارا پروردگار تم پر اپنی رحمت کا سایہ کر دے اور اس مشکل سے نکال کر تمہیں نجات کی راہ پر ڈال دے (ینشر لکم ربکم من رحمتہ ویھیئ لکم من امرکم مرفقًا)۔

"یھیئ" "تھیہ" کے مادہ سے تیار کرنے کے معنی میں ہے۔

اور "مرفق" اس چیز کو کہتے ہیں جو آرام و راحت اور مہربانی کا ذریعہ بنے۔ لہٰذا "یھیئ لکم من امرکم مرفقا" کا معنی ہے "خدا تمہارے لیے راحت و آرام کا ذریعہ فراہم کر دے"۔

بعید نہیں کہ "ینشر رحمۃ" گزشتہ جملے میں اللہ کے الطافِ معنوی کی طرف اشارہ ہو جبکہ دوسرا جملہ جسمانی و مادی نجات و آرام کی طرف اشارہ ہو۔

چند اہم نکات

۱۔ ایمان اور جوانمردی کا رشتہ: توحید پرستی اور اعلیٰ انسانی صفات ہمیشہ ساتھ ساتھ ہوتی ہیں۔ توحید پرستی، اعلیٰ انسانی صفات کے لیے سرچشمہ کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ ایک دوسرے کے لیے باہمی تاثیر رکھتی ہیں۔ اسی بناء پر اصحابِ کہف کی داستان میں ہے:

وہ ایسے جوانمرد تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے کہا ہے:

رأس الفتوۃ الایمان

جوانمردی کا سرچشمہ ایمان ہے۔

Marfat.com

بعض دیگر نے کہا ہے :

الفتوة بذل الندی وکف الاذی و ترک الشکوی

جوانمردی — عطا و سخاوت ، دوسروں کو اذیت پہنچانے سے احتراز اور مشکلات میں شکایت نہ کرنے کا نام ہے ۔

بعض دیگر نے "فتوت" کی تفسیر یوں کی ہے :

ھی اجتناب المحارم واستعمال المکارم

جوانمردی نام ہے گناہوں سے پرہیز کا اور انسانی فضائل و مکارم کو بروئے کار لانے کا ۔

۲ - ایمان اور امدادِ الٰہی : مندرجہ بالا آیات میں متعدد مواقع پر یہ حقیقت بڑی صراحت سے ظاہر ہوتی ہے کہ اگر انسان پہلا قدم راہِ خدا میں اٹھالے اور اس کے لیے قیام کرے تو خدا کی کمک اور امدادِ الٰہی اس کی طرف لپکتی ہے ۔

ایک مقام پر ہے کہ " وہ ایسے جوانمرد تھے کہ جو ایمان لائے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا ۔"

ایک اور مقام پر ہے : " ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کیا اور انہیں توانائی بخشی ۔"

اور آیات کے آخر میں بھی ہے کہ وہ رحمتِ الٰہی کے سایہ فگن ہونے اور راہِ نجات پانے کے انتظار میں تھے ۔

قرآن کی دیگر آیات سے بھی اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے ۔ مثلاً :

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا

جو لوگ ہماری راہ میں کوشاں ہوں ہم انہیں اپنے راستوں کی طرف راہنمائی کرتے ہیں

(عنکبوت - آخری آیت)

نیز سورہ محمدؐ کی آیت ۱۷ میں ہے :

وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی

جو راہِ ہدایت پر گامزن ہوئے اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا ۔

ہم جانتے ہیں کہ راہِ حق میں بہت دشواریاں اور رکاوٹیں ہیں اور لطفِ خداوندی شاملِ حال نہ ہو تو مقصد تک پہنچنا بہت ہی مشکل کام ہے ۔

ہم یہ بات بھی جانتے ہیں کہ لطفِ خداوندی اپنے حق طلب اور حق جُو بندے کو اس راہ میں ہرگز تنہا نہیں چھوڑتا ۔

۳ - "غار" کے نام کی ایک پناہ گاہ : "الکھف" میں الف اور لام شاید اس طرف اشارہ ہو کر

Marfat.com

انہوں نے کسی دُور علاقے میں پہلے سے ایک غار کے بارے میں طے کر رکھا تھا کہ اگر ان کی تبلیغات توحید کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو پھر وہ اس آلودہ اور تاریک ماحول سے نجات کیلئے اس میں پناہ لیں گے۔

"کہف" ایک معنی خیز لفظ ہے۔ اس سے انسان کی بالکل ابتدائی طرز زندگی کی طرف ذہن چلا جاتا ہے۔ وہ ماحول کہ جب راتیں تاریک اور سرد تھیں۔ روشنی سے محروم انسان جانکاہ دَرّوں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ زندگی جس میں مادی آسائشوں کا کوئی پتہ نہ تھا۔ جب نرم بستر تھے نہ خوشحالی۔

اب جب اس طرف توجہ کریں کہ جیسا تاریخ میں منقول ہے اصحابِ کہف اس دَور میں بادشاہ کے وزیر اور بہت بڑے اہل منصب تھے۔ انہوں نے بادشاہ اور اس کے مذہب کے خلاف قیام کیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ناز و نعمت سے بھری اس زندگی کو چھوڑنا اور اس پر غار نشینی کو ترجیح دینا کس قدر عزم، حوصلے، دلیری اور جانثاری کا غماز ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی رُوح کتنی عظیم تھی۔

یہ غار تاریک، سرد اور خاموش ضرور تھی اور اس میں موذی جانوروں کا خطرہ بھی تھا لیکن یہاں نور وصفا اور توحید و معنویت کی ایک دنیا آباد تھی۔

رحمتِ الٰہی کے نور کی لکیروں نے اس غار کی دیواروں پر گویا نقش و نگار کر دیا تھا اور لطفِ الٰہی کے آثار اس میں موجزن تھے۔ اس میں طرح طرح کے مضحکہ خیز بُت نہیں تھے اور ظالم بادشاہ کا ہاتھ وہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کی فضا نے جہل و جرم کے دم گھٹنے والے ماحول سے نجات عطا کر دی تھی اور یہاں انسانی فکر پر کوئی پابندی نہ تھی۔ فکر آزادی اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ موجود تھی۔

جی ہاں! ان خدا پرست جوانمردوں نے اس دنیا کو ترک کر دیا کہ جو اپنی وسعت کے باوجود ایک تکلیف دہ زندان کی مانند تھی اور اُس غار کو انتخاب کر لیا کہ جو اپنی تنگی و تاریکی کے باوجود وسیع تھی۔ بالکل پاکباز یوسفؑ کی طرح کہ جنہوں نے عزیزِ مصر کی خوبصورت بیوی کے شدید اصرار کے باوجود اس کی سرکش ہوس کے سامنے سر نہ جھکایا اور تاریک وحشتناک قید خانے میں جانا قبول کر لیا۔ اللہ نے ان کی استقامت میں اضافہ کر دیا اور آخر کار انہوں نے بارگاہِ خداوندی میں یہ حیران کن جملہ کہا:

رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ کَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ

پروردگارا! زندان اپنی جانکاہ تنگی و تاریکی کے باوجود مجھے اس گناہ سے زیادہ محبوب ہے کہ جس کی طرف یہ عورتیں مجھے دعوت دیتی ہیں اور اگر تُو ان کے وسوسوں کو مجھ سے دفع نہ کرے تو مَیں ان کے دام میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ (یوسف - ۳۳)

Marfat.com

(۱۷) وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ
الْيَمِيْنِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ
فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ
وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۝
(۱۸) وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ
وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ؕ لَوِاطَّلَعْتَ
عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ۝

ترجمہ

(۱۷) جب سورج نکلتا ہے تو تُو دیکھے گا کہ ان کی (غار کے) دائیں طرف جھک کے نکلتا ہے اور وقتِ غروب بائیں جانب کو اور وہ غار کے اندر ایک وسیع جگہ پر موجود ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ جس شخص کی ہدایت اللہ کرے درحقیقت وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ بھٹکا دے تو پھر تجھے اس کا کوئی سرپرست راہنما نہیں ملے گا۔

(۱۸) (اور اگر تو انہیں دیکھتا تو) سمجھتا کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ نیند میں مستغرق تھے اور ہم انہیں دائیں بائیں کروٹ بدلواتے تھے (تاکہ ان کا جسم صحیح و سالم رہے) اور اُن کے کُتّے نے غار کے دہانے پر اپنے اگلے پاؤں پھیلا رکھے تھے (اور نگہبانی کر رہا تھا) اور تُو اگر انہیں دیکھتا تو بھاگ کھڑا ہوتا اور سرتاپا وحشت زدہ ہو جاتا۔

Marfat.com

تفسیر

اصحابِ کہف کا اہم مقام

ان دو آیات میں قرآن غار میں اصحابِ کہف کی عجیب وغریب زندگی کی کچھ تفصیلات بیان کر رہا ہے۔ ان کی زندگی کی ایسی منظر کشی کی گئی ہے کہ گویا کوئی شخص غار کے سامنے بیٹھا ہے اور غار میں سوئے ہوئے افراد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

چھ نشانیاں اور خصوصیات

ان دو آیتوں میں غار اور اصحابِ کہف کی چھ نشانیاں اور خصوصیات بیان کی گئی ہیں:

۱۔ غار کا دہانہ شمال کی طرف ہے اور غار چونکہ زمین کے شمالی نصف کرہ میں واقع تھی لہٰذا سورج کی روشنی مستقیم اس میں نہیں پڑتی تھی۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: اگر تُو وقتِ طلوع سورج کو دیکھتا تو وہ غار کی دائیں جانب جُھک کے گزرتا ہے اور غروب کے وقت بائیں جانب (وتری الشمس اذا طلعت تزاور عن کھفھم ذات الیمین واذا غربت تقرضھم ذات الشمال)۔

اس طرح سے ان پر سورج کی براہِ راست روشنی نہیں پڑتی تھی۔ اگر پڑتی رہتی تو ہو سکتا ہے کہ ان کے جسم بوسیدہ ہو جاتے۔

"تزاور" کی تعبیر کہ جو جھکنے کے معنی میں ہے، اس میں یہ نکتہ پنہاں ہے کہ گویا سورج اس بات پر مامور تھا کہ غار کی دائیں سمت سے گزرے۔ اسی طرح "تقرض" کی تعبیر کاٹنے کے معنی میں ہے، اس میں بھی ماموریت کا مفہوم موجود ہے۔ اس سے قطع نظر "تزاور"، "زیارت" کے مادہ سے ہے۔ اس میں آغاز کی طرف اشارہ بھی موجود ہے کہ جو طلوعِ آفتاب کا مفہوم دیتا ہے اور "تقرض" قطع کرنے اور ختم کرنے کے معنی میں ہونے کے باعث غروب کا مفہوم بھی دیتا ہے۔

غار کا دہانہ شمال کی طرف ہونے کی وجہ سے اس میں اچھی اور لطیف ہَوائیں آتی تھیں کیونکہ یہ ہَوائیں عموماً شمال کی جانب سے چلتی ہیں۔ لہٰذا تازہ ہَوا آسانی سے غار میں داخل ہو جاتی اور ایک تازگی قائم رکھتی۔

۲۔ وہ غار کی ایک وسیع جگہ میں تھے (وھم فی فجوۃ منہ)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ غار کے دہانے پر موجود نہ تھے کیونکہ وہ تو عموماً تنگ ہوتا ہے۔ وہ غار کے وسطی حصے میں تھے تاکہ دیکھنے والوں کی نظروں سے بھی اوجھل رہیں اور سورج کی براہِ راست چمک سے بھی۔

Marfat.com

یہاں قرآن سلسلہ گفتگو کو گویا رد کرتے ہوئے ایک معنوی نتیجہ بیان کرتا ہے کیونکہ اس ساری داستان کا ذکر اسی مقصد کے لیے کیا جارہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ جس شخص کو اللہ ہدایت دے وہی حقیقی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ بھٹکا دے اس کے لیے تجھے کوئی سرپرست و راہنما نہیں ملے گا (ذٰلک من اٰیات اللہ من یھد اللہ فھو المھتد ومن یضلل فلن تجد لہ ولیا مرشدا)۔

جی ہاں! جو لوگ راہ خدا میں قدم اٹھاتے ہیں اور اس کی راہ میں جہاد کے لیے نکل پڑتے ہیں ہر قدم پر انہیں اللہ کا لطف و کرم حاصل ہوتا ہے۔ یہ لطف و کرم کام کی بنیاد ہی میں میسر نہیں آتا بلکہ اس کی جزئیات میں بھی شامل حال رہتا ہے۔

۳۔ ان کی نیند عام نیند کی سی نہ تھی " اگر تُو انہیں دیکھتا تو خیال کرتا کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ گہری نیند میں سوئے ہوئے تھے (وتحسبھم ایقاظا وھم رقود)۔

یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ ان کی آنکھیں بالکل ایک بیدار شخص کی طرح پوری طرح کھلی تھیں۔ یہ استثنائی حالت شاید اس بنا پر تھی کہ موذی جانور قریب نہ آئیں کیونکہ وہ بیدار آدمی سے ڈرتے ہیں۔ یا اس کی وجہ یہ تھی کہ ماحول رعب انگیز رہے تاکہ کوئی انسان ان کے پاس جانے کی جرأت نہ کرے اور یہ صورتِ حال ان کے لیے ایک سپر کا کام دے۔

۴۔ اس بنا پر کہ سالہا سال سوئے رہنے کی وجہ سے ان کے جسم بوسیدہ نہ ہو جائیں " ہم انہیں دائیں بائیں کروٹیں بدلواتے رہتے تھے (ونقلبھم ذات الیمین وذات الشمال)۔ تاکہ ان کے بدن کا خون ایک ہی جگہ نہ ٹھہر جائے اور طویل عرصہ ایک طرف مرتکز ہونے کی وجہ سے ان کے اعصاب خراب نہ ہو جائیں۔

۵۔ اس دوران میں " کُتا کہ جو اُن کے ہمراہ تھا غار کے دہانے پر اپنے اگلے پاؤں پھیلائے ہوئے تھا اور پہرہ دے رہا تھا (وکلبھم باسط ذراعیہ بالوصید)۔

جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے " وصید " ایسے کمرے اور سٹور کے معنی میں ہے کہ جو پہاڑی علاقوں میں اموال و اسباب ذخیرہ کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ یہاں یہ لفظ غار کے دہانے کے معنی میں ہے۔

اس سے پہلے ابھی تک قرآنی آیات میں اصحاب کہف کے کتے کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن قرآن واقعات کے دوران میں بعض اوقات ایسی باتیں کر جاتا ہے کہ جن سے دوسرے مسائل بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں اصحابِ کہف کے کتے کا ذکر آیا ہے۔ یہاں سے ظاہر ہوا کہ ان کے ہمراہ ایک کتا بھی تھا جو ان کے ساتھ ساتھ رہتا تھا اور ان کی حفاظت کرتا تھا۔

Marfat.com

یہ کہ یہ کتا اُن کے ساتھ کہاں سے شامل ہُوا تھا، کیا ان کا شکاری کتا تھا یا اُس چرواہے کا کُتا تھا کہ جس سے ان کی راستے میں ملاقات ہوئی تھی اور جب چرواہے نے انہیں پہچان لیا تھا تو اس نے اپنے جانور آبادی کی طرف روانہ کر دیئے تھے اور خود ان پاکباز لوگوں کے ساتھ ہو لیا تھا کیونکہ وہ ایک حق جُو اور دیدارِ الٰہی کا طالب انسان تھا۔ اس وقت کتا ان سے جدا نہ ہُوا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔

کیا اس بات کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ تمام عاشقانِ حق اس تک رسائی کے لیے اس کے راستے میں قدم رکھ سکتے ہیں اور کوئے یار کے دروازے کسی کے لیے بند نہیں ہیں۔ ظالم بادشاہ کے تائب ہونے والے وزیروں سے لے کر چرواہے تک بلکہ اس کے کتے تک کے لیے بارگاہ الٰہی کے دروازے کھلے ہیں۔

کیا ایسا نہیں ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ :

زمین و آسمان کے تمام ذرے، سارے درخت اور سب چلنے پھرنے والے ذکر الٰہی میں مگن ہیں، سب کے سر میں اُس کے عشق کا سودا سمایا ہے اور سب دلوں میں اس کی محبت جلوہ گر ہے۔ (بنی اسرائیل - ۴۴)

۶۔ غار میں اصحابِ کہف کا منظر ایسا رعب انگیز تھا کہ اگر تو انہیں جھانک کے دیکھ لیتا تو بھاگ کھڑا ہوتا اور تیرا وجود سرتاپا خوفزدہ ہو جاتا (لو اطلعت علیهم لولیت منهم فرارًا ولملئت منهم رعبًا)۔

یہ ایک ہی موقع نہیں کہ خدا تعالیٰ نے رعب اور خوف کو اپنے باایمان بندوں کے لیے ڈھال بنا دیا۔ سورہ آلِ عمران کی آیہ ۱۵۱ میں بھی ہے :

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ

ہم جلد ہی کافروں کے دلوں پر رعب ڈال دیں گے [۱]

دعائے ندبہ میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے :

ثم نصرته بالرعب

خداوندا! پھر تُو نے اپنے پیغمبر کی مدد اس طرح سے کی کہ اُس کے دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔

لیکن یہ رعب کہ جو اصحابِ کہف کو دیکھنے والے کو سرتاپا لرزا دیتا، ان کی جسمانی حالت کے باعث تھا یا یہ کہ پُراسرار روحانی طاقت تھی کہ جو اس سلسلے میں کام کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں آیاتِ قرآنی

---

[۱] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد سوم صـ۱۰۱ اور جلد ہفتم صـ۹۷ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

یں کوئی وضاحت نہیں ہے اگرچہ مفسرین نے کئی قسم کی بحثیں کی ہیں لیکن وہ کسی دلیل کی بنیاد پر نہیں ہیں اس لیے ہم ان سے صرف نظر کرتے ہیں۔

ضمناً " ولملئت منھم رعبًا " (تیرے وجود پر سرتاپا خوف چھا جاتا) درحقیقت " لولیت منھم فراراً " (اگر تُو انہیں دیکھتا تو بھاگ کھڑا ہوتا) کی علت ہے یعنی تُو اس لیے بھاگ اٹھتا کہ تُو وحشت زدہ ہو جاتا۔

بہرحال جب کسی چیز میں اللہ کا ارادہ شامل ہو جائے تو بڑی معمولی سی چیزوں سے بڑے بڑے نتیجے پیدا ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com

(۱۹) وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ○

(۲۰) اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ○

ترجمہ

(۱۹) اسی طرح ہم نے انہیں (نیند سے) اٹھا بٹھایا تاکہ وہ ایک دوسرے سے پوچھیں۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔ کتنی مدت سوئے ہو۔ انہوں نے کہا: ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصّہ (اور چونکہ انہیں اپنے سونے کی مدت ٹھیک طرح سے معلوم نہ تھی لہٰذا) کہنے لگے: تمہارا پروردگار بہتر جانتا ہے کہ تم کتنی مدت سوئے ہو۔ تمہارے پاس جو سکّہ ہے اب وہ دے کر کسی کو شہر کی طرف بھیجو تاکہ وہ دیکھے کہ سب سے پاکیزہ کھانا جہاں سے ملتا ہو وہاں سے وہ کھانے کے لیے کچھ لے آئے لیکن اُسے چاہیئے کہ بڑی احتیاط سے کام لے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کو تمہارے بارے میں کچھ بتا بیٹھے۔

(۲۰) کیونکہ اگر انہیں تمہارے بارے میں پتہ چل گیا تو وہ تمہیں سنگسار کر دیں گے

Marfat.com

یا اپنے دین کی طرف پھیر لے جائیں گے اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر تم کبھی فلاح کا منہ نہیں دیکھ پاؤ گے۔

تفسیر

ایک طویل نیند کے بعد بیداری

خدا نے چاہا تو آئندہ آیات کے ذیل میں ہم پڑھیں گے کہ اصحاب کہف کی نیند اتنی لمبی ہو گئی کہ وہ تین سو نو سال تک سوتے رہے اور اُن کی نیند موت سے بالکل ملتی جلتی تھی اور ان کی بیداری بھی قیامت کی مانند تھی۔ لہٰذا زیر بحث آیات میں قرآن کہتا ہے: اور ہم نے انہیں اسی طرح اٹھا کھڑا کیا (وکذٰلک بعثنٰھم)۔

یعنی اسی طرح کہ جیسے ہم اس پر قادر تھے کہ انہیں لمبی مدت تک سُلائے رکھتے انہیں پھر سے بیدار کرنے پر بھی قادر تھے۔

ہم نے انہیں نیند سے بیدار کر دیا" تاکہ وہ ایک دوسرے سے پوچھیں۔ ان میں سے ایک نے پوچھا، تمہارا کیا خیال ہے کتنی مدت سوئے ہو؟ (لیتساءلوا بینھم قال قائل منھم کم لبثتم)[1]

انہوں نے کہا: ایک دن یا دن کا کچھ حصہ (قالوا لبثنا یوماً او بعض یوم)۔

اس میں تردد شاید انہیں اس لیے ہوا کہ جیسے مفسرین نے کہا ہے کہ وہ جب غار میں آئے تھے تو دن کا ابتدائی حصہ تھا اور آکر وہ سو گئے تھے اور جب اٹھے تو دن کا آخری حصہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے انہوں نے سوچا کہ شاید ایک دن سو گئے ہیں اور جب انہوں نے سورج کی طرف دیکھا تو انہیں خیال آیا کہ شاید دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں۔

لیکن آخر کار چونکہ انہیں صحیح طرح سے معلوم نہ ہو سکا کہ کتنی دیر سوئے ہیں لہٰذا" کہنے لگے: تمہارا رب بہتر جانتا ہے کہ کتنی دیر سوئے ہو" (قالوا ربکم اعلم بما لبثتم)۔

بعض کا کہنا ہے کہ یہ بات ان میں سے بڑے نے کہی جس کا نام تملیخا تھا اور یہاں پر "قالوا" کہ جو جمع کا صیغہ ہے اس کا استعمال ایک معمول کی بات ہے۔

یہ بات انہوں نے شاید اس لیے کہی کہ ان کے چہرے مہرے سے، ناخنوں سے، بالوں سے اور

---

[1] "لیتساءلوا" میں جو لام ہے وہ اصطلاح میں لام عاقبت ہے نہ کہ لام علت۔ یعنی ان کے جاگنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی نیند کی مدت کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔

Marfat.com

لباس سے بالکل شک نہیں پڑتا تھا کہ وہ کوئی غیر معمولی طور پر نیند میں رہے ہیں۔

بہرحال انہیں بھوک اور پیاس کا احساس ہوا کیونکہ ان کے بدن میں جو غذا تھی وہ تو تمام ہو چکی تھی۔ لہٰذا پہلے پہلے انہوں نے یہی تجویز کیا کہ "تمہارے پاس چاندی کا جو سکہ ہے اپنے میں سے ایک کو دو تاکہ وہ جائے اور دیکھے کہ کس کے پاس اچھی پاکیزہ غذا ہے اور جتنی تمہیں چاہیئے تمہارے لیے لے آئے (فابعثوا احدکم بورقکم ھٰذہ الی المدینۃ فلینظر ایھا ازکی طعاما فلیأتکم برزق منہ)۔

"لیکن بہت احتیاط سے جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کو تمہارے بارے میں کچھ بتا بیٹھے" (ولیتلطف ولا یشعرن بکم احدا)۔

"کیونکہ اگر انہیں تمہارے بارے میں پتہ چل گیا اور انہوں نے تمہیں آلیا تو سنگسار کر دیں گے یا پھر تمہیں اپنے دین (بُت پرستی) کی طرف موڑ لے جائیں گے" (انھم ان یظھروا علیکم یرجموکم او یعیدوکم فی ملتھم)۔

"اور اگر ایسا ہو گیا تو تم نجات اور فلاح کا منہ نہ دیکھ پاؤ گے" (ولن تفلحوا اذا ابدا)۔

چند اہم نکات

۱۔ پاکیزہ ترین غذا: یہ بات بہت جاذب نظر ہے کہ اس داستان میں ہم نے پڑھا ہے کہ اصحاب کہف جب بیدار ہوئے تو ظاہر ہے انہیں بہت بھوک لگ رہی تھی اور اس طویل مدت کے دوران میں ان کے جسم میں جو غذا تھی صرف ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے جسے کھانا لانے کے لیے بھیجا اسے نصیحت کی کہ ہر غذا نہ خرید لے بلکہ دیکھ بھال کر کھانا بیچنے والوں کے پاس سے جو سب سے زیادہ پاکیزہ ہو اسے لے کر آئے۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے ذبح شدہ جانور کی طرف اشارہ تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس شہر میں ایسے لوگ رہتے ہیں کہ جو نجس و ناپاک اور کبھی مردہ کا گوشت بیچتے ہیں یا بعض لوگوں کا کام ہی حرام کا تھا لہٰذا انہوں نے نصیحت کی ایسے لوگوں سے کھانا نہ خریدنا۔

لیکن ظاہراً اس جملے کا وسیع مفہوم ہے کہ جس میں ہر قسم کی ظاہری اور باطنی پاکیزگی شامل ہے اور یہ دراصل راہ حق کے تمام راہیوں کے لیے نصیحت ہے کہ وہ نہ صرف روحانی غذا کے بارے میں فکر کریں بلکہ اپنی جسمانی غذا کی پاکیزگی کا بھی خیال رکھیں کہ وہ ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہو یہاں تک کہ زندگی کے مشکل ترین لمحات میں بھی اس بات کو فراموش نہ کریں۔

دورِ حاضر میں دنیا کے بہت سے لوگ اس حکم کی اہمیت سے کسی حد تک آگاہ ہو گئے ہیں اور کوشش

Marfat.com

کرتے ہیں کہ اُن کی غذا ہر قسم کی ظاہری آلودگی سے پاک ہو۔ وہ کھانے کی چیزوں کو ڈھک کر گندے ہاتھوں کی پہنچ سے دُور اور گرد و غبار سے بچا کر رکھتے ہیں۔ یہ کام بہت اچھا ہے لیکن اس پر قناعت نہیں کرنا چاہیئے بلکہ یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ غذا حرام نہ ہو، سود، ملاوٹ، دھوکا بازی اور ہر قسم کی باطنی آلودگی سے بھی پاک ہو۔

اسلامی روایات میں قبولیت دعا اور پاکیزگیٔ دل کے لیے حلال غذا کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا:

احب ان یستجاب دعائی

مَیں چاہتا ہوں میری دعا قبول ہو جائے۔

فرمایا: طهر مأكلك ولا تدخل بطنك الحرام

اپنی غذا کو پاک رکھو اور دھیان رکھو کہ تمہارے بطن میں حرام غذا داخل نہ ہونے پائے۔[1]

۲۔ اصلاح کنندہ تقیہ: مندرجہ بالا آیات کے الفاظ سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ کہف اس بات پر زور دیتے تھے کہ اس ماحول میں کسی کو ان کی پناہ گاہ کا پتہ نہ چلے کہ مبادا وہ لوگ انہیں بُت پرستی کا مذہب اختیار کرنے پر مجبور کریں یا پھر انہیں بُری طرح قتل کریں اور سنگسار کر دیں۔

وہ چاہتے تھے کہ ان کی کسی کو خبر نہ ہو تاکہ آئندہ کی جدوجہد کے لیے یا کم از کم اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے اپنی طاقت بچا کر رکھیں۔ یہ ایک قسم کا اصلاحی تقیہ ہے کیونکہ تقیہ کا مطلب ہے اپنی قوتوں کو فضول صرف ہونے سے بچانا اور اس کے لیے اپنے آپ کو چھپانا یا اپنے عقیدے کو چھپا کر اپنے آپ کو بچانا تاکہ ضرورت کے وقت مؤثر طریقے سے جدوجہد کی جا سکے۔

واضح ہے کہ جس مقام پر عقیدہ چھپانے سے ہدف اور پروگرام کو نقصان پہنچتا ہو وہاں تقیہ ممنوع ہے وہاں سب کچھ ظاہر کرنا چاہیئے۔

ولو بلغ ما بلغ

پھر جو کچھ ہوتا ہے ہونے دو۔

۳۔ قرآن کا مرکز "لطف" ہے: مشہور یہ ہے کہ الفاظ کی گنتی کے لحاظ سے لفظ "ولیتلطف" عین قرآن کا درمیان ہے۔ یہ ایک لطفِ خاص ہے اور بہت لطیف معنی کا حامل ہے کیونکہ

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۴ ابواب دعا، باب ۶۷ حدیث ۴۔ مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۶ کی تفسیر کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

یہ "لطف" اور "لطافت" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ یہاں یہ لفظ احتیاط اور باریک بینی سے کام لینے کے معنی میں لیا گیا ہے۔ یعنی غذا لانے کے لیے جانے والا شخص اس طرح سے جائے کہ کسی شخص کو ان کے بارے میں کوئی خبر نہ ہو۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہاں مراد غذا خریدنے میں لطافت سے کام لینا ہے یعنی معاملہ کرنے میں سخت گیری نہ کرے اور جھگڑا کھڑا نہ کر دے نیز بہترین چیز انتخاب کرے اور یہ بھی ایک لطف ہے کہ وسطِ قرآن کے لفظ میں لطف و تلطف کا مفہوم پوشیدہ ہے[1]

---

[1] اس وقت ہم پروردگار کی عظیم توفیق سے پورے دس سال کے بعد قرآن مجید کی تفسیر کے نصف حصہ تک پہنچ گئے ہیں۔ اس پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتے ہیں کہ اس دوران میں اگرچہ ہم اور ہمارے ملک نہایت سخت حالات اور طوفان گزرے لیکن اس علاقے میں نورِ اسلام بجھا نہیں بلکہ اس کا دامن وسیع ہوا ہے نیز اللہ کا شکر ہے کہ اس تفسیر کے لکھنے میں کوئی وقفہ پیش نہیں آیا ہے ۔۔ لہٰذا ہمیں امید ہے کہ باقی ماندہ تفسیر (انشاء اللہ) زیادہ سرعت کے ساتھ تکمیل کے مراحل طے کرے گی۔

یہ ٹھیک ہے کہ دس سال تھوڑی مدت نہیں ہوتے لیکن اب تک جو کام ہم نے اس تفسیر کے سلسلے میں انجام دیا ہے وہ بھی الحمد للہ کوئی چھوٹا سا نہیں۔

Marfat.com

(۲۱) وَكَذٰلِكَ اَعۡثَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ لِيَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ
وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيۡبَ فِيۡهَا ۚ اِذۡ يَتَنَازَعُوۡنَ بَيۡنَهُمۡ
اَمۡرَهُمۡ فَقَالُوا ابۡنُوۡا عَلَيۡهِمۡ بُنۡيَانًا ؕ رَبُّهُمۡ اَعۡلَمُ بِهِمۡ ؕ
قَالَ الَّذِيۡنَ غَلَبُوۡا عَلٰٓى اَمۡرِهِمۡ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيۡهِمۡ مَّسۡجِدًا ○
(۲۲) سَيَقُوۡلُوۡنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمۡ كَلۡبُهُمۡ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ خَمۡسَةٌ
سَادِسُهُمۡ كَلۡبُهُمۡ رَجۡمًا ۢ بِالۡغَيۡبِ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ سَبۡعَةٌ وَّثَامِنُهُمۡ
كَلۡبُهُمۡ ؕ قُلۡ رَّبِّىۡۤ اَعۡلَمُ بِعِدَّتِهِمۡ مَّا يَعۡلَمُهُمۡ اِلَّا قَلِيۡلٌ ۙ
فَلَا تُمَارِ فِيۡهِمۡ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۖ وَّلَا تَسۡتَفۡتِ فِيۡهِمۡ
مِّنۡهُمۡ اَحَدًا ○
(۲۳) وَلَا تَقُوۡلَنَّ لِشَایۡءٍ اِنِّىۡ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ○
(۲۴) اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۚ وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيۡتَ وَقُلۡ عَسٰٓى
اَنۡ يَّهۡدِيَنِ رَبِّىۡ لِاَقۡرَبَ مِنۡ هٰذَا رَشَدًا ○

ترجمہ

(۲۱) اور ہم نے اس طرح سے لوگوں کو اُن کے حال سے مطلع کیا تاکہ وہ جان لیں کہ (قیامت کا) اللہ کا وعدہ حق ہے اور دنیا کے ختم ہو جانے اور قیامت کے برپا ہو جانے میں کوئی شک نہیں۔ اس وقت ان میں اس بارے میں نزاع پیدا ہو گیا۔ کچھ نے کہا کہ ان پر ایک عمارت بنا دی جائے (تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے

Marfat.com

نظروں سے اوجھل ہو جائیں اور ان کے بارے میں باتیں نہ کرو کہ) ان کا رب ان کی کیفیت سے بہتر آگاہ ہے (لیکن جنہیں اس راز سے آگہی نصیب ہوئی اور جنہوں نے اس واقعے کو قیامت کے لیے ایک دلیل سمجھا) ہم ان کے (مدفن کے) پاس ایک مسجد بنائیں گے (تاکہ انہیں بھلایا نہ جا سکے)۔

(۲۲) بعض کہتے ہیں کہ وہ تین افراد تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ پانچ افراد تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ یہ سب بلا دلیل باتیں ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ سات افراد تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ کہہ دو کہ میرا رب ان کی تعداد سے بہتر آگاہ ہے۔ چند افراد کے سوا ان کی تعداد کو کوئی نہیں جانتا۔ لہٰذا ان کے بارے میں بغیر دلیل کے بات نہ کر اور ان کے بارے میں کسی سے سوال نہ کر۔

(۲۳) اور ہرگز یہ نہ کہہ کہ میں کل فلاں کام انجام دوں گا۔

(۲۴) مگر یہ کہ خدا چاہے اور اگر تو بھول جائے تو (اس کی تلافی کرتے ہوئے) اپنے رب کو یاد کر اور کہہ: مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے اس سے زیادہ واضح راستے کی ہدایت کرے گا۔

تفسیر

اصحابِ کہف کے واقعے کا اختتام

جلد ہی لوگوں میں ان عظیم جوانمردوں کی ہجرت کی داستان پھیل گئی۔ ظالم بادشاہ سیخ پا ہو گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی ہجرت یا بھاگ نکلنا لوگوں کی بیداری اور آگاہی کا سبب بن جائے۔ اُسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں وہ دُور یا نزدیک کے علاقے میں جا کر لوگوں کو دین توحید کی تبلیغ کرنے لگیں اور شرک و بت پرستی کے خلاف جدوجہد شروع کر دیں۔ لہٰذا اس نے خاص افراد کو مامور کیا کہ انہیں ہر جگہ تلاش کیا جائے اور ان کا کچھ اتہ پتہ معلوم

Marfat.com

ہو تو گرفتاری کے لیے تعاقب کیا جائے اور انہیں سزا دی جائے۔
لیکن انہوں نے جتنی بھی کوشش کی کچھ نہ پایا اور یہ امر خود علاقے کے لوگوں کے لیے ایک معمہ اور ان کے قلب و فکر کے لیے ایک خاص نقطہ بن گیا۔ نیز یہ امر کہ حکومت کے نہایت اہم چند اراکین نے ہر چیز کو ٹھوکر مار دی اور طرح طرح کے خطرات مول لے لیے شاید بعض لوگوں کی بیداری اور آگاہی کا سرچشمہ بن گیا۔
بہر حال ان افراد کی یہ حیران کن داستان ان کی تاریخ میں ثبت ہو گئی اور ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہونے لگی اور اسی طرح اس مسئلے کو صدیاں گزر گئیں۔
آیئے اب دیکھتے ہیں کہ اُس پر کیا گزری جو غذا لینے کے لیے آیا۔ وہ شہر میں داخل ہوا تو اُس کا منہ تعجب سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ شہر کی عمارتوں کی شکل و صورت تمام تبدیل ہو چکی تھی، سب چہرے ناشناس تھے، لباس نئے انداز کے تھے یہاں تک کہ لوگوں کی بول چال اور رسم و رواج بھی بدل چکے تھے۔ کل کے ویرانوں پر آج محل تھے اور جہاں پہلے محل تھے وہاں ویرانے ہی ویرانے تھے۔
شاید تھوڑی دیر کے لیے اس نے سوچا ہو کہ ابھی میں نیند میں ہوں اور یہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں سب خواب ہے۔ اُس نے اپنی آنکھوں کو مَلا۔ وہ سب چیزوں کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ کیسی حقیقت ہے کہ جس پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔
اب وہ سوچنے لگا کہ وہ غار میں ایک یا آدھا دن سوئے ہیں تو پھر یہ اتنی تبدیلیاں اتنی مدت میں کیسے ممکن ہیں؟
دوسری طرف اس کا چہرہ مہرہ اور حالت لوگوں کے لیے بھی عجیب اور غیر مانوس تھی۔ اس کا لباس، اس کی گفتگو اور اس کا چہرہ سب نیا معلوم ہوتا تھا شاید اسی وجہ سے کچھ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے پیچھے چل پڑے۔
اُس وقت لوگوں کا تعجب انتہا کو پہنچ گیا جب اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تاکہ اس کھانے کی قیمت ادا کرے جو اس نے خریدا تھا۔ دکاندار کی نگاہ سکے پر پڑی وہ تین سو سال سے زیادہ پرانے دَور کا تھا اور شاید اُس زمانے کے ظالم بادشاہ دقیانوس کا نام بھی اس پر کندہ تھا۔ جب اس نے وضاحت چاہی تو خریدار نے جواب میں کہا: میرے ہاتھ میں تو یہ سکّہ ابھی تازہ ہی آیا ہے۔
قرائن اور احوال سے لوگوں کو آہستہ آہستہ یقین ہو گیا کہ یہ شخص تو انہی افراد میں سے ہے جن کا ذکر ہم نے تین سو سال پہلے کی تاریخ میں پڑھا ہے اور بہت سی محفلوں میں ہم نے جن کی پُراسرار داستان سُنی ہے۔
خود اسے بھی احساس ہوا کہ وہ اور اس کے ساتھی کسی گہری اور طولانی نیند میں مستغرق رہے ہیں۔ اس بات کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں آن کی آن میں پھیل گئی۔
مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں ایک نیک اور خدا پرست بادشاہ حکومت کرتا تھا لیکن معادِ جسمانی

Marfat.com

اور موت کے بعد مُردوں کے جی اٹھنے کے مسئلہ پر یقین کرنا وہاں کے لوگوں کے لیے مشکل تھا۔ ان میں سے ایک گروہ کو اس بات پر یقین نہیں آتا تھا کہ انسان مرنے کے بعد پھر جی اٹھے گا لیکن اصحاب کہف کی نیند کا واقعہ معادِ جسمانی کے طرفداروں کے لیے ایک دنداں شکن دلیل بن گیا۔

اسی لیے زیرِ نظر پہلی آیت میں قرآن کہتا ہے: جیسے ہم نے انہیں سلا دیا تھا اسی طرح انہیں اس گہری اور طویل نیند سے بیدار کیا اور لوگوں کو اُن کے حال کی طرف متوجہ کیا تاکہ وہ جان لیں کہ قیامت کے بارے میں خدا کا وعدہ حق ہے (وکذٰلک اعثرنا علیھم لیعلموا ان وعد اللہ حق)۔

اور دنیا کے خاتمے اور قیامِ قیامت میں کوئی شک نہیں (وان الساعۃ لاریب فیھا)۔

کیونکہ صدیوں پر محیط یہ لمبی نیند موت سے غیر مشابہ نہیں ہے اور ان کا بیدار ہونا قبروں سے اٹھنے کی مانند ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سونا اور جاگنا کئی حوالوں سے مرنے اور پھر جی اٹھنے سے عجیب تر ہے کیونکہ وہ صدیوں سوئے رہے لیکن ان کا بدن بوسیدہ نہ ہوا جبکہ انہوں نے کچھ کھایا نہ پیا۔ تو پھر وہ اتنی لمبی مدت زندہ کس طرح رہے۔

کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ خدا ہر چیز اور ہر کام پر قادر ہے۔ ایسے منظر کی طرف نظر کی جائے تو موت کے بعد زندگی کا مسئلہ کوئی عجیب معلوم نہیں ہوتا بلکہ یقینی طور پر ممکن دکھائی دیتا ہے۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ جو شخص غذا لینے شہر میں آیا تھا اُس نے یہ صورت دیکھی تو جلدی سے غار کی طرف پلٹا اور اپنے دوستوں کو سارا حال سنایا، وہ سب کے سب گہرے تعجب میں ڈوب گئے۔ اب انہیں احساس ہوا کہ ان کے تمام بچے، بھائی اور دوست کوئی بھی باقی نہیں رہا اور ان کے احباب و انصار میں سے کوئی نہیں رہا۔ ایسے میں اُن کو یہ زندگی بہت سخت اور ناگوار لگی۔ لہٰذا انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ اس جہان سے ہماری آنکھیں بند ہو جائیں اور ہم جوارِ رحمتِ حق میں منتقل ہو جائیں۔

ایسا ہی ہوا۔ اس دنیا سے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے جسم غار میں پڑے تھے کہ لوگ ان کی تلاش کو نکلے۔

اس مقام پر معادِ جسمانی کے طرفداروں اور مخالفوں کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ مخالفین کی کوشش تھی کہ لوگ اصحابِ کہف کے سونے اور جاگنے کے مسئلہ کو جلد بھول جائیں لہٰذا انہوں نے تجویز پیش کی کہ غار کا دروازہ بند کر دیا جائے تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں (اذ یتنازعون بینھم امرھم فقالوا ابنوا علیھم بنیاناً)۔

وہ لوگوں کو خاموش ہونے کے لیے کہتے تھے کہ ان کے بارے میں زیادہ باتیں نہ کرو، ان کی داستان اسرار آمیز ہے "ان کا پروردگار ان کی کیفیت سے زیادہ آگاہ ہے" (ربھم اعلم بھم)۔ لہٰذا ان کا قصہ ان تک رہنے دو اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔

Marfat.com

جبکہ حقیقی مومن کہ جنہیں اس واقعے کی خبر ہوئی اور جو اسے قیامت کے حقیقی مفہوم کے اثبات کیلئے ایک زندہ دلیل سمجھتے تھے، ان کی کوشش تھی کہ یہ واقعہ ہرگز فراموش نہ ہونے پائے۔ لہٰذا "انہوں نے کہا: ہم ان کے مدفن کے پاس مسجد بناتے ہیں"، تاکہ لوگ انہیں اپنے دلوں سے ہرگز فراموش نہ کریں علاوہ ازیں ان کی ارواح پاک سے لوگ استمداد کریں (قال الذین غلبوا علی امرھم لنتخذن علیھم مسجدًا)۔

اس آیت کی تفسیر میں کئی اور احتمال بھی پیش کیے گئے ہیں۔ "چند اہم نکات" کے زیرِ عنوان ہم ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کریں گے۔

اگلی آیت میں ان چند اختلافات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو اصحاب کہف کے بارے میں لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک ان کی تعداد کے بارے میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا (سیقولون ثلاثۃ رابعھم کلبھم)۔

"بعض کہتے ہیں کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا (ویقولون خمسۃ سادسھم کلبھم)۔

یہ سب بلا دلیل باتیں ہیں اور اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہیں (رجمًا بالغیب)۔

"اور بعض کہتے ہیں کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا" (ویقولون سبعۃ وثامنھم کلبھم)۔

"کہہ دے: میرا رب ان کی تعداد بہتر جانتا ہے" (قل ربی اعلم بعدتھم)۔

"صرف تھوڑے سے لوگ ان کی تعداد جانتے ہیں" (ما یعلمھم الا قلیل)۔

قرآن نے ان جملوں میں اگرچہ صراحت سے ان کی تعداد بیان نہیں کی لیکن آیت میں موجود بعض اشاروں سے سمجھا جا سکتا ہے کہ تیسرا قول صحیح اور مطابق حقیقت ہے کیونکہ پہلے اور دوسرے قول کے بعد "رجمًا بالغیب" (اندھیرے میں تیر مارنا) آیا ہے کہ جو ان اقوال کے بے بنیاد ہونے کی طرف اشارہ ہے لیکن تیسرے قول کے بارے میں نہ صرف ایسی کوئی تعبیر نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: "کہہ دے: میرا رب ان کی تعداد سے بہتر طور پر آگاہ ہے" اور یہ بھی فرمایا گیا ہے "ان کی تعداد کو تھوڑے سے لوگ جانتے ہیں"۔ یہ جملے بھی اس تیسرے قول کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔

بہرحال آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: استدلالی اور منطقی گفتگو کے علاوہ ان کے بارے میں بحث نہ کر (فلا تمار فیھم الا مراءً ظاھرًا)۔

جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے "مراء" "مریۃ الناقۃ" (میں نے دودھ دوہنے کے لیے اونٹنی کا پستان ہاتھ میں پکڑا) سے لیا گیا ہے۔ بعدازاں کسی ایسی چیز کے بارے میں بحث کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا کہ جس میں شک ہو اور اکثر یہ لفظ باطل کی حمایت میں ہٹ دھرمی کی گفتگو کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن بنیادی طور پر یہ لفظ اس مفہوم کے لیے محدود نہیں ہے لیکن کسی بھی ایسی بات کے بارے میں بحث کے مفہوم میں آتا ہے کہ جس کے بارے میں شک ہو۔

Marfat.com

" ظاھرا " غالب، مسلط اور کامیاب کے معنی میں ہے۔
لہٰذا " فلا تمار فیھم الا مراء ظاھرا " کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے ساتھ اس طرح سے منطقی اور استدلالی گفتگو کر کہ تیری منطق کی برتری واضح ہو۔
اس آیت کی تفسیر میں بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ہٹ دھرم مخالفین سے علیحدگی میں بحث نہ کر کیونکہ اس طرح تو ان سے جو کچھ کہے گا وہ اس میں ردّ و بدل کریں گے لہٰذا اُن سے کھلم کھلا لوگوں کی موجودگی میں بات چیت کر تاکہ وہ حقیقت میں تحریف و انکار نہ کر سکیں۔
لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔
بہرحال اس گفتگو کا مفہوم یہ ہے کہ وحیِ خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے " تو ان کے ساتھ بات کر کیونکہ اس سلسلے میں محکم ترین دلیل یہی ہے لہٰذا جو لوگ بغیر دلیل کے اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں بات کرتے ہیں ان سے اس بارے میں سوال نہ کر (ولا تستفت فیھم منھم احدا)۔
اگلی آیت میں رسول اللہؐ کو ایک عمومی حکم دیا گیا ہے: کبھی نہ کہو کہ میں کل یہ کام کروں گا (ولا تقولن لشایٔ انی فاعل ذٰلک غدا)۔ "مگر یہ کہ خدا چاہے" (الا ان یشاء اللّٰہ)۔
یعنی آئندہ کی خبروں اور کاموں کے ارادے میں " انشاء اللہ " حتمی طور پر کہا کرو کیونکہ:
اولاً۔ ارادہ کرنے میں ہرگز تم مستقل نہیں کیونکہ خدا نہ چاہے تو کوئی شخص بھی کسی کام کی طاقت نہیں رکھتا لہٰذا یہ واضح کیا کرو کہ تمہاری قوت اس کی لایزال قوت سے ہے اور تمہاری طاقت اس کی قدرت سے وابستہ ہے۔ اس لیے لازمی طور پر " انشاء اللہ " (اگر خدا نے چاہا تو) کہا کرو۔
ثانیاً۔ ایسا انسان کہ جس کی طاقت محدود ہو اور راہ میں رکاوٹیں پیدا ہونے کا احتمال بھی ہو اس کیلئے صحیح نہیں ہے کہ وہ آئندہ کی کوئی یقینی اور قطعی خبر دے جبکہ بعض اوقات اچانک غیر متوقع رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ایسی باتوں کے ساتھ " انشاء اللہ " کہنا چاہیئے۔
زیر بحث آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے ایک اور احتمال ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ یہاں مراد یہ ہے کہ اس بات کی نفی کی جائے کہ انسان کو کاموں کی انجام دہی میں استقلال حاصل ہے۔ لہٰذا اس آیت کا مفہوم یہ ہے:
تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کل یہ کام کروں گا ــ مگر یہ کہ خدا چاہے۔
البتہ اس تفسیر کا لازمہ یہ ہے کہ اگر ہم " انشاء اللہ " کا اضافہ کر دیں تو گفتگو مکمل ہو جائے گی لیکن یہ جملے کا لازمہ ہے نہ کہ متن اور اصل جملے کا مفہوم ہے، جیسا کہ پہلی تفسیر میں کہا گیا ہے [1]

---

[1] توجہ رہے کہ پہلی تفسیر کی بناء پر " ان تقول " مقدر ماننا پڑے گا۔ تقدیر یوں ہوگی:
الا ان تقول انشاء اللّٰہ
لیکن دوسری تفسیر میں تقدیر کی ضرورت نہیں ہے۔

Marfat.com

زیر بحث آیات کے بارے میں ہم نے جو شانِ نزول نقل کی ہے وہ پہلی تفسیر کی تائید کرتی ہے کیونکہ رسول اللہؐ نے "انشاء اللہ" کہے بغیر اصحاب کہف سے متعلق سوال کرنے والوں کو جواب دیا تھا۔ اسی لیے ایک عرصے تک وحی الٰہی میں تاخیر ہوگئی تاکہ اس بارے میں آپؐ کو متوجہ کیا جائے اور آپؐ اس سلسلے میں سب کے لیے نمونہ بن جائیں ۔ [1]

اس جملے کے بعد قرآن کہتا ہے : اگر تُو بھول جائے تو پھر اپنے رب کو یاد کر (واذکر ربک اذا نسیت)۔

یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ آئندہ کے امور کے بارے میں بات کرتے ہوئے "انشاء اللہ" کہنا بھول جائے تو جس وقت یاد آئے فوراً تلافی کرو اور "انشاء اللہ" کہو۔ یہ کہنے سے گزشتہ کی تلافی ہو جائے گی۔ اور کہہ : مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے اس سے زیادہ واضح راستے کی ہدایت کرے گا (وقل عسیٰ ان یھدین ربی لاقرب من ھٰذا رشدًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ **"رجماً بالغیب" کا مفہوم :** "رجم" دراصل "پتھر" یا "پتھر پھینکنے" کے معنی میں ہے۔ بعدازاں یہ لفظ ہر قسم کی تیراندازی کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ کبھی یہ لفظ کنائے کے طور پر الزام لگانا یا تہمت لگانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ نیز گمان کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہونے لگا۔ لفظ "بالغیب" اس معنی کی تاکید کے لیے ہے یعنی عدم موجودگی میں بغیر کسی ماخذ و دلیل کے کسی چیز کے بارے میں فیصلہ کرنے کو کہتے ہیں۔

یہ بالکل ایسے ہے جیسے فارسی میں کہتے ہیں :

تیر در تاریکی انداختن

اندھیرے میں تیر مارنا۔

اندھیرے میں عموماً تیر صحیح نشانے پر نہیں لگتا اسی طرح اس قسم کا فیصلہ بھی عموماً صحیح نہیں ہوتا۔

۲۔ **"وثامنھم کلبھم" میں واؤ :** زیر نظر آیات میں "رابعھم کلبھم" اور "سادسھم کلبھم" دونوں جملے بغیر واؤ کے آئے ہیں جبکہ "وثامنھم کلبھم" واؤ کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور قرآن کی ہر تعبیر میں چونکہ کوئی نہ کوئی حکمت اور مقصد پوشیدہ ہے لہٰذا مفسرین نے اس واؤ کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔

---

[1] اس قسم کے خطاب جو ظاہراً پیغمبر اکرمؐ سے کیے گئے ہیں دراصل امت سے ہے لہٰذا شانِ نزول کا یہ حصہ کہ "آپؐ نے "انشاء اللہ" نہ کہا اس لیے کچھ عرصہ وحی کا سلسلہ رکا رہا" صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ (مترجم)

Marfat.com

شاید ان میں سے بہترین تفسیر یہ ہو کہ یہ واؤ آخری بات اور آخری حرف کی طرف اشارہ ہے۔ جیسے موجود زمانے کے ادب میں بھی یہ طریقہ عام ہو گیا ہے کہ چیزوں کو شمار کرتے وقت سب کو بغیر واؤ کے ذکر کرتے ہیں لیکن آخری کا ذکر لازمی طور پر واؤ کے ساتھ کرتے ہیں مثلاً:

زید، عمر، حسن و محمد آئے۔

(اُردو میں واؤ کی بجائے "اور" استعمال ہوتا ہے (مترجم))۔

یہاں پر واؤ کلام کے اختتام اور آخری شخص یا چیز کے بیان کی طرف اشارہ ہے۔

یہی بات مشہور مفسر ابن عباس سے منقول ہے۔ بعض دیگر مفسرین نے بھی اس کی تائید کی ہے نیز انہوں نے اسی واؤ سے اس امر کی تائید کے لیے بھی استفادہ کیا ہے کہ اصحاب کہف کی حقیقی تعداد سات تھی کیونکہ اس کے علاوہ اقوال کو بے بنیاد قرار دے کر قرآن نے ان کی حقیقی تعداد کو آخر میں بیان کیا ہے۔

بعض دوسرے مفسرین مثلاً فخر رازی اور قرطبی نے اس واؤ کی ایک اور تفسیر نقل کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

سات کا عدد عربوں میں ایک مکمل عدد شمار ہوتا ہے۔ اسی لیے سات کے عدد تک بغیر واؤ کے ذکر کرتے ہیں لیکن جب اس عدد سے آگے بڑھتے ہیں تو واؤ استعمال کرتے ہیں کہ جو ابتدائے کلام کی دلیل ہے۔ اسی لیے ادبائے عرب کی زبان میں یہ "واو ثمانیہ" مشہور ہو گئی۔

آیات قرآن میں بھی عموماً اسی طرح دیکھا گیا ہے۔ مثلاً سورہ توبہ کی آیت ۱۱۲ میں جہاں راہِ خدا کے مجاہدین کی صفات شمار کی گئی ہیں وہاں سات صفات تو واؤ کے بغیر آئی ہیں لیکن جب قرآن آٹھویں صفت پر پہنچتا ہے تو کہتا ہے:

وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ

اور برائیوں سے روکنے والے اور حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے۔

اسی طرح سورہ تحریم کی آیت ۵ میں ازواج پیغمبر کی صفات بیان کرتے ہوئے ساتویں صفت کے بعد آٹھویں صفت کا ذکر واؤ کے ساتھ کیا گیا ہے:

ثَيِّبَاتٍ وَّاَبْكَارًا

بیوائیں اور کنواریاں۔

نیز سورہ زمر کی آیت ۷۱ میں جہنم کے دروازوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا

اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔

لیکن دو آیتوں کے بعد جس وقت جنت کے دروازوں کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے تو فرمایا گیا ہے:

Marfat.com

وَ فُتِحَتۡ اَبۡوَابُهَا

اور اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔

کیا یہ اس بنا پر نہیں ہے کہ جہنم کے دروازے سات ہیں اور جنت کے دروازے آٹھ ہیں۔

البتہ شاید یہ کوئی کلی قانون نہ ہو لیکن زیادہ تر مواقع پر ایسا ہی ہے۔ بہرحال یہ بات اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ قرآن میں ایک واؤ تک کا وجود بھی کسی حساب کتاب کے تحت ہے اور کسی حقیقت کے بیان کے لیے ہے۔

۳۔ آرام گاہ کے پاس مسجد: تعبیر قرآن کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ آخر کار اصحاب کہف نے زندگی کو خیر باد کہا اور سپرد خاک ہوئے اور لفظ "علیھم" (ان پر) اس دعویٰ کی دلیل ہے۔

اس کے بعد ان کے عقیدت مندوں نے ارادہ کیا کہ ان کی آرام گاہ کے پاس عبادت خانہ بنائیں۔ قرآن نے زیر بحث آیات میں ان کے اس ارادے کو موافقت کے لہجے میں بیان کیا ہے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ بزرگان دین کی قبور کے احترام میں وہابیوں کے خیال کے برعکس مسجد اور عبادت خانہ بنانا نہ صرف حرام نہیں ہے بلکہ اچھا اور پسندیدہ کام ہے۔

اصولی طور پر ایسی عمارتیں کہ جو اہم اور عظیم شخصیات کی یاد کو زندہ رکھیں ان کی تعمیر کا سلسلہ ہمیشہ سے ساری دنیا کے لوگوں میں رہا ہے اور آج بھی ہے۔ دراصل اس کام سے ان بزرگوں کے بارے میں ایک طرح سے قدر دانی اور احسان شناسی کا اظہار ہوتا ہے نیز جیسے کام انہوں نے کیے ان سے ان کی طرف رغبت اور شوق دلانے کا مفہوم بھی اس میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اسلام نے نہ صرف اس کام سے منع نہیں کیا بلکہ اسے جائز شمار کیا ہے۔

اس قسم کی عمارتوں کا وجود ایسی شخصیتوں، ان کے کام اور ان کی تاریخ کے لیے ایک تاریخی سند ہے یہی وجہ ہے کہ جن انبیاء و مرسلین اور دیگر شخصیات کی قبریں نہیں ملتیں ان کی تاریخ بھی مشکوک ہوگئی ہے اور ایک سوال بن کر رہ گئی ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ اس قسم کی عمارات ہرگز توحید کی نفی نہیں کرتیں اور نہ ہی ان کے وجود سے اس بات کی ذرہ بھر نفی ہوتی ہے کہ عبادت فقط اللہ کے لیے مخصوص ہے کیونکہ احترام کرنا اور ہے اور عبادت کرنا اور ہے۔

البتہ یہ ایک طویل بحث ہے جس کا یہ موقع نہیں ہے۔

۴۔ تمام چیزیں مشیت الٰہی کے سہارے پر ہیں: آئندہ سے مربوط ارادے اور کام کے ساتھ "انشاء اللہ" کہنا نہ صرف بارگاہ خداوندی کے لیے ادب و احترام کا اظہار ہے بلکہ اس اہم حقیقت کا بیان بھی ہے کہ ہم اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں رکھتے، جو کچھ ہے اسی کی طرف سے ہے۔ مستقل بالذات

Marfat.com

خدا ہے اور ہم سب اسی کے سہارے پر ہیں ۔ اگر ساری دنیا کی تلواریں چل پڑیں لیکن اللہ کا ارادہ نہ ہو تو وہ ایک رگ بھی نہیں کاٹ سکتیں اور اگر اس کا ارادہ ہو تو ہر چیز تیزی سے واقع ہو جائے یہاں تک کہ وہ آئینے کو پتھر کے پہلو میں محفوظ رکھ سکتا ہے ۔

یہ درحقیقت "توحیدِ افعالی" کا مفہوم ہے ۔یعنی اگرچہ انسان ارادہ، اختیار اور آزادی رکھتا ہے لیکن ہر چیز اور ہر کام اللہ کی مشیّت کے ساتھ وابستہ ہے ۔

یہ تعبیر ہمیں کاموں میں خدا کی طرف زیادہ توجہ دلانے کے علاوہ طاقت و ہمت بھی بخشتی ہے اور عمل کی پاکیزگی اور صحت کی دعوت بھی دیتی ہے ۔

چند ایک روایات میں ہے کہ اگر کوئی شخص آئندہ کے بارے میں کوئی بات انشاء اللہ کے بغیر کہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے اور اپنی حمایت اس سے اٹھا لیتا ہے [1]

امام صادق علیہ السلام سے ایک حدیث مروی ہے ۔اس میں ہے :

امامؑ نے ایک خط لکھنے کا حکم دیا ۔خط اختتام کو پہنچا تو آپؑ کی خدمت میں پیش کیا گیا ۔امامؑ نے دیکھا کہ اس میں "انشاء اللہ" نہیں تھا، تو فرمایا :

کیف رجوتم ان یتم ھٰذا ولیس فیہ استثناء، انظروا کل موضع لا یکون فیہ استثناء فاستثنوا فیہ

تمہیں اس کے انجام پا جانے کی امید کیسے ہوئی جبکہ اس میں انشاء اللہ نہیں تھا ۔اس میں دیکھو جہاں جہاں پر (ضرورت ہے اور) نہیں ہے وہاں وہاں پر انشاء اللہ لکھو ۔

۵۔ایک سوال کا جواب : زیر بحث آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ اللہ نے اپنے رسولؐ سے فرمایا کہ جس وقت خدا کو بھول جاؤ اور پھر تمہیں یاد آئے تو اسے یاد کرو [2] ۔یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر انشاء اللہ کہنے کی صورت میں اس کی مشیت پر بھروسہ نہ کرو تو جس وقت تمہیں یاد آئے اس کی تلافی کرو ۔

اس آیت کی تفسیر میں اہلِ بیت علیہم السلام سے جو متعدد روایات منقول ہیں ان سے بھی اس مفہوم پر تاکید ہوتی ہے ۔یہاں تک کہ اگر ایک سال گزرنے کے بعد بھی تمہیں یاد آئے کہ انشاء اللہ نہیں کہا تھا تو گزشتہ کی تلافی کرو [3]

اس وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیسے ممکن ہے کہ رسول اللہؐ بھول گئے ہیں حالانکہ اگر ان کی فکر و نظر میں نسیان آجائے تو ان کی گفتار اور اعمال پر کامل اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور انبیاء و آئمہ کے خطا اور نسیان

---

[1] نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۵۴

[2] و [3] نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۵۴

Marfat.com

سے معصوم ہونے کی یہی دلیل ہے یہاں تک کہ موضوعات خارجیہ میں بھی۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ بہت سی قرآنی آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ روئے سخن انبیاء کی طرف ہے لیکن مقصود و منظور عام لوگ ہوتے ہیں۔ اس بات سے اس سوال کا جواب واضح ہوجاتا ہے۔ اس طرح کی گفتگو کے لیے عربوں کی مشہور ضرب المثل ہے:

ایاك اعنی و اسمعی یا جارة

میری مراد تو ہے جو میرے پاس ہے اور اے پڑوسن تو بھی سُن لے [1]

(بعض بزرگ مفسرین نے اس سوال کا ایک اور جواب دیا ہے جسے ہم سورہ انعام کی آیت ۶۸ کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں۔ پانچویں جلد کی طرف رجوع کیجئے)۔

---

[1] فارسی میں اس کے متبادل یہ ضرب المثل ہے:

در بتو می گویم دیوار تو بشنو

اے دروازے تجھے کہتا ہوں اور اے دیوار تو سُن لے۔

اُردو میں اس کے لیے یہ ضرب المثل ہے:

کہوں دھی کو سنو بہو تو کان رکھیو

نیز پنجابی زبان میں اس مفہوم کو شاید سب سے عمدہ ادا کیا گیا ہے:

کھنیاں دھی نوں تے سُنانیاں نونہ نوں

(ثاقب)

Marfat.com

۲۵ وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِينَ
وَازْدَادُوا تِسْعًا ○
۲۶ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا لَهُ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
اَبْصِرْ بِهِ وَاَسْمِعْ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ
فِي حُكْمِهِ اَحَدًا ○
۲۷ وَاتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهِ
وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهِ مُلْتَحَدًا ○

ترجمہ

۲۵ وہ اپنی غار میں تین سو سال سے نو سال اوپر ٹھہرے رہے۔

۲۶ کہہ دے: ان کے قیام کی مدت سے خدا زیادہ آگاہ ہے، آسمانوں اور زمین کے پوشیدہ امور سے وہی واقف ہے واقعاً وہ کیا خوب دیکھنے والا اور سننے والا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی ولی وسرپرست نہیں ہے اور کوئی شخص اس کے حکم میں شریک نہیں ہے۔

۲۷ جو کچھ کتاب میں سے تیرے رب کی طرف سے تجھ پر وحی کیا گیا ہے اس کی تلاوت کر، کوئی اس کے فرمودات بدل نہیں سکتا اور اس کے علاوہ تجھے کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی۔

Marfat.com

تفسیر

اصحابِ کہف کی نیند

گزشتہ آیات میں موجود قرآن سے اجمالاً معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب کہف کی نیند بہت لمبی تھی۔ یہ بات ہر شخص کی حسِ جستجو کو ابھارتی ہے۔ ہر شخص جاننا چاہتا ہے کہ وہ کتنے برس سوئے رہے۔ زیر نظر آیات اس داستان کی قرآن حکیم میں آخری آیات ہیں۔ ان آیات میں تردد ختم کرتے ہوئے اس سوال کا جواب دیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: وہ اپنی غار میں تین سو سے نو برس زیادہ ٹھہرے رہے (ولبثوا فی کہفھم ثلاث مائۃ سنین وازدادوا تسعًا) ؎۱

اس لحاظ سے وہ کُل تین سو نو سال غار میں سوئے رہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تین سو نو سال کہنے کی بجائے یہ جو کہا ــــ کہ نو سال اس سے زیادہ ــ یہ شمسی اور قمری سالوں کے فرق کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ شمسی حساب سے وہ تین سو سال رہے اور کہ جو قمری حساب سے تین سو نو سال ہوئے اور یہ تعبیر کا ایک لطیف پہلو ہے کہ ایک جزوی تعبیر کے ذریعے عبارت میں ایک اور وضاحت طلب حقیقت بیان کردی جائے ؎۲

اس کے بعد اس بارے میں لوگوں کے اختلافِ آراء کو ختم کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: کہہ دے: خدا ان کے قیام کی مدت کو بہتر جانتا ہے (قل اللہ اعلم بما لبثوا)۔ کیونکہ آسمانوں اور زمین کے غیب کے احوال اس کے سامنے ہیں اور وہ ہر کسی کی نسبت انہیں زیادہ جانتا ہے (لہ غیب السماوات والارض)۔ اور جو کُل کائناتِ ہستی سے باخبر ہے کیونکر ممکن ہے کہ وہ اصحابِ کہف کے غار میں قیام کی مدت سے آگاہ نہ ہو۔

واقعاً وہ کیا خوب دیکھنے والا اور سننے والا ہے (ابصر بہ واسمع) ؎۳

؎۱ قواعد نحو کے مطابق یہاں سنین (جمع) کی بجائے سنہ (مفرد) آنا چاہیے لیکن چونکہ یہ بہت طویل نیند تھی اور برسوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے تاکہ اس سے کثرت ظاہر ہو۔

؎۲ شمسی اور قمری سال کا فرق گیارہ دن کا ہے۔ اگر گیارہ کو تین سے ضرب دیں اور پھر جواب کو قمری سال کے دنوں یعنی ۳۵۴ پر تقسیم کریں تو نتیجہ نو ہی ہوگا (البتہ جو کچھ باقی بچے گا وہ چونکہ ایک سال سے کم مدت ہے لہٰذا نظرانداز کرنے کے قابل ہے)

؎۳ "ابصر بہ واسمع" یہ تعجب کے صیغے ہیں اور عظمت خدا ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوئے ہیں یعنی وہ اس قدر بینا اور شنوا ہے کہ انسان حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔

Marfat.com

لہٰذا آسمانوں اور زمین کے باسیوں کا اس کے علاوہ کوئی اور سرپرست نہیں ہے (ما لھم من دونہ من ولی)۔

یہ کہ "مالھم" کی ضمیر کن لوگوں کی طرف لوٹتی ہے، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ آسمان وزمین کے ساکنین کی طرف اشارہ ہے۔

بعض دوسرے کہتے ہیں کہ یہ اصحابِ کہف کی طرف اشارہ ہے یعنی اصحابِ کہف کا اس کے علاوہ کوئی ولی وسرپرست نہیں تھا۔ وہی تھا کہ جو اس ساری صورتِ حال میں ان کے ساتھ تھا اور اُن کی حمایت کرتا تھا۔

البتہ اس سے پہلے جملے کی طرف توجہ کریں تو اس میں آسمانوں اور زمین کے پوشیدہ احوال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے زیرِ بحث جملے کے بارے میں پہلی تفسیر زیادہ صحیح دکھائی دیتی ہے۔

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: اور کوئی شخص حکمِ خدا میں شریک نہیں ہے (ولا یشرك فی حکمہ احدًا)۔

درحقیقت یہ اللہ کی ولایتِ مطلقہ کے بارے میں تاکید ہے کہ نہ کوئی اور عالمین پر ولایت رکھتا ہے اور نہ کوئی ولایت میں شریک ہے۔ یعنی استقلال واشتراک دونوں لحاظ سے کوئی دوسرا اس عالمِ امکان کی ولایت میں نفوذ نہیں رکھتا۔

زیرِ نظر آخری آیت میں رُوئے سخن پیغمبرِ اکرمؐ کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جو کچھ کتابِ خدا میں سے تجھ پر وحی کیا گیا ہے اُس کی تلاوت کر (واتل ما اوحی الیك من کتاب ربك)۔

اور ادھر اُدھر کی دروغ آمیز اور بے بنیاد باتوں کی پرواہ نہ کر۔ ان امور میں تجھے صرف وحیِ خدا پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ کوئی چیز اس کی باتوں کو بدل نہیں سکتی۔ اور اس کی بات (اور اس کی معلومات) میں تبدیلی ممکن نہیں ہے (لا مبدل لکلماتہ)۔

اس کا علم اور کلام بندوں کے علم اور کلام کی طرح نہیں ہے کہ جو ہر روز نئے انکشاف اور آگاہی کی وجہ سے تبدیل ہوتا رہے۔ اسی لیے بندوں کے علم اور کلام پر سو فیصد اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

اسی وجہ سے تجھے اس کے علاوہ کوئی اور پناہ گاہ نہیں ملے گی (ولن تجد من دونہ ملتحدًا)۔

"ملتحد" "لحد" (بروزنِ "مھد") اس گڑھے کے معنی میں ہے جو درمیان سے کسی ایک جانب جھکا ہو (اس لحد کی طرح جو قبر کے لیے بنائی جاتی ہے) اسی لیے "ملتحد" اس جگہ کو کہتے ہیں جس کی طرف انسان مائل ہو۔ بعد ازاں یہ لفظ ملجا۔ اور پناہ گاہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

یہ بات توجہ طلب ہے کہ زیرِ بحث آخری دو آیات میں کئی لحاظ سے تمام موجوداتِ عالم پر خدا کا احاطۂ علمی بیان کیا گیا ہے۔

Marfat.com

پہلے فرمایا گیا ہے: آسمانوں اور زمین کے پوشیدہ امور اس کے سامنے ہیں لہٰذا وہ ان سب سے آگاہ ہے۔
پھر یہ فرمایا گیا ہے: صرف وہی ولی و سرپرست ہے اور وہ سب سے زیادہ آگاہ ہے۔
نیز اضافہ کیا گیا ہے: کوئی بھی اس کے حکم میں شریک نہیں ہے کہ جس کے باعث اس کا علم محدود ہو۔
اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اس کے علم اور کلام میں تبدیلی نہیں ہوتی کہ اس کی قدر و قیمت اور ثبات میں کمی واقع ہو۔
آخری جملے میں ہے: "عالم میں واحد پناہ گاہ اسی کی ذات ہے" لہٰذا واضح ہے کہ وہ تمام پناہ لینے والوں سے آگاہ ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ داستانِ اصحاب کہف احادیث کی روشنی میں: اصحاب کہف کے بارے میں منابع اسلامی میں بہت زیادہ روایات دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں سے بعض اسناد کے لحاظ سے قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ اسی لیے ان میں سے بعض میں باہم تضاد و اختلاف نظر آیا ہے۔

ایک روایت جو علی بن ابراہیم قمی نے اپنی تفسیر میں ذکر کی ہے وہ متن، مضمون اور آیاتِ قرآن سے ہم آہنگی کے اعتبار سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امام صادق علیہ السلام نے اصحاب کہف و رقیم کے بارے میں فرمایا:

وہ ایک جابر اور ظالم بادشاہ کے زمانے میں تھے۔ وہ بادشاہ اپنے ملک کے باسیوں کو بت پرستی کی دعوت دیتا تھا۔ جو شخص اس کی یہ دعوت قبول نہ کرتا اسے قتل کر دیتا تھا۔
اصحابِ کہف با ایمان افراد تھے اور خدائے بزرگ کی عبادت کرتے تھے (البتہ اس ظالم بادشاہ سے اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھے)۔
اس ظالم بادشاہ نے اپنے پایۂ تخت کے دروازے پر کچھ لوگ مامور کر رکھے تھے۔ ان کے ذمہ تھا کہ شہر سے جانے والا ہر شخص وہاں پڑے ہوئے بتوں کو سجدہ کرنے پر مجبور تھا۔
جیسے بھی ہو سکا یہ با ایمان افراد شکار کھیلنے کے بہانے شہر سے باہر آئے (ان کا پکا ارادہ تھا کہ اپنے اس شہر میں واپس نہ جائیں کہ جہاں کا ماحول بہت آلودہ تھا)۔
راستے میں ان کی ملاقات ایک چرواہے سے ہو گئی انہوں نے اسے خدائے واحد کی طرف دعوت دی۔ اس نے قبول نہ کی لیکن تعجب کی بات ہے کہ چرواہے کا کتا ان کے پیچھے ہو لیا اور پھر ان سے بالکل جدا نہ ہوا۔ وہ بت پرستی سے بھاگ کر نکلے تھے۔ دن ڈھل رہا تھا کہ ایک غار کے پاس پہنچے۔ وہ اس میں کچھ دیر استراحت کے لیے ٹھہر گئے۔ اللہ نے ان پر نیند مسلط کر دی

Marfat.com

جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: ہم نے انہیں سالہا سال نیند میں مستغرق رکھا۔

وہ ایسے محوِ خواب رہے کہ وہ ظالم بادشاہ مرگیا۔ شہر کے لوگ بھی یکے بعد دیگرے دنیا سے چل بسے۔ دَور بدل گیا اور لوگ بھی بدل گئے۔ اس طویل نیند کے بعد اصحابِ کہف جاگے تو ایک دوسرے سے اپنی نیند کی مدت کے بارے میں پوچھنے لگے۔ ان کی نظر سورج پر پڑی تو وہ اونچا ہوچکا تھا تو کہنے لگے کہ ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے میں سے ایک سے کہا: یہ چاندی کا سکہ لے جاؤ اور چپکے سے شہر چلے جاؤ، وہاں سے ہمارے لیے کھانا لے آؤ لیکن خیال رکھنا کوئی تمہیں پہچان نہ لے کیونکہ انہیں ہمارے بارے میں پتہ چل گیا تو ہمیں قتل کردیں گے یا اپنے دین کی طرف لے جائیں گے۔

وہ شخص شہر میں جا پہنچا لیکن شہر کا منظر تو اس کے خیال سے بالکل مختلف تھا اور لوگ بھی اس کے دیکھے بھالے نہ تھے۔ وہ ان کی زبان بھی اچھی طرح نہ سمجھتا تھا اور وہ بھی اس کی زبان پوری طرح نہ سمجھتے تھے۔ وہ پوچھنے لگے: تُو کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟۔

آخرکار اس نے اپنا بھید بتا دیا۔ (اس زمانے میں اس شہر کا حکمران خدا پرست) بادشاہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس شخص کے ہمراہ غار کی طرف آیا۔

یہ لوگ غار کے دہانے پر پہنچے تو اندر دیکھنے لگے۔ بعض کہتے، کہ یہ تین افراد سے زیادہ نہیں ہیں اور چوتھا ان کا کتا ہے۔ بعض کہتے کہ یہ پانچ افراد ہیں اور چھٹا ان کا کتا ہے اور بعض کہتے کہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔

اس وقت ان پر خدا کی طرف سے ایک رعب سا چھا گیا۔ کوئی شخص غار میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرتا تھا سوائے اس شخص کے کہ جو انہی میں سے تھا جب وہ غار میں گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ وحشت زدہ ہیں کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ ظالم بت پرست بادشاہ دقیانوس کے آدمی غار کے دروازے پر آپہنچے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھی نے انہیں ان کی طویل نیند سے آگاہ کیا اور ان سے کہا کہ خدا نے تمہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی قرار دیا ہے۔ یہ بات سنی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ خوشی کے مارے ان کے آنسو نکل آئے۔ انہوں نے اللہ سے درخواست کی کہ ہمیں پہلی حالت کی طرف لوٹا دے۔

اس زمانے کے بادشاہ نے کہا کہ بہتر ہے ہم یہاں ایک مسجد بنائیں کیونکہ وہ باایمان افراد تھے۔

امام علیہ السلام نے یہاں اضافہ فرمایا:

سال میں دو مرتبہ ان کے پہلو بدلتے تھے اور ان کے کتے نے غار کے دہانے پر اپنے اگلے

Marfat.com

پاؤں پھیلائے ہوئے تھے (اور ان کی حفاظت کر رہا تھا)[1]

اصحاب کہف کے بارے میں ایک تفصیلی حدیث حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

پہلے وہ چھ افراد تھے۔ دقیانوس نے انہیں اپنا وزیر بنا رکھا تھا۔ وہ ہر سال ان کیلئے ایک دن عید کے طور پر مناتا تھا۔

ایک برس جبکہ عید کا دن تھا۔ اس کے بڑے بڑے فوجی افسر اس کی دائیں طرف اور خاص مشیر بائیں طرف بیٹھے تھے۔

ایک فوجی کمانڈر نے اسے بتایا کہ ایران کا لشکر سرحدوں میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ خبر سُن کر اسے بہت دکھ ہوا۔ وہ اتنا پریشان ہوا کہ کانپنے لگا اور تاج اس کے سر سے گر پڑا۔

اس کے وزیروں میں سے ایک کہ جس کا نام تلیخا تھا، اس نے دل میں سوچا کہ اس شخص کو گمان تھا کہ یہ خدا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ اس قدر غمزدہ کیوں ہوا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں تمام بشری صفات موجود ہیں۔

اس کے چھ کے چھ وزیر روزانہ ایک وزیر کے گھر جمع ہوا کرتے تھے۔ اس روز تلیخا کی باری تھی۔ اس نے دوستوں کے لیے اچھا کھانا تیار کیا لیکن وہ پریشان دکھائی دیتا تھا۔ (کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتا تھا اس کے دوست اُس کی اس حالت کی طرف متوجہ ہوئے تو) اس نے کہا: میرے دل میں ایک بات ہے کہ جس کے باعث میرا کھانا پینا اور آرام جاتا رہا ہے۔

انہوں نے واقعہ پوچھا تو اُس نے کہا: اس بلند آسمان پر مَیں نے بہت غور کیا ہے کہ یہ بغیر کسی ستون کے قائم ہے۔ جس نے اس میں سورج اور چاند کی صورت میں دو روشن نشانیاں رواں دواں کر رکھی ہیں اور اس کی سطح ستاروں سے سجا رکھی ہے اس کے بارے میں مَیں نے بہت غور و فکر کیا ہے۔ پھر مَیں نے اس زمین کی طرف دیکھا ہے اور اپنے آپ سے پوچھا ہے کہ کس نے اسے پانی سے باہر نکالا اور پھیلایا ہے اور کس نے اس کی بے قراری کو پہاڑوں کے ذریعے قرار بخشا ہے۔ پھر مَیں نے اپنی حالت کے بارے میں سوچا ہے اور اپنے آپ سے پوچھا ہے کہ کس نے مجھے رحم مادر سے باہر بھیجا ہے، کس نے مجھے پستانِ مادر سے خوشگوار دودھ بخشا ہے اور غذا دی ہے۔ الغرض کس نے مجھے پروان چڑھایا ہے۔ ان سارے مسائل کے بارے میں مَیں نے تو یہی سمجھا ہے کہ کوئی ہے جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے، یہ سب کچھ

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۴۷ و ص ۲۴۸۔

Marfat.com

پیدا کیا ہے اور وہ ان کے نظام چلاتا ہے۔ اور یہ دقیانوس نہیں کوئی اور ہے — وہ کہ جو مالک الملوک بھی ہے، آسمانوں پر حاکم بھی،

اس نے یہ باتیں جب صراحت اور خلوص سے کیں۔ جو کچھ اُس کے دل سے نکلا اُس کے دوستوں کے دل میں اتر گیا۔ اچانک وہ سب اس کے پاؤں پر گر پڑے اور اس کی قدم بوسی کرنے لگے۔

انہوں نے کہا: اللہ نے تیرے ذریعے ہمیں گمراہی سے نکال کر ہدایت کی طرف دعوت دی ہے۔ اب بتاؤ ہم کیا کریں؟

تملیخا اٹھا۔ اس نے اپنے باغ کی کھجوریں تین ہزار درہم میں بیچیں۔ وہ رقم اٹھائی اور پھر وہ سب گھوڑوں پر سوار ہوگئے اور شہر سے باہر کی طرف چل پڑے۔ جب وہ تین میل کا راستہ طے کر چکے تو تملیخا نے کہا: بھائیو! بادشاہی اور وزارت تو گئی۔ اب خدا کی راہ کو ان قیمتی گھوڑوں کے ذریعے طے نہیں کیا جا سکتا۔ ان سے اتر آؤ تاکہ اب اس راستے کو پیدل طے کریں شاید خدا ہماری مشکلیں آسان کر دے۔

انہوں نے گھوڑے چھوڑ دیئے اور پیدل چل پڑے۔ اس روز انہوں نے تیزی سے سات فرسخ راستہ طے کر لیا۔ مگر ان کے پاؤں زخمی ہو گئے۔ ان کے پاؤں سے خون بہہ رہا تھا کہ ان کی ملاقات ایک چرواہے سے ہوئی۔ انہوں نے کہا: اے چرواہے! تمہارے پاس دودھ یا پانی کا گھونٹ ہے تو کچھ ہماری مہمانی کرو۔

چرواہے نے کہا: جو تمہیں پسند ہو وہ حاضر ہے لیکن تمہارے چہرے مجھے بادشاہوں والے لگتے ہیں۔ تم یہاں کس لیے آئے ہو۔ میرا خیال ہے تم دقیانوس بادشاہ سے بھاگ کر آئے ہو۔

انہوں نے کہا: اے چرواہے! حقیقت یہ ہے کہ ہم جھوٹ نہیں بول سکتے لیکن اگر ہم سچ کہیں تو کیا تُو ہمارے لیے کوئی مصیبت کھڑی تو نہیں کر دے گا؟

اس کے بعد انہوں نے چرواہے کو اپنی ساری کہانی کہہ سنائی۔ چرواہا ان کے ہاتھ پاؤں چومنے لگا۔ اس نے کہا: بھائیو! جو کچھ تمہارے دل میں اتر گیا ہے وہ میرے دل میں بھی سما گیا ہے لیکن اتنی اجازت دو کہ یہ بھیڑ بکریاں ہیں ان کے مالکوں کے سپرد کر آؤں اور تم سے آملوں۔

وہ کچھ دیر رُک گئے۔ چرواہا بھیڑ بکریاں پہنچا آیا۔ اُس کا کتا اس کے ساتھ ہی تھا۔ اُن جوانوں نے کتے کو دیکھا تو بعض نے کہا: ڈر ہے کہ کہیں یہ بھونک کر ہمارا راز فاش نہ کر دے۔ لیکن انہوں نے جتنی بھی کوشش کی کہ اُسے دُور کریں وہ نہ مانا۔ گویا وہ کہتا تھا: مجھے رہنے دو میں دشمنوں سے تمہاری حفاظت کروں گا (میں بھی تمہارے راستے کا مسافر ہوں)۔

Marfat.com

یہ ساتوں اپنی راہ پر چلتے رہے۔ کتا اُن کے پیچھے پیچھے تھا یہاں تک کہ ایک پہاڑ پر چڑھ گئے۔ ایک غار کے پاس پہنچ کر وہ رُک گئے۔ غار کے پاس انہوں نے چشمے اور پھلدار درخت دیکھے۔ انہوں نے پھل کھائے، پانی پیا اور سیراب ہوئے۔

رات کی تاریکی چھا گئی تو وہ غار میں جا پناہ گزیں ہوئے۔ کتے نے غار کے دہانے پر اپنے اگلے پاؤں پھیلا دیئے اور پہرہ دینے لگا۔ یہ حالت تھی کہ خدا نے موت کے فرشتے کو قبض ارواح کا حکم دیا اور ان پر موت کی سی گہری نیند مسلط ہو گئی۔[1]

دقیانوس کے بارے میں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ وہ شہنشاہ روم تھا اس نے ۲۴۹ سے ۲۵۱ عیسوی تک حکومت کی۔ وہ عیسائیوں کا سخت دشمن تھا اور انہیں بہت اذیت پہنچاتا تھا۔ یہ حکومت روم کے عیسوی دین قبول کرنے سے پہلے کا زمانہ تھا۔

۲۔ "غار" کہاں ہے؟ : یہ کہ اصحاب کہف کس علاقے میں رہتے تھے اور یہ غار کہاں تھی، اس سلسلے میں علماء اور مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے۔ البتہ اس علاقے کے مقام کو صحیح طور پر جاننے کا اصل داستان، اس کے تربیتی پہلوؤں اور تاریخی اہمیت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ یہ کوئی فرضی واقعہ نہیں کہ جس کی اصل داستان تو ہمیں معلوم ہے لیکن اس کی زیادہ تفصیلات معلوم نہیں ہیں لیکن مسلّم ہے کہ اس واقعے کا مقام جاننے سے اس کی خصوصیات کو مزید سمجھنے کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔

بہرحال اس سلسلے میں جو احتمالات ذکر کیے گئے اور جو اقوال نظر سے گزرتے ہیں ان میں سے دو زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

پہلا یہ کہ یہ واقعہ شہر "افسوس" میں ہوا اور یہ غار اس شہر کے قریب واقع تھی۔ ترکی میں اب بھی اس شہر کے کھنڈرات ازمیر کے قریب نظر آتے ہیں۔ وہاں قریب ایک قصبہ ہے جس کا نام "ایاصولوک" ہے اس کے پاس ایک پہاڑ ہے "ینایر داغ"۔ اب بھی اس میں ایک غار نظر آتی ہے جو افسوس شہر سے کوئی زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ یہ ایک وسیع غار ہے۔ کہتے ہیں اس میں سینکڑوں قبروں کے آثار نظر آتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اصحاب کہف کی غار یہی ہے۔

جیسا کہ جاننے والوں نے بیان کیا ہے کہ اس غار کا دہانہ شمال مشرق کی جانب ہے۔ اس وجہ سے بعض بزرگ مفسرین نے اس بارے میں شک کیا ہے کہ یہ وہی غار ہے حالانکہ اس کی یہی کیفیت اس کے اصلی ہونے کی مؤید ہے کیونکہ طلوع کے وقت سورج کا دائیں طرف اور غروب کے وقت بائیں طرف ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ غار کا دہانہ شمال یا کچھ شمال مشرق کی جانب ہو۔

---

[1] سفینۃ البحار، ج ۲ ص ۳۸۲ (مادہ "کہف")

Marfat.com

اس وقت وہاں کسی مسجد یا عبادت خانہ کا نہ ہونا بھی اس کے وہی غار ہونے کی نفی نہیں کرتا کیونکہ تقریباً سترہ صدیاں گزرنے کے بعد ممکن ہے اس کے آثار مٹ گئے ہوں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ وہ غار ہے کہ جو اُردن کے دارالحکومت عمان میں واقع ہے۔ یہ غار "رجیب" نامی ایک بستی کے قریب ہے۔ اس غار کے اوپر گرجے کے آثار نظر آتے ہیں۔ بعض قرائن کے مطابق ان کا تعلق پانچویں صدی عیسوی سے ہے۔ جب اس علاقے پر مسلمانوں کو غلبہ ہوا تو اسے مسجد میں تبدیل کر لیا گیا تھا اور وہاں محراب بنائی گئی تھی اور اذان کی جگہ کا اضافہ کیا گیا تھا۔ یہ دونوں اس وقت موجود ہیں۔

۳۔ اس واقعے کے تربیتی اور تعمیری پہلو: اس عجیب وغریب تاریخی واقعے کو قرآن نے تمام طرح کے خرافات اور بے بنیاد باتوں سے پاک کر کے ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا ہے۔ یہ واقعہ بھی قرآن کے دیگر تمام واقعات کی طرح تربیتی اور تعمیری نکات سے معمور ہے۔ تفسیر بیان کرتے ہوئے ہم نے ان نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک مرتبہ پھر مجموعی طور پر ان نکات کی طرف اشارہ کیا جائے تاکہ ہم قرآن کے اصلی مقصد کے زیادہ قریب ہو جائیں۔

الف۔ اس داستان کا پہلا سبق تقلید کے بند توڑنا ہے۔ اس داستان کا تقاضا ہے کہ فاسد ماحول کے رنگ میں نہیں رنگے جانا چاہیے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ معاشرے کی اکثریت گمراہ تھی لیکن اس کے مقابلے میں جوانمرد اصحاب کہف نے اپنی آزادئ فکر کو گنوایا نہیں اور یہی امر ان کی نجات و فلاح کا سبب بن گیا۔

اصولی طور پر انسان کو معاشرہ ساز ہونا چاہیے نہ کہ اس کی برائیوں کا شریک کار۔ سست، کمزور اور بے حیثیت لوگ وہ ہوتے ہیں جو کہتے ہیں:

خواہی نشوی رسوا ہم رنگ جماعت شو

اگر تم ذلیل نہیں ہونا چاہتے تو جیسے لوگ ہیں ویسے ہو جاؤ۔

جبکہ اہل ایمان اور حریت فکر رکھنے والے افراد کہتے ہیں:

لوگوں کا ہم رنگ ہونا تیرے لیے باعث ننگ و عار ہے۔

ب۔ اس عبرت انگیز واقعے کا دوسرا سبق بُرے ماحول سے ہجرت اختیار کرنا ہے۔ ان کا شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ تھا، خوشحال زندگی تھی، مادی نعمتیں ان کے لیے فراواں تھیں۔ اُن کے گھر بھرے پُرے تھے۔ ایسی زندگی کو انہوں نے ٹھکرا دیا اور اس غار میں جا ڈیرہ کیا کہ جہاں طرح طرح کی محرومیاں تھیں۔ یہ سب کچھ انہوں نے اس لیے کیا تاکہ اپنے ایمان کی حفاظت کر سکیں اور ظلم و جور اور کفر و شرک کی تقویت کا باعث نہ بنیں۔[1]

---

[1] اسلام میں ہجرت کی اہمیت اور اس کے فلسفے کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد چہارم ص۸۵ (اردو ترجمہ) پر تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔

Marfat.com

ج ۔ اس داستان کا تیسرا درس تقیہ ہے ۔ وہ تقیہ کہ جو تربیتی ، اصلاحی اور تعمیری ہے ۔ وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ شہر والوں کو ان کے بارے میں پتہ نہ چلے اور وہ اسی طرح پردۂ اسرار میں رہ جائیں کہ مبادا ان کی جان بے کار ہی ضائع چلی جائے یا انہیں جبری طور پر اس بُرے ماحول کی طرف پلٹا دیا جائے ۔

ہم جانتے ہیں کہ تقیہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ انسان اپنے حقیقی مقام یا مؤقف کو ایسے مقام پر مخفی رکھے کہ جہاں ظاہر کرنا بے نتیجہ ہو تاکہ مقابلے کے لیے اور دشمن پر ضرب لگانے کے موقع کے لیے اپنی قوت کو محفوظ رکھا جا سکے[1]

د ۔ اللہ کی راہ میں سب انسان برابر ہیں ۔ وزیر اور چرواہا اکٹھے ہیں ۔ بلکہ ان کی حفاظت کرنے والا کُتا بھی ان کے ساتھ ہے ۔ یہ بھی اس واقعے کا ایک درس ہے ۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مادی دنیا کے امتیازات اور مقام و منصب راہِ حق کے مسافروں کو ایک دوسرے سے ہرگز جُدا نہیں کرتے اور راہِ توحید تمام انسانوں میں مساوات کا راستہ ہے ۔

ہ ۔ اس داستان کا ایک درس یہ بھی ہے کہ مشکلات کے مواقع پر اللہ کی طرف سے اس کے بندوں کی تعجب انگیز طور پر امداد کی جاتی ہے ۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کیسے جب معاشرے کے حالات ناسازگار تھے تو اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کو سالہا سال سُلائے رکھا اور جب حالات سازگار ہوئے تو انہیں بیدار کر دیا ۔ اور لوگوں نے ان کا توحید پرستوں کی حیثیت سے احترام کیا ۔ نیز ہم نے دیکھا کہ کس طرح اس طویل مدت میں ان کے جسموں کو ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رکھا اور ان کے اندر ایک ایسا رعب پیدا کر دیا کہ جس نے حملہ آوروں کے مقابلے میں ڈھال بن کر ان کی حفاظت کی ۔

و ۔ اصحابِ کہف نے ان سخت ترین حالات میں بھی ہمیں پاکیزہ غذا کھانے کا درس دیا کیونکہ جسم انسان کی غذا کا انسانی روح ، فکر اور دل پر گہرا اثر ہوتا ہے ۔ انسان جب حرام اور ناپاک غذا سے آلودہ ہوتا ہے تو وہ راہِ خدا سے اور تقویٰ سے دُور ہو جاتا ہے ۔

ز ۔ مشیتِ خدا پر بھروسہ اور اعتماد ضروری ہے ۔ اس کے لطف و کرم سے مدد طلب کرنا اور آئندہ کے امور کے لیے انشاء اللہ کہنا ۔ یہ درس بھی ہم نے اس واقعے کے ضمن میں سیکھا ہے ۔

ح ۔ ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن انہیں جوانمرد (فتیۃ) کہہ کر یاد کر رہا ہے حالانکہ بعض روایات کے مطابق عمر کے لحاظ سے وہ جوان نہیں تھے ۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ پہلے وہ اس دَور کے ظالم بادشاہ کے وزیر تھے

---

[1] تقیہ کے بارے میں " تقیہ ایک حفاظتی ڈھال ہے " کے زیرِ عنوان ہم تفسیر نمونہ کی جلد ۲ صفحہ ۲۹۵ (اردو ترجمہ) پر گفتگو کر چکے ہیں اور اس کے فقہی مدارک " القواعد الفقہیہ " میں ہم نے بیان کیے ہیں ۔

Marfat.com

تو ماننا پڑے گا کہ وہ اچھی خاصی عمر کے تھے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ قرآن جوانی کو جوانمردی کے اصول پر دیکھتا ہے یعنی قرآن پاکیزگی، جرأت و ایثار کے حوالے سے جوانی کو ماپتا ہے۔

ط۔ اس واقعے سے ایک اور اصلاحی سبق یہ ملتا ہے کہ مخالفین سے سابقہ پڑے تو ضروری ہے کہ بحث منطقی بنیاد پر کی جائے۔ کیونکہ جب اصحاب کہف اس شرک آلود ماحول پر تنقید کرتے تو منطقی دلائل کا سہارا لیتے۔ اس کے کچھ نمونے ہم نے اسی سورہ کی آیات ۱۵ اور ۱۶ میں دیکھے ہیں۔

اصولی طور پر تمام انبیاء اور ہادیانِ الٰہی کا طریق کار یہ تھا کہ وہ مخالفین سے مقابلے اور آمنا سامنا ہونے کی صورت میں آزاد اور منطقی بنیاد پر گفتگو کرتے تھے۔ طاقت وہ صرف اسی صورت میں استعمال کرتے جب فتنہ و فساد کے خاتمے کے لیے منطقی بحث مؤثر نہ رہتی تھی یا یہ کہ جب مخالفین منطقی گفتگو میں رکاوٹ بن جاتے تھے۔

ی۔ دسواں درس اس داستان کا معادِ جسمانی اور قیامت کے دن انسان کی حیاتِ نو کے امکان کا ہے۔ اس کی تشریح آئندہ مباحث میں تفصیل کے ساتھ آئے گی۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اس داستان کے تربیتی، اصلاحی اور تعمیری نکات انہی میں منحصر ہیں لیکن ان دس درسوں میں سے ایک بھی ہو تو ایسی داستان بیان کرنے کے لیے کافی ہے چہ جائیکہ یہ سب موجود ہوں۔

بہر حال مقصد خواہ مخواہ کی مشغولیت اور داستان گوئی نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو مجاہد، بہادر، باایمان، آگاہ اور شجاع بنانا ہے اور ان کی اصلاح کرنا ہے۔ اس کے لیے دیگر تبلیغی طریقوں کے علاوہ ایک یہ ہے کہ انسان کی گزشتہ تاریخ سے حقیقی نمونے پیش کیے جائیں۔

اصحابِ کہف کا واقعہ علمی اعتبار سے

یہ بات مسلّم ہے کہ اصحاب کہف کا واقعہ کسی گزشتہ آسمانی کتاب میں نہیں تھا (چاہے وہ اصلی ہو یا موجودہ تحریف شدہ) اور نہ اسے ان کتابوں میں ہونا ہی چاہیئے تھا کیونکہ تاریخ کے مطابق یہ واقعہ ظہورِ حضرت مسیحؑ کے صدیوں بعد کا ہے۔

یہ واقعہ "دکیوس" کے دَور کا ہے، جسے عرب "دقیانوس" کہتے ہیں۔ اس کے زمانے میں عیسائیوں پر سخت ظلم ہوتا تھا۔

یورپی مؤرخین کے مطابق یہ واقعہ ۴۹ تا ۲۵۱ عیسوی کے درمیان کا ہے۔ ان مؤرخین کے خیال میں اصحاب کہف کی نیند کی مدت ۱۵۷ سال ہے۔ یورپی مؤرخین انہیں "افسوس کے سات سونے والے" کہتے ہیں ۱؎ جبکہ ہمارے ہاں انہیں "اصحاب کہف" کہا جاتا ہے۔

۱؎ اعلام قرآن صفحہ ۱۵۳۔

Marfat.com

اب دیکھتے ہیں کہ "افسوس" شہر کہاں ہے؟ تعجب ہے سب سے پہلے کن علما نے ان سونے والوں کے بارے میں کتاب لکھی اور وہ کس صدی کے تھے؟

"افسوس" یا "افسس" ایشیائے کوچک کا ایک شہر تھا (موجودہ ترکی جو قدیم مشرقی روم کا ایک حصہ تھا) یہ دریائے کاستر کے پاس "ازمیر" شہر کے تقریباً چالیس میل جنوب مشرق میں واقع تھا۔ یہ ایونی بادشاہ کا پایۂ تخت شمار ہوتا تھا۔ افسوس اپنے مشہور بت خانے ارطامیس کی وجہ سے بھی عالمی شہرت رکھتا تھا۔ یہ دنیا کے سات عجائبات میں سے تھا۔[1]

کہتے ہیں کہ اصحاب کہف کی داستان پہلی مرتبہ پانچویں صدی عیسوی میں ایک عیسائی عالم نے لکھی۔ اس کا نام "ژاک" تھا۔ وہ شام کے ایک گرجے کا متولی تھا۔ انہوں نے سریانی زبان کے ایک رسالے میں اس کے بارے میں لکھا تھا۔ اس کے بعد ایک اور شخص نے اس کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کا نام "گوگوریوس" تھا۔ ترجمے کا نام اس نے "جلال شہداء" کا ہم معنی رکھا تھا۔[2]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظہور اسلام سے ایک دو صدیاں پہلے یہ واقعہ عیسائیوں میں مشہور تھا اور گرجوں کی مجالس میں اس کا تذکرہ ہوتا تھا۔

البتہ جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے اسلامی مصادر میں اس کی جو تفصیلات آئی ہیں وہ مذکورہ عیسائیوں کے بیانات سے کچھ مختلف ہیں۔ جیسے ان کے سونے کی مدت۔ کیونکہ قرآن نے صراحت کے ساتھ یہ مدت ۳۰۹ سال بیان کی ہے۔

یاقوت حموی نے اپنی کتاب "معجم البلدان" ج ۳ ص ۸۰۶ پر، ابن خرداد بہ نے اپنی کتاب "المسالک والممالک" ص ۱۰۶ تا ص ۱۱۰ میں اور ابوریحان بیرونی نے اپنی کتاب "الآثار الباقیہ" میں نقل کیا ہے کہ قدیم سیاحوں کی ایک جماعت نے شہر "آبس" میں ایک غار دیکھی ہے جس میں چند انسانی ڈھانچے پڑے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے یہ بات اسی داستان سے مربوط ہو۔

سورہ کہف میں قرآن کے لب و لہجہ سے اور اس سلسلے میں اسلامی کتب میں منقول شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان یہودی علماء میں بھی ایک تاریخی واقعے کے طور پر مشہور تھی۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ طولانی نیند کا یہ واقعہ مختلف قوموں کے تاریخی مآخذ میں موجود رہا ہے۔[3]

شہر افسوس میں سالہا سال تک سوئے رہنے والے اصحاب کہف کی اس طویل نیند کے بارے میں

---

[1] قاموس مقدس ص ۸۳ سے ایک اقتباس۔

[2] اعلام قرآن ص ۱۵۴۔

[3] معاد و جہان پس از مرگ ص ۱۶۳ تا ص ۱۶۵۔

Marfat.com

ہو سکتا ہے کچھ افراد شک کریں کہ یہ بات سائنسی معیار پر پوری نہیں اترتی لہٰذا وہ اسے ایک افسانہ قرار دیں کیونکہ:

اولاً: اس قسم کی طولانی عمر تو جاگتے افراد کے لیے بعید معلوم ہوتی ہے چہ جائیکہ سوئے ہوئے افراد کیلئے۔

ثانیاً: اگر یہ قبول کر لیا جائے کہ بیداری کے عالم میں ایسی عمر ممکن ہے تب بھی سوئے ہوئے تو ممکن معلوم نہیں ہوتی کیونکہ کھائے پیئے بغیر اتنا طویل عرصہ انسان کیونکر زندہ رہ سکتا ہے۔ اگر فرض کیا جائے کہ ایک انسان کو ہر روز کے لیے ایک کلو کھانا اور ایک لٹر پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو اصحاب کہف کی عمر کے لیے سوٹن غذا اور ایک لاکھ لٹر پانی کی ضرورت ہے اور اتنا ذخیرہ ایک بدن میں ممکن نہیں۔

ثالثاً: اگر ان تمام چیزوں سے صرف نظر بھی کر لیا جائے تو بھی انسانی بدن اتنا طویل عرصہ ایک جیسا کیسے رہ سکتا ہے انسانی آرگانزم Organism کے لیے اتنی طولانی مدت یقیناً نقصان دہ ہے اور جسم کے اعضاء و اجزاء کا بہت سا حصہ اتنے طویل عرصے میں ضرور ضائع ہوتا ہے۔

ہو سکتا ہے پہلی نظر میں ان اشکالات اور موانع کے باعث ایسا ہونا ناقابل عمل دکھائی دے لیکن ایسا نہیں کیونکہ:

اولاً: لمبی عمر کا مسئلہ کوئی غیر سائنسی نہیں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ کسی زندہ موجود کی عمر کی طوالت کیلئے سائنسی حوالے سے کوئی ایسا معیار نہیں ہے کہ جس کے باعث موت حتمی اور یقینی ہو۔

دوسرے لفظوں میں یہ صحیح ہے کہ انسان کے جسمانی قویٰ جس قدر بھی ہوں آخر محدود اور اختتام پذیر ہیں لیکن اس کا یہ معنی نہیں کہ ایک انسانی بدن یا کسی اور زندہ شے کا بدن معمول سے زیادہ زندہ رہنے کی توانائی نہیں رکھتا۔

اس کی مثال پانی کی سی نہیں کہ جب اس کا درجہ حرارت سو تک پہنچ جاتا ہے تو وہ اُبلنے لگتا ہے اور صفر تک پہنچ جاتا ہے تو برف بن جاتا ہے۔ ایسا نہیں کہ جب انسان سو یا ڈیڑھ سو سال تک پہنچ جائے تو ضروری ہے کہ اس کے دل کی دھڑکن بند ہو جائے اور اس پر موت طاری ہو جائے۔ بلکہ زندہ موجودات کی عمر کا تعلق زیادہ تر اس کی کیفیت زندگی اور انداز بود و باش سے ہے اور حالات کی تبدیلی سے مکمل طور پر قابل تغیر ہے۔ اسی لیے کا زندہ شاہد یہ امر ہے کہ ایک طرف تو دنیا کے کسی سائنسدان نے انسانی عمر کے لیے کوئی معین معیار مقرر نہیں کیا جبکہ دوسری طرف تجربہ گاہوں میں یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ بعض زندہ موجودات کی عمر، دوگنا، کئی گنا یہاں تک کہ بارہ گنا اور اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ بلکہ اب تو امید بھی دلائی جا رہی ہے کہ بعض نئے عمل طریقے پیدا ہونے سے انسان کی عمر موجودہ عمر کی نسبت کئی گنا بڑھ جائے گی۔

یہ تو طول عمر کے بارے میں گفتگو تھی۔

ثانیاً: اس طولانی نیند میں آب و غذا کے بارے میں اگر تو معمول کی نیند ہو تو ہو سکتا ہے کہ اعتراض کرنے والے کو حق بجانب سمجھا جائے کہ یہ بات سائنسی اصول سے ہم آہنگ نہیں کیونکہ انسانی بدن میں اجزا کی بیشی

Marfat.com

نیند کی حالت میں عام حالت کی نسبت اگرچہ کم ہے پھر بھی اتنی طویل مدت میں تو بہت زیادہ ہوگی لیکن توجہ رہے کہ مادی دنیا میں ایسی نیندیں بھی ہیں کہ جن میں بدن کی غذا کا مصرف بہت کم ہوتا ہے اس کے لیے ان جانوروں کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جو موسم سرما میں سو جاتے ہیں۔ اس مسئلے کو ہم ذرا تفصیل سے دیکھتے ہیں:

بعض جانوروں کی سردیوں کی نیند: بہت سے جانور ایسے ہیں جو سارے موسم سرما میں سوئے رہتے ہیں۔ اسے سائنسی اصطلاح میں "سردیوں کی نیند" کہتے ہیں۔

ایسی نیند میں علامات حیات تقریباً ختم ہو جاتی ہیں۔ زندگی کا معمولی سا شعلہ روشن رہتا ہے۔ دل کی دھڑکن تقریباً رک جاتی ہے اور اتنی خفیف ہو جاتی ہے کہ بالکل محسوس نہیں ہوتی۔ ایسے مواقع پر بدن کو ایک ایسے بڑے بھٹے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے کہ جسے بجھا کر چھوٹا سا شعلہ بھڑکتا رہے۔ واضح ہے کہ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے شعلوں کے لیے بھٹے کو جتنے تیل یا گیس کی خوراک کی ایک دن کے لیے ضرورت ہوتی ہے ایک خفیف سے شعلے کے لیے اتنی برسہا برس یا صدیوں کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ اس میں جلتے ہوئے بھٹے کی مقدار اور خفیف سے شعلے کی مقدار کے لحاظ سے فرق ہو سکتا ہے۔

سائنس دان بعض جانوروں کی سردیوں کی نیند کے بارے میں کہتے ہیں:

> کوئی مینڈک جب سردیوں کی نیند میں ہو تو اسے اگر اس کی جگہ سے باہر نکال لیں تو وہ مُردہ معلوم ہوگا۔ اس کے پھیپھڑوں میں ہوا نہیں ہوتی۔ اس کے دل کی حرکت اس قدر کمزور ہوتی ہے کہ اس کا پتہ نہیں چلایا جاسکتا۔ خون سرد جانوروں Cool Blooded Animal میں سے بہت سے ایسی سردیوں کی نیند سوتے ہیں۔ اس سلسلے میں کئی طرح کے کیڑے مکوڑوں، حشرات الارض، گھونگھوں اور رینگنے والے جانوروں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ بعض خون گرم جانوروں Warm Blooded Animal کی بھی سردیوں کی ایسی نیند ہوتی ہے۔ اس نیند کے عالم میں حیاتی فعالیتیں بہت سست پڑ جاتی ہیں اور بدن میں ذخیرہ شدہ چربی آہستہ آہستہ صرف ہوتی رہتی ہے[1]

مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی نیند بھی ہے کہ جس میں غذا کی انتہائی کم ضرورت ہو جاتی ہے اور حیاتی فعالیتیں تقریباً صفر تک پہنچ جاتی ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہی صورت حال اعضا کو فرسودگی سے بچانے اور جانوروں کی طوالت عمر میں مدد کرتی ہے۔

اصولی طور پر جو جاندار احتمالاً سردیوں میں اپنی غذا حاصل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ان کے لیے سردیوں کی نیند بہت غنیمت چیز ہے۔

---

[1] اقتباس از کتاب فرہنگ نامہ (دائرۃ المعارف جدید فارسی) مادہ "زمستان خوابی"

Marfat.com

ایک اور نمونہ - یوگا کے ماہرین: یوگا کے ماہرین کے بارے میں دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے بعض کو یقین نہ کرنے والے حیرت زدہ افراد کی آنکھوں کے سامنے بعض اوقات تابوت میں رکھ کر ہفتہ بھر کی مدت تک کے لیے مٹی کے نیچے دفن کر دیتے ہیں اور مذکورہ مدت ختم ہونے کے بعد انہیں باہر نکالتے ہیں۔ ان کی مالش کی جاتی ہے اور مصنوعی سانس دی جاتی ہے اور وہ رفتہ رفتہ معمول کی حالت میں پلٹ آتے ہیں۔

اتنی مدت کے لیے اگر ضرورتِ غذا کا مسئلہ اہم نہ ہو تو بھی آکسیجن کا مسئلہ تو بہت اہم ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ دماغ کے خلیے آکسیجن کے معاملے میں اتنے حساس اور ضرورت مند ہوتے ہیں کہ اگر چند سیکنڈ بھی اس سے محروم رہیں تو تباہ ہو جائیں۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک یوگی پورا ہفتہ کس طرح آکسیجن کی اس کمی کو برداشت کر لیتا ہے۔

ہم جو وضاحت کر چکے ہیں اس کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ بات یہ ہے کہ یوگی کے بدن کی حیاتی فعالیت اس عرصے میں تقریباً رک جاتی ہے۔ اس دوران میں خلیے کو آکسیجن کی ضرورت اور اس کا مصرف بہت کم ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہی ہوا جو تابوت کے اندر والے حصے میں ہوتی ہے بدن کے خلیوں کی ہفتہ بھر کی غذا کے لیے کافی ہوتی ہے۔

زندہ انسان کے بدن کو منجمد کر دینا: جانداروں بلکہ انسانی بدن کو منجمد کر کے ان کی عمر بڑھانے کے بارے میں آج تو بہت سے نظریے اور بحثیں چل پڑی ہیں۔ ان میں بعض تو عملی جامہ بھی پہن چکی ہیں۔

ان نظریوں Theories کے مطابق یہ ممکن ہے کہ ایک انسان یا حیوان کے بدن کو ایک خاص طریقے کے تحت صفر سے کم درجۂ حرارت پر رکھ کر اس کی زندگی کو ٹھہرا دیا جائے، اس طرح سے کہ وہ واقعاً مر نہ جائے۔ پھر ایک ضروری مدت کے بعد اسے مناسب حرارت دی جائے اور وہ حالتِ معمول پر لوٹ آئے۔

ایسے کُرّے جو بہت دُور ہیں ان تک کا فضائی سفر جو کئی سو یا کئی ہزار سال تک کی مدت کا ہو سکتا ہے' کے لیے کئی منصوبے پیش کیے جا چکے ہیں۔ ان میں سے ایک یہی ہے کہ خلانورد کے بدن کو ایک خاص تابوت میں رکھ دیا جائے اور اسے منجمد کر دیا جائے اور جب سالہا سال کی مسافت کے بعد وہ مقررہ کُرّات کے قریب پہنچے تو ایک خود کار نظام کے تحت اس تابوت میں حرارت پیدا ہو جائے اور خلانورد حالتِ معمول پر لوٹ آئے بغیر اس کے کہ اُس کی عمر ضائع ہو۔

ایک سائنسی مجلے میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ حال ہی میں انسانی بدن کو لمبی عمر کے لیے منجمد کرنے کے بارے میں رابرٹ نیلسن نے کتاب لکھی ہے۔ سائنسی دنیا میں یہ کتاب بہت اہمیت اختیار کر گئی ہے اور اس کے مندرجات کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔

Marfat.com

مجلے کے اس مقالے میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ حال ہی میں اس عنوان کے تحت ایک خاص سائنسی شعبہ قائم ہو گیا ہے۔ مذکورہ مقالے میں لکھا گیا ہے:

حیات جاوداں پوری تاریخ انسانی میں ہمیشہ انسان کا سنہرا خواب رہی ہے لیکن اب یہ خواب حقیقت میں بدل گیا ہے۔ یہ امر ایک نئے علم کی خوشگوار اور حیرت انگیز ترقی کا مرہون منت ہے۔ اس علم کا نام کریانک ہے۔ (یہ علم انسانی بدن کو منجمد کر کے زندہ رکھنے کے بارے میں ہے۔ اس کے مطابق انسان کے بدن کو منجمد کر کے اسے بچایا جا سکتا ہے یہاں تک کہ سائنسدان اسے پھر سے زندہ کر دیں)۔

کیا یہ بات قابل یقین ہے؟

بہت سے اہم اور ممتاز سائنسدان کئی پہلوؤں سے اس مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔ اس کے بارے میں کئی کتابیں مثلاً "لائف" اور "اسکوائر" چھپ چکی ہیں۔ پوری دنیا کے اخبارات پوری شد و مد سے اس مسئلے پر بحث کر رہے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں اب تجربات شروع ہو چکے ہیں۔[1]

کچھ عرصہ ہوا کہ جرائد میں یہ خبر چھپی تھی کہ برفانی قطبی علاقے سے چند ہزار سال پہلے کی ایک منجمد مچھلی ملی ہے جسے خود وہاں کے لوگوں نے دیکھا ہے۔ اس مچھلی کو جب مناسب پانی میں رکھا گیا تو لوگ حیرت زدہ رہ گئے کہ وہ پھر سے جی اٹھی اور چلنے پھرنے لگی۔

واضح ہے کہ حالتِ انجماد میں علاماتِ حیات موت کی طرح بالکل ختم نہیں ہو جاتیں کیونکہ اس صورت میں تو پھر زندگی نہیں مل سکتی بلکہ اس عالم میں حیاتی فعالیتیں بہت سست رفتار ہو جاتی ہیں۔

ان تمام باتوں سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسانی زندگی کو ٹھہرایا یا بہت ہی سست کیا جا سکتا ممکن ہے اور مختلف سائنسی تحقیقات اس امکان کی کئی حوالوں سے تائید کرتی ہیں۔ اس حالت میں غذا کا مصرف بدن میں تقریباً صفر تک جا پہنچتا ہے اور غذا کا تھوڑا سا ذخیرہ جو بدن میں موجود ہوتا ہے اس کی سست زندگی کیلئے طویل برسوں تک کافی ہو سکتا ہے۔[2]

غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے ہم ان باتوں کے ذریعے اصحاب کہف کی نیند کے اعجاز کے پہلو کا انکار نہیں کرنا چاہتے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ سائنسی حوالے سے اس واقعے کو ہم ذہن کے قریب کر دیں کیونکہ تسلیم شدہ امر ہے کہ اصحاب کہف ہماری طرح نہیں سوئے۔ جیسے ہم معمول کے مطابق رات کو سوتے ہیں ان کی نیند ایسی نہ تھی بلکہ وہ استثنائی پہلو رکھتی تھی۔

---

[1] مجلہ "دانشمند" بہمن ماہ ۱۳۴۸ صفحہ ۔

[2] ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان نے قدرت کی بہت سی چیزیں دیکھ کر ویسی ہی ایجادات کی ہیں۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اصحاب کہف کے واقعے نے انسان کے ذہن میں منجمد کرنے کی ایجاد آئی ہو یا قدرت نے اسے منجمد کرنے کا اشارہ دیا ہو۔

Marfat.com

لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ وہ ارادۂ الٰہی کے ماتحت ایک طویل زمانے تک سوئے رہے اس دوران نہ انہیں غذا کی کمی لاحق ہوئی اور نہ ان کے بدن کے اجزا Organism کو کوئی نقصان پہنچا۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ سورہ کہف کی آیات سے ان کی سرگزشت کے بارے میں یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ان کی نیند عام طریقے کی نیند اور معمول کی نیند سے بہت مختلف تھی۔ ارشاد ہوتا ہے:

وتحسبهم ايقاظا وهم رقود... لو اطلعت عليهم لوليت منهم فرارا ولملئت منهم رعبا

وہ ایسے لگتے تھے جیسے جاگ رہے ہوں (ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں) اگر تو انہیں دیکھتا تو گھبرا کے بھاگ اٹھتا اور تیرے پورے وجود پر خوف چھا جاتا۔ (کہف - ۱۸)

یہ آیت اس بات کی گواہ ہے کہ ان کی نیند عام کی سی نہ تھی بلکہ ایسی نیند تھی جو حالت موت کے مشابہ تھی۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

علاوہ ازیں قرآن کہتا ہے:

سورج کی روشنی ان کے غار کے اندر نہیں پڑتی تھی۔

نیز اگر اس امر کی طرف توجہ کی جائے کہ ان کی غار احتمالاً ایشیائے کوچک کے کسی بلند اور ٹھنڈے مقام پر واقع تھی تو ان کی نیند کے استثنائی حالات اور زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔

دوسری طرف قرآن کہتا ہے:

ونقلبهم ذات اليمين و ذات الشمال

ہم دائیں بائیں ان کے پہلو بدلتے رہتے تھے۔ (کہف - ۱۸)

یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ وہ بالکل ایک ہی حالت میں نہیں رہتے تھے ایسے عوامل کہ جو ابھی تک ہمارے لیے راز ہیں ان کے تحت شاید سال میں ایک مرتبہ انہیں دائیں بائیں پلٹایا جاتا تھا تاکہ ان کے بدن کے آرگانزم Organism میں کوئی نقص نہ پڑ جائے۔

اب جبکہ اس سلسلے میں کافی واضح علمی بحث ہو چکی ہے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے معاد اور قیامت کے بارے میں زیادہ گفتگو کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ ایسی طویل نیند کے بعد بیداری موت کے بعد زندگی کے غیر مشابہ نہیں ہے۔ اس سے ذہن معاد اور قیامت کے امکان کے قریب ہو جاتا ہے[1]

* * *

---

[1] اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے کتاب "معاد و جہان پس از مرگ" کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

(۲۸) وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ
وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ
زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا
وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ○
(۲۹) وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ
فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا
وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ بِئْسَ
الشَّرَابُ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ○
(۳۰) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ
مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ○
(۳۱) اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ
يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا
مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ نِعْمَ
الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ○

ترجمہ

(۲۸) ان لوگوں کے ساتھ رہ کہ جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور صرف
اُس کی ذات کے خواہاں ہیں۔ حیاتِ دنیا کی آرائش کی وجہ سے ہرگز اپنی نگاہیں

Marfat.com

ان سے نہ اٹھا لے اور ان لوگوں کی اطاعت نہ کر کہ جن کے دلوں کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے وہ کہ جنہوں نے ہوائے نفس کی پیروی کی ہے اور جن کے کام تجاوز پر مبنی ہیں۔

(۲۹) اور کہہ دے کہ یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے جو چاہے ایمان لے آئے (اور اس حقیقت کو مان لے) اور جو چاہے کافر ہو جائے۔ ظالموں کے لیے ہم نے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے کہ جس کی قناتیں انہیں ہر طرف سے گھیر لیں گی اور اگر وہ پانی مانگیں گے تو انہیں ایسا پانی پیش کیا جائے گا جو پگھلی ہوئی دھات کی مانند ہوگا اور منہ کو بھون ڈالے گا۔ وہ کیا برا پانی ہے اور وہ کیا برا ٹھکانہ ہے۔

(۳۰) یقیناً جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اچھے عمل انجام دیئے، تو ہم نیک لوگوں کی جزا ضائع نہیں کریں گے۔

(۳۱) وہ ایسے لوگ ہیں کہ جن کا مسکن بہشت جاوداں ہے، ایسے باغاتِ بہشت کہ جن کے درختوں اور محلوں کے نیچے نہریں رواں ہیں۔ وہ وہاں سونے کے کنگنوں سے سنوارے جائیں گے اور انہیں سبز رنگ کے نازک اور دبیز ریشم کے (فاخرہ) لباس پہنائے جائیں گے اور وہ تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ کیا ہی اچھی جزا ہے اور کیسی پیاری جگہ ہے۔

شانِ نزول

مندرجہ بالا آیات میں سے کچھ کی شانِ نزول کے بارے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ کچھ سرمایہ دار متکبر، خودغرض اشراف خدمتِ رسولؐ میں حاضر ہوئے۔ وہ سلمان، ابوذر، صہیب اور خباب وغیرہ کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگے: اے محمد(ص)! اگر تو کسی محفل میں صدر نشین ہو اور ایسے افراد کہ جن کی بدبو انسانی مشام

Marfat.com

کو اذیت پہنچاتی ہے اور جنہوں نے سخت اُونی لباس پہن رکھے ہیں اپنے سے دُور کر دے (یعنی مجلس میں اشراف اور بڑے لوگ بیٹھے ہوں) تو ہم تیرے پاس آئیں گے، تیری مجلس میں بیٹھیں گے اور تیری باتوں سے فائدہ اٹھائیں گے لیکن کیا کریں ان لوگوں کے ہوتے ہوئے تو ہم یہاں نہیں بیٹھ سکتے۔

اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں اور پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا کہ ان پُرفریب کھوکھلی باتوں کی طرف ہرگز مائل نہ ہوں اور زندگی کے ہر دَور میں ہمیشہ باایمان، پاک دل افراد کے ساتھ رہیں کہ جو سلمانؓ و ابوذرؓ جیسے ہوں اگرچہ ان کا ہاتھ ثروتِ دنیا سے خالی ہو اور ان کا لباس کھردرا ہو۔

ان آیات کے نزول کے بعد رسول اللہؐ ان افراد کی تلاش کے لیے اٹھے۔ (یہ مخلص مومنین ان سرمایہ داروں کی باتیں سُن کر ناراض تھے اور مسجد کے ایک گوشے میں جا کر عبادتِ پروردگار میں مشغول ہوگئے تھے)۔

آخر کار رسول اللہؐ نے انہیں مسجد کے آخری حصے میں پالیا۔ وہ لوگ ذکرِ الٰہی میں مشغول تھے۔ آپؐ نے فرمایا:

حمد ہے اس خدا کے لیے جس نے موت سے پہلے یہ حکم دیا کہ تم جیسے لوگوں کے ساتھ رہوں۔

معکم المحیا و معکم الممات

تمہارے ساتھ جینا اور تمہارے ساتھ مرنا ہی اچھا ہے۔[1]

تفسیر

پاک دل غریب لوگ

اصحاب کہف کے واقعے نے ہمیں جو بہت سے درس دیئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسانوں کی قدر و قیمت کا معیار منصب، ظاہری مقام اور دولت و ثروت نہیں ہے۔ اللہ کی راہ میں وزیر اور چرواہا ایک ہی صف میں ہیں۔ زیرِ بحث آیات میں درحقیقت اسی اہم مسئلے کو پیش کیا گیا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے: ان افراد کے ساتھ رہو کہ جو صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور صرف اسی کی پاک ذات کے طلبگار ہیں (واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغدٰوۃ والعشی یریدون وجھہ)۔

"واصبر نفسک" (اپنے آپ کو صابر بنا) — یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ

---

[1] مجمع البیان اور قرطبی — زیرِ بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

رسول اللہ پر متکبر دشمنوں اور بڑے اشراف کی طرف سے دباؤ تھا کہ غریب و فقیر مومنین کو اپنی بارگاہ سے دُور کر دیں لہٰذا اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ اس دباؤ کے مقابلے میں صبر و استقامت اختیار کرو اور ہرگز ان کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرو۔

"صبح و شام" کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ہر حالت میں اور زندگی بھر یادِ خدا میں محو رہتے ہیں۔

"یریدون وجھہ" (وہ اس کی ذات کے طلب گار ہیں) — یہ تعبیر ان کے خلوص اور اخلاص کی دلیل ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ خدا سے صرف اسی کو چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ بہشت کی نعمتیں اگرچہ بہت عظیم ہیں مگر وہ اس کی خاطر اللہ کی بندگی نہیں کرتے اور جہنم کا عذاب اگرچہ بہت دردناک ہے لیکن وہ اس کے خوف سے عبادتِ الٰہی نہیں کرتے بلکہ صرف اس کی پاک ذات کی خاطر اس کی پرستش کرتے ہیں۔ ان کے دل کی آواز تو بس یہ ہے:

ما از تو بغیر از تو نداریم تمنا

ہم تجھ سے تیرے علاوہ کوئی تمنا نہیں رکھتے۔

اور یہ اللہ کی اطاعت، اس کی بندگی، اس کے عشق اور اس پر ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ ہے[1]

اس کے بعد تاکید کے طور پر گفتگو جاری ہے: یہ باایمان کہ جو ظاہراً فقیر سے ہیں ان سے ہرگز اپنی آنکھیں نہ پھیرو اور دنیا کی زینتوں کی خاطر خدا سے بے خبر ان متکبرین کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو (ولا تعد عیناک عنھم ترید زینة الحیوٰة الدنیا)[2]

مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: اور جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے ان کی اطاعت نہ کرو (ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذکرنا)۔ ان کی کہ جنہوں نے ہوائے نفس کی پیروی کی ہے (واتبع ھواہ)۔ وہی کہ جن کے سارے کام افراط پر مبنی ہیں۔ جو سوچ بچار اور غور و فکر سے کام نہیں لیتے اور جن کے کام حد سے بڑھے ہوئے ہیں (وکان امرہ فرطا)[3]

---

[1] "وجہ" کبھی "ذات" کے معنی میں آتا ہے اور کبھی "چہرے" کے معنی میں۔ اس قسم کے مواقع پر اس لفظ کے انتخاب کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۲۰۵ (اردو ترجمہ) پر تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

[2] "لا تعد" "عدا یعدو" کے مادہ سے تجاوز کرنے کے معنی میں ہے لہٰذا جملے کا مفہوم یہ ہوگا "ان سے آنکھیں ہی نہ ہٹا کہ دوسرے پر نگاہ پڑے"۔

[3] "فرط" حد سے تجاوز کرنے کے معنی میں ہے اور ہر وہ چیز جو اپنی حد سے نکل کر اسراف ہو جائے اسے "فرط" کہتے ہیں۔

Marfat.com

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں گروہوں کی صفات کو ایک دوسرے کے مدِمقابل رکھ دیا ہے۔

حقیقی مومنین ۔ کہ جو تہی دست ہیں ۔ ان کے دل عشقِ خدا سے سرشار ہیں۔ وہ ہمیشہ اس کی یاد میں محو رہتے ہیں اور اُس سے فقط اس کے طلب گار ہیں۔

لیکن دولت مند متکبر یادِ خدا سے بالکل غافل ہیں۔ ہوائے نفس کے علاوہ ان کی کوئی طلب نہیں۔ ان کے سارے کام اعتدال کی حد سے بڑھے ہوئے ہیں اور وہ افراط و تجاوز سے کام لیتے ہیں۔

مذکورہ موضوع کی اس قدر اہمیت ہے کہ اگلی آیت میں قرآن صراحت کے ساتھ رسول اللہ سے کہتا ہے: کہہ دو کہ میرا تو یہ طریق کار ہے اور یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک حقیقت ہے جو چاہے ایمان لے آئے اور اس حقیقت کو قبول کر لے اور جو چاہے کافر ہو جائے (وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر)۔

لیکن یہ جان لو کہ یہ دنیا پرست ظالم کہ جو اپنی دنیاوی زندگی اور اس کی زیب و زینت پر اتراتے ہوئے سلمان و ابوذر جیسے لوگوں کے کھردرے لباس کا مذاق اڑاتے ہیں ان کا انجام بہت بُرا اور تاریک ہے کیونکہ "ہم نے ان ظالموں کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے کہ جس کے بلند خیموں نے چاروں طرف سے انہیں گھیر رکھا ہے (انا اعتدنا للظّٰلمین نارًا احاط بھم سرادقھا)۔

جی ہاں! وہ جب اس دنیاوی زندگی میں پیاسے ہوتے تو آواز دیتے اور خدام طرح طرح کے مشروبات ان کے سامنے لا حاضر کرتے لیکن ، جہنم میں جب وہ پانی مانگیں گے انہیں ایسا پانی پیش کیا جائے گا جو ایسی پگھلی ہوئی دھات کی مانند ہو گا کہ اگر چہرے کے قریب ہو تو اسے بھون دے (وان یستغیثوا یغاثوا بماءٍ کالمھل یشوی الوجوہ)[1] یہ پینے کی کیا بُری چیز ہے (بئس الشراب)۔ اور دوزخ کتنا بُرا ٹھکانا ہے (وساءت مرتفقًا)[2]

غور کیجئے ۔ وہ پانی کہ جو چہرے کے قریب ہو تو اسے بھون دے ، کیا پینے کے قابل ہے؟ یہ اس بنا پر ہے کہ یہ لوگ دنیا میں اچھے اچھے مشروبات پیا کرتے تھے جبکہ محروم اور مستضعف لوگوں کے دلوں کو جلایا کرتے تھے۔ اب یہ وہی آگ ہے جس نے یہ جسمانی شکل اختیار کر لی ہے۔

---

1. "مُھل" (بروزن "قفل") ۔ جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے تہ نشین تیل کو کہتے ہیں کہ جو عام طور پر گندا، کثیف، گاڑھا اور بدذائقہ ہوتا ہے لیکن بعض مفسروں نے اس لفظ سے ہر قسم کی پگھلی ہوئی دھات مراد لیا ہے اور "یشوی الوجوہ" (چہروں کو بھون دیتا ہے) یہ تعبیر دوسرے معنی کی تائید کرتی ہے۔
2. "مرتفق" "رفق" اور "رفیق" کے مادہ سے ہے۔ اس سے دوستوں کے جمع ہونے کی جگہ مراد ہے۔

Marfat.com

عجیب بات یہ ہے کہ قرآن نے یہاں دولت مندوں اور ظالم و بے ایمان مفاد پرستوں کے لیے جہنم میں بھی اس جہان کے تکلفات کا ذکر کیا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ دنیا میں دولت مندوں کے جو "سرادق" یعنی بلند خیمے (یہ لفظ فارسی کے لفظ "سراپردہ" سے لیا گیا ہے) ہوتے ہیں ان میں غریبوں کا کوئی گزر نہیں۔ یہاں یہ امیروں کے عیش و نوش اور بادہ گساری کے لیے ہوتے ہیں لیکن وہاں ان کے بلند خیمے "دوزخ کے بلند بھڑکتے ہوئے شعلے" ہیں۔ یہاں ان کے عیش کدوں میں طرح طرح کے مشروبات ہیں اور جب وہ ساقی کو آواز دیتے ہیں تو وہ شراب کے رنگا رنگ جام ان کے سامنے لا حاضر کرتے ہیں۔ دوزخ میں بھی ان کیلئے ساقی اور مشروبات موجود ہیں لیکن وہاں کا مشروب پگھلی ہوئی دھات کی مانند ہوگا یتیموں کے اشکِ سوزاں اور محتاجوں کی آہ آتشیں سے اُبلتا ہوا پانی۔

جی ہاں وہاں جو کچھ ہے وہ یہاں کی کیفیتوں کا تجسم ہے (پناہ بخدا)۔

قرآن حکیم کی روش چونکہ تطبیقی اور تربیتی ہے لہٰذا خود غرض دنیا پرستوں کے اوصاف اور ان کا کیفر کردار بیان کرنے کے بعد حقیقی مومنین کی حالت اور ان کا انتہائی زیادہ اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے۔ پہلے مختصر طور پر اور پھر ذرا تفصیل سے ۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ کہ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے ہم ان نیکو کاروں کا اجر و ثواب ضائع نہیں کریں گے (ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات انا لا نضیع اجر من احسن عملاً)۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جنّاتِ جاوداں ان کے لیے ہیں (اولئك لهم جنّات عدن)۔ وہ باغاتِ بہشت کہ جن کے درختوں تلے نہریں رواں ہیں (تجری من تحتهم الانهار)۔ وہ سونے کے کنگنوں سے آراستہ ہوں گے (یحلون فیها من اساور من ذهب)[1] اور وہ سبز رنگ کے نازک دبیز ریشم کے فاخرہ لباس زیبِ تن کیے ہوں گے (و یلبسون ثیاباً خضراً من سندس و استبرق)۔ جبکہ وہ تختوں اور کرسیوں پر تکیہ لگائے ہوں گے (متکئین فیها علی الارائك)[2]

واہ کیا کہنا! کیا اچھی چیز ہے (نعم الثواب)۔

اور دوستوں کا کیسا اچھا اکٹھ ہے (وحسنت مرتفقاً)۔

٭ ٭ ٭

---

[1] "اساور" "اسوره" (بروزن "مشوره") کی جمع ہے اور خود "اسوره" بھی "سوار" (بروزن "غبار" اور "کتاب") کی جمع ہے۔ اصل میں یہ فارسی لفظ "دستوار" (کنگن) سے لیا گیا ہے۔ اسے عربی میں ڈھالنے کے بعد اس سے عربی کے فعل بھی مشتق ہوئے ہیں۔

[2] "ارائک" "اريكة" کی جمع ہے۔ یہ اس تخت کو کہتے ہیں جو چاروں طرف سے سائبان کی طرح ڈھانپا گیا ہو۔ راغب کے بقول یہ اصل میں "اراک" سے ہے جو ایک مشہور درخت (پیلو) کا نام ہے' سے لیا گیا ہے کیونکہ عرب بعض اوقات اس درخت سے ایک خاص طرح کا سائبان بناتے تھے۔ یا یہ لفظ "اروک" سے لیا گیا ہے کہ جو اقامت اور توقف کرنے کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

چند اہم نکات

۱۔ طبقاتی تفاوت ۔ معاشرے کی عظیم مشکل ہے : صرف یہی آیات نہیں کہ جو معاشرے کی امیر اور غریب کی تقسیم کے خلاف جنگ کر رہی ہیں بلکہ قرآن کی ایسی بہت سی آیات ہیں ۔ ان میں سے بعض کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں اور بعض آئندہ آئیں گی ۔

وہ معاشرہ کہ جس میں ایک گروہ (جو ظاہر ہے اقلیت میں ہوگا) بڑی خوشحال زندگی گزار رہا ہو، ناز و نعمت میں غرق ہو، اسراف میں ڈوبا ہو اور ساتھ ہی طرح طرح کے مفاسد اور برائیوں میں آلودہ ہو جبکہ دوسرا گروہ جو کہ اکثریت میں ہے زندگی کی ابتدائی ضروریات سے بھی محروم ہو ۔ یہ وہ معاشرہ ہے کہ جسے نہ اسلام پسند کرتا ہے اور نہ وہ حقیقی انسانی معاشرے کا رنگ رکھتا ہے ۔

ایسے معاشرے میں کبھی سکون و اطمینان نہیں ہو سکتا ۔ اس پر ہمیشہ ظلم و ستم، لوٹ کھسوٹ اور استعمار و استبداد کی حکمرانی ہوگی ۔ ایسے معاشرے میں آزادیاں سلب ہوں گی ۔ خونین جنگیں عموماً ایسے ہی معاشروں سے اٹھی ہیں اور ایسے معاشرے سے پریشانیاں کبھی ختم نہیں ہو سکتیں ۔

اصولی طور پر یہ سب نعمات الٰہی آخر کیوں چند لوگوں کے ہاتھ میں ہوں اور معاشرے کی اکثریت طرح طرح کی محرومیوں، درد و رنج، بھوک اور بیماریوں میں ایڑیاں رگڑ رہی ہو ۔ یقیناً ایسا معاشرہ کینہ، بغض، دشمنی، حسد، غرور، ظلم، خود پرستی، استکبار اور تباہی کے ایسے ہی عوامل سے پُر ہوگا ۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ تمام عظیم انبیاء خصوصاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایسے نظام کے خلاف شدت سے اور مسلسل جہاد کیا تو اس کی بھی یہی وجہ ہے ۔

ایسے معاشرے میں دولت مندوں کی محفلیں ہمیشہ تہی دستوں کی محفلوں سے الگ ہوتی ہیں ۔ ان کے محلے الگ ہوتے ہیں، سیر و تفریح کے مراکز جُدا ہوتے ہیں اور مل بیٹھنے کی جگہیں جدا ہوتی ہیں ۔ (اگر غریبوں کے لیے بھی کوئی تفریح کی جگہ ہو تو وہاں کے طور طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں) ۔ یہاں تک کہ ان کے قبرستان بھی جُدا جُدا ہیں ۔

یہ تفاوت اور تفریق کہ جو انسانی تقاضوں کے خلاف ہے اور تمام انسانی قوانین کی روح کے خلاف ہے کسی مرد خدا کے لیے قابل برداشت نہ تھی اور نہ ہے ۔ زمانہ جاہلیت میں شدت سے یہ تفریق موجود تھی یہاں تک کہ وہ لوگ رسولِ اسلام کا سب سے بڑا عیب یہی سمجھتے تھے کہ سلمان و ابوذر جیسے پا برہنہ اور تہی دست لوگوں نے آپ کو گھیر رکھا ہے ۔

حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں بھی بت پرست اشراف اور "بڑے لوگ" آپ پر یہی اعتراض کرتے تھے کہ : "پست لوگوں" (اراذل) نے کیوں تیری پیروی کی ہے ؟

Marfat.com

کیونکہ دل کے یہ اندھے بڑائی اور پستی کا معیار درہم و دینار کو سمجھتے تھے۔ قرآنی الفاظ میں:

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا۔ (ہود - ٢٧)

ہم نے دیکھا ہے کہ ان خود پرست بے ایمان لوگوں کو با ایمان غریبوں کے ساتھ چند لمحے بھی بیٹھنا گوارا نہیں۔

اور تاریخ اسلام شاہد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیسے ان خود پرستوں کو ایک طرف کر کے محروم لوگوں کو مواقع فراہم کیے اور ان کے ذریعے ایک حقیقی توحیدی معاشرہ تشکیل دیا۔ وہ معاشرہ کہ جس میں مخفی صلاحیتیں بیدار ہوئیں اور معاشرے میں انسانی وقار کا معیار انسانی کمالات، انسانی قدریں۔ تقوی، علم، ایمان، جہاد اور عمل صالح قرار دیا۔

آج بھی ایسے معاشروں کی تشکیل کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پیغمبر اسلام کے طرز عمل کو نمونہ بنایا جائے۔ تعلیم و تربیت اور صحیح قوانین کی بنیاد پر طبقاتی فکر و نظر کا خاتمہ کر دیا جائے اور ان صحیح قوانین کو پوری طرح سے رائج کیا جائے چاہے عالمی استکبار کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے اور وہ اس کی مخالفت کے لیے ہی کیوں نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ ہمیں جدوجہد کرنا چاہیئے کیونکہ اس کے بغیر ایک صحیح و سالم حقیقی انسانی معاشرہ ہرگز تشکیل نہیں پا سکتا۔

٢- دونوں جہانوں کی زندگی کا موازنہ: ہم نے بارہا کہا ہے کہ تجسیم اعمال قیامت سے مربوط ایک نہایت اہم مسئلہ ہے یعنی اس جہان میں جو کچھ ہوگا وہ اس جہان کی ایک بڑی کی ہوئی تصویر (ENLARGED PICTURE) ہے وہ اسی دنیا کا تکامل و ارتقاء ہے۔ ہمارے اعمال و افکار، معاشرتی طور طریقے، مختلف اخلاقی عادات و خصائل اس جہان میں مجسم ہوں گے اور ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔

زیر بحث آیات اس حقیقت کی زندہ تصویر ہیں۔

خود پرست اور ظالم دولت مند کہ جو اس جہان میں محلوں میں تکیہ لگائے ہوئے مے نوشی میں سرمست تھے اور جن کی کوشش تھی کہ ان کی ہر چیز غریب مومنین سے الگ ہو۔ وہ وہاں بھی بلند خیموں کے حامل ہوں گے لیکن وہ خیمے جلا ڈالنے والی آگ کے ہوں گے۔ کیونکہ ظلم درحقیقت آتش سوزاں ہے کہ جو مستضعفین کے خرمن حیات اور سرمایۂ امید کو جلا دیتی ہے۔ وہاں بھی انہیں مشروبات ملیں گے۔ وہاں شراب دنیا کا باطن جسمانی روپ اختیار کرے گا۔ وہاں کے مشروبات محروم انسانوں کے خونِ دل کا نتیجہ ہوں گے۔ اس دنیا میں ان کو ملنے والا مشروب نہ فقط ان کی انتڑیوں کو جلا دے گا بلکہ پگھلی ہوئی دھات کی مانند جب وہ پینے کے لیے اپنا چہرہ اس کے قریب کریں گے تو وہ چہروں کو بھون دے گا۔

لیکن اس کے برعکس جن لوگوں نے اپنی پاکدامنی کی حفاظت کی اصول عدالت کا احترام کیا، ان چیزوں کو

Marfat.com

ٹھکرا دیا، سادہ زندگی پر قناعت کی اور اس دنیا کی محرومیوں کو اس لیے قبول کر لیا کہ عدل قائم ہو۔ وہاں ان کے لیے بہشت بریں کے باغات ہونگے جن کے درختوں تلے نہریں رواں ہوں گی۔ وہ فاخرہ لباس پہنے ہونگے، زینت و رنگ اور شوق انگیز محفلیں ان کے انتظار میں ہوں گی۔ یہ تجسم ہے ان کی پاک نیت کا کہ وہ یہ نعمات دُنیا تمام بندگانِ خدا کے لیے چاہتے ہیں۔

۳۔ ہَوا پرستی اور خدا سے غفلت: انسان کی روح میں خدا سمایا ہوتا ہے یا ہوائے نفس — یہ دونوں چیزیں اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔ نفس پرستی درحقیقت خدا اور خلقِ خدا سے غفلت کا سرچشمہ ہے۔ ہَوا پرستی تمام اخلاقی اصولوں سے دُوری کا سبب ہے۔

مختصر یہ کہ ہَوا پرستی انسان کو خود محور بنا دیتی ہے اور دنیا کے تمام حقائق سے دُور کر دیتی ہے۔ ایک نفس پرست انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے علاوہ کچھ نہیں سوچتا۔ علم، آگاہی، ایثار، قربانی اور روحانیت کا اس کے لیے کوئی مفہوم نہیں۔

مندرجہ بالا آیات میں ہَوا پرستی اور خدا سے غفلت کے درمیان رابطہ اچھی طرح سے واضح ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے:

ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذكرنا واتبع هواه وكان امره فرطا

پہلے خدا سے غفلت کا ذکر ہے اور پھر خواہشات کی پیروی کا۔ یہ بات لائق توجہ ہے کہ ان کا نتیجہ تجاوز اور افراط بیان کیا گیا ہے جو کہ مطلق کی صورت میں ہے۔ نفس پرست انسان ہمیشہ افراط میں گرفتار رہتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ جب وہ مادی لذتوں میں پڑتا ہے تو پھر زیادہ اور زیادہ کی طلب ہوتی ہے۔ کل ایک شخص نشہ آور چیز کی جس مقدار سے مست ہوتا تھا آج اتنی مقدار سے اسے نشہ نہیں ہوتا بلکہ وہ تدریجاً اس کی مقدار میں اضافہ کرتا ہے۔ کل ایک شخص کو اپنے ساز و سامان کے ساتھ اگر نسبتاً ایک چھوٹی کوٹھی کافی معلوم ہوتی تھی تو آج وہ اسے کم سمجھتا ہے۔ انسان کی تمام خواہشات کا یہی عالم ہے یہاں تک کہ وہ اسی چکر میں اپنے آپ کو تباہ کر لیتا ہے۔

۴۔ دوسرے جہان میں لباسِ زینت: ممکن ہے بہت سے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دنیا کی زیب و زینت کی مذمت کی ہے لیکن مومنین کے لیے ایسی ہی زیب و زینت کا آخرت میں وعدہ کیا ہے۔ طلائی زیورات، باریک و دبیز ریشمی لباس اور خوبصورت تخت وغیرہ۔

اس سوال کے جواب میں پہلے ہم اس نکتے کی طرف توجہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم توجیہیں نکالنے والوں کی طرح، ان تمام الفاظ کو معنوی مفاہیم کے لیے ہرگز کنایہ قرار نہیں دیں گے کیونکہ ہم نے خود قرآن سے سیکھا ہے کہ معاد و قیامت کا ایک پہلو روحانی ہے اور ایک پہلو جسمانی بھی ہے۔ لہٰذا اس جہان کی لذتیں بھی دونوں طرح کی ہیں۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ وہاں کی روحانی لذتوں کا مقابلہ جسمانی لذتوں سے نہیں کیا جا سکتا

Marfat.com

اس کے باوجود اس حقیقت کو نہیں چھپایا جاسکتا کہ اُس جہان کی نعمتیں ہمارے لیے ایک ہیولے کی طرح ہیں کہ جسے ہم دور سے دیکھ رہے ہوں۔ وہاں کی باتیں ہمارے لیے ایک اشارے کی مانند ہیں کیونکہ وہ جہان ہمارے لیے ایسے ہی ہے جیسے شکمِ مادر میں موجود بچے کے لیے ہمارا یہ جہان۔

ماں اپنے شکم کے بچے سے اس دنیا کے بارے میں کچھ کہہ سکے تو اس دنیا کی خوبصورتی، خورشید درخشاں، ماہ تاباں، رواں چشموں، باغات، رنگ برنگے پھولوں اور ایسی دوسری چیزوں کے بارے میں کچھ اشارے ہی کیے جاسکیں گے۔ چونکہ عالمِ جنین میں بچے کو سمجھانے کے لیے کافی و وافی الفاظ نہیں ہیں۔ اسی طرح رحمِ دنیا میں ہماری نظر محدود ہے۔ یہاں واضح طور پر قیامت کی مادی ومعنوی نعمات کا پورا ادراک ممکن نہیں ہے۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد اب ہم اس سوال کے جواب کی طرف آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس دنیا کی زیب و زینت کی مذمت اس لیے کرتا ہے کہ یہ دنیا محدود ہے اور اگر کوئی یہاں پر زیب و زینت میں پڑے گا تو ایسی زندگی کی فراہمی کے لیے وہ طرح طرح کے ظلم اور زیادتی کا مرتکب ہوگا اور ایسی زندگی پانے کے بعد وہ غفلت میں جا پڑے گا۔ اس راستے میں تفریقات اور طبقے پیدا ہو جاتے ہیں جن کے باعث کینے، حسد، عداوتیں اور بالآخر خون ریزیاں جنم لیتی ہیں۔ لیکن اس جہان کی ہر چیز فراواں ہے۔ وہاں ایسی زینتوں کے حصول سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا اور نہ وہاں ان چیزوں کا حصول تفریق اور محرومیت کا سبب بنتا ہے، نہ وہاں اس سے کینہ اور نفرت ابھرتی ہے اور نہ معنویت و روحانیت سے معمور اس ماحول میں انسان خدا سے غافل ہوتا ہے۔ نہ وہاں چیزوں کی حفاظت کا مسئلہ ہے اور نہ ہی رقیبوں کے حسد کا۔ یہ چیز وہاں غرور و تکبر کا باعث بنتی ہے اور نہ خدا اور خلقِ خدا کی دُوری کا۔

لہٰذا اہلِ بہشت عظیم روحانی نعمتوں کے ساتھ ساتھ اس جسمانی لذت سے کیوں محروم رہیں جبکہ اس کا کوئی ناپسندیدہ نتیجہ نہیں ہے۔

۵۔ سرمائے کی وجہ سے سرمایہ داروں کی قربت: زیرِ بحث آیات ہمیں جو ایک اور نکتہ سکھاتی ہیں یہ ہے کہ ہم کسی گروہ کو ہدایت و ارشاد اس لیے ترک نہ کریں کہ وہ دولت مند ہے اور خوشحال زندگی گزارتا ہے۔ ایسے لوگوں کے گرد سرخ لکیر نہیں کھینچ دینا چاہیئے بلکہ قابلِ مذمت یہ ہے کہ ہم اُن کی مادی زندگی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کے قریب ہوں اور قرآن کے بقول "تريد زينة الحيٰوة الدنيا" (تم دنیاوی زندگی کے طلبگار ہو) کے مصداق نہ بنیں لیکن اگر مقصد ان کی ہدایت اور ارشاد ہو۔ یہاں تک کہ مقصد ان کے وسائل سے مثبت اور تعمیری معاشرتی و اجتماعی ضروریات کے لیے فائدہ اٹھانا ہو تو ان سے رابطہ قائم رکھنا نہ صرف یہ کہ مذموم نہیں ہے بلکہ ضروری ہے۔

Marfat.com

(۳۲) وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ
مِنْ أَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝
(۳۳) كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا وَّفَجَّرْنَا
خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۝
(۳۴) وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ أَنَا
أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّأَعَزُّ نَفَرًا ۝
(۳۵) وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ قَالَ مَا أَظُنُّ أَنْ
تَبِيْدَ هٰذِهٖ أَبَدًا ۝
(۳۶) وَّمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ إِلٰى رَبِّيْ لَأَجِدَنَّ
خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝

ترجمہ

(۳۲) ان سے مثال بیان کرو کہ دو شخص تھے۔ ایک کو ہم نے قسم قسم کے انگوروں کے دو باغ دے رکھے تھے ان کے گرداگرد کھجور کے درخت تھے اور ان دونوں کے درمیان اچھی بابرکت کھیتی تھی۔

(۳۳) دونوں باغ پھلتے پھولتے تھے اور ان کے بار آور ہونے میں کوئی کمی نہ تھی۔ ان دونوں کے بیچوں بیچ ایک نہر گزرتی تھی۔

(۳۴) اس باغ کے مالک کو خوب پیداوار ملتی تھی لہٰذا جب وہ اپنے دوست سے

Marfat.com

بات کرنے لگا تو اُس نے کہا : مَیں دولت کے لحاظ سے تجھ سے برتر ہوں اور میرے پاس زیادہ طاقتور افراد ہیں ۔

۳۵ حالانکہ وہ اپنے اوپر ظلم کر رہا تھا۔ پھر وہ اپنے باغ میں داخل ہوا اور کہنے لگا کہ میرا نہیں خیال کہ یہ باغ کبھی اجڑ جائے گا ۔

۳۶ اور مجھے نہیں توقع کہ قیامت برپا ہوگی اور اگر میں اپنے رب کی طرف پلٹ بھی گیا (اور قیامت آبھی گئی) تو مجھے اس سے بہتر جگہ ملے گی ۔

تفسیر

مستضعفین کے مقابلے میں مستکبرین کا مؤقف

گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ دنیا پرست کس طرح سے کوشش کرتے ہیں کہ وہ تہی دست اور غریب مردانِ حق سے دُور دُور رہیں ۔ ہم نے یہ بھی پڑھا ہے کہ دوسرے جہان میں ان کا انجام کیا ہوگا ۔

زیر بحث آیتوں میں دو دوستوں یا دو بھائیوں کی داستان مثال کے طور پر بیان کی گئی ہے ۔ ان میں سے ہر ایک مستکبرین اور مستضعفین کا ایک نمونہ تھا ۔ ان کی طرزِ فکر اور ان کی گفتار و کردار ان دونوں گروہوں کے مؤقف کا ترجمان تھا ۔

پہلے فرمایا گیا ہے : اے رسول ! ان سے دو شخصوں کی مثال بیان کرو کہ جن میں سے ایک کو ہم نے انگوروں کے دو باغ دیئے تھے ۔ ان میں طرح طرح کے انگور تھے ۔ ان کے گرداگرد کھجور کے درخت تھے آسمان سے باتیں کر رہے تھے ۔ ان دونوں باغوں کے درمیان ہری بھری کھیتی تھی (واضرب لهم مثلا رجلين جعلنا لاحدهما جنتين من اعناب وحففناهما بنخل وجعلنا بينهما زرعًا) ۔ ایسے باغ اور کھیتیاں جن میں ہر چیز خوب تھی ۔ انگور بھی تھے ، کھجوریں بھی تھیں ، گندم اور دوسرا اناج بھی تھا ۔ خودکفیل کھیتیاں تھیں ۔ یہ دونوں باغ پیداوار کے لحاظ سے بھرے پُرے تھے ۔ درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے اور کھیتوں کے پودے خوب خوشہ دار تھے ۔ ان دونوں باغوں میں کسی چیز کی کمی نہ تھی (کلتا الجنتين اٰتت اكلها ولم تظلم منه شيئًا) ۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ پانی جو ہر چیز کے لیے مایۂ حیات ہے ، خصوصاً باغات و زراعت کیلئے ، انہیں فراہم تھا ۔ کیونکہ دونوں باغوں کے درمیان ہم نے ایک نہر جاری کی تھی (وفجرنا خلالهما نهرًا) ۔

Marfat.com

اس طرح سے ان باغات اور کھیتیوں کے مالک کو خوب پیداوار ملتی تھی (وکان لہ ثمر)۔
دنیا کا مقصد پورا ہو رہا ہو اور تو کم ظرف اور بے وقعت انسان اپنی دنیاوی مراد پا کر غرور و تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور سرکشی کرنے لگتا ہے۔ پہلے پہلے وہ دوسروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ باغات کے اس مالک نے بھی اپنے دوست سے بات کرتے ہوئے کہا: میں دولت اور سرمائے کے لحاظ سے تجھ سے برتر ہوں، میری آبرو، عزت اور حیثیت تجھ سے زیادہ ہے (فقال لصاحبه وهو يحاوره انا اكثر منك مالاً و اعز نفرًا)۔ اور افرادی قوت بھی میرے پاس بہت زیادہ ہے۔ مال و دولت اور اثر و رسوخ میرا زیادہ ہے۔ معاشرے میں میری حیثیت زیادہ ہے۔ تُو میرے مقابلے میں کیا ہے اور تُو کس کھاتے میں ہے؟

آہستہ آہستہ اس کے خیالات بڑھتے چلے گئے اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ دنیا کو جاوداں، مال و دولت کو ابدی اور مقام و حشمت کو دائمی خیال کرنے لگا۔ وہ مغرور تھا حالانکہ وہ خود اپنے آپ پر ظلم کر رہا تھا۔ ایسے میں اپنے باغ میں داخل ہوا اس نے ایک نگاہ سرسبز درختوں پر ڈالی جن کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے خم ہو گئی تھیں۔ اس نے اناج کی ڈالیوں کو دیکھا، نہر کے آب رواں کی لہروں پر نظر کی کہ جو چلتے چلتے درختوں کو سیراب کر رہا تھا۔ ایسے میں وہ سب کچھ بھول گیا اور کہنے لگا "میرا خیال نہیں کہ میرا باغ بھی کبھی اجڑے گا" (ودخل جنته وهو ظالم لنفسه قال ما اظن ان تبيد هٰذه ابدًا)۔

پھر اُس نے اس سے بھی آگے کی بات کی۔ اس جہان کا دائمی ہونا چونکہ عقیدۂ قیامت کے منافی ہے لہٰذا وہ انکارِ قیامت کا سوچنے لگا۔ اُس نے کہا:

میرا ہرگز نہیں خیال کہ کوئی قیامت بھی ہے (وما اظن الساعة قائمة) یہ تو وہ باتیں ہیں جو بعض لوگوں نے جی بہلانے کے لیے بنا رکھی ہیں۔

پھر مزید کہنے لگا: فرض کیا قیامت ہو بھی اور میں اپنی اس حیثیت اور مقام کے ساتھ اپنے رب کے پاس جاؤں بھی تو یقیناً اُس سے بہتر جگہ پاؤں گا (ولئن رددت الى ربى لاجدن خيرًا منها منقلبًا)۔

وہ ان خام خیالوں میں غرق تھا اور ایک کے بعد دوسری فضول بات کرتا جاتا تھا کہ اس کا باایمان ساتھی بول اٹھا (اس نے جو باتیں کیں اُن کا ذکر آئندہ آیات میں آرہا ہے)۔

⁂ ⁂ ⁂

Marfat.com

(۳۷) قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ
تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ۝
(۳۸) لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝
(۳۹) وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ
اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ۝
(۴۰) فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا
حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاۗءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ۝
(۴۱) اَوْ يُصْبِحَ مَاۗؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ۝

ترجمہ

(۳۷) جب وہ یہ باتیں کر رہا تھا تو اس کے (باایمان) دوست نے کہا: کیا تو اس
خدا سے کافر ہوگیا ہے کہ جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور پھر
تجھے پورا شخص بنایا۔

(۳۸) لیکن میرا تو ایمان ہے کہ اللہ میرا رب ہے اور میں کسی کو اپنے رب کا شریک
قرار نہیں دیتا۔

(۳۹) جب تُو اپنے باغ میں داخل ہوا تو تُو نے یہ کیوں نہیں کہا کہ یہ نعمت اللہ کی
منشا سے ہے اور اس کے علاوہ کوئی قوت نہیں ہے، اگر تُو مجھے مال و اولاد کے
لحاظ سے کم پاتا ہے (تو یہ کوئی اہم بات نہیں ہے)۔

Marfat.com

(۴۰) بعید نہیں کہ میرا پروردگار مجھے تیرے باغ سے بہتر عطا کر دے اور تیرے باغ پر آسمان سے کوئی ایسا عذاب نازل کر دے کہ جو اسے چٹیل میدان میں بدل دے کہ جس پر پاؤں پھسل پھسل جائیں۔

(۴۱) یا اس کا پانی زمین کی تہوں میں ایسا اتر جائے کہ تُو اسے پا بھی نہ سکے۔

تفسیر

مستضعفین کا جواب

ان آیات میں اُس مغرور، بے ایمان، خودغرض دولت مند کی بے بنیاد باتوں کا جواب اس کے مومن دوست کی زبانی دیا گیا ہے۔ پہلے وہ خاموشی سے اس کوتاہ فکر انسان کی باتیں سنتا رہا تاکہ جو کچھ اس کے اندر ہے باہر آجائے اور پھر ایک ہی بار اسے جواب دیا جائے۔ "اُس نے کہا: کیا تُو اس خدا سے کافر ہو گیا ہے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور پھر تجھے پورا شخص بنایا (قال له صاحبه وهو يحاوره اكفرت بالذي خلقك من تراب ثم من نطفة ثم سوّٰك رجلًا)۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ گزشتہ آیتوں میں مغرور شخص کی جو باتیں ہم نے پڑھی ہیں ان میں وجودِ خدا کا صریح انکار تو موجود نہیں ہے جبکہ ایک توحید پرست شخص اسے جو جواب دے رہا ہے ظاہراً تو سب سے پہلے اُسے انکارِ خدا پر سرزنش کر رہا ہے اور اسے تخلیقِ انسان کے حوالے سے خدائے عالم و قادر کی طرف متوجہ کر رہا ہے کیونکہ تخلیقِ انسان دلائلِ توحید میں سے بہت واضح دلیل ہے۔

وہ خدا کہ جس نے ابتداء میں انسان کو خاک سے پیدا کیا۔ درختوں اور نباتات کی جڑوں نے زمین سے غذا حاصل کی۔ پھر نباتات حیوانات کی غذا بنے۔ انسان نے نباتات اور حیوانات سے غذا حاصل کی اور اس غذا کی قوت سے انسان کا نطفہ بنا۔ جس نے رحمِ مادر میں تکمیل کے مراحل طے کیے۔ وہ دنیا میں آیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک پورے انسان میں تبدیل ہو گیا۔ وہ انسان کہ جو موجوداتِ زمین میں تمام سے برتر ہے۔ جو سوچتا ہے، غور و فکر کرتا ہے، ارادہ کرتا ہے اور سب چیزوں کو اپنا مطیع بنا لیتا ہے۔

جی ہاں۔ ظاہراً ایک بے حیثیت مٹی کا ایسے عجیب و غریب موجود میں تبدیل ہونا جس کی مشینری جسم و روح کے پیچیدہ آلات پر مشتمل ہے۔ توحید کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔

مفسرین نے مذکورہ سوال کے جواب میں مختلف تفسیریں پیش کی ہیں، مثلاً:

۱۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس مغرور شخص نے صراحت کے ساتھ معاد اور قیامت کا انکار کیا ہے یا پھر اسے

Marfat.com

شک کی نظر سے دیکھا ہے جس کا لازمی نتیجہ انکارِ خدا ہے کیونکہ معادِ جسمانی کے منکر درحقیقت قدرت خدا کے منکر ہیں۔ انہیں اس بات پر یقین نہیں کہ منتشر ہو جانے کے بعد مٹی پھر سے لباسِ حیات پہن سکے گی۔ لہٰذا اس باایمان شخص نے خاک سے انسان کی پہلی خلقت، پھر نطفے سے اس کی تخلیق اور پھر دوسرے مراحل کے حوالے سے اسے پروردگار کی بے پایاں قدرت کی طرف متوجہ کیا تاکہ وہ جان لے کہ معاد کے کئی مناظر تو ہم ہمیشہ اپنی اسی زندگی میں دیکھتے رہتے ہیں۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے شرک اور کفر کی وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ مالکیت خود اس کی اپنی طرف سے ہے۔ یعنی وہ اپنے لیے مالکیت میں اس کا قائل تھا اور اپنی مالکیت کو جاودانی خیال کرتا تھا۔

۳۔ تیسرا احتمال بھی بعید نظر نہیں آتا، وہ یہ کہ اس نے اپنی کچھ باتوں میں خدا کا انکار کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی ساری باتیں بیان نہیں کیں۔ اس کا اندازہ اس باایمان شخص کی باتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اگلی آیت میں وہ صاحب ایمان کہتا ہے کہ اگر تو اللہ کا انکار کرتا ہے اور راہ شرک اختیار کرتا ہے تو میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔

بہرحال مذکورہ تینوں احتمالات آپس میں غیر مربوط نہیں ہیں اور ہو سکتا ہے اس توحید پرست شخص کا اشارہ ان سب کی طرف ہو۔

اس کے بعد اس باایمان شخص نے اس کے کفر اور غرور کو توڑنے کے لیے کہا: لیکن میرا تو ایمان ہے کہ اللہ میرا پروردگار ہے اور مجھے اس عقیدے پر فخر ہے (لکنا ھو اللہ ربی) [۱]

تو اس بات پر نازاں ہے کہ تیرے پاس باغات، کھیتیاں، پھل اور پانی فراواں ہیں لیکن مجھے اس پر فخر ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے، میرا خالق و رازق وہ ہے، تجھے اپنی دنیا پر فخر ہے اور مجھے اپنے عقیدہ توحید و ایمان پر: "اور میں کسی کو اپنے رب کا شریک قرار نہیں دیتا" (ولا اشرک بربی احدًا)۔

توحید اور شرک کا مسئلہ انسان کی سرنوشت میں اہم ترین کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے بارے میں گفتگو جاری ہے: "جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو تو نے یہ کیوں نہیں کہا کہ یہ نعمت اللہ کی منشا سے ہے۔ تو نے اسے اللہ کی جانب سے کیوں نہیں جانا اور اس کا شکر کیوں نہیں بجا لایا (ولولا اذ دخلت جنتك قلت ما شاء الله) [۲]

---

[۱] لفظ "لکنا" دراصل "لکن انا" تھا۔ پھر یہ دونوں الفاظ آپس میں مدغم ہو گئے تو یہ صورت ہو گئی۔

[۲] "ماشاء اللہ" میں محذوف ہے۔ اس کی تقدیر یوں ہے:

هٰذا ما شاء الله

یہ وہ چیز ہے کہ جو اللہ نے چاہی ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

تُو نے کیوں نہیں کہا کہ اللہ کے سوا کسی کی کچھ طاقت نہیں (لاقوة الا باللہ)۔
اگر تُو نے زمین میں ہل چلایا ہے، بیج بویا ہے، درخت لگائے ہیں، قلمیں لگائی ہیں اور تجھے ہر موقع پر سب کچھ میسر آیا ہے یہاں تک کہ تو اس مقام پر پہنچا ہے تو سب اللہ کی قدرت سے استفادہ کرنے کی وجہ سے ہے۔ یہ تمام وسائل اور صلاحیتیں تجھے اللہ نے بخشی ہیں۔ اپنی طرف سے تو کچھ بھی تیرے پاس نہیں ہے اور اس کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہے۔
اس کے بعد اُس نے مزید کہا: یہ جو تجھے نظر آتا ہے کہ مَیں مال و اولاد کے لحاظ سے تجھ سے کم ہوں (تو یہ کوئی اہم بات نہیں ہے) (ان ترن انا اقل منك مالا و ولدًا)۔
اللہ تیرے باغ کی نسبت مجھے بہتر عطا کر سکتا ہے (فعسٰی ربی ان یؤتین خیرًا من جنتك)۔
بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدا آسمان سے تیرے باغ پر بجلی گرائے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ سرسبز و شاداب زمین ایسے چٹیل میدان میں بدل جائے کہ جہاں پاؤں پھسلتے ہوں (و یرسل علیها حسبانًا من السماء فتصبح صعیدًا زلقًا)۔
یا زمین کو حکم دے کہ وہ ہل جائے اور "یہ چشمے اور نہریں اس کی تہ میں ایسی چلی جائیں کہ پھر تُو انہیں پا نہ سکے (او یصبح ماؤها غورًا فلن تستطیع له طلبًا)۔
"حُسبان" (بروزن "لُقمان") دراصل "حساب" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ ایسے تیروں کے معنی میں استعمال ہونے لگا کہ جنہیں چلاتے ہوئے شمار کیا جاتا ہے۔ نیز یہ ایسی سزا کے معنی میں بھی ہے کہ جو کسی حساب کتاب کے تحت ہو مندرجہ بالا آیت میں اس کا یہی مفہوم ہے۔
"صعید" اصل میں "صعود" سے لیا گیا ہے، اس سے مراد زمین کے اوپر کی تہ ہے۔
"زلق" چٹیل میدان کو کہتے ہیں، جس پر کوئی گھاس پھونس نہ ہو اور جس پر انسان کا پاؤں پھسل پھسل جائے۔
(یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں ریت کو بہہ جانے سے روکنے کے لیے اور آبادیوں کو ریت کے طوفانوں میں دب جانے سے بچانے کے لیے کوشش کرتے ہیں کہ ایسے علاقوں میں نباتات اور درخت اگائے جائیں۔ یعنی ایسے علاقوں میں "زلق" اور پھسلنے کی کیفیت کو اس طرح سے کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے)۔
درحقیقت اس باایمان اور توحید پرست شخص نے اپنے مغرور ساتھی کو خبردار کیا کہ وہ ان نعمتوں سے دل

بقیہ گزشتہ حاشیہ: یا پھر یوں ہے:
ماشاء اللہ کائن
جو خدا چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔

Marfat.com

نہ باندھ لے کیونکہ ان میں کوئی چیز بھی بھروسے کے قابل نہیں ہے۔

دراصل وہ کہتا ہے کہ تُونے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا کم ازکم سُنا ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آسمانی بجلی لحہ بھر میں باغوں، گھروں اور کھیتوں کو مٹی کے ٹیلوں یا بے آب و گیاہ زمین میں بدل کے رکھ دیتی ہے۔ نیز تُونے سُنا ہے یا دیکھا ہے کبھی زمین پر ایسا زلزلہ آتا ہے کہ چشمے خشک ہو جاتے ہیں اور نہریں نیچے چلی جاتی ہیں اس طرح سے کہ وہ قابلِ اصلاح بھی نہیں رہتیں۔

جب تُو ان چیزوں کو جانتا ہے تو پھر یہ غرور و غفلت کس بنا پر؟ تُونے یہ منظر دیکھے ہیں تو پھر یہ دلبستگی آخر کیوں؟ تُو یہ کہتا ہے کہ مَیں نہیں سمجھتا کہ یہ نعمتیں کبھی فنا ہوں گی اور تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ ہمیشہ رہیں گی۔ یہ کیسی نادانی اور حماقت ہے؟

Marfat.com

(۴۲) وَاُحِيۡطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصۡبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيۡهِ عَلٰى مَاۤ اَنۡفَقَ فِيۡهَا وَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوۡشِهَا وَيَقُوۡلُ يٰلَيۡتَنِىۡ لَمۡ اُشۡرِكۡ بِرَبِّىۡۤ اَحَدًا ○

(۴۳) وَلَمۡ تَكُنۡ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنۡصُرُوۡنَهٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنۡتَصِرًا ○

(۴۴) هُنَالِكَ الۡوَلَايَةُ لِلّٰهِ الۡحَقِّ ؕ هُوَ خَيۡرٌ ثَوَابًا وَّخَيۡرٌ عُقۡبًا ○

ترجمہ

(۴۲) (بہرحال عذابِ الٰہی آپہنچا) اور اس کا سارا ثمرہ تباہ ہوگیا۔ اس کی جو لاگت آئی تھی اُس پر وہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ باغ کی حالت یہ تھی کہ اپنی ٹہنیوں پر اوندھا گرا پڑا تھا۔ اب وہ کہتا تھا اے کاش مَیں نے کسی کو اپنے رب کا شریک قرار نہ دیا ہوتا۔

(۴۳) اور کوئی جتھا نہ تھا جو خدا کے سوا اُس کی مدد کرتا اور نہ وہ آپ اپنی کچھ مدد کرسکتا تھا۔

(۴۴) اس وقت ثابت ہوا کہ ولایت (اور قدرت) خداوند حق کے لیے ہے کہ جس کے ہاں (اطاعت گزاروں کے لیے) بہترین ثواب اور بہترین انجام ہے۔

Marfat.com

تفسیر

اور ان کا انجام کار...

ان کی آپس کی گفتگو ختم ہو گئی۔ اس خدا پرست شخص کی باتوں کا اس مغرور و بے ایمان دولت مند کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے اُنہی جذبات اور طرزِ فکر کے ساتھ اپنے گھر لوٹ گیا۔ اسے اس بات کی خبر نہ تھی کہ اس کے باغوں اور سرسبز کھیتوں کی تباہی کے لیے اللہ کا حکم صادر ہو چکا ہے۔ اسے خیال نہ تھا کہ وہ اپنے تکبر اور شرک کی سزا اسی جہان میں پالے گا اور اس کا انجام دوسروں کے لیے باعثِ عبرت بن جائے گا۔

شاید اسی وقت کہ جب رات کی تاریکی ہر چیز پر چھائی ہوئی تھی، عذابِ الٰہی نازل ہوا۔ ممکن بجلی کی صورت میں یا وحشتناک طوفان کی شکل میں یا ہولناک زلزلے کی صورت میں اللہ کا عذاب نازل ہوا۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا اُس نے چند لمحوں میں تروتازہ باغات، سربفلک درخت اور خوشوں سے لدی کھیتیاں درہم برہم اور تباہ کر دیں۔ "اور عذابِ الٰہی حکم خدا سے ہر طرف سے اس کے ثمرہ پر محیط ہو گیا اور اسے نابود کر دیا (واحیط بثمرہ)۔

"احیط" "احاطہ" کے مادہ سے ہے اور ایسے مواقع پر یہ گھیر لینے والے ایسے عذاب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کے نتیجے میں مکمل نابودی ہے۔

دن چڑھا۔ باغ کا مالک باغ کی طرف چلا۔ سرکشی اس کے ذہن میں سمائی ہوئی تھی۔ وہ اپنے باغات کی پیداوار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھا۔ جب وہ باغ کے قریب پہنچا تو اچانک اُس نے وحشت ناک منظر دیکھا۔ حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی اور وہ وہاں بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔

اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ یہ خواب دیکھ رہا ہے یا حقیقت۔ سب درخت اوندھے پڑے تھے۔ کھیتیاں زیر و زبر ہو چکی تھیں۔ زندگی کے کوئی آثار وہاں دکھائی نہ دیتے تھے۔ گویا وہاں کبھی بھی شاداب و سرسبز باغ اور کھیتیاں نہ تھیں۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ حلق خشک ہو گیا۔ اس کے دل و دماغ سے سب غرور و نخوت جاتی رہی۔ اُسے ایسے لگا جیسے وہ ایک طویل اور گہری نیند سے بیدار ہوا ہے۔ وہ مسلسل اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔ اسے ان اخراجات کا خیال آ رہا تھا جو اس نے پوری زندگی میں ان پر صرف کیے تھے۔ اب وہ سب برباد ہو چکے تھے اور درخت اوندھے گرے پڑے تھے (فاصبح یقلب کفیه علیٰ ما انفق فیها وهی خاویة علیٰ عروشها)۔

اس وقت وہ اپنی فضول باتوں اور بیہودہ سوچوں پر پشیمان ہوا۔ وہ کہتا تھا: کاش میں نے کسی کو

Marfat.com

اپنے پروردگار کا شریک قرار نہ دیا ہوتا۔ اے کاش میں نے شرک کی راہ پر قدم نہ رکھا ہوتا (ویقول یالیتنی لم اشرك بربی احدًا)۔

زیادہ المناک پہلو یہ تھا کہ ان تمام مصائب و آلام کے سامنے وہ تن تنہا کھڑا تھا۔ "خدا کے علاوہ کوئی نہ تھا کہ جو اس مصیبتِ عظیم اور اتنے بڑے نقصان پر اس کی مدد کرتا" (ولم تکن له فئة ینصرونه من دون الله)۔ اور چونکہ اُس کا سارا سرمایہ تو یہی تھا جو برباد ہوگیا تھا۔ اب اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ لہٰذا " وہ خود بھی اپنی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا" (وما کان منتصرًا)۔

درحقیقت اس واقعے نے اس کے تمام غرور آمیز تصورات و خیالات کو زمین بوس اور باطل کر دیا۔ کبھی تو وہ کہتا تھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ عظیم دولت و سرمایہ کبھی فنا ہوگا لیکن آج وہ اپنی آنکھوں سے اس کی تباہی دیکھ رہا تھا۔

دوسری طرف وہ اپنے خدا پرست اور باایمان دوست کے سامنے غرور و تکبر کا مظاہرہ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ میں تجھ سے زیادہ قوی ہوں۔ میرے یار و مددگار زیادہ ہیں لیکن اس واقعے کے بعد اس نے دیکھا کہ کوئی بھی اس کا مددگار نہیں ہے۔

اُسے کبھی اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی بہت قوت ہے لیکن جب یہ واقعہ رونما ہوا اور اس نے دیکھا کہ کچھ بھی اُس کے بس میں نہیں تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کیونکہ اب وہ دیکھ رہا تھا کہ اُس کے بس میں اتنا بھی نہیں کہ وہ اس نقصان کے کچھ حصے کی بھی تلافی کر سکے۔

اصولی طور پر مال و دولت کے گرد جمع ہو جانے والے لوگ تو مٹھاس پر مکھیوں کے جمع ہونے کی مانند ہوتے ہیں بعض اوقات انسان سمجھتا ہے کہ بُرے دنوں میں یہ لوگ اس کا سہارا بنیں گے لیکن جب مال و دولت ختم ہو جائے تو وہ بھی نظر نہیں آتے۔ کیونکہ ان کی دوستی کوئی قلبی اور روحانی بنیاد پر تو ہوتی نہیں وہ تو مادی ہوتی ہے اور جب مادی نعمت ختم ہو جاتی ہے تو وہ بھی دکھائی نہیں دیتے۔

لیکن جو بھی ہوا اب تو وقت گزر چکا تھا اور کسی سنگین مصیبت کو دیکھ کر جو بیداری پیدا ہوتی ہے وہ تو اضطراری حیثیت رکھتی ہے۔ ایسی بیداری تو فرعون اور نمرود جیسے افراد میں بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے لیے بھی اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُس وقت اُس نے کہا:

لم اشرک بربی احدًا

کاش! میں اپنے رب کا کسی کو شریک نہ گردانتا۔

یہی بات تو اُس کے دوست نے کہی تھی۔ لیکن اُس کا یہ ایمان سلامتی کے ماحول میں تھا اور اس کا یہ اظہارِ مصیبت کے موقع پر تھا۔

"یہ وہ وقت تھا کہ یہ حقیقت پھر پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ ولایت و قدرت خدا کے لیے ہے وہ خدا

Marfat.com

کہ جو عین حق ہے" (ھنالک الولایۃ للہ الحق)۔

جی ہاں! اس موقع پر یہ پوری طرح واضح ہوگیا کہ تمام نعمتیں اس کی طرف سے ہیں اور جو کچھ اس کا ارادہ ہو وہی کچھ ہوتا ہے اور اس کے لطف وکرم پر بھروسہ کیے بغیر کچھ نہیں بنتا۔

جی ہاں وہی ہے کہ جس کے ہاں اطاعت گزاروں کے لیے بہترین جزا و ثواب ہے اور بہترین عاقبت و آخرت ہے (ھو خیر ثوابًا وخیر عقبًا)۔

پس اگر انسان کسی سے دل لگانا چاہتا ہے اور کسی پر بھروسہ کرنا چاہتا ہے اور کسی سے جزا کی امید باندھنا چاہتا ہے تو کیا ہی بہتر ہے کہ وہ خدا سے لَو لگائے، اس پر بھروسہ کرے اور اس کے لطف و احسان کی امید رکھے۔

چند اہم نکات

۱۔ دولت کا غرور: اس داستان میں ہم نے دولت کے غرور کی زندہ تصویر دیکھی ہے اس میں ہمیں معلوم ہوا ہے کہ غرور کا انجام کیا ہے، وہ غرور کہ جس کی انتہا شرک اور کفر ہے۔

کم ظرف لوگ جب کسی مقام پر جا پہنچتے ہیں اور مقام و دولت کے لحاظ سے دوسروں پر کچھ برتری حاصل کر لیتے ہیں تو اکثر اوقات غرور کی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان وسائل کے بل بوتے پر وہ دوسروں کے سامنے بڑے بنتے پھرتے ہیں۔ مکھیوں کی طرح بھنبھنانے والے لوگ جب ان کے گرد جمع ہو جائیں تو وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں پر ان کا اثر و رسوخ قائم ہوگیا ہے۔ اسی کو قرآن ۔ "انا اکثر منك مالًا واعز نفرًا" میں بیان کر رہا ہے۔

دنیا کا عشق رفتہ رفتہ ان میں یہ خیال پیدا کرنے لگتا ہے کہ یہ دنیا جاوداں ہے اور پھر وہ یہ کہنے لگتے ہیں:

ما اظن ان تبید ھٰذہ ابدًا

مَیں نہیں سمجھتا کہ یہ کبھی ختم ہوگا۔

اگر انسان مادی دنیا کی جاودانی کا قائل ہو جائے تو اس سے قیامت پر ایمان کی نفی ہوتی ہے لہٰذا ایسے لوگ کہنے لگتے ہیں:

وما اظن الساعۃ قائمۃ

میرا نہیں خیال کہ کبھی قیامت بھی آئے گی۔

ان کی خود پسندی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مقرب بارگاہِ الٰہی سمجھنے لگتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ خدا کے ہاں ان کا بہت زیادہ مقام و مرتبہ ہے اور کہنے لگتے ہیں کہ اگر ہمیں اللہ کی طرف واپس

Marfat.com

جانا بھی پڑا اور معاد و قیامت کا کوئی وجود ہوا تو پھر بھی وہاں ہمارا مقام یہاں سے بہتر ہوگا "ولئن رددت الی ربی لاجدن خیرًا منھا منقلبًا"

یہ چار مراحل کم و بیش تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تمام دنیا پرست اہل اقتدار اور طاقتوروں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے انحراف کا آغاز دنیا پرستی سے ہوتا ہے اور شرک، بت پرستی اور انکار قیامت پر جا ختم ہوتا ہے کیونکہ وہ مادی طاقت کو بُت کی طرح پوجتے ہیں اور اس کے علاوہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

۲۔ اس داستان کے چند سبق : یہ عبرت انگیز داستان مختصر سی ہے لیکن اس میں مذکورہ بہت بڑے درس کے علاوہ بھی بہت سے درس موجود ہیں۔ مثلاً :

الف۔ مادی دنیا کی نعمتیں جتنی بھی زیادہ ہوں ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور وہ ناپائیدار ہوتی ہیں، کڑکتی ہوئی بجلی چند لمحوں میں سالہا سال میں تیار کیے گئے باغوں اور کھیتوں کو خاکستر بنا دیتی ہے۔ ان کی جگہ مٹی کے ٹیلوں اور پھسلنے والی زمین کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ تھوڑا سا زلزلہ زمین کے ان پانیوں اور چشموں کو نگل لیتا ہے جن پر زندگی اور اس کی برکتوں کا دارومدار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ پھر اصلاح کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔

ب۔ مادی مفادات کے لیے جو دوست انسان کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں وہ اس قدر بے اعتبار اور بے وفا ہوتے ہیں کہ اسی لمحے جب دنیاوی نعمتیں انسان سے جدا ہو رہی ہوتی ہیں وہ اس سے ایسے رخصت ہوتے ہیں جیسے پہلے ہی جانے کو تیار بیٹھے تھے۔ "ولم تکن لہ فئۃ ینصرونہ من دون اللہ"۔

ایسے واقعات ہم نے بارہا سُنے یا دیکھے ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی سے دل نہیں باندھنا چاہیئے۔ انسان کے باوفا اور سچے دوست وہی ہیں جن سے معنوی اور روحانی رشتہ ہو۔ ایسے ہی دوست ثروت و تنگدستی، بڑھاپے اور جوانی، تندرستی اور بیماری اور عزت و ذلت کے ہر عالم میں دوست ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی محبت و مودت کا رشتہ موت کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔

ج۔ بلا و مصیبت کے بعد کی بیداری عام طور پر فضول ہوتی ہے۔ ہم نے بارہا کہا ہے کہ اضطراری بیداری انسان کے اندرونی انقلاب اور اس کے طرزِ عمل کی تبدیلی کے لیے دلیل نہیں ہوتی اور نہ گزشتہ اعمال پر ندامت کی علامت ہوتی ہے بلکہ جب تختہ دار پر یا موجِ طوفان پر انسان کی نگاہ پڑتی ہے تو اس پر وقتی طور پر اثر ہوتا ہے۔ ایسے میں چند لمحوں کے لیے جبکہ اسے اپنی زندگی بھی چند لمحے دکھائی دیتی ہے وہ اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی کا ارادہ کرتا ہے لیکن چونکہ یہ ارادہ اس کی روح سے نہیں اٹھا ہوتا لہٰذا اس طوفان کے گزرتے ہی اس کا یہ ارادہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور وہ اپنے پہلے راستے کی طرف پلٹ جاتا ہے۔

یہ جو سورہ نساء کی آیہ ۱۸ میں ہے کہ انسان جب موت کی نشانیاں دیکھتا ہے تو توبہ کے دروازے اُس پر بند ہو جاتے ہیں، اس کی یہی وجہ ہے۔ اسی طرح قرآن سورہ یونس کی آیت ۹۰ اور ۹۱ میں فرعون کے بارے میں کہتا ہے کہ جب وہ غرق ہونے لگا اور جب وہ دریا کی لہروں میں غوطے کھانے لگا تو اس نے

Marfat.com

پکارا کہ میں بنی اسرائیل کے خدا، خدائے یکتا پر ایمان لایا ہوں لیکن اُس کی یہ توبہ ہرگز قبول نہ ہوئی۔ فرعون کی اس توبہ کی عدمِ قبولیت کی بھی یہی وجہ ہے۔

د۔ نہ فقر ذلت کی دلیل ہے اور نہ ثروت عزت کی دلیل ہے۔ یہ بھی ایک درس ہے کہ جو ہم زیرِ بحث آیات سے حاصل کرتے ہیں جبکہ مادی معاشروں اور مادی مکتبِ فکر کے نزدیک تو فقر و ثروت ذلت و عزت کی دلیل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے مشرکین پیغمبرِ اسلامؐ کے یتیم اور تہی دست ہونے پر تعجب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی دولت مند پر کیوں نازل نہیں ہوا۔ ان کے الفاظ میں:

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (زخرف - ۳۱)

ھ۔ جب مال و مقام کی وجہ سے ایک آزاد انسان غرور کی زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے تو اگر وہ اپنی پیدائش کی تاریخ پر نظر کرے تو یہ زنجیریں ٹوٹ سکتی ہیں۔ کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ وہ تو بے وقعت خاک تھا، ایک ناتواں نطفہ تھا پھر وہ اپنی ماں کے بطن سے اس حالت میں پیدا ہوا کہ بہت کمزور تھا۔ جیسا کہ قرآن زیرِ نظر آیات میں اس بے ایمان دولت مند کا غرور ختم کرنے کے لیے گزرے ہوئے زمانے کی اسے یاد دلاتا ہے۔ اس کا باایمان دوست کہتا ہے:

اکفرت بالذی خلقك من تراب ثم من نطفة ثم سواك رجلًا

و۔ ان آیات میں عالمِ طبیعت کے ایک درس کی طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہرے بھرے باغوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

ولم تظلم منه شیئًا

یعنی ـ پھل دینے میں ان باغوں نے جہانِ انسانیت پر کوئی ظلم نہیں کیا۔

لیکن اس صاحبِ باغ کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

ودخل جنته وھو ظالم لنفسه

وہ اپنے باغ میں داخل ہوا جبکہ وہ اپنے آپ پر ظلم کر رہا تھا۔

قرآن کہنا یہ چاہتا ہے کہ اے انسان! جہانِ خلقت پر نگاہ ڈال، پھلوں سے لدے ان درختوں اور ان ہری بھری کھیتیوں کے پاس جو کچھ ہے خلوص کے طبق میں رکھ کر تجھے پیش کر دیتی ہیں۔ ان میں خود غرضی ہے اور نہ بخل و حسد۔ جہانِ آفرینش ایثار اور بخشش کا منظر پیش کرتا ہے۔ جو کچھ زمین کے پاس ہے وہ بڑے ایثار کے ساتھ نباتات اور حیوانات کو پیش کر رہی ہے۔ نباتات اپنی ساری نعمتیں انسان اور دوسرے جانداروں کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ سورج کی ٹکیہ روز بروز کمزور پڑ رہی ہے مگر نور افشانی کیے جا رہی ہے۔ بادل برستے ہیں اور بادِ نسیم کی موجیں چلتی ہیں اور ہر طرف زندگی کی لہریں بکھیر دیتی ہیں۔ یہ نظامِ آفرینش ہے۔

Marfat.com

لیکن ۔ اے انسان ! تُو چاہتا ہے کہ تُو اس عالم کا کُل سرسبد بھی ہو اور اس کے واضح قوانین کو بھی پا مال کردے ۔ تیری آرزو ہے کہ تُو ساری نعمتیں خود لے لے اور دوسروں کا حق بھی چھین لے ۔

⁂

(۴۵) وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ
السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ فَاَصۡبَحَ هَشِيۡمًا تَذۡرُوۡهُ
الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ مُّقۡتَدِرًا ○
(۴۶) اَلۡمَالُ وَالۡبَنُوۡنَ زِيۡنَةُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَالۡبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ
خَيۡرٌ عِنۡدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيۡرٌ اَمَلًا ○

ترجمہ

(۴۵) انہیں حیاتِ دنیا کے لیے یہ مثال دو کہ ہم آسمان سے پانی برساتے ہیں اس سے زمین کی پود خوب پھلی پھولی پھر کچھ عرصے بعد وہ خشک ہوگئی اور ہَوا نے اسے اِدھر اُدھر بکھیر دیا اور خدا ہر چیز پر قادر ہے ۔

(۴۶) مال و اولاد تو دنیاوی زندگی کی زینت ہیں اور باقیاتِ صالحات (پائیدار اور اچھے اعمال اور یہ نیکیوں) کا ثواب تیرے رب کے ہاں بہتر اور زیادہ اُمید بخش ہے ۔

تفسیر

زندگی کی ابتدا و انتہا کیلئے ایک مثال

گزشتہ آیات میں مادی دنیا کی ناپائیدار نعمتوں کے بارے میں گفتگو تھی اور اس حقیقت کا ادراک چونکہ ۶۰ یا ۸۰ سال کی عمر میں عام افراد کے لیے آسان نہیں ہے لہٰذا قرآن نے زیرِ نظر آیت میں اس کے لیے

Marfat.com

ایک بڑی زندہ اور منہ بولتی مثال پیش کی ہے ۔ یہ وہ مثال ہے جو لوگ اپنی زندگی میں عموماً دیکھتے رہتے ہیں یہ مثال مغرور و غافل افراد کو بیدار کرنے کے لیے بیان کی گئی ہے ۔

ارشاد ہوتا ہے : حیاتِ دنیا کے لیے ان سے آسمان سے برسنے والے بارش کے قطروں کی مثال بیان کر (واضرب لهم مثل الحیٰوة الدنیا کماءٍ انزلناه من السماء) ۔

بارش کے یہ حیات بخش قطرے پہاڑوں ، صحراؤں اور میدانوں میں گرتے ہیں ۔ زمین کے اندر موجود وہ دانے جن میں صلاحیت ہوتی ہے ان میں ان قطروں سے جان پڑ جاتی ہے اور وہ اپنی زندگی کا ارتقائی سفر شروع کر دیتے ہیں ۔

دانے اگرچہ سخت ہوتے ہیں اور ان کی جلد مضبوط ہوتی ہے لیکن وہ بارش کی نرمی کے ساتھ نرم ہو جاتے ہیں ۔ ان میں سے پودے پھوٹتے ہیں اور آخر کار شاخیں مٹی سے سر نکالتی ہیں ۔ سورج چمکتا ہے' بادِ نسیم چلتی ہے ، زمین میں موجود غذائی مواد بھی مدد کرتا ہے اور یہ نورس شاخیں ان تمام عوامل حیات سے قوت پاکر رشد و نمو کا سفر جاری رکھتی ہیں ۔ اس طرح سے " کچھ مدت بعد پودے ایک دوسرے سے مل جُل جاتے ہیں ایسے کہ جیسے گلے مل رہے ہوں ۔ (فاختلط به نبات الارض) ۔

کوہ و صحرا میں زندگی لہلہانے لگتی ہے ۔ پھول اور پھل شاخوں کو زینت بخشتے ہیں تو ہر طرف خوشیاں اور مسرتیں بکھر جاتی ہیں — لیکن یہ دلربا منظر زیادہ دیر نہیں رہتا ۔ پھر بادِ خزاں چلنے لگتی ہے ۔ موت کی گرد اُن کے سروں پر آپڑتی ہے ۔ ہوا خُنک ہو جاتی ہے اور پانی کم ہو جاتا ہے " زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ وہ مسکراتے ہوئے سر سبز و شاداب پودے پژمُردہ اور بے فروغ شاخوں اور پتوں میں بدل جاتے ہیں" (فاصبح هشیمًا) [۱]

وہ پتے کہ جنہیں فصلِ بہار کی تیز ہوائیں بھی جدا نہیں کر سکتی تھیں آج اس قدر بے جان ہو گئے ہیں کہ " ہَوا کے جھونکے انہیں جدا کر کے اِدھر اُدھر لیے پھرتے ہیں" (تذروه الریاح) ۔ [۲]

جی ہاں ! خدا ہر چیز پر قادر تھا اور قادر ہے (وکان الله علیٰ کل شیءٍ مقتدرًا) ۔

مال و ثروت اور افرادی قوت کہ جو دنیاوی زندگی کے دو اصلی رکن ہیں' ان کے بعد اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے : مال و اولاد حیاتِ دنیا کی زینت ہیں (المال والبنون زینة الحیٰوة الدنیا) ۔

یہ حیاتِ دنیا کے شجر کی شاخوں کے پھول ہیں جن کی عمر بہت کم ہے ۔ راہِ خدا میں رنگِ جاوداں

---

[۱] " هشیم " " هشم " کے مادہ سے توڑنے کے معنی میں لیا گیا ہے اور یہاں ایسی خشک گھاس پھونس کے لیے استعمال ہوا ہے کہ جسے توڑ دیا گیا ہو ۔

[۲] " تذروه " مادہ " ذرو " سے منتشر کرنے اور بکھرنے کے معنی میں ہے ۔

Marfat.com

نہ پالیں تو یہ بہت بے اعتبار ہیں۔

درحقیقت اس آیت میں دنیاوی زندگی کے سرمائے کے دو اہم ترین حصوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ دنیاوی زندگی کی باقی چیزیں انہی دو سے وابستہ ہیں۔ ایک اقتصادی قوت ہے اور دوسری افرادی قوت۔ ہر مادی مقصد تک پہنچنے کے لیے حتماً ان دو قوتوں کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ اقتدار یا طاقت حاصل کرنے کے خواہشمند ان دو قوتوں کو جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خصوصاً گزشتہ زمانے میں جس شخص کے زیادہ بیٹے ہوتے تھے وہ اپنے آپ کو زیادہ قوی محسوس کرتا تھا۔ گزشتہ آیات میں بھی جس بے ایمان دولت مند کا ذکر کیا گیا ہے وہ اپنے مال اور افرادی قوت کا ذکر دوسروں کے سامنے بڑے غرور سے کرتا تھا اور کہتا تھا:

انا اکثر منك مالًا و اعز نفرًا

میرے پاس تجھ سے زیادہ مال اور زیادہ آدمی ہیں۔

پہلے "بنون" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو "ابن" کی جمع ہے جس کا معنی ہے بیٹا۔ کیونکہ وہ بیٹوں کو انسانی سرمایہ اور فعال قوت سمجھتے تھے نہ کہ بیٹیوں کو۔

بہرحال جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے باغات، کھیتیاں اور پانی کے چشمے چند لمحوں میں نابود ہو گئے جو ظاہراً بہت مستحکم دولت تھی۔ اولاد کی زندگی اور سلامتی بھی ہمیشہ خطرے میں ہونے کے علاوہ بعض اوقات وہ دشمن ہو جاتی ہے اور مددگار ہونے کی بجائے تکلیف رساں ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: باقیاتِ صالحات (پائیدار اور شائستہ کاموں اور نیکیوں کا ثواب تیرے پروردگار کے ہاں بہتر اور زیادہ امید بخش ہے (والباقیات الصالحات خیر عند ربک ثوابًا وخیر املًا)۔

بعض مفسرین نے "باقیات الصالحات" کا بالکل محدود مفہوم بیان کیا ہے۔ مثلاً بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد نمازِ پنجگانہ ہے۔ کچھ نے کہا ہے کہ اس سے یہ ذکر مراد ہے:

سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر

اسی طرح بعض لوگوں نے دیگر محدود مفاہیم بیان کیے ہیں لیکن واضح ہے کہ اس تعبیر کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ ہر صالح اور اچھا عقیدہ، نظریہ، گفتار اور کردار شامل ہے کہ جو باقی رہ جاتا ہے اور جس کے اثرات و برکات لوگوں پر اور معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ بعض روایات میں اس سے نمازِ تہجد یا مؤدت اہل بیت مراد لی گئی ہے یہ بلاشبہ واضح مصادیق کا بیان ہے اور ان روایات سے یہ مراد نہیں کہ باقیات الصالحات کا مفہوم ان امور میں منحصر ہے خصوصاً ان روایات میں لفظ "من" استعمال ہوا ہے جو ان کے ایک مفہوم کے

Marfat.com

ایک پہلو پر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

لا تستصغر مودتنا فانها من الباقیات الصالحات

ہماری محبت و مودت کو کم تر نہ سمجھو کہ یہ بھی باقیات الصالحات میں سے ہے۔

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

تسبیحاتِ اربعہ پڑھنے میں تنگدلی نہ دکھاؤ کیونکہ یہ باقیات الصالحات میں سے ہے۔

یہاں تک کہ وہ ناپائیدار اموال اور اولاد کہ جو کبھی فتنے اور آزمائش کا باعث ہوتے ہیں اللہ کی راہ میں ہوں تو وہ بھی باقیات الصالحات کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں کیونکہ خدا کی پاک ذات جاوداں ہے اور جو چیز اس کے لیے اور اس کی راہ میں ہو وہ جاوداں ہو جاتی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ دنیا کی ناپائیدار خوشنمایاں: زیر نظر آیات میں ایک مرتبہ پھر معانی کو مثال کے پیرائے میں مجسم کر کے پیش کیا جارہا ہے۔ وہ عقلی حقائق جن کا ادراک شاید بہت سے لوگوں کے لیے اتنا آسان نہیں ہے، قرآن مجید انہیں ایک زندہ اور واضح مثال کے ذریعے محسوسات کے قریب لے آتا ہے۔

قرآن انسانوں سے کہتا ہے: اپنی زندگی کا آغاز و انجام کا منظر ہر سال تم دیکھتے ہو۔ اگر تمہاری عمر ساٹھ سال ہے تو یہ منظر تم نے ساٹھ مرتبہ دیکھا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ ہر موسم بہار میں ویرانے، دل انگیز اور خوبصورت مناظر میں بدل جاتے ہیں اور ان کے ہر گوشے سے زندگی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں لیکن فصل خزاں میں سرسبز وادیاں ویرانوں اور صحراؤں میں بدل جاتی ہیں اور ان کے ہر گوشے سے موت کے آثار نمایاں نظر آنے لگتے ہیں۔

جی ہاں! تم بھی ایک دن بچے تھے، خوشگفتہ غنچے کی طرح۔ پھر تم جوان ہو جاتے ہو تر و تازہ اور کھلے ہوئے پھول کی مانند۔ پھر تم بوڑھے اور ناتواں ہو جاتے ہو، پژمردہ اور خشک پھولوں کی طرح اور زرد افسردہ پتوں کی طرح۔ پھر طوفانِ اجل تمہیں کاٹ دیتا ہے۔ پھر چند دنوں کے بعد تمہاری بوسیدہ مٹی طوفانوں کے دوش پر ادھر اُدھر بکھر جاتی ہے۔

لیکن یہ واقعہ کبھی غیر طبیعی صورت میں بھی پیش آجاتا ہے۔ بیچ راہ ہی میں بجلی یا طوفان اس زندگی کو ختم کر دیتا ہے، اس طرح سے جیسے سورہ یونس کی آیہ ۲۴ میں آیا ہے:

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ حَتّٰۤى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ

Marfat.com

زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَا اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَا اَتٰهَا اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ

دنیا کی زندگی کی مثال ایسی ہے کہ ہم نے آسمان سے پانی برسایا جس سے طرح طرح کے نباتات اُگتے ہیں جنہیں انسان اور چوپائے کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ زمین اپنا حُسن و زیبائی ان سے لے لیتی ہے۔ ان کے مالک مطمئن ہوتے ہیں کہ اچانک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آپہنچتا ہے (ہم ان پر سردی یا بجلی کو مسلط کر دیتے ہیں) اور انہیں یوں کاٹ کے رکھ دیتے ہیں گویا وہ تھے ہی نہیں۔

لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بیچ راہ میں پیش آنے والے حوادث ان نباتات کو تباہ نہیں کرتے اور وہ اپنا طبیعی سفر پورا کر لیتے ہیں البتہ ان کا انجام بہرحال پژمردگی، پراگندگی اور فنا ہے، جیسا کہ زیر بحث آیت میں اشارہ ہوا ہے۔ لہٰذا دنیاوی زندگی اپنا طبیعی سفر پورا کرے یا نہ کرے جلد یا بدیر دستِ فنا اُس کا دامن آپکڑے گا۔

۲۔ **غرور شکن عوامل:** ہم کہہ چکے ہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب انہیں مادی نعمتیں میسر آتی ہیں تو وہ مغرور ہو جاتے ہیں اور یہ غرور انسانی سعادت کا بہت بڑا دشمن ہے۔ گزشتہ آیات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح غرور، شرک و کفر کا باعث بنتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن جو ایک اعلیٰ تربیتی کتاب ہے اس غرور کی کمر توڑنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتی ہے۔ کبھی وہ بتاتی ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ کبھی وہ مثالوں کے ذریعے مادی چیزوں کی ناپائیداری کو واضح کرتی ہے (جیسا کہ زیر بحث آیات میں کہا گیا ہے)۔ کبھی یہ خبردار کرتی ہے کہ ہو سکتا ہے تمہاری دنیا کے وسائل اور سرمائے ہی تمہارے لیے دشمن جاں ہو جائیں (جیسا کہ سورہ توبہ کی آیت ۵۵ میں ہے)۔ کبھی یہ تاریخ کے مغرور لوگوں کا انجام بیان کرتی ہے جیسا کہ قارون اور فرعون کا انجام بیان کر کے ان جیسے افراد کو خبردار کیا گیا ہے اور کبھی یہ انسان کو اس کے اس دَور کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ جب وہ ایک بے حیثیت نطفہ یا معمولی سی خاک تھا۔ کبھی وہ اس کے ایسے ہی مستقبل کو اس کی آنکھوں کے سامنے مجسم کرتی ہے تاکہ وہ جان لے کہ ایسے کمزور و ناتواں آغاز و انجام کے درمیانی عرصے میں غرور و تکبر احمقانہ قدم ہے (جیسا کہ سورہ طارق کی آیت ۶، سورہ سجدہ کی آیت ۸ اور سورہ قیامت کی آیت ۳۸ میں ہے)۔

شیطان پوری تاریخ میں بڑے بڑے جرائم کا باعث رہا ہے۔ قرآن شیطانی حربوں کی ناکامی کے لیے یہ تمام ذرائع استعمال کرتا ہے۔

مسلّم ہے کہ باایمان، باظرف اور حقیقت شناس انسان مقام و ثروت پا کر غرور جیسی قبیح عادت

Marfat.com

میں مبتلا نہیں ہوتے ۔ نہ صرف یہ کہ وہ مغرور نہیں ہوتے بلکہ ان کے طرزِ عمل میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں آتی ۔ وہ ثروت و حیثیت کو عاریتاً ملنے والی ایسی چیز سمجھتے ہیں جو ہوا کے ایک جھونکے سے گر پڑے ۔

(۴۷) وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ۝

(۴۸) وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ ؗ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ۝

(۴۹) وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝

ترجمہ

(۴۷) اس دن کا سوچو جب ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور تُو دیکھے گا کہ زمین کھلے میدان کی مانند ہوگی اور ہم ان سب (انسانوں) کو محشور کریں گے اور کسی کو نظرانداز نہیں کریں گے ۔

(۴۸) وہ سب صف بستہ تیرے رب کے حضور پیش ہوں گے (اور انہیں کہا جائے گا) تم سب کو اسی طرح ہمارے پاس آنا پڑا جس طرح ابتدا میں ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا جبکہ تمہارا یہ گمان تھا کہ ہم تمہارے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کریں گے ۔

Marfat.com

(۴۹) اور (سب انسانوں کے نامۂ اعمال کی) کتاب وہاں رکھ دی جائے گی تو تُو گنہگاروں کو دیکھے گا کہ وہ اس میں جو کچھ لکھا ہے اسے دیکھ دیکھ کر ڈریں گے اور کہیں گے ہائے ہماری شامت، یہ کیسی کتاب ہے کہ جو کسی چھوٹے بڑے عمل کو شمار کیے بغیر نہیں چھوڑتی اور وہ اپنے تمام اعمال کو موجود پائیں گے اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔

تفسیر

ہائے ہماری شامت! یہ کیسی کتاب ہے

گزشتہ آیات میں ایک خود پرست اور مغرور انسان کے بارے میں گفتگو تھی کہ جس نے اپنے تکبر کی وجہ سے قیامت کا انکار کر دیا تھا۔ زیرِ نظر آیات میں قیامت کی کیفیت کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں تین مراحل کا ذکر ہے:

پہلا مرحلہ انسانوں کے قبروں سے اٹھنے سے پہلے کا ہے۔

دوسرا مرحلہ قیامت کا ہے اور

تیسرا مرحلہ اس کے بعد کا ہے

ارشاد ہوتا ہے: اس وقت کا سوچو جب (جہانِ ہستی کا یہ نظام نئے نظام کے مقدمے کے طور پر درہم برہم ہو جائے گا اور) پہاڑ چلنے لگیں گے اور سطحِ زمین کی ساری اونچ نیچ ختم ہو جائے گی۔ زمین کھلے میدان کی طرح ہو گی اور ہر چیز اس میں تم نمایاں دیکھو گے (ویوم نسیر الجبال وتری الارض بارزة)۔

ان آیات میں اُن حوادث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو آغازِ قیامت میں رونما ہوں گے۔ یہ حوادث بہت زیادہ ہیں۔ قرآن حکیم کی آخری مختصر سورتوں میں ان کا خاص طور پر بہت ذکر ہے۔ انہیں "اشراط الساعة" (قیامت کی نشانیاں) کہا جاتا ہے۔

یہ سب نشانیاں اس بات کی دلیل ہیں کہ آج کی دنیا اور یہ موجود عالم بالکل دگر گوں ہو جائے گا۔ پہاڑ چلنے لگیں گے اور پھر دکھائی نہ دیں گے۔ درخت اور عمارتیں گر پڑیں گی۔ زمین صاف اور ہموار ہو جائے گی۔ پھر زلزلے اسے درہم برہم کر دیں گے۔ سورج کی روشنی ختم ہو جائے گی اور چاند بے نور

Marfat.com

ہو جائے گا۔ ستاروں کے چراغ بجھ جائیں گے۔ پھر ان ویرانوں میں نئے جہان اور نئے زمین و آسمان تعمیر ہوں گے۔ انسان نئے سرے سے نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔

مزید فرمایا گیا ہے: اس وقت ہم محشور کریں گے اور ان میں سے ہم کسی کو نظر انداز نہیں کریں گے (وحشرناھم فلم نغادر منھم احدًا)۔

"نغادر"، "غدر" کے مادہ سے کسی چیز کو ترک کرنے کے معنی میں ہے اسی لیے اپنے عہد و پیمان کو توڑنے والے شخص کے بارے میں کہتے ہیں کہ اُس نے "غدر" کیا ہے اور یہ جو پانی کے گڑھے کو "غدیر" کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ بارش کے پانی کی کچھ مقدار وہاں چھوڑ دی گئی اور ترک کر دی گئی ہوتی ہے۔

بہر حال مذکورہ جملہ اس حقیقت کی تاکید کرتا ہے کہ معاد کا حکم سب کے لیے ہے اور اس سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں ہے۔

اگلی آیت میں قبروں سے انسانوں کے اٹھنے اور محشور ہونے کی کیفیت کے بارے میں یہ ارشاد ہوتا ہے: وہ سب ایک ہی صف میں تیرے رب کی بارگاہ میں پیش ہوں گے (وعرضوا علیٰ ربک صفًا)۔

ہو سکتا ہے یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ لوگوں کا ہر گروہ جو ایک عقیدے کا حامل ہے یا جن کے عمل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں وہ ایک صف میں ہوں گے یا یہ کہ سب کے سب کسی فرق اور امتیاز کے بغیر ایک صف میں ہوں گے۔

اور انہیں کہا جائے گا: تم سب کو ہمارے پاس اس طرح آنا پڑا جیسے ہم نے آغاز میں تمہیں پیدا کیا (لقد جئتمونا کما خلقناکم اول مرۃ)۔

نہ مال و ثروت کا کوئی پتہ ہے، نہ زر و زیور کی کوئی خبر ہے، نہ مادی امتیازات ہیں نہ رنگا رنگ لباس ہیں اور نہ یاور و مددگار۔ بالکل اسی طرح جیسے ابتدائے آفرینش میں تھے، آج بھی اسی پہلی حالت میں ہو۔

لیکن تمہیں یہ گمان تھا کہ ہم تمہارے لیے کوئی وعدہ گاہ قرار نہیں دیں گے (بل زعمتم الن نجعل لکم موعدًا)۔ اور یہ اس وقت ہوتا تھا جب مادی وسائل اور نعمتوں کا غرور تم پر چھا جاتا تھا۔ تمہیں دنیا جاوداں لگنے لگتی تھی اور آخرت کی فطری فکر اس میں چھپ جاتی تھی۔

اس کے بعد اس قیامتِ کبریٰ کے دوسرے مراحل بیان کیے گئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ کتاب، وہاں رکھ دی جائے گی جو سب انسانوں کا نامۂ اعمال ہے (ووضع الکتاب)۔

گنہگار جب اس کے مندرجات سے آگاہ ہوں گے تو خوفزدہ ہو جائیں گے اور وحشت کے آثار

Marfat.com

تو ان کے چہرے پر دیکھے گا (فتری المجرمین مشفقین ممّا فیہ)۔
تو اس وقت فریاد کریں گے اور کہیں گے : ہائے افسوس! یہ کیسی کتاب ہے کہ جو کوئی چھوٹا بڑا عمل شمار کیے بغیر نہیں چھوڑتی (و یقولون یا ویلتنا مال هٰذا الکتاب لا یغادر صغیرة ولا کبیرة الا احصاها)۔
اس نے تو چھوٹی سے چھوٹی چیز کا حساب رکھا ہے اور کسی چیز کو نظر انداز نہیں کیا۔ واقعاً یہ بھی کتنی وحشتناک ہے جن کاموں کو ہم نے بھلا دیا تھا اور ہم تو سوچتے تھے کہ ہم نے کوئی غلط کام کیا ہی نہیں لیکن آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری جوابدہی کا وزن کتنا بھاری ہے اور ہمارا انجام تاریک ہے۔
اس تحریری سند کے علاوہ "تم اپنے سب اعمال کو حاضر پاؤ گے" (ووجدوا ما عملوا حاضرًا)۔
نیکیاں، برائیاں، مظالم، عدل کے کام، فضول باتیں اور خیانتیں سب ان کے سامنے مجسم ہوں گی۔
درحقیقت وہ اپنے کیے میں گرفتار ہوں گے "اور تیرا رب تو کسی پر ظلم نہیں کرتا" (ولا یظلم ربک احدًا)۔
یہ تو وہی کام ہوں گے جو انہوں نے اس جہان میں انجام دیے ہیں لہٰذا وہ شکوہ بھی اپنے آپ ہی سے کر سکتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ **پہاڑ کیوں منہدم ہوں گے؟** ہم کہہ چکے ہیں کہ قیامت کے آغاز میں مادی دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ البتہ اس سلسلے میں قرآن میں مختلف تعبیریں دکھائی دیتی ہیں۔
زیر بحث آیات میں ہے :
نسیر الجبال
یعنی۔ ہم پہاڑوں کو حرکت میں لائیں گے اور انہیں چلائیں گے۔
یہی تعبیر سورہ نبا کی آیت ۲۰ اور سورہ تکویر کی آیت ۳ میں بھی نظر آتی ہے۔ لیکن سورہ مرسلات کی آیت ۱۰ میں ہے :
وَ اِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۝
شدید طوفانوں کے باعث پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے اور الگ ہو جائیں گے۔
جبکہ سورہ حاقہ کی آیت ۱۴ میں ہے :

Marfat.com

وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ٥

زمین اور پہاڑ اپنی جگہ سے اٹھ جائیں گے اور ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے۔

سورہ مزمل کی آیت ۱۴ میں ہے:

يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ٥

وہ دن کہ جب زمین اور پہاڑوں میں لرزہ پیدا ہوگا اور پہاڑ ریت کے ملے ہوئے ٹیلوں کی طرح ہو جائیں گے۔

سورہ واقعہ کی آیت ۵،۶ میں ہے:

وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْبَثًّا ٥

پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور پھر گرد و غبار کی طرح بکھر جائیں گے۔

بالآخر سورہ قارعہ کی آیت ۵ میں ہے:

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ٥

اور پہاڑ رنگی ہوئی دُھنی ہوئی اُون کی مانند ہوں گے (کہ جو ادھر اُدھر بکھر جاتی ہے)۔

واضح ہے کہ ان آیات میں آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ پہاڑوں کے درہم برہم ہونے کے مختلف مراحل کی طرف مختلف اشارے ہیں۔

پہاڑ اس زمین کا محکم ترین اور مضبوط ترین حصّہ ہے۔ معاملہ ان کی حرکت اور چلنے سے شروع ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ گرد و غبار بن کر یوں اُڑیں گے کہ فضا میں ان کا صرف رنگ نظر آئے گا۔

یہ اتنی بڑی حرکت کیسے پیدا ہوگی، یقیناً اس کا ہمیں علم نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ زمین کی کشش ثقل وقتی طور پر اٹھالی جائے اور زمین کی دَوری حرکت کے سبب پہاڑ درہم برہم ہو جائیں اور فضاؤں میں بکھر جائیں۔ یا ہوسکتا ہے بڑے بڑے ایٹمی دھماکوں کے باعث زمین کے مرکز میں ایسی عظیم اور وحشت ناک حرکت پیدا ہو جائے۔

بہر حال یہ سب امور اس بات کی دلیل ہیں کہ قیامت ایک بہت بڑے انقلاب کی حامل ہے۔ عالم کے بے جان مادہ میں بھی انقلاب پیدا ہوگا اور انسانوں کی زندگی میں بھی۔ سب انسان جہانِ نو میں بلند تر زندگی شروع کریں گے۔ روح اور جسم تو اس دنیا میں بھی ہوگی لیکن وہاں اس کی بناوٹ ہر لحاظ سے وسیع تر اور کامل تر ہوگی۔

قرآن کی یہ تعبیر ضمنی طور پر انسان کو اس حقیقت کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے کہ باغ اور پانی تو معمولی چیزیں ہیں، بڑے بڑے پہاڑ تک ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائیں گے۔ اس طرح دنیا کی تمام موجودات یہاں تک کہ جو بہت بڑی بڑی چیزیں ہیں سب کے لیے فنا ہے۔

Marfat.com

۲۔ نامۂ اعمال: زیر بحث آیات کے ذیل میں تفسیر المیزان میں ہے کہ تمام آیاتِ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم قیامت میں انسانوں کے لیے تین قسم کے اعمال نامے ہوں گے۔

پہلی قسم: تو وہ ایک ہی کتاب ہے جو سب کے اعمال کے لیے رکھی گئی ہے۔ درحقیقت اس میں سب اولین و آخرین کے اعمال ثبت ہیں جیسا کہ زیر بحث آیات میں ہے:

ووضع الکتاب

اس کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ سب انسانوں کے حساب کتاب کے لیے ایک ہی کتاب ہوگی۔

دوسری قسم: وہ کتاب ہے جو ہر امت کے لیے ہوگی۔ ہر امت کے لیے ایک کتاب ہوگی کہ جس میں اس کے اعمال درج ہوں گے۔ جیسا کہ سورہ جاثیہ کی آیت ۲۸ میں ہے:

کُلُّ اُمَّۃٍ تُدْعٰی اِلٰی کِتٰبِھَا

ہر امت اپنی کتاب اور نامۂ اعمال کی طرف بلائی جائے گی۔

تیسری قسم: وہ کتاب ہے کہ جو ہر انسان کے لیے الگ الگ ہے۔ جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۳ میں ہے:

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا ....

ہر انسان کے نامۂ اعمال کی جوابدہی ہم نے اسی کی گردن میں ڈالی ہے اور روزِ قیامت ہم اس کے لیے کتاب اور نامۂ اعمال باہر نکالیں گے۔[1]

واضح ہے کہ یہ آیات ایک دوسری کے منافی نہیں ہیں کیونکہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ آدمی کے اعمال مختلف کتب میں درج ہوں۔ موجودہ زمانے میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ ملک کے اداروں اور محکموں میں تفصیلات کے لیے ہر شخص کی الگ فائل ہوتی ہے اور پھر محکمے اور شعبے کے مجموعی ریکارڈ میں

---

[1] المیزان۔ ج ۱۳ ص ۳۴۸۔ مفسر قرآن مجید، فیلسوف عالی قدر، عالم بزرگ اخلاق آیۃ اللہ علامہ طباطبائی انہی دنوں ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ ان کی یہ جدائی ہمارے لیے ایک بہت بڑا صدمہ اور نقصان ہے۔ وہ ایک ایسی عظیم ہستی تھے کہ جنہوں نے اپنی بابرکت زندگی میں بہت ہی اہم اور قیمتی خدمات انجام دی ہیں۔ وہ ہر قسم کی خود نمائی سے دور اسلامی معاشرے کی خدمت میں مصروف رہے۔ انہوں نے حوزہ علمیہ قم اور دورِ حاضر کے علماء کے افکار میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور بہت ہی بلند پایہ شاگردوں کی تربیت کی۔ انہوں نے بہت قیمتی آثار بطور یادگار چھوڑے ہیں خصوصاً ان کی گرانقدر تفسیر المیزان نے قرآن کریم کے نئے باب کھولے ہیں۔ یہ تفسیر تفسیر کے اہم اسلامی علم کی طرف نئی لگن کا سبب بنی ہے۔ اللہ کرے ان کی رُوح غریقِ رحمت ہو اور ان کی یاد ہمیشہ احترام و تکریم کے ساتھ دلوں میں باقی رہے۔ (آپ کی تاریخ رحلت ۲۴ آبان ماہ ۱۳۶۰ ہجری شمسی، بطابق ۱۸ محرم الحرام ۱۴۰۲ ہجری قمری)۔

Marfat.com

بھی اس کے بارے میں کوائف ہوتے ہیں اور اسی طرح سلسلہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔

لیکن اس نکتے کی طرف توجہ رہے کہ قیامت میں انسانوں کے نامۂ اعمال اس جہان کی عام فائلوں اور کتابوں کی طرح نہیں ہیں۔ وہ تو ایک منہ بولتا اور ناقابلِ انکار مجموعہ ہوگا۔ شاید وہ خود انسان کے اعمال کا فطری نتیجہ ہو۔

بہرحال زیرِ بحث آیات نشاندہی کرتی ہیں کہ خاص کتابوں میں درج ہونے کے علاوہ خود اعمال بھی وہاں مجسم ہوں گے اور حاضر ہوں گے (ووجدوا ما عملوا حاضرًا)۔

وہ اعمال جو بکھر جانے والی توانائیوں کی طرح اس جہان میں نظروں سے محو ہو چکے ہیں حقیقت میں ختم نہیں ہوئے۔

(دورِ حاضر کے علم نے بھی ثابت کیا ہے کہ مادہ، توانائی اور کوئی کوشش ختم نہیں ہوتی بلکہ ان کی شکل بدل جاتی ہے)۔ نیک اعمال جاذب اور خوبصورت شکل میں ظاہر ہوں گے اور بُرے اعمال بُرے اور بدصُورت چہروں میں ظاہر ہوں گے۔ یہ اعمال ہمارے ساتھ ساتھ ہوں گے یہی وجہ ہے کہ زیرِ بحث آیات کے آخری جملے میں فرمایا گیا ہے:

ولا یظلم ربک احدًا

تیرا رب اپنے بندوں میں سے کسی پر بھی ظلم نہیں کرے گا۔

کیونکہ جزا اور سزا ان کے عمل کا ماحصل ہی ہے۔

البتہ بعض مفسرین نے "ووجدوا ما عملوا حاضرًا" کو نامۂ اعمال کے مسئلہ پر تاکید سمجھا ہے اور کہا ہے کہ اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ لوگ اپنے نامۂ اعمال کی کتاب میں اپنے تمام کاموں کو موجود اور لکھا ہوا پائیں گے[1]

بعض دوسرے مفسرین اس آیت میں لفظ "جزا" کو مقدر سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے:

اس دن لوگ اپنے اعمال کی جزا کو حاضر اور موجود پائیں گے[2]

لیکن پہلی تفسیر آیات کے ظاہری مفہوم سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

تجسم اعمال کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی دوسری جلد میں سورہ آل عمران کی آیت ۳۰ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی متعلقہ آیات کے ذیل میں بحث کریں گے۔

۳۔ معاد پر ایمان کا تربیتی نتیجہ: قرآن واقعاً ایک عجیب تربیتی کتاب ہے۔ جب اس میں انسانوں

---

[1] و [2] فخرالدین رازی۔ تفسیر کبیر میں اور قرطبی۔ تفسیر الجامع میں۔

Marfat.com

کے سامنے قیامت کا منظر پیش کیا جاتا ہے تو فرمایا جاتا ہے کہ "وہ دن جب سب لوگ اللہ کی بارگاہِ عدل میں منظم طور پر صفیں باندھے پیش کیے جائیں گے"

ان کی مختلف صفیں ان کے عقائد و اعمال میں ہم آہنگی کی بنا پر ترتیب پائیں گی۔ ان کے ہاتھ تہی ہوں گے اور تمام دنیاوی تعلقات ختم ہو جائیں گے۔ وہاں اجتماع کے باوجود وہ تنہا ہوں گے اور تنہائی کے باوجود اکٹھے ہوں گے اور اعمال نامے کھلے ہوں گے۔ سب چیزیں بولیں گی اور انسانوں کے چھوٹے بڑے اعمال بتائیں گی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ خود اعمال و افکار میں جان پڑ جائے گی اور جسمانی شکل میں ظاہر ہوں گے ہر شخص کے گرد اس کے اعمال جسمانی صورت میں موجود ہوں گے۔ لوگ اپنے آپ میں اس طرح سے کھوئے ہوں گے کہ ماں کو بیٹے کا اور بیٹے کو ماں کا ہوش نہیں ہوگا۔

عدلِ الٰہی کی عدالت لگی ہوگی۔ عذاب عظیم بدکاروں کے انتظار میں ہوگا۔ لوگ اس سے سخت وحشت زدہ ہوں گے۔ سانس سینوں میں اٹکے ہوں گے اور آنکھیں پتھرائی ہوں گی۔

ایسی عدالت میں ایمان واقعاً انسانی تربیت کے لیے کس قدر مؤثر ہے۔ ہوا و ہوس پر کنٹرول کیلئے یہ ایمان کس قدر مفید ہے۔ یہ ایمان انسان کو کس قدر آگاہی اور بیداری عطا کرتا ہے اور اس کے اندر احساسِ ذمہ داری پیدا کرتا ہے۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

اذا كان يوم القيامة دفع للانسان كتاب ثم قيل له اقرء — قلت فيعرف مافيه - فقال انه يذكره فما من لحظة ولا كلمة ولا نقل قدم ولا شیٔ فعله الا ذكره، كأنه فعله تلك الساعة، ولذلك قالوا يا ويلتنا مالهٰذا الكتاب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة الا احصاها۔

روزِ قیامت انسان کے ہاتھ میں اس کا نامۂ اعمال تھمایا جائے گا پھر اس سے کہا جائے گا: پڑھو۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے امامؑ سے پوچھا: جو کچھ اس نامۂ اعمال میں ہوگا کیا وہ شخص اسے پہچان لے گا اور اسے یاد آجائے گا۔

امامؑ نے فرمایا:

اسے سب کچھ یاد آجائے گا۔ پلکوں کا جھپکنا، ہر لفظ کا ادا کرنا اور ہر قدم کا اٹھانا مختصر یہ کہ اس نے جو کام بھی انجام دیا اسے ایسے یاد آجائے گا گویا اس نے ابھی انجام دیا ہے۔ لہٰذا لوگ فریاد کریں گے اور کہیں گے: ہائے افسوس! یہ کیسی کتاب ہے کہ جس نے کسی چھوٹے

Marfat.com

بڑے کام کو شمار کیے بغیر نہیں چھوڑا۔[1]

اس حقیقت پر ایمان کا تربیتی اثر کسے بغیر واضح ہے۔ واقعاً کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ انسان ایسے عالم پر ایمان قاطع رکھتا ہو اور پھر بھی گناہ کرے۔

(۵۰) وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ
كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ
ذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ
بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ○
(۵۱) مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ
اَنْفُسِهِمْ ۪ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ○
(۵۲) وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ
فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ○
(۵۳) وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا
وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ○

ترجمہ

(۵۰) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، وہ جنوں میں سے تھا اس لیے وہ اپنے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا (اس کے باوجود تم) میری بجائے اسے اور

---

[1] نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۷۶۔

Marfat.com

اس کی اولاد کو اولیاء بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں ظالم لوگ بہت بُرا بدل اپناتے ہیں۔

(۵۱) مَیں نے آسمانوں اور زمین کی خلقت کے وقت انہیں نہیں بلایا تھا اور نہ خود انہیں پیدا کرتے وقت انہیں شریک کیا تھا اور مَیں گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار نہیں بناتا۔

(۵۲) اُس دن کا سوچو کہ جب اللہ کہے گا کہ اب انہیں آواز دو جنہیں تم میرا شریک خیال کرتے تھے (تاکہ وہ تمہاری مدد کو آئیں) لیکن انہیں جتنا بھی پکاریں وہ ان کی کچھ نہ سنیں گے اور ہم ان دونوں کے درمیان مرکزِ ہلاکت بنا دیں گے۔

(۵۳) اور سارے مجرم (جہنم کی) آگ دیکھیں گے اور یقین کرلیں گے کہ انہیں آگ میں ڈالا جائے گا اور آگ ان پر ڈالی جائے گی اور انہیں اس سے بچ نکلنے کی کوئی راہ سجھائی نہ دے گی۔

تفسیر

شیطانوں کو اپنا سرپرست نہ بناؤ

قرآن میں کئی مقامات پر خلقتِ آدمؑ کی داستان بیان ہوئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ فرشتوں نے انہیں سجدہ کیا مگر ابلیس نے حکمِ خدا کی مخالفت کی۔ جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں یہ تکرار ہمیشہ کسی مقصد کے پیشِ نظر ہے اور ہر موقع پر کوئی خاص نکتہ پنہاں ہوتا ہے۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ کسی ایک اہم واقعے کے مختلف پہلو ہوں اور جب بھی اس واقعے کا ذکر ہو تو کوئی ایک پہلو ملحوظِ نظر ہو۔

گزشتہ مباحث میں متکبر و مغرور دولت مندوں کے بارے میں ایک مثال بیان کی گئی ہے۔ اس مثال میں تہی دست مستضعفین کے بارے میں ان کے خیالات بیان کیے گئے ہیں اور پھر ان کے انجام کی تصویرکشی کی گئی ہے۔

Marfat.com

دراصل روزِ اوّل سے غرور و تکبر ہی انحراف، کفر اور سرکشی کی بنیاد رہا ہے لہٰذا زیرِ بحث آیات میں ابلیس کا ذکر ہے کہ اُس نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس امر کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے تاکہ ہم جان لیں کہ شروع ہی سے غرور و تکبر کفر و سرکشی کا سرچشمہ رہا ہے۔ علاوہ ازیں اس داستان سے واضح ہوتا ہے کہ انحرافات کا باعث شیطانی وسوسے ہیں اور اس کے وسوسوں کے سامنے سر جھکا دینا کس قدر احمقانہ حرکت ہے کہ جس نے پہلے دن ہی سے ہماری دشمنی پر کمر باندھ رکھی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: وہ دن یاد کرو کہ جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نافرمانی کی (واذ قلنا للملائکة اسجدوا لاٰدم فسجدوا الا ابلیس)۔

اس استثناء سے ہوسکتا ہے یہ وہم پیدا ہو کہ ابلیس فرشتوں میں سے ہے حالانکہ فرشتے معصوم ہیں لہٰذا اُس نے کیونکر سرکشی کی ۔ اس لیے ساتھ فرمایا گیا ہے: وہ جنوں میں سے تھا اس لیے اپنے رب کی اطاعت سے نکل گیا (کان من الجن ففسق عن امر ربه)۔

وہ فرشتوں میں سے نہیں تھا لیکن اللہ کی بندگی، اطاعت اور قرب کی وجہ سے اس نے فرشتوں کی صف میں جگہ پالی تھی۔ یہاں تک کہ شاید ان کا اُستاد ہو گیا تھا لیکن لمحہ بھر کے غرور و تکبر نے اسے ایسا گرایا کہ اُس کا تمام تر روحانی مقام جاتا رہا اور وہ بارگاہِ خدا سے ٹھکرا دیا گیا اور وہ خدا کے نزدیک سب سے بڑھ کر قابلِ نفرت ہو گیا۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: کیا اس کے باوجود تم میری بجائے اسے اور اس کی اولاد کو اپنا سرپرست بناتے ہو (افتتخذونه و ذریته اولیاء من دونی)۔ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں (وهم لكم عدو)۔

اُس نے تمہاری گمراہی اور تباہی کے لیے قسم کھا رکھی ہے اور تمہارے باپ کے بارے میں اس کی دشمنی پہلے روز ہی آشکار ہو گئی تھی۔

خدا کے بدلے شیطان اور اس کی اولاد کو اپنانا کتنا بُرا ہے (بئس للظالمین بدلاً)[1]

واقعاً کس قدر بُری بات ہے کہ انسان عالم و آگاہ، رحیم و مہربان اور فیض رساں خدا کو چھوڑ کر شیطان اور اس کے حواریوں کو اپنا لے۔ یہ بدترین انتخاب ہے، کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک عقلمند انسان ایسے کو اپنا ولی، راہنما اور سہارا سمجھ لے کہ جس نے روزِ اول سے اس کی دشمنی پر کمر باندھ رکھی ہے۔

اگلی آیت میں اس غلط خیال کے ابطال کے لیے ایک اور دلیل پیش کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: آسمانوں اور زمین کی خلقت کے وقت ہم نے ابلیس اور اولادِ ابلیس کو نہیں بلایا یہاں تک کہ ان کی اپنی

---

[1] "بدلا" ترکیب نحوی کے لحاظ سے تمیز ہے اور "بئس" کا فاعل شیطان اور اس کا لاؤلشکر ہے یا شیطان اور اس کے لاؤلشکر کی عبادت فاعل ہے۔

Marfat.com

تخلیق کے وقت بھی انہیں شریک نہیں کیا (ما اشھدتھم خلق السماوات والارض ولا خلق انفسھم)۔ کیونکہ اس عالم کی خلقت میں ان کی مدد درکار تھی اور نہ انہیں آگاہ کیا جانا ضروری تھا۔ لہٰذا جس کا اس عالم کی آفرینش سے کوئی تعلق ہے اور نہ اپنی تخلیق میں کوئی دخل ہے اور نہ رموزِ خلقت کی جسے کچھ خبر ہے وہ ولایت و پرستش کے لائق کیسے ہو سکتا ہے اور اصولی طور پر اس کے بس میں ہے ہی کیا؟ وہ تو ایک ناتواں موجود ہے یہاں تک کہ خود اپنے مسائل سے ناآگاہ ہے تو پھر وہ دوسروں کی کیا رہبری کر سکتا ہے اور دوسروں کو مشکلات سے کیا نجات دلا سکتا ہے؟

آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: میں ہرگز گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار نہیں بناتا (وما کنت متخذ المضلین عضدًا)۔ یعنی خلقت تو دوستی اور ہدایت کی بنیاد پر ہے لہٰذا جس کا کام ہی گمراہ کرنا ہو اس نظامِ خلقت کو چلانے میں اس کا دخل نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو آفرینش و ہستی کے اس نظام کی بالکل مخالفت سمت میں گامزن ہے وہ تو خرابیاں پیدا کرتا ہے اور ویرانیاں لاتا ہے نہ کہ اصلاح، تکامل اور ارتقار کے لیے کچھ کرتا ہے۔

زیرِ بحث آخری آیت ایک مرتبہ پھر خبردار کرتی ہے: اس وقت کا سوچو جب اللہ فرمائے گا کہ جنہیں تم میرا شریک خیال کرتے تھے انہیں اب اپنی مدد کے لیے آواز دو (ویوم یقول نادوا شرکاءی الذین زعمتم)۔ ایک عمر تم ان کا دم بھرتے رہے اور ان کے آستانے پر سجدہ کرتے رہے۔ اب جب کہ تمہیں عذاب کی موجوں نے گھیر لیا ہے تو انہیں آواز دو کہ ایک لمحے کے لیے تو تمہاری مدد کو آجائیں۔

وہ لوگ گویا انہی دنیاوی افکار کے مطابق "انہیں پکاریں گے لیکن یہ خیالی اور جعلی معبود انہیں جواب تک نہیں دیں گے" چہ جائیکہ مدد کو آئیں (فدعوھم فلم یستجیبوا لھم)۔ اور ان کے درمیان ہم مرکزِ ہلاکت بنائیں گے (وجعلنا بینھم موبقًا) [1]

زیرِ بحث آخری آیت میں شیطان کے پیروکاروں اور مشرکین کا انجام واضح کیا گیا ہے: اس دن گنہگار جہنم کی آگ دیکھیں گے (ورآ المجرمون النار)۔ وہ آگ کہ جس کے بارے میں انہیں کبھی یقین نہ آتا تھا ان کی آنکھوں کے سامنے ہوگی۔ اس موقع پر انہیں اپنی گزشتہ غلطیوں کا اندازہ ہوگا "اور اب انہیں یقین آئے گا کہ وہ آگ میں ڈالے جائیں گے اور آگ ان پر ڈالی جائے گی (فظنوا انھم مواقعوھا)۔ پھر انہیں یقین آجائے گا کہ اب اس سے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے (ولم یجدوا عنھا مصرفًا)۔

---

[1] "موبق" "وبوق" (بروزن "نبوغ") کے مادہ سے ہے کہ جو ہلاکت کے معنی میں ہے اور "موبق" جائے ہلاکت کو کہتے ہیں۔

Marfat.com

نہ ان کے خود ساختہ معبود ان کی فریاد کو پہنچیں گے نہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت ان کے بارے میں مؤثر ہوگی اور نہ جھوٹ، زر یا زور سے وہ جہنم کی آگ سے بچ سکیں گے، وہ آگ کہ جو ان کے اعمال و کردار نے دہکائی ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ "ظنوا" اگرچہ "ظن" کے مادہ سے ہے لیکن یہاں اور بہت سے دیگر مواقع پر یہ لفظ یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے اسی لیے سورہ بقرہ کی آیت ۲۴۹ میں حضرت طالوت کے ساتھی حقیقی مومنین اور ثابت قدم مجاہدین کہ جو جابر و ظالم جالوت کے خلاف جنگ کے لیے نکلے ان کے بارے میں ہے:

قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ

جو اللہ سے ملاقات پر ایمان رکھتے تھے انہوں نے کہا کہ ایسا بہت مرتبہ ہوا ہے کہ چھوٹے سے (باایمان) گروہ نے بڑے گروہ پر کامیابی حاصل کی ہے۔

ضمناً لفظ "مواقعوھا" کہ جو "مواقعۃ" کے مادہ سے ہے ایک دوسرے پر واقع ہونے کے معنی میں ہے، اس طرف اشارہ ہے کہ وہ بھی آگ میں گریں گے اور آگ بھی ان پر گرے گی، وہ بھی آگ میں داخل ہوں گے اور آگ بھی ان میں داخل ہوگی۔ کیونکہ قرآن کی دوسری آیات میں ہے کہ:

گنہگار خود آگ کا ایندھن ہیں۔ (بقرہ - ۲۴)

چند اہم نکات

۱۔ کیا شیطان فرشتہ تھا؟ ہم جانتے ہیں کہ فرشتے معصوم ہیں۔ قرآن نے ان کی پاکیزگی اور عصمت کا ذکر کیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۙ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝

وہ خدا کے محترم و مکرم بندے ہیں۔ کسی بات میں اس پر سبقت نہیں کرتے اور اس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ (انبیاء - ۲۶، ۲۷)

اصولی طور پر اُن کے جوہر میں عقل ہے اور شہوت نہیں ہے لہٰذا تکبر، خود پرستی اور گناہ پر اُکسانے والی کوئی چیز اُن میں نہیں ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں کہا گیا ہے کہ ابلیس کے سوا سب فرشتوں نے سجدہ کیا۔ اسی طرح کا ذکر دوسری آیات میں بھی ہے۔ اس استثناء سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا جبکہ اس کی نافرمانی اور سرکشی پر نظر کی جائے تو یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی فرشتہ

Marfat.com

گناہان کبیرہ کا مرتکب ہو۔
خصوصاً جبکہ نہج البلاغہ کے بعض خطبات میں بھی ہے کہ:
ماکان اللہ سبحانہ لیدخل الجنة بشرا بامر اخرج بہ منھا ملکا
ہرگز ممکن نہیں کہ اللہ انسان کو ایسا کام کرنے پر بہشت میں بھیج دے جیسا کام کرنے پر اس نے ایک فرشتے کو بہشت سے نکال دیا تھا۔[1]
یہ ابلیس کے غرور کی طرف اشارہ ہے۔
زیر نظر آیات نے اس سوال کو حل کر دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:
کان من الجن
ابلیس جنوں کے گروہ میں سے تھا۔
جن ایسے موجودات ہیں جو ہماری نظروں سے پنہاں ہیں۔ وہ عقل و شعور بھی رکھتے ہیں اور شہوت و غضب بھی۔ ہم جانتے ہیں کہ لفظ "جن" قرآن میں جہاں کہیں بھی آیا ہے اسی مخلوق کی طرف اشارہ ہے۔
بعض مفسرین کہ جن کا نظریہ ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا وہ زیر بحث آیت میں آنے والے لفظ "جن" کا لغوی معنی لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "کان من الجن" سے مراد یہ ہے کہ ابلیس دیگر فرشتوں کی طرح نظروں سے پنہاں تھا۔ حالانکہ یہ معنی بالکل خلاف ظاہر قرآن ہے۔
ہمارے دعویٰ کے ثبوت میں سے ایک واضح دلیل یہ ہے کہ قرآن ایک طرف سے کہتا ہے:
وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۝
جن کو ہم نے آگ کے مخلوط شعلے سے پیدا کیا (رحمٰن - ۱۵)
دوسری طرف سے جس وقت ابلیس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اس سرکشی کے لیے یہ منطق پیش کی:
خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ۝
میری تخلیق تُو نے آگ سے کی ہے اور اسے تُو نے مٹی سے بنایا ہے۔ (اعراف - ۱۲)
اس سے قطع نظر زیر بحث آیات میں ابلیس کی "ذریہ" (اولاد) کا ذکر ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ فرشتوں کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔
جو کچھ کہا گیا ہے اسے ملحوظ نظر رکھا جائے اور فرشتوں کے جوہر ساخت کو بھی پیش نگاہ رکھا جائے تو مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ابلیس ہرگز فرشتہ نہیں تھا لیکن چونکہ ان کی صف میں شامل ہو گیا تھا اور اس

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۲ (خطبہ قاصعہ)۔

Marfat.com

نے اللہ کی اتنی عبادت کی تھی کہ مقرب خدا فرشتوں کے مقام تک جا پہنچا تھا لہٰذا جب آدم کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا تو وہ بھی شامل تھا۔ اسی لیے آیاتِ قرآن میں اس کی نافرمانی کا ذکر استثناء کی صورت میں آیا ہے نیز خطبہ قاصعہ میں اسے "ملک" مجازی طور پر کہا گیا ہے (غور کیجئے گا)۔

"عیون الاخبار" میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہے:

سب فرشتے معصوم ہیں اور لطف پروردگار سے کفر اور برائیوں سے محفوظ ہیں۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے عرض کیا:

تو کیا ابلیس فرشتہ نہیں تھا؟

امامؑ نے فرمایا:

نہیں وہ جنوں میں سے تھا۔ کیا تو نے اللہ کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ وہ فرماتا ہے:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ

جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا اور وہ جنوں میں سے تھا[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ امام صادق علیہ السلام کے ایک خاص صحابی کہتے ہیں:

میں نے امامؑ سے ابلیس کے بارے میں استفسار کیا کہ کیا وہ فرشتوں میں سے تھا؟

آپؑ نے فرمایا:

نہیں وہ تو جنوں میں سے تھا لیکن فرشتوں کے ساتھ رہتا تھا اور اس طرح سے ان کے ساتھ تھا کہ وہ (اس کی عبادت اور قربِ الٰہی کے سبب) سمجھتے تھے کہ وہ انہی کی نوع میں ہے لیکن خدا جانتا تھا کہ وہ ان میں سے نہیں ہے۔ جس وقت سجدے کا حکم ہوا تو یہ بات ظاہر ہوئی (پردے ہٹ گئے اور ابلیس کی ماہیت و حقیقت آشکار ہو گئی)[2]

ابلیس اور شیطان کے بارے میں ہم نے سورہ اعراف کی آیت ۱۱ تا ۱۸ —— (تفسیر نمونہ ج ۶ ص ۹۵ اُردو ترجمہ) اور سورہ انعام کی آیت ۱۱۲ (تفسیر نمونہ ج ۵ ص ۳۲۶ اردو ترجمہ) اور سورہ بقرہ کی آیت ۳۴ (تفسیر نمونہ جلد اوّل ص ۱۶۶ اُردو ترجمہ) کے ذیل میں —— تفصیلی بحث کی ہے۔

۲۔ گمراہوں کو تعاون کی دعوت نہیں دینا چاہیئے: زیرِ نظر آیات میں اللہ کے بارے میں گفتگو ہے اور گمراہوں میں سے اس کے لیے یاور و مددگار کی نفی کی گئی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اصولی طور پر اللہ کسی معین و مددگار کا محتاج نہیں، چاہے کوئی گمراہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ سب کے لیے ایک عظیم درس ہے کہ اجتماعی

---

[1] و [2] نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۶۷۔

Marfat.com

کاموں میں ہمیشہ ایسے لوگوں کی مدد حاصل کی جائے کہ جو خود بھی حق وعدالت کے راستے پر ہوں اور طلب اعانت کرنے والا بھی صحیح راستے کے لیے مدد چاہے ۔ ہم نے بہت دیکھا ہے کہ نیک افراد نے معاونین کے انتخاب کے وقت صحیح توجہ نہیں دی جس کے نتیجے میں بہت سی مشکلات، ناکامیوں اور انحراف سے دوچار ہوئے ہیں۔ انہیں گمراہوں اور گمراہ کرنے والوں نے گھیر لیا ہے اور یہ لوگ ان کے کام کو تباہی کی طرف لے گئے ہیں۔ آخر کار ایسے لوگوں نے ان کا سب کچھ برباد کر دیا ہے ۔

واقعہ کربلا میں ہے کہ دورانِ راہ سرورِ شہیداں حضرت امام حسین علیہ السلام کی ملاقات عبیداللہ بن حُر سے ہوگئی ۔ امامؑ . عبیداللہ سے ملنے کے لیے گئے تو اس نے آپؑ کا بہت احترام کیا لیکن جب امامؑ نے اسے مدد کی دعوت دی تو اُس نے قسم کھا کر کہا کہ مَیں تو کوفے سے اسی لیے نکلا ہوں کہ اس جنگ سے کنارہ کش ہو جاؤں ۔

اُس نے مزید کہا : مَیں جانتا ہوں کہ اگر ان لوگوں سے آپؑ نے جنگ کی تو سب سے پہلے آپؑ ہی مارے جائیں گے ۔ البتہ مَیں یہ تلوار اور گھوڑا آپؑ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ۔

امامؑ نے اس سے منہ پھیر لیا اور فرمایا :

جب تُو اپنی جان بچاتا ہے تو ہمیں تیرے مال کی ضرورت نہیں ۔

پھر آپؑ نے اس آیت کی تلاوت کی :

وما کنت متخذ المضلین عضدا

یہ اس طرف اشارہ تھا کہ تُو گمراہ اور گمراہ کنندہ ہے لہٰذا تُو اس قابل نہیں کہ تیرا یہ تعاون قبول کیا جائے[1]۔

بہر حال دوست اور مددگار کا نہ ہونا بُرے لوگوں سے مدد لینے اور انہیں اپنے گرد جمع کر لینے سے بہتر ہے ۔

[1] نورالثقلین جلد ۳ صفحہ ۲۶۸

Marfat.com

(۵۴) وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِیۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لِلنَّاسِ مِنۡ كُلِّ مَثَلٍ ؕ
وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ اَكۡثَرَ شَیۡءٍ جَدَلًا ○
(۵۵) وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡۤا اِذۡ جَآءَهُمُ الۡهُدٰی وَیَسۡتَغۡفِرُوۡا
رَبَّهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِیَهُمۡ سُنَّةُ الۡاَوَّلِیۡنَ اَوۡ یَاۡتِیَهُمُ الۡعَذَابُ
قُبُلًا ○
(۵۶) وَمَا نُرۡسِلُ الۡمُرۡسَلِیۡنَ اِلَّا مُبَشِّرِیۡنَ وَمُنۡذِرِیۡنَ ۚ وَ
یُجَادِلُ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا بِالۡبَاطِلِ لِیُدۡحِضُوۡا بِهِ الۡحَقَّ وَاتَّخَذُوۡۤا
اٰیٰتِیۡ وَمَاۤ اُنۡذِرُوۡا هُزُوًا ○

ترجمہ

(۵۴) اس قرآن میں ہم نے لوگوں کے لیے ہر طرح کی مثال بیان کی ہے لیکن انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔

(۵۵) انسانوں کے ایمان لانے اور اپنے رب سے طلب مغفرت میں اس کے سوا کیا امر مانع ہے کہ وہ بھی گزشتہ لوگوں کے سے انجام کے منتظر ہیں یا یہ کہ عذابِ الٰہی کو دیکھنے کے منتظر ہیں۔

(۵۶) اور ہم نے رسولوں کو صرف بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کفار حق کو نیچا دکھانے اور ہماری ان آیتوں اور سزاؤں کا مذاق اڑانے کیلئے جھگڑتے رہتے ہیں۔

Marfat.com

تفسیر

گویا وہ عذاب کے منتظر ہیں

ان آیات میں گویا گزشتہ اور آئندہ کی بحثوں کا نتیجہ پیش کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اس قرآن میں ہم نے لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثال بیان کی ہے۔ (ولقد صرفنا فی هٰذا القراٰن للناس من کل مثل)۔

گزشتہ لوگوں کی ہلا کر رکھ دینے والی تاریخ کے مختلف نمونے ہم نے پیش کیے ہیں۔ ہم نے ان کی زندگی کے دردناک واقعات اور تلخ و شیریں باتیں لوگوں کو بتائی ہیں اور مسائل کو ایسی نچلی سطح پر بیان کیا گیا ہے کہ آمادہ دل حق کو قبول کرلیں اور باقی لوگوں کے لیے اتمام حجت ہو جائے اور کسی ابہام کی گنجائش باقی نہ رہے۔

لیکن اس کے باوجود سرکش لوگ بالکل ایمان نہ لائے کیونکہ "انسان سب سے بڑھ کر جھگڑالو ہے" (وکان الانسان اکثر شیء جدلًا)۔

"صرفنا"، "تصریف" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے تبدیل کرنا، دگرگوں کرنا اور ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنا۔ زیر بحث آیت میں اس لفظ کا مقصد یہ ہے کہ ہم نے مختلف انداز میں اور ہر اس پیرائے جس میں تاثیر کا امکان تھا لوگوں سے گفتگو کی ہے۔

"جدل" اس گفتگو کو کہتے ہیں کہ جو جھگڑے اور دوسرے پر تسلط حاصل کرنے کے لیے ہو۔ لہٰذا "مجادلہ" دو آدمیوں کی آپس میں تُو تکرار اور کھینچا تانی کو کہتے ہیں جیسا کہ راغب نے کہا ہے: یہ لفظ "جدلت الحبل" (رسی کو مضبوطی سے بٹ دیا) سے لیا گیا ہے۔ گویا جو شخص اس انداز سے بات کرتا ہے وہ مدِمقابل کے افکار کو زبردستی لپیٹ میں لے لینا چاہتا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "جدال" دراصل کشتی لڑنے اور دوسرے کو زمین پر پٹخنے کے معنی میں ہے اور یہ لفظ لفظی اور زبانی جھگڑوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

بہرحال یہاں انسانوں سے مراد غیر تربیت یافتہ انسان ہیں۔ اس کی نظیر قرآن میں بہت ہے۔ اس سلسلے میں تفصیلی بحث ہم سورہ یونس کی آیت ۱۲ کے ذیل میں کر آئے ہیں (نمونہ، جلد ۶ صفحہ ۱۹۲ اردو ترجمہ)۔

اگلی آیت میں ہے: ایسی طرح طرح کی مثالیں پیش کی گئیں، ہلا دینے والے واقعات بیان کیے گئے اور منطق و دلیل سے بات کی گئی۔ جس انسان کا دل صاف ہے اس پر ان چیزوں کو ضرور اثر کرنا چاہیے پھر بھی بہت سے ایسے گروہ ہیں کہ جو ایمان نہیں لائے۔ "ہدایتِ الٰہی آ جانے کے بعد ایمان اور طلب مغفرت میں لوگوں کو سوائے اس کے کونسا امر مانع تھا کہ وہ گزشتہ لوگوں کے سے انجام کے منتظر تھے" (وما منع

Marfat.com

الناس ان یؤمنوا اذ جاءھم الھدٰی ویستغفروا ربھم الا ان تأتیھم سنۃ الاولین)۔
اور یا پھر وہ اس بات کے منتظر تھے کہ عذاب الٰہی کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں (او یأتیھم العذاب قبلًا) [1]

یہ آیت درحقیقت اس طرف اشارہ ہے کہ یہ ہٹ دھرم اور مغرور لوگ ہرگز اپنے ارادے اور رغبت سے ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ صرف دو صورتوں میں ایمان لائیں گے۔ پہلی یہ کہ جیسے گزشتہ قوموں کو عذاب نے آگھیرا تھا اسی طرح انہیں بھی آگھیرے اور دوسری یہ کہ کم ازکم یہ عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور ایسے اضطراری ایمان کی کوئی حیثیت نہیں۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ ایسی قوموں کو ہرگز ایسا کوئی انتظار نہ تھا بلکہ ان کی کیفیت ایسی تھی کہ گویا وہ اس انتظار میں ہوں اور یہ ایک قسم کا خوبصورت کنایہ ہے۔ جیسے ہم کسی سرکش آدمی سے کہیں کہ تُو تو بس یہ چاہتا ہے کہ تجھے سزا ملے یعنی تجھے بہرحال سزا ملے گی اور تُو گویا سزا کے انتظار میں ہے۔

بہرحال سرکش اور مغرور انسان کبھی اس حالت کو جا پہنچتا ہے کہ وحی آسمانی، انبیاء کی مسلسل تبلیغ معاشرتی زندگی کے عبرت ناک درس اور گزشتہ لوگوں کی تاریخ ــ کوئی چیز بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ صرف خدا کی لاٹھی ہی سے اس کی عقل ٹھکانے آسکتی ہے لیکن نزول عذاب کے وقت تو توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور پھر لوٹ آنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔

اس کے بعد مخالفین کی ہٹ دھرمی کے مقابلے میں پیغمبر اکرمؐ کی تسلی اور دلجوئی کے لیے فرمایا گیا ہے: تیری ذمہ داری تو صرف بشارت اور انذار ہے۔ ہم نے انبیاء و مرسلین کو بشارت و انذار کے علاوہ کسی اور چیز کے لیے نہیں بھیجا (وما نرسل المرسلین الا مبشرین ومنذرین)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہ کوئی نئی بات نہیں کہ ایسے لوگ مخالفت کرنے لگیں اور مذاق اڑائیں "کافر اور ہٹ دھرم لوگ ہمیشہ غلط طور پر جھگڑتے رہے ہیں، اس زعم میں کہ حق کو ختم کر دیں اور قیامت و عذاب کے بارے میں ہماری آیتوں کا مذاق اڑائیں (ویجادل الذین کفروا بالباطل لیدحضوا بہ الحق واتخذوا اٰیاتی وما انذروا ھزوًا) [2]

---

[1] "قبل" مقابلہ اور سامنے کے معنی میں ہے یعنی عذاب الٰہی کو وہ اپنے مقابلے اور سامنے دیکھیں۔ طبرسی نے مجمع البیان میں، ابوالفتوح نے روح الجنان میں اور آلوسی نے روح المعانی میں یہی احتمال ذکر کیا ہے کہ "قبیل" کی جمع "قبل" عذاب کی مختلف نوعیتوں کی طرف اشارہ ہے لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

[2] "یدحضوا" "ادحاض" کے مادہ سے ابطال اور زائل کرنے کے معنی میں ہے اور اصل میں یہ "دحض" سے لیا گیا ہے کہ جو لغزش کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

یہ آیت درحقیقت سورہ حج کی آیات ۴۲ تا ۴۵ کے مشابہ ہے۔ ان میں ہے :

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ .....

اگر انہوں نے تیری تکذیب کی ہے تو تجھ سے پہلے قوم نوح، عاد اور ثمود نے بھی اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی ہے۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انبیاء جبر و اکراہ سے کام نہیں لیتے بلکہ ان کی ذمہ داری بشارت و انذار ہے۔ آخری ارادہ خود لوگوں کی طرف سے ہوتا ہے تاکہ وہ کفر و ایمان کے انجام کے بارے میں سوچ سمجھ لیں اور اپنے آزادانہ ارادے سے ایمان لائیں نہ یہ کہ عذاب الٰہی کو سامنے پاکر اضطراری طور پر اظہارِ ایمان کریں۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آزادی و اختیار کہ جو وسیلۂ تکامل ہے اس سے زیادہ تر غلط فائدہ اٹھایا گیا ہے اور طرفداران باطل نے ہمیشہ حق سے جھگڑا کیا ہے۔ کبھی مغالطے پیدا کرکے اور کبھی مذاق اڑا کر انہوں نے چاہا ہے کہ دین حق کو ختم کردیں لیکن جن کے دلوں کے دریچے حق کے لیے کھلے تھے انہوں نے حمایت حق میں قیام کیا اور حق و باطل کی یہ جنگ پوری تاریخ میں جاری رہی ہے۔

Marfat.com

۵۷ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا
وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ
يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى
فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ۝

۵۸ وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا
لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ
دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ۝

۵۹ وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا
لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ۝

ترجمہ

۵۷ ان سے بڑھ کر کون ظالم ہے کہ جنہیں پروردگار کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ منہ پھیر لیتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے اپنے ہاتھ سے کیا ہوتا ہے اسے بھول جاتے ہیں۔ ان کے دلوں پر ہم نے پردہ ڈال دیا ہے تاکہ وہ کچھ نہ سمجھیں اور ان کے کان ہم نے بھاری کر دیئے ہیں (تاکہ انہیں آوازِ حق سنائی نہ دے) یہی وجہ ہے کہ اگر تم انہیں ہدایت کی طرف پکارو گے تو وہ ہرگز ہدایت حاصل نہیں کریں گے۔

۵۸ اور تیرا رب بخشنے والا اور صاحبِ رحمت ہے اگر وہ انہیں ان کے

Marfat.com

اعمال کی سزا دینا چاہتا تو ان کے لیے فوراً عذاب بھیج دیتا لیکن ان کے لیے ایک وعدہ گاہ ہے جہاں پہنچنے سے وہ رہ نہیں سکتے ۔

۵۹ یہ قریے اور آبادیاں (جنہیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو) وہ ہیں کہ جب انہوں نے ظلم کیا تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا (اور پھر بھی) ان کی ہلاکت کے لیے ہم نے میعاد مقرر کر دی ۔

تفسیر

عذابِ الٰہی میں جلدی نہیں ہو سکتی

گزشتہ آیات میں تاریک دل متعصب کافروں کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیرِ نظر آیات میں بھی وہی سلسلہ گفتگو جاری ہے ۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ان سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے کہ جنہیں ان کے رب کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ منہ پھیر لیتے ہیں (ومن اظلم ممّن ذکّر بآیات ربه فاعرض عنها ونسی ما قدمت یداه) ۔

لفظ "تذکر" (یاد دہانی) گویا اس طرف اشارہ ہے کہ انبیاء کی تعلیمات حقائق کی یاد آوری کی طرح ہیں ۔ گویا یہ تعلیمات روحِ انسانی کی گہرائیوں میں موجود ہوتی ہیں اور انبیاء کا کام ان کے چہرے سے پردہ ہٹانا ہے ۔ یہی مفہوم نہج البلاغہ کے ایک خطبے میں بھی ہے :

لیستادوھم میثاق فطرته ویذکروھم منسی نعمته ویحتجوا الیھم بالتبلیغ ویثیروالھم دفائن العقول

انبیاء کی بعثت کا ہدف یہ تھا کہ وہ انسانوں کو عہدِ فطرت پورا کرنے پر ابھاریں، انہیں خدا کی بھولی ہوئی نعمتیں یاد دلائیں، تبلیغ کے ذریعے ان پر اتمامِ حجت کریں اور عقل کے پنہاں خزانے آشکار کریں ۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ ان دل کے اندھوں کو تین طرح سے بیداری کا درس دیا گیا ہے ۔

اوّل : یہ کہ یہ حقائق تمہاری فطرت ، وجدان اور روح سے مکمل آشنائی رکھتے ہیں ۔

دوم : یہ کہ تمہارے رب کی طرف سے ہیں ۔

Marfat.com

سوم: یہ کہ یہ نہ بھول جاؤ کہ تم نے بہت سی غلطیاں کی ہیں اور انبیاء کی تعلیم کا مقصد ان کے اثرات کو دُور کرنا ہے۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے "کیونکہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے گرا دیئے ہیں تاکہ وہ سمجھ نہ پائیں اور ان کے کان بوجھل کر دیئے ہیں تاکہ وہ آوازِ حق سن نہ سکیں" (انا جعلنا علی قلوبھم اکنۃ ان یفقھوہ و فی اٰذانھم وقرا) [1]

یہی وجہ ہے کہ "اگر تم انہیں حق کی طرف پکارو تو وہ ہرگز ہدایت قبول نہیں کریں گے" (وان تدعھم الی الھدٰی فلن یھتدوا اذًا ابدًا)۔

شاید یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ اگر اللہ نے قوتِ ادراک اور قوتِ سماعت چھین لی ہے تو اس کی وجہ ہے "ما قدمت یداہ" (ان کے وہی اعمال جو انہوں نے خود کیے ہیں) اور یہ سزا خود انہی کے اعمال کا سیدھا نتیجہ ہے بلکہ دوسرے لفظوں میں ان کے وہی بُرے اور شرمناک اعمال ہی ان کے دلوں پر پردے اور اُن کے کانوں کے لیے بوجھل پن میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کا ذکر قرآن کی بہت سی آیات میں ہے۔

مثلاً سورہ نساء کی آیت ۱۵۵ میں ہے:

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے لہٰذا بہت کم لوگ ایمان لانے والے ہیں۔

لیکن کچھ لوگ اسلام کو مکتبِ جبر و اکراہ ثابت کرنے کے لیے بہانے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ انہوں نے زیرِ بحث آیت کے دوسرے جملوں کو نظر میں نہیں رکھا اور اس کی تفسیر کرنے والی دیگر آیتوں کو بھی نہیں دیکھا۔ انہوں نے اس کے ایک حصّے کے ظاہری لفظی معنی کا سہارا لے کر اپنا نقطہ نظر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ جیسے ہم نے بیان کیا ہے اس اشکال کا جواب پوری طرح واضح ہے۔

خدا کا تربیتی پروگرام ایسا ہے کہ وہ بغیر مہلت اور موقع دیئے ظالم بادشاہوں کی طرح فوراً سزا نہیں دیتا۔ اس کی وسیع رحمت کا تقاضا ہے کہ گنہ گاروں کو زیادہ سے زیادہ مہلت دی جائے اور اصلاح کا موقع دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے: تیرا رب بخشنے والا اور صاحبِ رحمت ہے (وربك الغفور ذو الرحمۃ)۔

---

[1] جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں "اکنۃ" "کنان" (بروزن "کتاب") کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے پردہ یا وہ چیز جو چھپا دینے والی ہو اور "وقر" کان کے بوجھل پن اور کم سننے کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

اگر وہ انہیں سزا دینا چاہتا تو ان پر فوراً عذاب بھیج دیتا (لو یؤاخذھم بما کسبوا لعجل لھم العذاب)۔ لیکن ان کے لیے ایک میعاد مقرر ہے کہ جب وہ پوری ہوگئی تو پھر وہ بچ کر نہیں جائیں گے (بل لھم موعد لن یجدوا من دونہ موئلاً) [1]

اس کی بخشش کا تقاضا ہے کہ وہ توبہ کرنے والوں کو بخش دے اور اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ دوسروں کے عذاب میں بھی جلدی نہ کرے، شاید وہ توبہ کرنے والوں میں شامل ہو جائیں لیکن اس کی عدالت کا بھی تقاضا ہے کہ جب سرکشی انتہا کو پہنچ جائے تو پھر ان کا حساب بے باک کر دے۔ وہ فاسد و مفسد افراد کو جن کی اصلاح کی امید تک باقی نہ رہے اصولی طور پر ایسے لوگوں کی بقار حکمت خلقت کی نظر سے کوئی معنی نہیں رکھتی لہٰذا ان کا خاتمہ ضروری ہے تاکہ زمین ان کے وجود ناپاک سے پاک ہو جائے۔

آخر میں ایک اور یاد دہانی ہے۔ آیات کے اس سلسلے کے آخر میں گزشتہ ظالموں کا دردناک انجام یاد دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور یہ آبادیاں کہ جو ویرانوں میں بدل چکی ہیں، جب یہ لوگ ظلم و ستم کے مرتکب ہوئے تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا لیکن اس کے باوجود ہم نے انہیں عذاب کرنے میں جلدی نہیں کی بلکہ ان کی ہلاکت کے لیے ایک میعاد مقرر کی ہے (وتلک القریٰ اھلکنا ھم لما ظلموا و جعلنا لمھلکھم موعداً)۔

---

[1] "موئل"، "وئل" (بروزن "سرد") کے مادہ سے ملجا، پناہ گاہ اور ذریعۂ نجات کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

(۶۰) وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ
اَوْ اَمْضِىَ حُقُبًا ○
(۶۱) فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ
فِى الْبَحْرِ سَرَبًا ○
(۶۲) فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ز لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ
سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ○
(۶۳) قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّىْ نَسِيْتُ
الْحُوْتَ ز وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ج وَاتَّخَذَ
سَبِيْلَهٗ فِى الْبَحْرِ صلے عَجَبًا ○
(۶۴) قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ صلے فَارْتَدَّا عَلٰٓى
اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ○

ترجمہ

(۶۰) وہ وقت یاد کرو کہ جب موسٰی نے اپنے دوست سے کہا کہ میں تلاش
جاری رکھوں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں۔ اگرچہ اس
کے لیے مجھے طویل عرصے تک سفر جاری رکھنا پڑے۔
(۶۱) جس وقت وہ ان دو دریاؤں کے سنگم پر پہنچے تو انہیں اپنی مچھلی کا خیال نہ رہا
(کہ جو انہوں نے پکا کر کھانے کیلئے پکڑ رکھی تھی) اور وہ نکل بھاگی۔

Marfat.com

(۶۲) آگے جاکر موسیٰ نے اپنے ہمسفر دوست سے کہا: لاؤ ہمارا کھانا لے آؤ، ہم اس سفر سے بہت تھک گئے ہیں۔

(۶۳) اُس نے کہا آپ کو یاد ہے کہ جب نے اس پتھر کے پاس پناہ لی (اور آرام کیا) تو میں مچھلی کے بارے میں بتانا بھول گیا تھا اور یہ بات شیطان نے میرے ذہن سے نکال دی تھی اور مچھلی عجیب طریقے سے دریا کی طرف چلتی بنی۔

(۶۴) (موسیٰ نے) کہا: اسی کو تو ہم ڈھونڈھ رہے تھے۔ پھر وہ اسے تلاش کرتے ہوئے اسی راستے سے واپس آئے۔

تفسیر

خضرؑ اور موسیٰؑ کی حیرت انگیز داستان

مفسرین نے ان آیات کی شانِ نزول کے بارے میں لکھا ہے کہ کچھ اہلِ قریش رسول اللہؐ کی خدمت میں آئے۔ انہوں نے آپؐ سے اس عالم کے بارے میں سوال کیا کہ حضرت موسیٰؑ کو جس کی پیروی کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ آیات اسی ضمن میں نازل ہوئی ہیں۔

اصولی طور پر اس سورت کہف میں تین واقعات بیان ہوئے ہیں۔ یہ تینوں ایک لحاظ سے ہم آہنگ ہیں۔ پہلا واقعہ اصحابِ کہف کا ہے، جو گزر چکا ہے دوسرا زیرِ نظر ہے یہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کی داستان ہے تیسرا واقعہ ذوالقرنین کے بارے میں ہے جو بعد میں آئے گا۔

یہ تینوں واقعات ہمیں ہماری اس محدود زندگی سے باہر نکالتے ہیں جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔ یہ واقعات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ جہاں اسی میں محدود نہیں ہے کہ جو کچھ ہمیں لگتا ہے اور نہ ہی واقعات کی حقیقت بس وہی ہے جو ہمیں معلوم ہوتی ہے یا جو ہم سمجھتے ہیں۔

بہر حال اصحابِ کہف کا واقعہ ایسے جوانمردوں کی کہانی ہے کہ جنہوں نے اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے ہر چیز کو ٹھوکر مار دی۔

حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کہ جو ایک زمانے کے بڑے عالم تھے ان کا واقعہ بھی عجیب ہے یہ واقعہ نشاندہی کرتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ جیسے اولوالعزم پیغمبر کہ جو اپنے ماحول کے آگاہ ترین اور عالم ترین فرد تھے، بعض

Marfat.com

پہلوؤں سے ان کا علم بھی محدود تھا لہٰذا وہ استاد کی تلاش میں نکلے تاکہ اس سے درس لیں۔ استاد نے بھی ایسے درس دیئے کہ جن میں سے ہر ایک دوسرے سے عجیب تر ہے۔ اس داستان میں بہت سے اہم نکات پوشیدہ ہیں۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ نے اپنے دوست اور ساتھی جوان سے کہا کہ میں تو کوشش جاری رکھوں گا جب تک "مجمع البحرین" تک نہ پہنچ جاؤں، اگرچہ مجھے یہ سفر لمبی مدت تک جاری رکھنا پڑے (واذ قال موسیٰ لفتٰہ لا ابرح حتیٰ ابلغ مجمع البحرین او امضی حقباً)۔

اس آیت میں "موسیٰ" سے مراد بلاشبہ وہی مشہور اولوالعزم پیغمبر حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام ہیں بعض مفسرین نے اس احتمال کا اظہار کیا ہے کہ یہاں کوئی اور موسیٰ مراد ہے۔ ہم بعد میں اس سلسلے میں وضاحت کریں گے کہ اس احتمال کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ مفسرین اس واقعے سے ابھرنے والے چند سوالات کا جواب تلاش نہیں کر پائے لہٰذا وہ مجبور ہوتے ہیں کہ کوئی اور موسیٰ فرض کریں حالانکہ قرآن نے جہاں کہیں "موسیٰ" کی بات کی ہے وہاں موسیٰ بن عمران علیہ السلام ہی مراد ہیں۔

بہت سے مفسرین اور بہت سی روایات کے مطابق آیت میں "فتاہ" سے مراد "یوشع بن نون" ہیں۔ وہ بنی اسرائیل کے رشید، شجاع اور باایمان جوانمرد تھے۔ ہو سکتا ہے اُن کے لیے لفظ "فتیٰ" (جوان) انہی برجستہ صفات کی بنا پر ہو یا اس لیے کہ وہ حضرت موسیٰؑ کی خدمت کرتے تھے، ان کے ہمراہی اور ہم قدم تھے۔

"مجمع البحرین" کا مطلب ہے دو دریاؤں کا سنگم۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ "بحرین" سے یہاں کون سے دو دریا ہیں۔ اس سلسلے میں تین مشہور نظریے ہیں:

۱۔ خلیج عقبہ اور خلیج سویز کے ملنے کی جگہ ـــ ہم جانتے ہیں کہ بحیرہ احمر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ شمال مشرق کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور دوسرا شمال مغرب کی طرف، پہلے حصے کو خلیج عقبہ کہتے ہیں اور دوسرے کو خلیج سویز اور یہ دونوں خلیجیں جنوب میں پہنچ کر آپس میں مل جاتی ہیں اور پھر بحیرہ احمر اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔

۲۔ اس سے بحر ہند اور بحیرہ احمر کے ملنے کی طرف اشارہ ہے کہ جو باب المندب پر جا ملتے ہیں۔

۳۔ یہ بحیرہ روم اور بحر اطلس کے سنگم کی طرف اشارہ ہے کہ جو شہر طنجہ کے پاس جبل الطارق کا تنگ دہانہ ہے۔

تیسری تفسیر تو بہت ہی بعید نظر آتی ہے کیونکہ حضرت موسیٰؑ جہاں رہتے تھے وہاں سے جبل الطارق کا فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ اُس زمانے میں حضرت موسیٰؑ اگر عام راستے سے وہاں جاتے تو کئی ماہ لگ جاتے۔

Marfat.com

دوسری تفسیر میں جس مقام کی نشاندہی کی گئی ہے اس کا فاصلہ اگرچہ نسبتاً کم بنتا ہے لیکن اپنی حد تک وہ بھی زیادہ ہے کیونکہ شام سے جنوبی یمن کا فاصلہ بھی بہت زیادہ ہے۔

پہلا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جہاں رہتے تھے وہاں سے یعنی شام سے خلیج عقبہ تک کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ ویسے بھی زیر نظر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے کوئی زیادہ سفر طے نہیں کیا تھا اگرچہ وہ مقصد تک پہنچنے کے لیے بہت زیادہ سفر کے لیے بھی تیار تھے (غور کیجئے گا)۔

بعض روایات میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ نظر آتا ہے۔

لفظ "حقب" "عرصہ دراز" کے معنی میں ہے۔ بعض نے اس کی ۸۰ سال سے تفسیر کی ہے۔ اس لفظ سے حضرت موسیٰ کا مقصد یہ تھا کہ مجھے جس کی تلاش ہے میں اسے ڈھونڈھ کے رہوں گا چاہے اس مقصد کے لیے مجھے سالہا سال تک سفر جاری رکھنا پڑے۔

جو کچھ سطور بالا میں کہا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو کسی نہایت اہم چیز کی تلاش تھی۔ وہ اس کی جستجو میں در بدر پھر رہے تھے۔ وہ عزم بالجزم اور پختہ ارادے سے اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ ارادہ کیے ہوئے تھے کہ جب تک اپنا مقصود نہ پالیں چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

حضرت موسیٰ جس کی تلاش پر مامور تھے اس کا آپ کی زندگی پر بہت گہرا اثر ہوا اور اس نے آپ کی زندگی کا نیا باب کھول دیا ـــ جی ہاں! وہ ایک مردِ عالم و دانشمند کی جستجو میں تھے ـــ ایسا عالم کہ جو حضرت موسیٰ کی آنکھوں کے سامنے سے بھی حجاب ہٹا سکتا تھا اور انہیں نئے حقائق سے روشناس کروا سکتا تھا اور ان کے لیے علوم و دانش کے تازہ باب کھول سکتا تھا۔

ہم اس سلسلے میں جلد پڑھیں گے کہ اس عالم بزرگ کی جگہ معلوم کرنے کے لیے حضرت موسیٰ کے پاس ایک نشانی تھی اور وہ اس نشانی کے مطابق ہی چل رہے تھے۔

بہرحال جس وقت وہ ان دو دریاؤں کے سنگم پر جا پہنچے تو ایک مچھلی کہ جو ان کے پاس تھی اسے بھول گئے (فلما بلغا مجمع بينهما نسيا حوتهما) لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ مچھلی نے دریا میں اپنی راہ لی اور چلتی بنی (فاتخذ سبيله فی البحر سربًا)[1]

یہ مچھلی جو ظاہراً ان کے پاس غذا کے طور پر تھی ـــ کیا بھونی ہوئی تھی اور اسے نمک لگا ہوا تھا یا یہ تازہ مچھلی تھی کہ جو معجزانہ طور پر زندہ ہو کر اچھل کر پانی میں جا کر تیرنے لگی ـــ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

---

[1] جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے "سرب" (بروزن "جرب") نشیب کی طرف جانے کے معنی میں ہے اور "سرب" (بروزن "حرب") نشیبی راستے کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

بعض کتب تفاسیر میں یہ بھی ہے کہ اس علاقے میں آب حیات کا چشمہ تھا۔ اس کے کچھ قطرات مچھلی پر پڑ گئے جس سے مچھلی زندہ ہو گئی۔

لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ مچھلی ابھی پوری طرح مری نہ تھی کیونکہ بعض مچھلیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو پانی سے نکلنے کے بعد بہت دیر تک نیم جاں صورت میں رہتی ہیں اور اس مدت میں پانی میں گر جائیں تو ان کی معمول کی زندگی پھر شروع ہو جاتی ہے۔

آخر کار موسیٰ اور ان کے ہمراہی دو دریاؤں کے سنگم سے آگے نکل گئے تو لمبے سفر کے باعث انہیں خستگی کا احساس ہوا اور بھوک بھی ستانے لگی۔ اس وقت موسیٰ کو یاد آیا کہ غذا تو ہم ہمراہ لائے تھے لہٰذا انہوں نے اپنے ہمسفر دوست سے کہا ہمارا کھانا لایئے۔ اس سفر نے تو بہت تھکا دیا ہے (فلما جاوزا قال لفتٰه اٰتنا غدائنا لقد لقینا من سفرنا ھٰذا نصبًا)۔

"غداء" ناشتے کو یا دوپہر کے کھانے کو کہتے ہیں لیکن کتب لغت میں جو تعبیرات آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانے میں "غداء" صرف اس کھانے کو کہتے تھے جو دن کی ابتداء میں کھایا جاتا تھا کیونکہ یہ لفظ "غدوۃ" سے لیا گیا جو دن کے آغاز کے معنی میں ہے جبکہ موجودہ عربی زبان میں "غداء" اور "تغدی" دن یا دن کے کھانے کو کہتے ہیں۔

بہرحال یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت یوشع نے اتنا راستہ طے کر لیا تھا کہ جس پر سفر کا اطلاق ہوتا تھا لیکن یہی تعبیرات نشاندہی کرتی ہیں کہ سفر کچھ زیادہ طولانی نہ تھا۔

اس وقت "ان کے ہمسفر نے انہیں خبر دی کہ آپ کو یاد ہے کہ جب ہم نے اس پتھر کے پاس پناہ لی تھی (اور آرام کیا تھا) تو مجھے مچھلی کے بارے میں بتانا یاد نہ تھا اور شیطان ہی تھا جس نے یہ بات مجھے بھلا دی تھی۔ ہوا یہ کہ مچھلی نے بڑے حیران کن طریقے سے دریا کی راہ لی اور پانی میں چلتی بنی (قال اَرءیت اذ اوینا الی الصخرۃ فانی نسیت الحوت وما انسانیه الا الشیطان ان اذکرہ واتخذ سبیله فی البحر عجباً)[1]

یہ معاملہ چونکہ موسیٰ کے لیے اس عالم بزرگ کو تلاش کرنے کے لیے نشانی کی حیثیت رکھتا تھا لہٰذا "موسیٰ نے کہا: یہی تو ہمیں چاہیئے تھا اور یہی چیز تو ہم ڈھونڈتے پھرتے تھے" (قال ذٰلك ماکنا نبغ)۔

اور اُس وقت وہ تلاش کرتے ہوئے اسی راہ کی طرف پلٹے (فارتدا علیٰ اٰثارھما قصصًا)۔

---

[1] "وما انسانیه الا الشیطان ان اذکرہ"۔ یہ جملہ معترضہ ہے کہ جو بات کے بیچ میں آگیا ہے۔ یہ جملہ درحقیقت بھول جانے کی علت بیان کر رہا ہے اس لیے درمیان میں آگیا ہے۔ خصوصاً ایسے اشخاص کہ جنہیں کسی بزرگ تر شخصیت کی طرف سے عتاب و خطاب ہو رہا ہو معمولاً وہ علت اصلی کو اپنی گفتگو کے بیچ میں جملہ معترضہ کی صورت میں ذکر کر دیتے ہیں تاکہ اعتراض کم ہو جائے۔

Marfat.com

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا ممکن ہے کہ حضرت موسیٰ جیسے پیغمبر نسیان کا شکار ہو جائیں کیونکہ قرآن کہتا ہے:

نسیا حوتھما

وہ دونوں اپنی مچھلی کو بھول گئے

علاوہ ازیں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ موسیٰ کے ہمسفر نے اپنی بھول کی نسبت شیطان کی طرف کیوں دی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ جن مسائل کا تعلق احکام الٰہی اور امور تبلیغی سے نہ ہو یعنی روزمرہ کے عام مسائل ہوں ان میں نسیان ہو جائے (خصوصاً ایسے موقع پر جہاں معاملے کا تعلق آزمائش سے ہو جیسا کہ اس موقع پر حضرت موسیٰ کے لیے کہا جاتا ہے۔ اس کی تشریح بعد میں آئے گی)۔[1]

باقی رہا آپ کے ہمسفر کا نسیان کی نسبت شیطان کی طرف دینا۔ تو ممکن ہے یہ اس بنا پر ہو کہ مچھلی کا معاملہ اس عالم بزرگ کو پانے اور اس کی ملاقات سے مربوط تھا اور چونکہ شیطان ہر نیکی میں حائل ہونے کی کوشش کرتا ہے لہٰذا اس نے چاہا کہ اس ملاقات میں انہیں دیر ہو جائے اور شاید اس کی بنیاد خود یوشع کی طرف سے پڑی ہو کہ اس کام میں جس قدر اہتمام اور احتیاط ضروری تھی وہ انہوں نے نہ کی ہو۔

---

[1] یہ جواب اطمینان بخش نہیں ہے خصوصاً شیعہ مسلک کے حوالے سے (مترجم)۔

Marfat.com

۶۵ فَوَجَدَا عَبۡدًا مِّنۡ عِبَادِنَاۤ اٰتَیۡنٰهُ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَعَلَّمۡنٰهُ مِنۡ لَّدُنَّا عِلۡمًا ۝

۶۶ قَالَ لَهٗ مُوۡسٰى هَلۡ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنۡ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمۡتَ رُشۡدًا ۝

۶۷ قَالَ اِنَّكَ لَنۡ تَسۡتَطِيۡعَ مَعِىَ صَبۡرًا ۝

۶۸ وَكَيۡفَ تَصۡبِرُ عَلٰى مَا لَمۡ تُحِطۡ بِهٖ خُبۡرًا ۝

۶۹ قَالَ سَتَجِدُنِىۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَاۤ اَعۡصِىۡ لَكَ اَمۡرًا ۝

۷۰ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعۡتَنِىۡ فَلَا تَسۡـئَلۡنِىۡ عَنۡ شَىۡءٍ حَتّٰۤى اُحۡدِثَ لَكَ مِنۡهُ ذِكۡرًا ۝

ترجمہ

۶۵ (وہاں) انہیں ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ ملا — وہ بندہ کہ جس پر ہم نے اپنی رحمت کی تھی اور جسے ہم نے اپنی طرف سے بہت سا علم دیا تھا۔

۶۶ موسیٰ نے اس سے کہا: مجھے اجازت ہے کہ میں آپ کی پیروی کروں تاکہ جو علم آپ کو عطا کیا گیا ہے اور جو باعثِ رشد و صلاح ہے آپ وہ مجھے سکھا دیں۔

۶۷ اُس نے کہا: تم ہرگز میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے۔

Marfat.com

۶۸ اور جس چیز کے رموز سے تم آگاہ ہی نہیں ہو تم اس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہو؟

۶۹ (موسٰی نے) کہا: انشاء اللہ مجھے صابر پاؤ گے اور میں کسی امر میں آپ کے حکم کی مخالفت نہیں کروں گا۔

۷۰ (خضر نے) کہا: اچھا اگر تم چاہتے ہو تو میرے پیچھے پیچھے آجاؤ اور دیکھو! کسی مسئلے کے بارے میں سوال نہ کرنا یہاں تک کہ میں خود (موقع پر) تجھ سے بیان کر دوں۔

تفسیر

عظیم اُستاد کی زیارت

جس وقت موسٰیؑ اور ان کے ہمسفر دوست مجمع البحرین اور پتھر کے پاس پلٹ کر آئے تو "اچانک ہمارے بندوں میں سے ایک بندے سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ وہ بندہ کہ جس پر ہم نے اپنی رحمت کی تھی اور جسے ہم نے بہت سے علم و دانش سے نوازا تھا (فوجدا عبدًا من عبادنا اٰتیناہ رحمۃ من عندنا وعلمناہ من لدنا علمًا)۔

"وجدا" کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اسی عالم کی تلاش میں تھے اور آخرکار انہوں نے اسے "پا لیا"۔

"عبدًا من عبادنا" (ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ) ـ یہ تعبیر بتاتی ہے کہ انسان کیلئے بہترین اعزاز و اعتماد یہ ہے کہ وہ خدا کا سچا بندہ ہو اور یہ مقام عبودیت ہی ہے کہ جہاں انسان پر رحمت الٰہی نازل ہوتی ہے اور علوم کے دریچے اس کے دل کے سامنے کھل جاتے ہیں۔

"من لدنا" کی تعبیر بھی بتاتی ہے کہ اس عالم کا علم معمولی اور عام سا نہیں تھا بلکہ اس جہان کے ایسے اسرار و حوادث کی آگاہی کا ایک حصہ تھا کہ جنہیں صرف خدا جانتا ہے۔

"علمًا" کی تعبیر نکرہ ہے اور نکرہ ایسے مواقع پر عموماً تعظیم کے لیے ہوتا ہے۔ یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ اس مرد عالم نے اس علم سے اچھا خاصا حصہ پایا تھا۔

یہ کہ زیر بحث آیت میں "رحمۃ من عندنا" سے کیا مراد ہے ـ اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف تفسیریں ذکر کی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مقام نبوت کی طرف اشارہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ عمر طولانی

Marfat.com

کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد شایان شان استعداد، عظمت روح اور شرح صدر ہو اور یہ خدا کی طرف سے اس جوانمرد کے لیے اس لیے ہو کہ وہ علم الٰہی کے حصول کا اہل ہو سکے۔
یہ کہ اس عالم کا نام "خضر" تھا۔ وہ پیغمبر تھا یا نہیں ۔۔ اس سلسلے میں ہم آئندہ صفحات میں بحث کریں گے۔
اس وقت حضرت موسیٰ نے بڑے ادب سے اس عالم بزرگ کی خدمت میں "عرض کیا: کیا مجھے اجازت ہے کہ میں آپ کی پیروی کروں تاکہ جو علم آپ کو عطا کیا گیا ہے اور جو باعث رشد و صلاح ہے۔ مجھے بھی تعلیم دیں" (قال له موسیٰ هل اتبعك علىٰ ان تعلمن مما علمت رشدًا)۔
"رشدًا" کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ علم ہدف و مقصد نہیں ہے بلکہ علم تو حصول مقصد کا ذریعہ اور خیر و صلاح کے حصول کا وسیلہ ہے ۔۔ ایسا ہی علم قدر و قیمت کا حامل ہے اور استاد سے ایسا ہی علم حاصل کرنا چاہیئے اور یہی علم مایۂ افتخار ہے۔
لیکن بڑے تعجب کی بات ہے کہ اس عالم نے موسیٰ سے کہا: تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکو گے (قال انك لن تستطيع معى صبرًا)۔
ساتھ ہی اس کی وجہ اور دلیل بھی بیان کر دی اور کہا: "تم اس چیز پر کیسے صبر کر سکتے ہو جس کے اسرار سے تم آگاہ ہی نہیں" (وكيف تصبر علىٰ ما لم تحط به خبرًا)۔
جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے یہ عالم اسرار و حوادث کے باطنی علوم پر دسترس رکھتا تھا جبکہ حضرت موسیٰ نہ باطن پر مامور تھے اور نہ ان کے بارے میں زیادہ آگاہی رکھتے تھے۔
ایسے مواقع پر ایسا بہت ہوتا ہے کہ حوادث کے ظاہر سے ان کا باطن مختلف ہوتا ہے بعض اوقات کسی واقعے کا ظاہر احمقانہ اور ناپسندیدہ ہوتا ہے جبکہ باطن میں بہت مقدس منطقی اور سوچا سمجھا ہوتا ہے۔
ایسے مواقع پر جو شخص ظاہر کو دیکھتا ہے وہ اس پر صبر نہیں کر پاتا اور اس پر اعتراض کرتا ہے یا مخالفت کرنے لگتا ہے لیکن وہ استاد کہ جو اسرار دروں سے آگاہ ہے اور معاملے کے باطن پر نظر رکھتا ہے وہ بڑے اطمینان اور ٹھنڈے دل سے کام جاری رکھتا ہے اور اعتراض اور واویلے پر کان نہیں دھرتا بلکہ مناسب موقع کے انتظار میں رہتا ہے تاکہ حقیقتِ امر بیان کرے جبکہ شاگرد بے تاب رہتا ہے لیکن جب اسرار اس پر کھل جاتے ہیں تو اُسے پوری طرح سکون و قرار آ جاتا ہے۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ بات سن کر پریشان ہوئے انہیں خوف تھا کہ اس عالم بزرگ کا فیض ان سے منقطع نہ ہو لہٰذا انہوں نے وعدہ کیا کہ تمام امور پر صبر کریں گے اور "کہا انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی کام میں آپ کی مخالفت نہیں کروں گا" (قال ستجدنی ان شاء الله صابرًا ولا اعصى لك امرًا)۔
یہ کہہ کر حضرت موسیٰ نے پھر انتہائی ادب و احترام اور خدا کی حیثیت پر اپنے بھروسے کا اظہار کیا۔

Marfat.com

آپ نے اس عالم سے یہ نہیں کہا کہ میں صابر ہوں بلکہ کہتے ہیں: انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔
لیکن چونکہ ایسے واقعات پر صبر کرنا کہ جو ظاہراً ناپسندیدہ ہوں اور انسان جن کے اسرار سے آگاہ نہ ہو کوئی
آسان کام نہیں اس لیے اس عالم نے حضرت موسیٰ کو خبردار کرتے ہوئے پھر عہد لیا اور کہا اچھا اگر تم میرے
پیچھے پیچھے آنا چاہتے ہو تو دیکھو! خاموش رہنا اور کسی معاملے پر سوال نہ کرنا جب تک کہ مناسب موقع پر
میں خود تم سے بیان نہ کر دوں (قال فان اتبعتنی فلا تسئلنی عن شیء حتیٰ احدث لک منه ذکرا)[1]

۷۱ فَانْطَلَقَا حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِى السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ۭ قَالَ اَخَرَقْتَهَا
لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ۝

۷۲ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝

۷۳ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ
اَمْرِيْ عُسْرًا ۝

۷۴ فَانْطَلَقَا حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا
زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ۝

۷۵ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝

۷۶ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ
مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ۝

۷۷ فَانْطَلَقَا حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِۨ اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا
فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ

---

[1] "احدث لک منه ذکرا" میں لفظ "احدث" کا مفہوم ہے کہ میں خود بات شروع کروں گا اور پہلے خود اس سے پردہ اٹھاؤں گا، تم بات نہ کرنا۔

Marfat.com

قَالَ لَوۡ شِئۡتَ لَتَّخَذۡتَ عَلَيۡهِ اَجۡرًا ○
۷۸ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيۡنِىۡ وَبَيۡنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاۡوِيۡلِ مَا لَمۡ تَسۡتَطِعْ عَّلَيۡهِ صَبۡرًا ○

ترجمہ

۷۱ وہ چل پڑے یہاں تک کہ ایک کشتی پر سوار ہو گئے۔ اس نے کشتی میں سوراخ کر دیا (تو موسیٰ نے) کہا: کیا آپ نے اس میں سوار لوگوں کو غرق کرنے کے لیے اس میں سوراخ کر دیا ہے، واقعاً آپ نے کیسا بُرا کام انجام دیا ہے۔

۷۲ اُس نے کہا: مَیں نے نہ کہا تھا کہ تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔

۷۳ (موسیٰ نے) کہا: اس بھول پر میرا مواخذہ نہ کریں اور اس امر پر مجھ پر سخت گیری نہ کریں۔

۷۴ پھر وہ چل پڑے یہاں تک کہ ایک بچے کو دیکھا۔ اُس نے اس بچے کو قتل کر دیا۔ (موسیٰ نے) کہا: کیا آپ نے ایک پاک انسان کو قتل کر دیا ہے جبکہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ آپ نے سچ مچ بُرا کام کیا ہے۔

۷۵ اُس (عالم) نے (پھر) کہا: مَیں نے تم سے نہ کہا تھا کہ تم ہرگز میرے ساتھ صبر نہیں کر پاؤ گے۔

۷۶ (موسیٰ نے) کہا: اس کے بعد اگر مَیں آپ سے کسی چیز کے بارے میں سوال کروں تو مجھے ساتھ نہ رکھیے گا کیونکہ پھر میری طرف سے آپ معذور ہوں گے۔

۷۷ وہ پھر چل پڑے۔ چلتے چلتے ایک بستی کے پاس پہنچے۔ انہوں نے ان

Marfat.com

سے کھانا مانگا لیکن انہوں نے مہمان بنانے سے انکار کر دیا۔ (اس کے باوجود) انہوں نے وہاں ایک دیوار دیکھی کہ جو گر رہی تھی (اس عالم نے) اس (دیوار) کو کھڑا کر دیا۔ (موسیٰ نے) کہا (کم از کم) اس کام کی اجرت ہی لے لیتے۔

(۷۸) اس نے کہا: اب تمہارے اور میرے درمیان جدائی کا وقت آگیا ہے لیکن میں جلد تمہیں اس چیز کے راز سے آگاہ کروں گا جس پر تم صبر نہیں کر سکے۔

تفسیر

خدائی معلم اور یہ ناپسندیدہ کام؟

موسیٰ اس عالم ربانی کے ساتھ چل پڑے۔ چلتے چلتے ایک کشتی تک پہنچے اور اس میں سوار ہو گئے (فانطلقا حتی اذا رکبا فی السفینۃ)۔

یہاں سے ہم دیکھتے ہیں کہ اب قرآن تثنیہ کی ضمیر استعمال کرنے لگا ہے۔ یہ اشارہ ہے حضرت موسیٰ اور اس عالم بزرگوار کی طرف۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے ہمسفر یوشع کی ماموریت اس مقام پر ختم ہوگئی تھی اور وہ یہاں سے پلٹ گئے تھے یا پھر یہ ہے کہ وہ موجود تو تھے لیکن اس معاملے سے ان کا تعلق نہیں تھا لہٰذا انہیں یہاں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ لیکن پہلا احتمال زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔

بہرحال وہ دونوں کشتی پر سوار ہو گئے تو اس عالم نے کشتی میں سوراخ کر دیا (خرقھا)۔

جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے " خرق " کسی چیز کو بے سوچے سمجھے تباہ کرنے کی نیت سے چیرنے پھاڑنے کے معنی میں ہے اور اس عالم کا کام ظاہری طور پر یوں ہی لگتا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ ایک طرف تو اللہ کے عظیم نبی بھی تھے لہٰذا انہیں لوگوں کی جان و مال کا محافظ بھی ہونا چاہیئے تھا اور انہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی کرنا چاہیئے تھا اور دوسری طرف ان کا انسانی ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ اس قسم کے غلط کام پر خاموشی اختیار کریں لہٰذا حضرت خضرؑ کے ساتھ ان کا جو معاہدہ ہوا تھا اسے ایک طرف رکھا اور اس کام پر اعتراض کر دیا اور" کہا: کیا آپ نے اہل کشتی کو غرق کرنے کے لیے اس میں سوراخ کر دیا ہے۔ واقعاً آپ نے کس قدر بُرا کام انجام دیا ہے (قال اخرقتھا لتغرق اھلھا لقد جئت شیئًا امرًا)۔

Marfat.com

اس میں شک نہیں کہ اس عالم کا مقصد کشتی والوں کو غرق کرنا نہ تھا لیکن اس عمل کا نتیجہ غرق ہونے کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا لہٰذا حضرت موسیٰ نے لام غایت کے ساتھ اسی طرف اشارہ کر دیا کیونکہ لام غایت مقصد بیان کرنے کے لیے آتی ہے۔

یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ ایک شخص بہت کھانا کھاتا جائے تو اُسے کہا جائے کہ کیوں اپنے آپ کو مارنا چاہتے ہو۔ یقیناً اس کا یہ مقصد تو نہیں کہ اپنے آپ کو مار ڈالے لیکن ہو سکتا ہے اس کے عمل کا یہی نتیجہ نکلے۔

"اِمر" (بروزن "شمر") حیرت انگیز اہم کام یا بہت بُرے کام کو کہا جاتا ہے اور یہ کام واقعاً ظاہری طور پر تعجب انگیز اور بہت بُرا ہے۔ واقعاً یہ کام کتنا حیرت انگیز ہے کہ کسی کشتی میں بہت سے مسافر سوار ہوں اور اس میں سوراخ کر دیا جائے۔

بعض روایات میں ہے کہ اہل کشتی جلد ہی متوجہ ہو گئے اور انہوں نے اس سوراخ کو کسی ذریعے سے پُر کر دیا لیکن اب وہ کشتی صحیح نہیں رہ گئی تھی۔

اس وقت اس عالم نے بڑی متانت کے ساتھ موسیٰ پر نگاہ ڈالی اور کہا: میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکو گے (قال الم اقل انك لن تستطيع معی صبرًا)۔

اس واقعے کی اہمیت کے پیش نظر حضرت موسیٰ کی عجلت اگرچہ فطری تھی تاہم وہ پشیمان ہوئے۔ انہیں اپنا معاہدہ یاد آیا لہٰذا معذرت آمیز لہجے میں استاد سے کہا: اس بھول پر مجھ سے مؤاخذہ نہ کیجئے اور اس کام پر مجھ پر سخت گیری نہ کیجئے (قال لا تؤاخذنی بما نسيت ولا ترهقنی من امری عسرًا)۔ یعنی اشتباہ ہو گیا۔ اب وہ وقت گزر گیا ہے آپ اپنی بزرگی کی وجہ سے صَرفِ نظر کریں۔

"لا ترهقنی" "ارهاق" کے مادہ سے قہر و غلبہ سے کسی چیز کو ڈھانپنے کے معنی میں ہے کبھی یہ تکلیف دینے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ زیرِ بحث جملے میں مراد یہ ہے کہ مجھ پر سختی نہ کیجئے اور مجھے تکلیف میں نہ ڈالیں اور اس کام کی وجہ سے اپنا فیضِ علم مجھ سے منقطع نہ کریں۔

ان کا دریائی سفر ختم ہو گیا۔ وہ کشتی سے اتر آئے۔ سفر جاری تھا۔ اثنائے راہ میں انہیں ایک بچہ ملا لیکن اس عالم نے کسی تمہید کے بغیر ہی اس بچے کو قتل کر دیا (فانطلقا حتّٰی اذا لقيا غلامًا فقتله)۔

حضرت موسیٰ سے پھر نہ رہا گیا۔ یہ نہایت وحشتناک منظر تھا۔ بلا جواز اور بے وجہ ایک بے گناہ بچے کا قتل، ایسی چیز نہ تھی کہ حضرت موسیٰ خاموش رہ سکتے۔ آپ غصے سے آگ بگولہ ہو گئے۔ غم و اندوہ اور غصے کا یہ عالم تھا کہ آپ نے پھر اپنے معاہدے کو نظر انداز کرتے ہوئے اب کے شدید تر اور واضح تر اعتراض کیا۔ یہ واقعہ بھی پہلے واقعے کی نسبت زیادہ وحشتناک تھا۔ وہ کہنے لگے: کیا آپ نے ایک بے گناہ اور پاک انسان کو قتل کر دیا ہے جبکہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا (قال اقتلت نفسًا زكية بغير نفس)۔

Marfat.com

واقعاً آپ نے کیسا بُرا کام انجام دیا ہے (لقد جئت شیئاً نکراً)۔

لفظ "غلام" جوان نورس کے معنی میں ہے۔ وہ حدِ بلوغ کو پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔ جس نوجوان کو اس عالم نے قتل کیا تھا وہ حدِ بلوغ کو پہنچا ہوا تھا یا نہیں۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

بعض نے "نفساً زکیۃً" (پاک اور بے گناہ انسان) کو اس بات کی دلیل قرار دیا ہے کہ وہ بالغ نہیں تھا۔

بعض دیگر نے "بغیر نفس" کی تعبیر کو اس بات کی دلیل بنایا ہے کہ وہ بالغ تھا کیونکہ قصاص صرف بالغ سے لیا جا سکتا ہے۔

البتہ آیت کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس سلسلے میں حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

"نکر" قبیح اور منکر کے معنی میں ہے ایسے کام کا نتیجہ بھی "امر" سے زیادہ ہے جو کشتی میں سوراخ کرنے کے واقعے کے لیے آیا ہے۔ اس کی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ ان کے پہلے کام نے چند لوگوں کو خطرے میں ڈال دیا تھا اور وہ لوگ جلد ہی متوجہ ہو گئے اور انہوں نے خطرے کو اپنے آپ سے دور کر دیا لیکن دوسرے کام میں ظاہراً وہ ایک جرم کے مرتکب ہوتے تھے۔

اس عالم بزرگوار نے پھر اپنے خاص اطمینان اور نرم لہجے میں وہی جملہ دہرایا۔ کہا: میں نے تجھ سے نہ کہا تھا کہ تم ہرگز میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے (قال الم اقل لک انک لن تستطیع معی صبراً)۔

پہلے اور اس جملے میں فرق یہ ہے کہ اس میں لفظ "لک" کا اضافہ ہے کہ جو مزید تاکید کے لیے ہے یعنی میں نے یہ بات خود تم سے کہی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا عہد یاد آگیا۔ انہیں بہت احساس شرمندگی ہو رہا تھا کیونکہ دو مرتبہ یہ پیمان ٹوٹ چکا تھا چاہے بھول کر ہی ایسا ہوا ہو۔ انہیں خیال آرہا تھا کہ ہو سکتا ہے استاد کی بات صحیح ہو کہ انہوں نے تو پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ ابتداء میں ان کے کام موسیٰ کے لیے ناقابلِ برداشت ہوں گے۔ موسیٰ نے پھر عذر خواہی کے لہجے میں کہا کہ اس دفعہ بھی مجھ سے صرفِ نظر کیجیے اور میری بھول چوک کو نظرانداز کر دیجیے اور "اگر اس کے بعد میں آپ کے کاموں کے بارے میں وضاحت کا تقاضا کروں (اور آپ پر اعتراض کروں) تو پھر بے شک مجھے ساتھ نہ رکھیں اور اس صورت میں آپ میری طرف سے معذور ہوں گے" (قال ان سألتک عن شیء بعدھا فلا تصاحبنی قد بلغت من لدنی عذراً)۔

یہ جملہ حضرت موسیٰ کی انصاف پسندی، بلند نظری اور عالی ظرفی کی حکایت کرتا ہے اور نشاندہی کرتا ہے کہ وہ ایک حقیقت کے سامنے سر جھکا دینے والے تھے اگرچہ وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں تین بار کی آزمائش نے یہ واضح ہو جائے گا کہ ان دونوں کی ... الگ الگ

Marfat.com

ہے اور اس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔

اس گفتگو اور نئے معاہدے کے بعد "موسیٰ اپنے استاد کے ساتھ چل پڑے۔ چلتے چلتے وہ ایک بستی میں پہنچے۔ انہوں نے اس بستی والوں سے کھانا مانگا لیکن بستی والوں نے انہیں مہمان بنانے سے انکار کر دیا (فانطلقا حتیٰ اذا اتیا اهل قریة استطعما اهلها فابوا ان یضیفوهما)۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کوئی ایسے افراد نہ تھے کہ اس بستی کے لوگوں پر بوجھ بننا چاہتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا زاد و توشہ راستے میں کہیں دے بیٹھے تھے یا پھر ختم ہو گیا تھا۔ لہذا وہ چاہتے تھے کہ بستی والوں کے مہمان ہو جائیں (یہ احتمال بھی ہے کہ اس عالم نے جان بوجھ کر لوگوں سے ایسا کہا ہو تاکہ حضرت موسیٰ کو ایک اور درس دیا جا سکے)۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ "قریة" قرآن کی زبان میں ایک عام مفہوم رکھتا ہے اور ہر قسم کے شہر اور آبادی کے معنی میں آیا ہے لیکن یہاں خصوصیت سے شہر مراد ہے کیونکہ چند آیات کے بعد اس کے لیے لفظ "المدینہ" آیا ہے۔

بہرحال مفسرین میں اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ یہ شہر کونسا تھا اور کہاں واقع تھا۔ ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ شہر "انطاکیہ" تھا[1]

بعض نے کہا ہے کہ یہاں "ایلہ" شہر مراد ہے کہ جو آج کل "ایلات" نام کی مشہور بندرگاہ ہے اور بحیرہ احمر کے کنارے خلیج عقبہ کے نزدیک واقع ہے۔

بعض دوسروں کا نظریہ ہے کہ اس سے "ناصرہ" شہر مراد ہے کہ جو فلسطین کے شمال میں واقع ہے اور حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش ہے۔ مرحوم طبرسی نے اس مقام پر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ جو آخری احتمال کی تائید کرتی ہے۔

مجمع البحرین کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ اس سے مراد خلیج عقبہ اور خلیج سویز کا سنگم ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شہر ناصرہ اور بندرگاہ ایلہ اس جگہ سے انطاکیہ کی نسبت زیادہ قریب ہیں۔

بہرصورت جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے استاد کے ساتھ اس شہر میں پیش آیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کے رہنے والے بہت بخیل اور کم ظرف لوگ تھے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس شہر والوں کے بارے میں ایک حدیث منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

---

[1] "انطاکیہ" شام کے قدیم شہروں میں سے ہے۔ اس کا فاصلہ حلب سے ۹۶ کلومیٹر ہے اور اسکندرون سے ۵۹ کلومیٹر ہے۔ یہ علاقہ اناج کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔ سویدیہ بندرگاہ اسی علاقے میں ہے اور انطاکیہ سے ۲۷ کلومیٹر دور ہے (دائرۃ المعارف فرید وجدی جلد ۱ صفحہ ۵۳۵)۔

Marfat.com

کانوا اھل قریۃ لئام

وہ کمینے اور کم ظرف لوگ تھے[1]

قرآن کہتا ہے: اس کے باوجود انہوں نے اس شہر میں ایک گرتی ہوئی دیوار دیکھی تو اس عالم نے اس کی مرمت شروع کردی اور اسے کھڑا کردیا (فوجدا فیھا جدارًا یرید ان ینقض فاقامہ)۔[2]

حضرت موسیٰ اس وقت تھکے ہوئے تھے۔ انہیں بھوک بھی ستا رہی تھی، کوفت الگ تھی۔ وہ محسوس کر رہے تھے اس آبادی کے ناسمجھ لوگوں نے ان کی اور ان کے استاد کی ہتک کی ہے۔ دوسری طرف وہ دیکھ رہے تھے اس بے احترامی کے باوجود حضرت خضرؑ اس گرتی ہوئی دیوار کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے جیسے ان کے سلوک کی مزدوری دے رہے ہوں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کم ازکم استاد یہ کام اجرت لے کر ہی کرتے تاکہ کھانا تو فراہم ہو جاتا۔

لہٰذا وہ اپنے معاہدے کو پھر بھول گئے۔ انہوں نے پھر اعتراض کیا لیکن اب لہجہ پہلے کی نسبت ملائم اور نرم تھا۔ کہنے لگے: اس کام کی کچھ اجرت ہی لے لیتے: (قال لو شئت لاتخذت علیہ اجرًا)۔

درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ سوچ رہے تھے کہ یہ عدل تو نہیں کہ انسان ان لوگوں سے ایثار کا سلوک کرے کہ جو اس قدر فرومایہ اور کم ظرف ہوں۔ دوسرے لفظوں میں نیکی اچھی چیز ہے مگر جب برمحل ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ برائی کے جواب میں نیکی کرنا مردانِ خدا کا طریقہ ہے لیکن وہاں کہ جہاں بُروں کے لیے بُرائی کی تشویق کا باعث نہ ہو۔ (یعنی وہ "شرافت خور" نہ ہو)۔

اس موقع پر اس عالم بزرگوار نے حضرت موسیٰؑ سے آخری بات کہی کیونکہ گزشتہ تمام واقعات کی بناء پر انہیں یقین ہوگیا تھا کہ موسیٰ ان کے کاموں کو برداشت نہیں کرسکتے۔ لہٰذا فرمایا: "لو اب تمہارے اور میرے درمیان جدائی کا وقت آگیا ہے۔ جلد میں تمہیں ان امور کے اسرار سے آگاہ کروں گا کہ جن پر تم صبر نہ کرسکے" (قال ھٰذا فراق بینی و بینک سانبئک بتأویل ما لم تستطع علیہ صبرًا)۔

حضرت موسیٰ نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ گزشتہ واقعے میں یہی بات وہ خود تجویز کر چکے تھے یعنی خود حضرت موسیٰؑ پر یہ حقیقت ثابت ہوچکی تھی کہ ان کا نباہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن پھر بھی جدائی کی خبر موسیٰ کے دل پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح لگی ۔ ایسے استاد سے جدائی کہ جس کا سینہ مخزنِ اسرار

---

[1] مجمع البیان، زیربحث آیت کے ذیل میں۔

[2] دیوار کی طرف ارادہ کی نسبت یقینی طور پر مجازی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ایسی کمزور اور خستہ ہوچکی تھی کہ گویا اس نے گرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔

Marfat.com

ہو، جس کی ہمراہی باعثِ برکت ہو اور جس کی ہر بات ایک درس ہو، جس کا طرزِ عمل الہام بخش ہو جس کی پیشانی سے نورِ خدا ضوفشاں ہو اور جس کا دل علمِ الٰہی کا گنجینہ ہو۔ ایسے رہبر سے جدائی باعثِ رنج و غم تھی۔لیکن یہ ایک ایسی تلخ حقیقت تھی جو موسیٰؑ کو بہر حال قبول کرنا تھی۔

مشہور مفسر ابوالفتوح رازی کہتے ہیں کہ ایک روایت ہے:

لوگوں نے حضرت موسیٰؑ سے پوچھا: آپ کی زندگی میں سب سے بڑی مشکل کونسی تھی؟

حضرت موسیٰؑ نے کہا: مَیں نے بہت سختیاں جھیلی ہیں (فرعون کے دَور کی سختیاں اور پھر بنی اسرائیل کے دَور کی مشکلات کی طرف اشارہ ہے) لیکن کسی مشکل اور رنج نے میرے دل کو اتنا رنجور نہیں کیا جتنا حضرت خضرؑ سے جدائی کی خبر نے [1]

"تأویل" "اَول" (بروزنِ "قول") کے مادہ سے کسی چیز کو لوٹانے کے معنی میں ہے۔ لہٰذا ہر کام یا بات کو اس کے اصلی ہدف کی طرف لوٹا دیئے جانے کو تاویل کہتے ہیں اور خواب کی تعبیر کو بھی اسی لیے تاویل کہتے ہیں (جیسا کہ سورہ یوسف کی آیہ ۱۰۰ میں آیا ہے):

هٰذا تأويل رؤياى [2]

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] مزید توضیح کے لیے جلد ۲ تفسیرِ نمونہ میں سورہ آلِ عمران کی آیہ ۷ کے ذیل میں رجوع کریں۔

Marfat.com

(۷۹) اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِى الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ
اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ
غَصْبًا ○
(۸۰) وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا
طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ○
(۸۱) فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً
وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ○
(۸۲) وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِى الْمَدِيْنَةِ وَ
كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ
اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ
وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِىْ ؕ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ
عَّلَيْهِ صَبْرًا ○

ترجمہ

(۷۹) ہاں وہ کشتی کی بات ۔ تو وہ کچھ مسکین وغریب افراد کی تھی۔ وہ اس سے دریا میں کام کرتے تھے۔ مَیں نے چاہا کہ اس میں کوئی نقص ڈال دوں (کیونکہ) ایک ظالم بادشاہ ان کے پیچھے تھا کہ جو ہر کشتی کو زبردستی ہتھیا رہا تھا۔

(۸۰) رہا وہ لڑکا ۔ تو اس کے ماں باپ صاحبِ ایمان تھے۔ ہم نے پسند نہیں کیا

Marfat.com

کہ وہ انہیں سرکشی اور کفر پر اُکسائے۔

(۸۱) ہم نے چاہا کہ ان کا رب اس کے بدلے انہیں زیادہ پاک اور زیادہ پُرمحبت اولاد عطا کردے۔

(۸۲) رہی اُس دیوار کی بات، تو وہ اس شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی۔ اس کے نیچے ان کا خزانہ تھا۔ اُن کا باپ نیک اور صالح شخص تھا۔ تیرا رب چاہتا تھا کہ وہ بالغ ہو کر اپنا خزانہ نکال لیں۔ یہ تیرے پروردگار کی رحمت تھی۔ مَیں نے یہ کام اپنی مرضی سے نہیں کیا اور یہ تھا ان کاموں کا راز کہ جن پر تُو صبر کی تاب نہ رکھتا تھا۔

تفسیر

ان واقعات کا راز

جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا جُدا ہونا طے پا گیا تو ضروری تھا کہ یہ الٰہی استاد اپنے ان کاموں کے اسرار ظاہر کرے کہ حضرت موسیٰؑ جنہیں گوارا نہیں کر پائے تھے۔ درحقیقت ان سے ہمراہی کا فائدہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے یہی تھا کہ وہ ان تین عجیب واقعات کا راز سمجھ لیں اور یہی راز بہت سے مسائل کی تفہیم کے لیے کلید بن سکتا تھا اور مختلف سوالوں کا جواب اس میں پنہاں تھا۔

حضرت خضر نے کشتی والے واقعے سے بات شروع کی اور کہنے لگے: ہاں، تو وہ کشتی والی بات یہ تھی کہ وہ چند غریب و مسکین افراد کی ملکیت تھی۔ وہ اس سے دریا میں کام کرتے تھے۔ مَیں نے سوچا کہ اس میں کوئی نقص ڈال دوں کیونکہ مَیں جانتا تھا کہ ایک ظالم بادشاہ ان کے پیچھے ہے اور وہ ہر صحیح سالم کشتی کو زبردستی ہتھیا لیتا ہے (اما السفینة فکانت لمساکین یعملون فی البحر فاردت ان اعیبها و کان ورائهم ملك یأخذ کل سفینة غصباً)۔

گویا کشتی میں سوراخ کرنا ظاہراً تو بُرا لگتا تھا لیکن اس کام میں ایک اہم مقصد پوشیدہ تھا اور وہ تھا کشتی کے غریب مالکوں کو ایک غاصب بادشاہ کے ظلم سے بچانا کیونکہ اس کے نزدیک عیب دار کشتیاں اس کے کام کی نہ تھیں اور ایسی کشتیوں پر وہ قبضہ نہیں جماتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ یہ کام چند مسکینوں کے مفاد کی

Marfat.com

حفاظت کے لیے تھا، اور اسے انجام پانا ہی چاہیئے تھا۔

لفظ "وراء" (پیچھے) ۔یقیناً یہاں مکانی پہلو نہیں رکھتا۔ یہ تعبیر یہاں کنائے کے طور پر آئی ہے اور اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ وہ متوجہ ہوئے بغیر اس ظالم کے چنگل میں پھنس جاتے اور انسان چونکہ اپنے پس پشت ہونے والے واقعات سے بے خبر ہوتا ہے لہٰذا یہاں یہ تعبیر استعمال کی گئی ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ میرے قرض خواہ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور مجھے چھوڑتے نہیں۔ سورہ ابراہیم کی آیہ ۱۶ میں ہے:

مِنْ وَّرَآئِہٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ۝

اور جہنم اُن کے پیچھے ہے ....

گویا جہنم ان کا تعاقب کر رہی ہے۔ یہاں بھی وہی "وراء" کی تعبیر آئی ہے [۱]

ضمناً لفظ "مساکین" سے یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسکین وہ شخص نہیں ہے کہ جس کے پاس بالکل کوئی چیز نہ ہو بلکہ ایسے شخص کو بھی مسکین کہا جاتا ہے جس کے پاس اتنا مال ہو کہ جو اس کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہو۔

یہ احتمال بھی ہے کہ انہیں مالی حوالے سے "مساکین" نہ کہا گیا ہو بلکہ طاقت کے حوالے سے وہ مسکین اور فقیر ہوں اور عربی زبان میں یہ تعبیر موجود ہے اور یہ مفہوم مسکین کے اصلی معنی سے بھی مطابقت رکھتا ہے جس کے مطابق ساکن، کمزور اور ناتواں کو مسکین کہا جاتا ہے۔

نہج البلاغہ میں ہے:

مسکین ابن اٰدم .... تؤلمه البقة و تقتله الشرقة و تنتنه العرقة

بے چارہ فرزند آدم .... مچھر اسے تکلیف پہنچا دیتا ہے۔ تھوڑا سا پانی اس کے گلو میں اٹک جاتا ہے اور پسینہ آجائے تو اس سے بدبو آنے لگتی ہے [۲]

اس کے بعد حضرت خضرؑ لڑکے کے قتل کے مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ کہتے ہیں: "رہا وہ لڑکا، تو اس کے ماں باپ صاحب ایمان تھے۔ ہمیں یہ بات اچھی نہ لگی کہ وہ اپنے ماں باپ کو راہِ ایمان سے بھٹکا دے اور سرکشی و کفر پر ابھارے (واما الغلام فكان ابواه مؤمنين فخشينا ان يرهقهما طغياناً وكفراً)۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہاں یہ مراد نہیں کہ کافر و سرکش لڑکا اپنے مومن ماں باپ کو منحرف نہ کر دے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اپنی سرکشی اور کفر کی وجہ سے اپنے ماں باپ

۱۔ "وراء" کے معنی کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۰ سورہ ابراہیم آیہ ۱۶ کے ذیل میں بحث کی گئی ہے۔

۲۔ نہج البلاغہ ۔ کلمات قصار جملہ ۴۱۹۔

Marfat.com

کو زیادہ اذیت نہ دے[1] البتہ پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

بہرحال اس عالم نے اس لڑکے کو قتل کر دیا اور اس لڑکے کے زندہ رہنے کی صورت میں اس کے ماں باپ کو آئندہ جو ناگوار واقعات پیش آنے والے تھے انہیں اس قتل کی دلیل قرار دیا۔

انشاء اللہ ہم جلد اس داستان کے مختلف نکات پر تفصیلی بحث کریں گے اور حضرت خضرؑ کے تمام کاموں کو احکامِ الٰہی اور منطقی حوالوں سے دیکھیں گے اور "جرم سے قبل قصاص" والے اعتراض کا جواب دیں گے۔

"خشینا" (ہمیں ڈر تھا کہ ایسا ہوگا) — یہ بہت معنی خیز تعبیر ہے۔ یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ وہ عالم اپنے آپ کو لوگوں کے مستقبل کا ذمہ دار سمجھتا تھا اور وہ اس بات کے لیے تیار نہ تھا کہ صاحبِ ایمان ماں باپ اپنی جوان اولاد کے انحراف کی وجہ سے مصیبت سے دوچار ہوں۔

ضمناً یہ بات بھی ہو جائے کہ لفظ "خشینا" (ہمیں خوف ہوا) یہاں "ہمیں اچھا نہ لگا" کے معنی میں آیا ہے کیونکہ علم و قدرت میں، اس مقام کے حامل شخص کے لیے ایسے امور میں خوف و خطر نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں مقصد ناپسندیدہ کام سے بچنا ہے اور انسان اپنی فطرت کی بناء پر ناگوار امور سے بچنا چاہتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ لفظ یہاں "علمنا" (ہم نے جانا) کے معنی میں ہو۔ ابن عباس سے بھی اس کا یہی مفہوم منقول ہے۔ یعنی:

> ہم نے جانا اور ہمیں معلوم ہوا کہ اگر یہ لڑکا زندہ رہ گیا تو اس کے ماں باپ کو ناگوار واقعہ دیکھنا پڑے گا۔

رہا یہ سوال کہ ایک شخص کے لیے جمع متکلم کی ضمیر کیوں استعمال ہوئی ہے — تو اس کا جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ —

یہ پہلا موقع نہیں کہ ہم قرآن میں ایسی ضمیر دیکھ رہے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں، اس کے علاوہ عربی زبان اور دوسری زبانوں کے محاورات میں بھی بڑے لوگ کبھی گفتگو کرتے وقت جمع کی ضمیر استعمال کرتے ہیں اور یہ عام طور پر اپنے ماتحت افراد کو مختلف کاموں کی انجام دہی کے لیے مامور کرنے اور ایسے ہی دیگر مواقع پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو حکم دیتا ہے اور انسان اپنے ماتحت افراد کو۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے چاہا کہ ان کا رب ان کو اس کے بدلے زیادہ پاک اور

---

[1] پہلی تفسیر کے مطابق "یرھق" کے دو مفعول ہیں۔ پہلا "ھما" اور دوسرا "طغیاناً"۔ اور دوسری تفسیر کی بناء پر "طغیاناً" اور "کفراً" مفعول لاجلہ (مفعول لہ) ہیں۔

Marfat.com

زیادہ پُر محبت اولاد عطا فرمائے (فاردنا ان یبدلھما ربھما خیرًا منه زکوٰة واقرب رحمًا)۔

"اردنا" (ہم نے ارادہ کیا) اور "ربھما" (ان دونوں کا رب)۔ یہ دونوں یہاں معنی خیز تعبیریں ہیں اور ہم جلد ان کے مقصد سے آگاہ ہو جائیں گے۔

لفظ "زکوٰة" پاکیزگی اور طہارت کے معنی میں ہے اور اس کا یہاں وسیع مفہوم ہے اور اس میں ایمان اور عمل صالح بھی شامل ہے۔ اس میں دینی امور بھی شامل ہیں اور دنیاوی بھی اور شاید یہ تعبیر حضرت موسیٰ کا جواب ہو کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ آپ نے "نفس زکیه" کو قتل کر دیا ہے۔ حضرت خضرؑ نے جواب میں کہا کہ نہیں وہ پاکیزہ نہ تھا بلکہ ہم چاہتے تھے کہ اللہ اس کی بجائے انہیں پاکیزہ اولاد عطا کرے۔

مختلف اسلامی کتب میں آنے والی احادیث میں یہ عبارت آئی ہے:

ابدلھما الله به جارية ولدت سبعين نبيًا

اللہ نے اس بیٹے کی جگہ انہیں ایک ایسی بیٹی عطا فرمائی کہ جس کی نسل سے ستر نبی پیدا ہوئے۔[1]

آخری زیر بحث آیت میں تیسرے کام یعنی دیوار بنانے کے واقعے کا جواب ہے۔ اس عالم نے اس واقعے کے راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا: رہی دیوار کی بات ــ تو وہ اس شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی۔ اس دیوار کے نیچے ان کا خزانہ چھپا ہوا تھا اور ان کا باپ ایک نیک اور صالح شخص تھا (واما الجدار فکان لغلامین یتیمین فی المدینة وکان تحته کنزلھما وکان ابوھما صالحًا)۔

تیرا پروردگار چاہتا تھا کہ وہ بالغ ہو جائیں اور اپنا خزانہ نکال لیں (فاراد ربك ان یبلغا اشدھما ویستخرجا کنزھما)۔ یہ تو تیرے رب کی طرف سے رحمت تھی (رحمة من ربك) اور ان کے نیک ماں باپ کی وجہ سے میں مامور تھا کہ اس دیوار کو تعمیر کروں کہ کہیں وہ گر نہ جائے اور خزانہ ظاہر ہو کر خطرے سے دوچار نہ ہو جائے۔

آخر میں انہوں نے چاہا کہ حضرت موسیٰ کا ہر قسم کا شک دُور ہو جائے اور وہ یقین کر لیں کہ یہ سب کام ایک خاص منصوبے اور ذمہ داری کے تحت تھے۔ لہٰذا انہوں نے کہا: اور میں نے یہ کام خود سے نہیں کیے بلکہ اللہ کے حکم کے تحت انجام دیئے (وما فعلته عن امری)۔

جی ہاں! یہ تھے ان کاموں کے راز کہ جن پر صبر کی تم میں تاب نہیں تھی (ذٰلك تأويل ما لم تسطع علیه صبرا)۔

---

[1] نور الثقلین ج ۳ ص ۲۸۶ و ص ۲۸۸۔

Marfat.com

چند اہم نکات

۱۔ خضرؑ کی ماموریت تشریعی تھی یا تکوینی؟ یہ وہ اہم ترین مسئلہ ہے جس نے بزرگ علماء کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ تین واقعات کہ جو اس عالم کے ہاتھوں انجام پائے ان پر حضرت موسیٰ نے اعتراض کیا کیونکہ وہ باطنِ امر سے آگاہ نہ تھے لیکن بعد میں استاد نے وضاحت کی تو مطمئن ہو گئے۔

سوال یہ ہے کہ کیا واقعاً کسی کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر نقص پیدا کیا جا سکتا ہے، اس بنا پر کہ غاصب اسے لے نہ جائے۔

اور کیا کسی لڑکے کو اس کام پر سزا دی جا سکتی ہے کہ جو وہ آئندہ انجام دے گا۔

اور کیا ضروری ہے کہ کسی کے مال کی حفاظت کے لیے ہم مفت زحمت برداشت کریں۔

ان سوالات کے جواب میں ہمارے سامنے دو راستے ہیں:

پہلا یہ کہ ان امور کو ہم فقہی احکام اور شرعی قوانین کی روشنی میں دیکھیں ـــ بعض مفسرین نے یہی راستہ اختیار کیا ہے۔

انہوں نے پہلے واقعے کو اہم اور اہم تر قوانین پر منطبق سمجھا ہے اور کہا ہے کہ مسلّم ہے کہ ساری کشتی اور پوری کشتی کی حفاظت اہم کام تھا جبکہ جزوی نقص سے حفاظت زیادہ اہم نہیں تھا۔ دوسرے لفظوں میں حضرت خضرؑ نے کم نقصان کے ذریعے زیادہ نقصان کو روکا فقہی زبان میں "افسد کو فاسد سے دفع کیا" خصوصاً جبکہ یہ بات ان کے پیشِ نظر تھی کہ کشتی والوں کی باطنی رضامندی انہیں حاصل ہے کیونکہ اگر وہ اصل صورتِ حال سے آگاہ ہو جاتے تو اس کام پر راضی ہو جاتے۔ (فقہی تعبیر کے مطابق حضرت خضرؑ کو اس مسئلے میں "اذنِ فحوی" حاصل تھا)۔

اس لڑکے کے بارے میں مفسرین کا اصرار ہے کہ یقیناً وہ بالغ تھا اور وہ مرتد یا فاسد تھا لہٰذا وہ اپنے موجودہ اعمال کی وجہ سے جائز القتل تھا اور یہ جو حضرت خضرؑ اپنے اقدام کے لیے اس کے آئندہ جرائم کو دلیل بناتے ہیں تو وہ اس بنا پر ہے کہ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ مجرم نہ صرف یہ کہ اس وقت اس کام میں مبتلا ہے بلکہ آئندہ بھی اس سے بڑھ کر جرائم کا مرتکب ہوگا لہٰذا اس کا قتل قوانینِ شریعت کے مطابق تھا اور وہ اپنے افعال اور خود کردہ گناہوں کی وجہ سے جائز القتل تھا۔

رہا تیسرا واقعہ تو کوئی شخص کسی پر یہ اعتراض نہیں کر سکتا کہ تم دوسرے کے لیے کیوں ایثار کرتے ہو اور اس کے اموال کو بچانے کے لیے کیوں بیگار اٹھاتے ہو۔ ہو سکتا ہے یہ ایثار واجب نہ ہو لیکن مسلّم ہے کہ یہ اچھا کام ہے اور لائقِ تحسین ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ بعض مواقع پر سرحدِ وجوب تک پہنچ جائے۔ مثلاً کسی یتیم بچے کا بہت سا مال ضائع ہو رہا ہو اور تھوڑی سی زحمت کر کے اسے بچایا جا سکے تو بعید نہیں ہے کہ ایسے

Marfat.com

موقع پر کام واجب ہو۔

دوسرا راستہ اس بنیاد پر ہے کہ مذکورہ بالا توضیحات اگرچہ خزانے اور دیوار کے بارے میں لائق اطمینان ہوں لیکن جو جوان مارا گیا اس کے بارے میں مذکورہ وضاحتیں ظاہر آیت سے مناسبت نہیں رکھتیں کیونکہ اس کے قتل کا جواز ظاہراً اس کے آئندہ کا عمل قرار دیا گیا ہے نہ کہ موجودہ عمل۔

کشتی کے بارے میں بھی مذکورہ وضاحت کسی حد تک قابل بحث ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ کوئی اور راہ اختیار کی جائے اور وہ یہ ہے:

اسی جہان میں ہمیں دو نظاموں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایک نظام تکوین ہے اور دوسرا نظام تشریع۔ یہ دونوں نظام اگرچہ کلی اصول میں تو ہم آہنگ ہیں لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جزئیات میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

مثلاً اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمائش خوف، اموال و ثمرات کے نقصان، اپنی اور عزیزوں کی موت اور قتل کے ذریعے کرتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ کون شخص ان حوادث و مصائب پر صبر و شکیبائی اختیار کرتا ہے۔

تو کیا کوئی فقیہ بلکہ کوئی پیغمبر ایسا کر سکتا ہے — یعنی اموال و نفوس، ثمرات اور امن کو ختم کر کے لوگوں کو آزمائے؟

یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض نبیوں اور صالح بندوں کو خبردار کرنے اور انہیں تنبیہ کرنے کے لیے کسی ترک اولیٰ پر بڑی مصیبتوں میں گرفتار کرتا ہے جیسا کہ حضرت یعقوبؑ مصیبت میں گرفتار ہوئے اس بات پر کہ انہوں نے بعض مساکین کی طرف کم توجہ دی یا حضرت یونسؑ کو ایک معمولی ترک اولیٰ پر مصیبت میں گرفتار ہونا پڑا۔ تو کیا کوئی حق رکھتا ہے کہ کسی کو سزا کے طور پر ایسا کرے۔

یا یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کبھی اللہ تعالیٰ کسی انسان کی ناشکری کی وجہ سے اس سے کوئی نعمت چھین لیتا ہے مثلاً کوئی شخص مال ملنے پر شکر ادا نہیں کرتا تو اس کا مال دریا میں غرق ہو جاتا ہے یا صحت پر شکر ادا نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اس سے صحت لے لیتا ہے تو کیا فقہی اور شرعی قوانین کی رُو سے کوئی ایسا کر سکتا ہے کہ ناشکری کی وجہ سے کسی کا مال ضائع کر دے اور اس کی سلامتی کو بیماری میں بدل دے۔

ایسی مثالیں بہت زیادہ ہیں — یہ سب مثالیں مجموعی طور پر ظاہر کرتی ہیں کہ جہان آفرینش خصوصاً خلقتِ انسان اس احسن نظام پر استوار ہے کہ اللہ نے انسان کو کمال تک پہنچانے کے لیے کچھ تکوینی قوانین بنائے ہیں کہ جن کی خلاف ورزی سے مختلف نتائج مرتب ہوتے ہیں حالانکہ قانونِ شریعت کے لحاظ سے ہم ان قوانین پر عمل نہیں کر سکتے۔

مثلاً کسی انسان کی انگلی ڈاکٹر اس لیے کاٹ سکتا ہے کہ زہر اُس کے دل کی طرف سرایت نہ کر جائے

Marfat.com

لیکن کیا کوئی شخص کسی انسان میں صبر پیدا کرنے کے لیے یا کفرانِ نعمت کی وجہ سے اس کی انگلی کاٹ سکتا ہے؟ (جبکہ یہ بات مسلّم ہے کہ خدا ایسا کر سکتا ہے کیونکہ ایسا کرنا نظامِ احسن کے مطابق ہے)۔

اب جبکہ ثابت ہو گیا کہ ہم دو نظام رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ دونوں نظاموں پر حاکم ہے تو کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ اللہ ایک گروہ کو نظامِ تشریعی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مامور کرے اور فرشتوں کے ایک گروہ یا بعض انسانوں کو (مثلاً حضرت خضرؑ کو) نظامِ تکوین کو عملی شکل دینے پر مامور کرے (غور کیجئے گا)۔

اللہ تعالیٰ کے نظامِ تکوین کے لحاظ سے کوئی مانع نہیں کہ وہ کسی نابالغ بچے کو بھی کسی حادثے میں مبتلا کر دے اور اس میں اس کی جان چلی جائے کیونکہ ہو سکتا ہے اس کا وجود مستقبل کے لیے بہت بڑے خطرات کا حامل ہو جیسا کہ بعض اوقات ایسے اشخاص کا باقی رہ جانا آزمائش وغیرہ کے حوالے سے مصلحت کا حامل ہوتا ہے۔ نیز کوئی مانع نہیں کہ اللہ مجھے آج کسی سخت بیماری میں مبتلا کر دے، اس طرح سے کہ میں گھر سے باہر نہ نکل سکوں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں گھر سے باہر نکلا تو خطرناک حادثہ پیش آجائے گا اور وہ مجھے اس حادثے سے بچانا چاہتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس عالم میں مامورین کا ایک گروہ باطن پر مامور ہے اور ایک گروہ ظاہر پر مامور ہے۔ جو باطن پر مامور ہیں ان کے لیے اپنے اصول و ضوابط اور پروگرام ہیں اور جو ظاہر پر مامور ہیں ان کیلئے اپنے خاص اصول و ضوابط ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان دونوں پروگراموں کا اصلی اور کلّی مقصد انسان کو کمال کی طرف لے جانا ہے اس لحاظ سے دونوں ہم آہنگ ہیں لیکن بعض اوقات جزئیات میں فرق ہوتا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا مثالوں سے واضح ہوتا ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں طریقوں میں سے کسی میں بھی کوئی خود سری سے کوئی اقدام نہیں کر سکتا بلکہ ضروری ہے کہ وہ حقیقی مالک و حاکم کی طرف سے مجاز ہو لہٰذا حضرت خضر علیہ السلام نے صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کیا اور کہا:

ما فعلته عن امری

میں نے یہ کام خود سے ہرگز نہیں کیے۔

یعنی — میں نے یہ کام حکمِ الٰہی کے مطابق اور اسی کے ضابطے اور طریقے کے مطابق انجام دیئے ہیں۔

اس طرح ان اقدامات میں جو ظاہری تضاد نظر آتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔

اور یہ جو ہم دیکھ رہے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ حضرت خضرؑ کے کاموں کو برداشت نہیں کر پاتے تھے تو یہ اسی بنا پر تھا کہ ان کی ماموریت اور ذمہ داری کا طریقہ جناب خضرؑ کی ذمہ داری کے راستے سے الگ تھا لہٰذا جب انہوں نے حضرت خضرؑ کا کام ظاہراً شرعی قوانین کے خلاف دیکھا تو اس پر اعتراض کیا لیکن حضرت خضرؑ نے ٹھنڈے دل سے اپنا کام جاری رکھا اور چونکہ یہ دو عظیم خدائی رہبر مختلف ذمہ داریوں کی بنا پر ہمیشہ کے لیے

Marfat.com

اکٹھے نہیں رہ سکتے تھے لہٰذا حضرت خضرؑ نے کہا :

ھٰذا فراق بینی و بینک

یہ اب میرے اور تمہارے جدا ہونے کا مرحلہ آگیا ہے ۔

۲۔ خضرؑ ۔ کون تھے : جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت خضرؑ کا نام صراحت کے ساتھ قرآن میں نہیں لیا گیا اور حضرت موسیٰؑ کے دوست اور استاد کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے :

عبداً من عبادنا اٰتیناہ رحمۃ من عندنا وعلمناہ من لدنا علماً

ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ جسے ہم نے اپنی رحمت عطا کی اور جسے ہم نے اپنے علم سے نوازا ۔

اس تعارف میں ان کے مقام عبودیت کا تذکرہ ہے اور ان کے خاص علم کو واضح کیا گیا ہے لہٰذا ہم نے بھی عالم کے طور پر ان کا زیادہ ذکر کیا ہے ۔ لیکن متعدد روایات میں اس عالم کا نام "خضر" بتایا گیا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اصلی نام "بلیا ابن ملکان" تھا اور "خضر" ان کا لقب ہے کیونکہ وہ جہاں کہیں قدم رکھتے ان کے قدموں کی بدولت زمین سرسبز ہو جاتی تھی ۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس عالم کا نام "الیاس" ہے ۔ یہیں سے یہ تصور پیدا ہوا کہ ہو سکتا ہے "الیاس" اور "خضر" ایک ہی شخص کے دو نام ہوں لیکن مشہور و معروف مفسرین اور راویوں نے پہلی بات ہی بیان کی ہے ۔

واضح ہے کہ یہ بات کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی کہ اس شخص کا نام کیا ہے ۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ ایک عالم ربانی تھے اور پروردگار کی خاص رحمت ان کے شامل حال تھی ۔ وہ باطن اور نظام تکوینی پر مامور تھے اور کچھ اسرار سے آگاہ تھے اور ایک لحاظ سے موسیٰؑ بن عمران کے معلم تھے اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کئی لحاظ سے ان پر مقدم تھے ۔

یہ کہ وہ پیغمبر تھے یا نہیں ۔ اس سلسلے میں روایات مختلف ہیں ۔ اصول کافی جلد اوّل میں متعدد روایات ہیں کہ جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ پیغمبر نہیں تھے بلکہ وہ "ذوالقرنین" اور "آصف ابن برخیا" کی طرح ایک عالم تھے [1]

جبکہ کچھ اور روایات ایسی بھی ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقام نبوت کے حامل تھے اور زیر نظر روایات میں بھی بعض تعبیرات کا ظاہری مفہوم بھی یہی ہے ۔ کیونکہ ایک موقع پر وہ کہتے ہیں :

مَیں نے یہ کام اپنی طرف سے نہیں کیا ۔

---

[1] اصول کافی، ج ۱، باب "ان الائمۃ بمن یشبھون فیمن مضی" صـ۲۶۸ ۔

Marfat.com

ایک اور مقام پر کہتے ہیں :

ہم چاہتے تھے کہ ایسا ہو ۔

نیز بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک لمبی عمر کے حامل تھے ۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے ۔ وہ یہ کہ کیا اس عالم بزرگوار کا واقعہ یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابوں میں بھی ہے ؟

سوال کا جواب یہ ہے :

اگر کتب سے مراد کتب عہدین (تورات و انجیل) ہیں ، تو ان میں تو نہیں ہے لیکن بعض یہودی علماء کی کتابیں کہ جو گیارہویں صدی عیسوی میں مدوّن ہوئی ہیں' ان میں ایک داستان نقل ہوئی ہے کہ جو حضرت موسیٰ کی مذکورہ داستان سے کچھ مشابہت رکھتی ہے ۔ اگرچہ اس داستان کے ہیرو "الیاس" اور "یوشع بن لاوی" ہیں کہ جو تیسری صدی عیسوی کے "تلمود" کے مفسرین میں سے تھے ۔ یہ داستان اور کئی پہلوؤں سے بھی موسیٰ و خضر کی داستان سے مختلف ہے ۔

بہرحال مذکورہ داستان کچھ یوں ہے :

یوشع نے خدا سے چاہا کہ اُس کی الیاس سے ملاقات ہو ۔ اس کی دعا پوری ہوگئی اور اسے الیاس سے ملاقات کا اعزاز حاصل ہوگیا ۔ اس کی آرزو تھی کہ الیاس سے کچھ اسرار حاصل کرے ۔ الیاس نے اُس سے کہا : تجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ انہیں برداشت کر پائے ۔

لیکن یوشع نے اصرار کیا تو الیاس نے اس کی درخواست اس شرط پر قبول کرلی کہ وہ جو کچھ بھی دیکھے گا ہرگز سوال نہیں کرے گا اور اگر اس نے خلاف ورزی کی تو اسے الگ ہونا پڑے گا ۔

بہرحال اس معاہدے کے بعد یوشع اور الیاس اکٹھے چل پڑے ۔

دورانِ سفر وہ ایک گھر میں داخل ہوتے ہیں ۔ صاحبِ خانہ بڑی گرم جوشی سے ان کی پذیرائی کرتا ہے ۔ اس گھر والوں کے پاس دنیا کی چیزوں میں سے صرف ایک گائے تھی کوئی اور چیز ان کی ملکیت نہ تھی ۔ وہ گائے کا دودھ بیچ کر گزر اوقات کرتے تھے ۔

الیاس نے صاحبِ خانہ کو حکم دیا کہ گائے کو ذبح کردے ۔ یوشع کو اس کردار پر سخت تعجب ہوتا ہے ۔ وہ اس کا سبب پوچھتا ہے ۔ الیاس اسے معاہدہ یاد دلاتا ہے اور جدا ہونے کی دھمکی دیتا ہے ۔ یوشع مجبوراً خاموش ہو جاتا ہے ۔

وہاں سے وہ دونوں ایک اور بستی کی طرف چل پڑتے ہیں ۔ اس بستی میں پہنچ کر ایک مالدار آدمی کے گھر داخل ہوتے ہیں ۔ اس گھر کی ایک دیوار گرنے کے قریب ہوتی ہے ۔ الیاس خود مٹی کے کام میں ہاتھ ڈالتا ہے اور اس دیوار کی مرمت کر دیتا ہے ۔

Marfat.com

وہاں سے وہ ایک اور بستی میں پہنچتے ہیں۔ اس گاؤں کے چند لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ وہ ان دونوں کی اچھی پذیرائی نہیں کرتے۔ الیاس نے ان کے لیے دعا کی کہ ان سب کو ریاست و امارات نصیب ہو۔

وہ چوتھی بستی میں پہنچتے ہیں تو ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا جاتا ہے۔ الیاس ان کے لیے دعا کرتا ہے کہ ان میں سے صرف ایک کو ریاست نصیب ہو۔

آخر کار یوشع بن لاوی کی قوت برداشت جواب دے دیتی ہے وہ ان چار واقعات کے بارے میں سوال کرتا ہے تو الیاس کہتا ہے:

پہلے گھر میں صاحب خانہ کی بیوی بیمار تھی۔ اگر وہ گائے صدقہ کے طور پر قربان نہ کی جاتی تو وہ عورت مر جاتی۔

دوسرے گھر میں دیوار کے نیچے ایک خزانہ تھا کہ جو ایک یتیم بچے کیلئے محفوظ رہنا چاہیے تھا

تیسری بستی کے سب لوگوں کے لیے ریاست کی دعا اس لیے کی کہ وہ پریشانی سے دوچار ہوں جبکہ اس کے برعکس چوتھی بستی کے ایک شخص کے لیے دعا کی تاکہ ان کے امور منظم اور بہتر طور پر انجام پائیں [1]

غلط فہمی نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم ہرگز یہ نہیں کہتے کہ یہ دونوں داستانیں ایک ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ یہودیوں نے جو داستان نقل کی ہے وہ قرآن کی موسیٰ و خضر کی داستان کے مشابہ ہے یا پھر موسیٰ و خضر کی داستان میں تحریف ہو کر یہ اس صورت میں باقی رہ گئی ہے۔

۳۔ خود ساختہ افسانے: حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کی داستان کی بنیاد وہی ہے کہ جو کچھ قرآن میں آیا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس سے منسلک کرکے بہت سے افسانے گھڑ لیے گئے ہیں۔ ان افسانوں کو اس داستان کے ساتھ خلط ملط کرنے سے اصل داستان کی صورت بھی بگڑ جاتی ہے۔ جاننا چاہیئے کہ یہ کوئی پہلی داستان نہیں ہے کہ جس کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا ہے اور بہت سی سچی داستانوں کے ساتھ یہی ہاتھ کیا گیا ہے۔

لہٰذا حقیقت تک رسائی کے لیے قرآن کی ان تئیس آیتوں کو بنیاد قرار دیا جانا چاہیئے جن میں یہ داستان بیان ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ احادیث کو بھی اسی صورت میں قبول کیا جا سکتا ہے جب وہ قرآن کے موافق ہوں۔ اگر کوئی حدیث اس کے برخلاف ہو تو یقیناً وہ قابل قبول نہیں ہے اور خوش قسمتی سے معتبر احادیث میں ایسی کوئی حدیث نہیں ہے۔

---

[1] یہ تمام تر عبارت کتاب اعلام قرآن ص ۲۱۳ سے نقل کی گئی ہے۔

۴۔ کیا انبیاء کے لیے بھول چوک ممکن ہے؟ مندرجہ بالا واقعے میں ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھول گئے۔ پہلے تو اس مچھلی کو جو انہوں نے کھانے کے لیے رکھی تھی۔ دوسری اور تیسری مرتبہ آپ اپنے عالم دوست سے کیے گئے معاہدہ کو بھول گئے۔ ان امور کو دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انبیاء کے لیے نسیان ممکن ہے؟

بعض کا نظریہ ہے کہ انبیاء سے ایسے نسیان کا صدور بعید نہیں ہے کیونکہ یہ دعوتِ نبوّت کی بنیاد اور اصول سے مربوط ہے اور نہ اس کے فروع سے اور نہ ہی اس کا تعلق تبلیغ نبوت کے ساتھ ہے بلکہ اس کا تعلق صرف روزمرہ کی معمول کی زندگی سے ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو کچھ مسلّم ہے یہ ہے کہ کوئی نبی نبوت کی دعوت اور اس سے متعلقہ امور میں ہرگز خطا و اشتباہ کا شکار نہیں ہوتا اور ان کا مقام عصمت انہیں اس قسم کی چیزوں سے محفوظ رکھتا ہے لیکن اس میں کیا مانع ہے کہ موسیٰ کو جو بڑے اشتیاق سے اس عالم کی تلاش میں جا رہے تھے اپنے کھانے بھول گئے اور یہ ایک معمول کا مسئلہ ہے نیز اس میں کیا مانع ہے کہ کشتی میں سوراخ، نوجوان لڑکے کے قتل اور بخیلوں کے شہر کی دیوار کی بے وجہ تعمیر جیسے بڑے واقعات نے ایسا ہیجان زدہ کیا کہ انہوں نے اپنے عالم دوست سے جو ذاتی عہد کیا تھا اُسے بھول گئے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ نہ ایک پیغمبر سے بعید ہے اور نہ مقام عصمت کے منافی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ نسیان یہاں مجازی معنی میں یعنی ترک کرنے کے معنی میں آیا ہے کیونکہ انسان جب کسی چیز کو ترک کرتا ہے تو وہ ایسے ہی ہے جیسے اسے بھول گیا ہو اور اس کے بارے میں اس نے نسیان کیا ہو۔ حضرت موسیٰ نے اپنی غذا کو اس لیے ترک کیا کیونکہ وہ اس کے بارے میں بے اعتنا تھے اور اپنے عالم دوست سے کیے ہوئے معاہدے کو انہوں نے اس لیے ترک کیا کیونکہ حوادث کو ظاہری حوالے سے دیکھنے کی وجہ سے اصلاً یہ بات ان کے لیے قابلِ قبول نہ تھی کہ کوئی شخص بلا وجہ لوگوں کے جان و مال کو نقصان پہنچائے لہٰذا انہوں نے اعتراض کرنا اپنی ذمہ داری سمجھا اور ان کے نزدیک یہ معاہدے کا مقام نہ تھا۔

لیکن واضح ہے کہ ایسی تفاسیر ظاہر آیات سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتیں [1]

---

[1] یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ کسی نقلی دلیل کا ظہور مسلّم عقلی دلیل کے ساتھ ٹکرائے تو اس نقلی دلیل کی تاویل کی جائے گی مثلاً خدا کے بارے میں قرآن کی بہت سی آیات کا ظہور یہ ہے کہ وہ ہاتھ، آنکھیں، پہلو اور نفس رکھتا ہے یا معاذ اللہ وہ جسم رکھتا ہے لیکن چونکہ یہ امور اصول مسلمہ اور دلائل عقلیہ قطعیہ کے خلاف ہیں لہٰذا ان آیات کی تاویل کی جاتی ہے یعنی خلافِ ظاہر معنی کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ معنی مجازی ہوتا ہے۔ اسی طرح انبیاء اور آئمہ کا مطلقاً معصوم ہونا عقلاً ضروری ہے لہٰذا اس کے خلاف ظہورات کی تاویل کی جانا چاہیئے (مترجم)۔

Marfat.com

۵۔ موسیٰ خضرؑ کی ملاقات کو کیوں گئے ؟ ابی بن کعب نے ابن عباس کی وساطت سے پیغمبرِ اکرمؐ کی ایک حدیث اس طرح نقل کی ہے :

ایک دن موسیٰ بنی اسرائیل سے خطاب کر رہے تھے۔ کسی نے آپ سے پوچھا روئے زمین پر سب سے زیادہ علم کون رکھتا ہے۔ موسیٰ نے کہا مجھے اپنے آپ سے بڑھ کر کسی کے عالم ہونے کا علم نہیں۔ اس وقت موسیٰ کو وحی ہوئی کہ ہمارا ایک بندہ مجمع البحرین میں ہے کہ جو تجھ سے زیادہ عالم ہے۔ اس وقت موسیٰ نے درخواست کی کہ میں اس عالم کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر اللہ نے انہیں ان سے ملاقات کی راہ بتائی[1]

ایسی ہی ایک حدیث امام صادق علیہ السلام سے بھی منقول ہے[2]

یہ درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تنبیہ تھی کہ اپنے تمام تر علم و فضل کے باوجود اپنے آپ کو افضل ترین نہ سمجھیں۔ لیکن یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا ایک اولو العزم صاحبِ رسالت و شریعت شخص کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم نہیں ہونا چاہیئے ؟

اس سوال کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اپنی ماموریت کی قلمرو میں نظام تشریع میں اسے سب سے بڑا عالم ہونا چاہیئے اور حضرت موسیٰ اسی طرح تھے لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے نکتے میں بیان کیا ہے کہ ان کی ماموریت کی قلمرو ان کے عالم دوست کی قلمرو سے الگ تھی۔ ان کے عالم دوست کی ماموریت کا تعلق عالم تشریع سے نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ عالم ایسے اسرار سے آگاہ تھے کہ جو دعوت نبوت کی بنیاد نہ تھے۔

اتفاقاً ایک حدیث کہ جو امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے اس میں صراحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ حضرت خضرؑ سے زیادہ عالم تھے یعنی علم شریعت میں[3]

شاید اس سوال کا جواب نہ پانے کی وجہ سے اور نسیان سے مربوط سوال کا جواب نہ پانے کے سبب بعض نے ان آیات میں جس موسیٰ کا ذکر ہے اسے موسیٰ بن عمران تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

ایک حدیث کہ جو حضرت علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس سے بھی یہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کا دائرہ کار اور قلمرو ایک دوسرے سے مختلف تھی اور ہر ایک دوسرے سے اپنے کام میں زیادہ عالم تھا[4]

---

[1] مجمع البیان، ج ۶ ص ۴۸۱ (ہم نے روایت اختصار سے درج کی ہے)۔

[2] نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۷۵ ۔

[3] المیزان، ج ۱۳ ص ۳۵۲ ۔

[4] مجمع البیان، ج ۶ ص ۴۸۱ ۔

Marfat.com

اس نکتے کا ذکر بھی مناسب ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

جس وقت موسیٰؑ خضرؑ سے ملے تو ایک پرندہ ان کے سامنے ظاہر ہوا۔ اس نے پانی کا ایک قطرہ اپنی چونچ میں لیا تو حضرت موسیٰؑ سے خضرؑ نے کہا: جانتے ہو کہ پرندہ کیا کہتا ہے:

موسیٰؑ نے کہا: کیا کہتا ہے؟

خضرؑ کہنے لگے: کہتا ہے:

ما علمك وعلم موسٰی فی علم الله الا کما اخذ منقاری من الماء

تیرا علم اور موسیٰ کا علم خدا کے علم کے مقابلے میں اس قطرے کی طرح ہے جو میں نے پانی سے چونچ میں لیا ہے[1]

۶۔ وہ خزانہ کیا تھا؟ اس داستان کے بارے میں ایک سوال اور بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ خزانہ آخر کیا تھا جسے موسیٰؑ کے عالم دوست پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے اور آخر اس باایمان شخص یعنی یتیموں کے باپ نے یہ خزانہ کیوں چھپا دیا تھا؟

بعض نے کہا ہے کہ وہ خزانہ مادی پہلو کی بجائے زیادہ معنوی پہلو رکھتا تھا۔ بہت سی شیعہ سنّی روایات کے مطابق وہ ایک تختی تھی جس پر حکمت آمیز کلمات نقش تھے۔ اس بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ وہ حکمت آمیز کلمات کیا تھے۔

کتاب کافی میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

یہ سونے چاندی کا خزانہ نہیں تھا۔ یہ تو صرف ایک تختی تھی جس پر یہ چار جملے ثبت تھے:

لا اله الا الله،

من ایقن بالموت لم یضحك،

ومن ایقن بالحساب لم یفرح قلبه،

ومن ایقن بالقدر لم یخش الا الله،

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

جو موت پر یقین رکھتا ہے وہ (بے ہودہ) نہیں ہنستا۔

اور جسے اللہ کی طرف سے حساب کا یقین ہے (اور اسے جوابدہی کی فکر ہے) وہ خوش نہیں رہتا۔

اور جسے تقدیر الٰہی کا یقین ہے وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا[2]

---

[1] تفسیر المیزان میں درالمنثور اور دیگر کتب کے حوالے سے یہ روایت درج کی گئی ہے۔

[2] نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۸۷۔

Marfat.com

لیکن کچھ اور روایات میں آیا ہے کہ وہ سونے کی تختی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ روایات ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں کیونکہ پہلی روایت کا مقصد یہ ہے کہ وہ درہم و دینار کا ڈھیر نہ تھا کیونکہ "خزانہ" سے یہی مفہوم ذہن میں آتا ہے۔

بالفرض اگر ہم لفظ "کنز" کا ظاہری مفہوم یعنی زر و سیم کا ذخیرہ مراد لیں پھر بھی اس میں کوئی اشکال نہیں کیونکہ ایسا خزانہ اور ذخیرہ ممنوع ہے کہ جو ایسے بہت زیادہ گراں قیمت مال پر مشتمل ہو جو طویل مدت کے لیے جمع رکھا جائے جبکہ معاشرے کو اس کی بہت ضرورت ہو لیکن اگر مال کی حفاظت کے لیے، وہ مال جو معاملہ کی گردش میں ہے، ایک دن یا چند دن زیرِ زمین دفن کر دیا جائے (گزشتہ زمانے میں بے امنی کی وجہ سے اس کا معمول تھا یہاں تک کہ لوگ ایک رات کے لیے بھی اپنے اموال دفن کر دیتے تھے) اور بعد ازاں اس کا مالک کسی حادثے کی بنا پر دنیا سے چل بسے تو ایسا خزانہ ہرگز قابلِ اعتراض نہیں ہے۔

۷۔ اس داستان سے حاصل ہونے والے درس: اس داستان سے ہمیں بہت سے سبق حاصل ہوتے ہیں مثلاً:

(ا) عالم رہبر کی تلاش اور اس کے علم سے استفادہ کرنا اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ حضرت موسیٰ جیسے اولوالعزم پیغمبر نے اس کی تلاش میں اتنا سفر کیا اور یہ سب انسانوں کے لیے ایک نمونہ ہے وہ جس مرتبہ کے بھی ہوں اور جس سن و سال کے اور انہیں جیسے بھی حالات درپیش ہوں۔

(ب) جوہرِ علم الٰہی کا سرچشمہ عبودیت اور اللہ کی بندگی ہے۔ جیسا کہ زیرِ نظر آیات میں ہم نے پڑھا ہے:

عبدًا من عبادنا اٰتیناہ رحمۃ من عندنا وعلمناہ من لدنا علمًا

وہ ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ تھا اسے ہم نے اپنے خاص علم سے نوازا تھا۔

(ج) علم ہمیشہ عمل کے لیے حاصل کرنا چاہیئے جیسا کہ حضرت موسیٰ اپنے عالم دوست سے کہتے ہیں:

مما علمت رشدًا

مجھے ایسا علم سکھایئے جو راہِ مقصد میں میرے لیے مفید ہو۔

یعنی میں علم برائے علم نہیں چاہتا بلکہ حصولِ مقصد کے لیے علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

(د) کاموں میں جلد بازی نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ بہت سے امور کے لیے مناسب موقع کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے:

الامور مرھونۃ باوقاتھا

امور اپنے وقت کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔

خصوصاً زیادہ اہم مسائل میں اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اسی بنا پر اس عالم نے اپنے کاموں کے اسرار حضرت موسیٰ سے مناسب وقت پر بیان کیے۔

Marfat.com

(۵) چیزوں اور واقعات کا ظاہری چہرہ بھی ہوتا ہے اور باطنی بھی ۔ یہ ایک اہم سبق ہے کہ جو ہم اس داستان سے سیکھتے ہیں اس سے ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ اپنی زندگی میں پیش آنے والے ناگوار واقعات کے بارے میں ہمیں جلد بازی سے فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے ۔ کتنے ہی ایسے واقعات ہیں کہ جو ہمیں ناپسند ہوتے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے لیے اللہ کا لطفِ خفی تھے ۔ اسی بات کے بارے میں قرآن حکیم ایک اور جگہ کہتا ہے :

عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

ہوسکتا ہے ایک چیز تمہیں ناپسند ہو حالانکہ وہ تمہارے فائدے میں ہو اور ممکن ہے ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہ تمہارے لیے مضر ہو اور خدا جانتا ہے تم نہیں جانتے ۔ (بقرہ ۔ ۲۱۶)

اس حقیقت کی طرف توجہ کے سبب انسان ناگوار واقعات و حوادث پر فوراً مایوس نہیں ہوتا ۔ اس سلسلے میں ایک جاذبِ نظر حدیث امام صادق علیہ السلام سے منقول نظر سے گزرتی ہے ۔ امامؑ نے فرزندِ زرارہؓ[1] سے فرمایا :

اپنے باپ سے میرا اسلام کہہ کر یہ کہنا : بعض محفلوں میں جو تیری بُرائی بیان کرتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دشمن اس بات کی نگرانی کرتے ہیں کہ ہم کس شخص سے اظہارِ محبت کرتے ہیں تاکہ اسے اس محبت کی وجہ سے تکلیف پہنچائیں کہ جو ہم اس سے رکھتے ہیں ۔ اس کے برعکس اگر ہم کسی کی مذمت کرتے ہیں تو وہ اس کی تعریف کرتے ہیں ۔ بعض اوقات اگر میں تیری عدم موجودگی میں تیری بُرائی کرتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں ہماری ولایت و محبت کے حوالے سے مشہور ہوچکا ہے ۔ اسی بنا پر ہمارے مخالفین تیری مذمت کرتے ہیں ۔ میں چاہتا ہوں کہ تجھ پر عیب لگاؤں تاکہ تجھ سے ان کا شر دُور ہو ۔ جیسا کہ اللہ موسیٰؑ کے دوست عالم کی زبانی فرماتا ہے :

اما السفينة فكانت لمساكين يعملون فی البحر فاردت ان اعيبها وكان ورائهم ملك يأخذ كل سفينة غصبًا ۔ ۔ ۔ ۔

"کشتی کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ چند مسکینوں کی ملکیت تھی وہ اس سے دریا میں کام کرتے تھے ۔ میں نے اُس میں اس لیے عیب اور نقص ڈال دیا کہ ایک بادشاہ ان کے پیچھے تھا اور وہ سب کشتیوں کو زبردستی ہتھیا رہا تھا ۔"

---

[1] زرارہ اپنے زمانے کے بزرگ فقہاء اور محدثین میں شمار ہوتے تھے انہیں امامؑ سے بہت محبت تھی اور امامؑ کو ان سے بہت لگاؤ تھا ۔

Marfat.com

اس مثال کو اچھی طرح سمجھ لے لیکن خدا کی قسم تو لوگوں میں مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے چاہے وہ زندہ ہیں یا فوت ہوگئے ہیں۔ تو اس موجزن دریا میں بہترین کشتی ہے اور ظالم غاصب بادشاہ تیرے پیچھے ہے جس کی بڑی گہری نظر ہے کہ بحرِ ہدایت میں سے کونسی صحیح وسالم کشتیاں گزرتی ہیں تاکہ انہیں غصب کرلے۔ تم پر اللہ کی رحمت ہو زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی [1]

(و) اعتراض کے ساتھ ساتھ حقیقتوں کا اعتراف — اس داستان کا ایک اور سبق ہے۔ حضرت موسیٰ نے تین بار نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے عالم دوست سے کیے گئے عہد کو نظر انداز کر دیا اور باوجود اس کے اس استاد کی جدائی انہیں سخت ناگوار بھی تاہم اس تلخ حقیقت کے سامنے انہوں نے ہٹ دھرمی سے کام نہیں لیا، اور ان کے اقدام کو حق تسلیم کیا۔ ان سے بڑی محبت اور خلوص کے عالم میں جدا ہوئے اور اپنے کام میں لگ گئے جبکہ اس دوستی اور رفاقت کے مختصر سے عرصے میں انہوں نے حقیقت کے عظیم خزانے جمع کر لیے تھے۔

انسان کو نہیں چاہیئے کہ آخر عمر تک اپنی آزمائش میں لگا رہے اور ایسے مستقبل کے لیے اپنی زندگی کو تجربہ گاہ نہ بنالے کہ جو ہرگز نہیں آئے گا۔ جب انسان کسی ایک چیز کو چند مرتبہ آزمالے تو پھر اس کے نتیجے کے سامنے سر جھکا دے۔

(ز) ماں باپ کے ایمان کا اولاد کے لیے اثر بھی اس داستان کا ایک اہم سبق ہے۔ حضرت خضرؑ نے ایک نیک اور صالح باپ کی وجہ سے اس کی اولاد کی اس قدر حمایت اپنے ذمہ لے لی کہ جس قدر ہوسکتی۔ یعنی اولاد اپنے باپ کے ایمان اور امانت کی وجہ سے سعادت مند ہوسکتی ہے اور اس کی نیکی کا فائدہ اس کی اولاد کو پہنچ سکتا ہے۔ چند ایک روایات میں ہے کہ وہ مردِ صالح ان یتیموں کا باپ نہیں تھا بلکہ ان کے دُور کے اجداد میں شمار ہوتا تھا (جی ہاں! عملِ صالح کی تاثیر اس قدر ہے) [2]

اس کے صالح ہونے کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اپنی اولاد کے لیے معنویت کے خزانے اور حکیمانہ پند و نصائح بطور یادگار چھوڑے۔

(ح) اس داستان کا ایک سبق یہ ہے کہ ماں باپ کو تکلیف پہنچانے سے عمر کم ہو جاتی ہے۔ جب ایسی اولاد موت کی مستحق ہے کہ جس نے آئندہ ماں باپ کو تکلیف پہنچانا ہے ان کے مقابلے میں سرکشی اور کفران اختیار کرنا ہے یا انہیں راہِ خدا سے منحرف کرنا ہے — تو پھر اس اولاد کی کیفیت بارگاہِ الٰہی میں کیا ہوگی

۱۔ معجم رجال الحدیث، ج، ص۲۲۶۔

۲۔ نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۸۹۔

Marfat.com

کہ جو اس وقت مشغولِ گناہ ہے۔

اسلامی روایات میں بیان ہوا ہے کہ عمر کی کمی اور ترکِ صلہ رحمی (خصوصاً ماں باپ کو تکلیف پہنچانے) کے درمیان قریبی رشتہ ہے۔ ان میں کچھ روایات کا ذکر ہم اسی جلد میں سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۲۳ کے ذیل میں کر آئے ہیں۔

(ط) اس داستان کا ایک درس یہ ہے کہ لوگ اس چیز کے دشمن ہوتے ہیں جسے نہیں جانتے۔ بسا ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص ہمارے بارے میں نیکی کرتا ہے لیکن چونکہ ہم باطن کار سے آگاہ نہیں ہوتے اس لیے اُسے دشمن خیال کرتے ہیں اور اس پر برہم ہوتے ہیں۔ خصوصاً ہم ان چیزوں کے بارے میں کم صبر اور بے حوصلہ ہوتے ہیں جنہیں نہیں جانتے۔ البتہ یہ ایک فطری امر ہے کہ انسان ایسے امور کے بارے میں بے صبر ہوتا ہے کہ جن کا صرف ایک رُخ اور ایک زاویہ اُس کے سامنے ہوتا ہے۔ بہرحال یہ داستان ہمیں بتاتی ہے کہ فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیئے بلکہ تمام پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کے بعد فیصلہ کرنا چاہیئے۔

امیرالمؤمنین علی علیہ السلام سے بھی ایک حدیث مروی ہے، آپؑ نے فرمایا:

الناس اعداء ما جھلوا

انسان جس چیز کو نہیں جانتے اس کے دشمن ہوتے ہیں [1]

اسی بناء پر لوگوں کی سطحِ علم و آگہی جس قدر بلند ہوگی مسائل سے ان کا برتاؤ اتنا ہی منطقی ہوتا چلا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں صبر کی بنیاد علم و آگہی ہے۔

البتہ حضرت موسیٰؑ ایک لحاظ سے مضطرب اور ناراحت ہونے کا حق رکھتے تھے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان تینوں واقعات میں شریعت کے احکام کا بہت سا حصہ خطرے میں پڑ گیا ہے۔ پہلے واقعے میں لوگوں کا مال محفوظ نہیں رہا دوسرے میں جان محفوظ نہیں رہی اور تیسرے میں مسائلِ حقوق خطرے سے دوچار ہو گئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے دیکھا کہ ظاہراً لوگوں کے حقوق کے ساتھ منطقی برتاؤ نہیں ہوا لہٰذا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اس قدر پریشان ہو جائیں کہ اس عالم بزرگ سے باندھا ہوا عہد بھلا دیں لیکن جب وہ باطنِ امر سے آگاہ ہوئے تو انہیں چین آگیا اور پھر کوئی اعتراض نہ کیا اور یہ بات خود اس امر کو واضح کرتی ہے کہ معاملات کے باطن سے مطلع نہ ہونا کس قدر پریشان کن ہے۔

(ی) اس داستان سے ہم استاد اور شاگرد کے آداب بھی سیکھ سکتے ہیں۔ اس عالمِ ربانی اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان ہونے والی گفتگو سے استاد اور شاگرد کے درمیان آداب کے سلسلے میں بہت سے نکات سامنے آتے ہیں۔ مثلاً:

---

[1] نہج البلاغہ، حکم ۱۷۲۔

Marfat.com

(۱) حضرت موسیٰ اپنے آپ کو حضرت خضرؑ کے تابع قرار دیتے ہیں :

اتبعك

(۲) اور اس پیروی اور اتباع کے لیے حضرت موسیٰ اپنے استاد سے اجازت طلب کرتے ہیں :

هل اتبعك

"کیا میں آپ کی اتباع کر سکتا ہوں ؟"

(۳) حضرت موسیٰ اپنی احتیاج علم اور استاد کے صاحب علم ہونے کا اقرار کرتے ہیں :

علیٰ ان تعلمن

تاکہ میں آپ سے علم حاصل کر سکوں ۔

(۴) انکساری کا اظہار کرتے ہوئے حضرت موسیٰ اپنے استاد کا علم بہت زیادہ قرار دیتے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ میں تو اس علم کا کچھ حصہ حاصل کرنے حاضر ہوا ہوں ۔ لفظ "مما" اس کی دلیل ہے ۔

(۵) علم اُستاد کو علم الٰہی کے عنوان سے یاد کرتے ہیں (علمت) ۔

(۶) ان سے ارشاد و ہدایت کی خواہش کرتے ہیں (رشداً) ۔

(۷) حضرت موسیٰ در پردہ اپنے استاد سے کہتے ہیں کہ جس طرح اللہ نے آپ پر لطف و کرم کیا ہے اور آپ کو تعلیم دی ہے آپ بھی مجھ پر یہ لطف کیجئے :

تعلمن مما علمت

(۸) "هل اتبعك" سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ شاگرد کو استاد کے پیچھے جانا چاہیئے نہ کہ اُستاد کو شاگرد کے پیچھے (سوائے خاص مواقع کے) ۔

(۹) حضرت موسیٰ بہت بلند مقام اور عظیم مقام کے حامل تھے ۔ اولوالعزم نبی تھے اور صاحبِ رسالت و کتاب تھے اس کے باوجود انہوں نے اس انکساری کا مظاہرہ کیا ہے ۔

ان کا کردار ہر کسی سے کہہ رہا ہے کہ تُو جو بھی ہے اور جو مقام بھی رکھتا ہے کسبِ علم و دانش کے موقع پر فروتنی اور انکساری سے کام لینا چاہیئے ۔

(۱۰) حضرت موسیٰ نے استاد سے عہد کرتے وقت قطعی اور یقینی لفظ استعمال نہیں کیے بلکہ کہا :

ستجدنی انشاء اللہ صابرًا

انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے ۔

یہ اللہ کے حضور بھی ادب ہے اور استاد کے حضور بھی ۔ کہ خلاف ورزی ہو جاتے تو اُستاد کی ہتک احترام نہ ہو ۔

(۱۱) اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اس عالم ربانی نے تعلیم و تربیت کے وقت انتہائی حلم و بردباری

Marfat.com

کا مظاہرہ کیا۔ موسیٰ جب ہیجان واضطراب کے عالم میں اپنا عہد بھول جاتے تھے اور اعتراض کرنے لگتے تھے
تو وہ بڑے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوالیہ انداز میں صرف اتنا کہتے تھے :
میں نہ کہتا تھا کہ میرے کاموں پر تم صبر نہ کر سکو گے ۔

٨٣ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ ؕ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ
مِّنْهُ ذِكْرًا ۝
٨٤ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِى الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ سَبَبًا ۝
٨٥ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۝
٨٦ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِىْ عَيْنٍ
حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۬ؕ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّاۤ اَنْ
تُعَذِّبَ وَاِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۝
٨٧ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ
فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝
٨٨ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ١نِ الْحُسْنٰى ۚ وَ
سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ؕ ۝
٨٩ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝
٩٠ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ
نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝
٩١ كَذٰلِكَ ؕ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝

Marfat.com

ترجمہ

(۸۳) اور تجھ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ عنقریب اس کی کچھ سرگزشت تم سے بیان کروں گا۔

(۸۴) ہم نے اسے روئے زمین پر قدرت و حکومت عطا کی اور ہر طرح کے اسباب اس کے اختیار میں دیئے۔

(۸۵) اس نے ان اسباب سے استفادہ کیا۔

(۸۶) یہاں تک کہ وہ سورج کے مقام غروب تک پہنچا۔ اسے آفتاب ایسے دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ کالے کیچڑ کے چشمے میں ڈوب رہا ہو۔ وہاں اس نے ایک قوم کو آباد پایا۔ ہم نے کہا اے ذوالقرنین کیا تم انہیں سزا دینا چاہو گے یا اچھی جزاء۔

(۸۷) کہنے لگا: جن لوگوں نے ظلم کیا ہے انہیں تو ہم سزا دیں گے اور وہ اپنے رب کی طرف پلٹ جائیں گے۔ اور اللہ انہیں سخت سزا دے گا۔

(۸۸) رہا وہ شخص جو ایمان لے آئے گا اور نیک کام کرے گا وہ اچھی جزا پائے گا اور ہم اسے آسان کام کہیں گے۔

(۸۹) اس نے پھر ان اسباب سے کام لیا۔

(۹۰) یہاں تک کہ وہ سورج کے مقام طلوع تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایسے لوگوں پر طلوع کر رہا ہے جن کے لیے سورج کے سوا ہم نے کوئی ستر (اور لباس) قرار نہیں دیا۔

Marfat.com

(۹۱) جی ہاں (ذوالقرنین کا معاملہ) ایسا ہی تھا اور اس کے پاس جو وسائل تھے ہم ان سے اچھی طرح آگاہ تھے۔

تفسیر

ذوالقرنین کی عجیب کہانی

اصحاب کہف کے بارے میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ چند قریشیوں نے رسول اللہؐ کو آزمانا چاہا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے مدینے کے یہودیوں کے مشورے سے تین مسئلے پیش کیے۔ ایک اصحاب کہف کے بارے میں تھا، دوسرا مسئلہ روح کا تھا اور تیسرا ذوالقرنین کے بارے میں۔ ان میں سے روح کے مسئلہ کا جواب سورہ بنی اسرائیل میں آیا ہے دوسرے دو سوالوں کا جواب زیر نظر سورہ کہف میں ہے۔

اب ذوالقرنین کی داستان کی باری ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں خود سورہ کہف میں تین واقعات کا ذکر ہے۔ یہ واقعات اگرچہ ظاہراً ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ان میں ایک قدر مشترک ہے۔ اصحاب کہف کا واقعہ، موسیٰؑ وخضرؑ کی داستان اور ذوالقرنین کی کہانی ـــ یہ سب ایسے مسائل پر مشتمل ہیں جو ہمیں عام محدود زندگی سے باہر لے جاتے ہیں اور نشاندہی کرتے ہیں کہ عالم اور اس کے حقائق بس یہی نہیں کہ جو ہم دیکھتے ہیں اور جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔

ذوالقرنین کی داستان ایسی ہے کہ جس پر طویل عرصے سے فلاسفہ اور محققین غور وخوض کرتے چلے آئے ہیں اور ذوالقرنین کی معرفت کے لیے انہوں نے بہت کوشش کی ہے۔

اس سلسلے میں پہلے ہم ذوالقرنین سے مربوط آیات کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔ یہ کل سولہ آیتیں ہیں کیونکہ تاریخی تحقیق سے قطع نظر ذوالقرنین کی ذات خود سے ایک بہت ہی تربیتی درس کی حامل ہے اور اس کے بہت سے قابل غور پہلو ہیں۔ ان آیات کی تفسیر کے بعد ذوالقرنین کی شخصیت کو جاننے کے لیے ہم آیات، روایات اور مؤرخین کے اقوال کا جائزہ لیں گے۔ دوسرے لفظوں میں پہلے ہم اس کی شخصیت کے بارے میں گفتگو کریں گے اور پہلا موضوع وہی ہے جو قرآن کی نظر میں اہم ہے۔

اس سلسلے کی پہلی آیت کہتی ہے: تجھ سے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کرتے ہیں: (ویسئلونك عن ذی القرنین)۔ کہہ دو عنقریب اس کی سرگزشت کا کچھ حصہ تم سے بیان کروں گا (قل سأتلوا علیکم منه ذکرًا)۔

"سأتلوا" میں جو "سین" ہے وہ مستقبل قریب کے لیے آئی ہے حالانکہ اس بارے میں رسول اللہؐ

Marfat.com

نے ساتھ ہی گفتگو شروع کر دی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ ادب کے پیش نظر ہو۔ ایسا ادب کہ جس میں ترک عجلت کا مفہوم پایا جاتا ہے اور ایسا ادب کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا سے بات معلوم کر کے لوگوں کو بتائی جارہی ہے۔

بہرحال اس آیت کی ابتداء یہ بتاتی ہے کہ لوگ پہلے بھی ذوالقرنین کے بارے میں بات کیا کرتے تھے۔ البتہ اس سلسلے میں ان میں اختلاف اور ابہام پایا جاتا تھا۔ اسی لیے انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے ضروری وضاحتیں چاہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ہم نے اسے زمین پر تمکنت عطا کی (قدرت، ثبات قوت اور حکومت بخشی) (انا مکنا له فی الارض)۔

اور ہر طرح کے وسائل و اسباب اس کے اختیار میں دیئے (و اٰتیناه من کل شیءٍ سببًا)۔

"سبب" دراصل اس رسی کو کہتے ہیں کہ جس کے ذریعے کھجور کے درختوں پر چڑھتے ہیں۔ بعد ازاں یہ لفظ ہر قسم کے وسیلے اور ذریعے کے معنی میں بولا جانے لگا۔ بعض مفسرین نے اس لفظ کو کسی خاص مفہوم میں محدود کرنا چاہا ہے لیکن ظاہر ہے کہ آیت پوری طرح مطلق ہے اور وسیع مفہوم رکھتی ہے اور نشاندہی کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو ہر چیز تک پہنچنے کے اسباب عنایت فرمائے تھے۔ "سبب" کے اس مفہوم میں عقل و درایت، انتظامی صلاحیت، طاقت و قوت، لشکر، افرادی قوت، مادی وسائل غرض ہر قسم کے ایسے مادی وسائل شامل ہیں جو مقاصد کے حصول کے لیے ضروری تھے۔

اس نے بھی ان سے استفادہ کیا (فاتبع سببًا)۔ یہاں تک کہ وہ سورج کے مقام غروب تک پہنچ گیا (حتّٰی اذا بلغ مغرب الشمس)۔ وہاں اس نے محسوس کیا کہ سورج تاریک اور کیچڑ آلود چشمے یا دریا میں ڈوب جاتا ہے (وجدها تغرب فی عین حمئة)[1]

وہاں اُس نے ایک قوم کو دیکھا (کہ جس میں اچھے بُرے ہر طرح کے لوگ تھے) (و وجد عندها قومًا)۔

تو ہم نے ذوالقرنین سے کہا: کہ تم انہیں سزا دینا چاہو گے یا اچھی جزا (قلنا یا ذا القرنین اما ان تعذب و اما ان تتخذ فیهم حسنًا)[2]

---

[1] "حمئة" دراصل سیاہ بدبودار کیچڑ کے معنی میں ہے دوسرے لفظوں میں یہ "لجن" کے معنی میں ہے (جس کا معنی ہے سیاہ مٹی جو کسی حوض یا نالے کی تہ میں ہوتی ہے)۔ یہ لفظ نشاندہی کرتا ہے کہ ذوالقرنین جس علاقے میں پہنچے تھے وہاں بدبودار کیچڑ بہت زیادہ تھا۔ یہاں تک کہ غروب آفتاب کے وقت ذوالقرنین کو ایسا لگتا تھا جیسے سورج کالے اس کیچڑ میں ڈوب رہا ہو۔ جیسے دریا کے پاس سے گزرنے والے مسافروں اور وہاں رہنے والوں کو وقت غروب ایسا لگتا ہے جیسے سورج دریا میں غروب ہو رہا ہے اور طلوع کے وقت ایسا لگتا ہے جیسے دریا سے نکل رہا ہو۔

[2] جملہ "اما ان تعذب..." ایسا لگتا ہے جیسے استفہامیہ ہو اگر اس کا ظاہر خبریہ ہے۔

Marfat.com

بعض مفسرین نے لفظ "قلنا" (ہم نے ذوالقرنین سے کہا) سے ان کی نبوت پر دلیل قرار دیا ہے لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اس جملے سے قلبی الہام مراد ہو کہ جو غیر انبیاء میں بھی ہوتا ہے لیکن اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تفسیر زیادہ تر نبوت کو ظاہر کرتی ہے۔

ذوالقرنین نے "کہا: وہ لوگ کہ جنہوں نے ظلم کیے ہیں، انہیں تو ہم سزا دیں گے" (قال اما من ظلم فسوف نعذبہ)۔ "اور پھر وہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جائیں گے اور اللہ انہیں شدید عذاب کرے گا۔ (ثم یرد الیٰ ربہ فیعذبہ عذابًا نکرًا)[1] یہ ظالم و ستمگر دنیا کا عذاب بھی چکھیں گے اور آخرت کا بھی۔

اور رہا وہ شخص کہ جو با ایمان ہے اور عمل صالح کرتا ہے اسے اچھی جزا ملے گی (واما من اٰمن و عمل صالحًا فلہ جزاءً الحسنیٰ) اور اسے ہم آسان کام سونپیں گے (وسنقول لہ من امرنا یسرًا)۔

اس سے بات بھی محبت سے کریں گے اور اس کے کندھے پر سخت ذمہ داریاں بھی نہیں رکھیں گے اور اس سے زیادہ خراج بھی وصول نہیں کریں گے۔

ذوالقرنین کی اس بیان سے گویا یہ مراد تھی کہ توحید پر ایمان اور ظلم و شرک اور برائی کے خلاف جدوجہد کے بارے میں میری دعوت پر لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہوگا جو اس الٰہی تعمیری پروگرام کو مطمئن ہو کر تسلیم کر لیں گے انہیں اچھی جزا ملے گی اور وہ آرام و سکون سے زندگی گزاریں گے جبکہ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہوگا جو اس دعوت سے دشمنی پر اتر آئیں گے اور شرک و ظلم اور برائی کے راستے پر ہی قائم رہیں گے انہیں سزا دی جائے گی۔

ضمناً یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ "من ظلم" کہ جو "من اٰمن و عمل صالحًا" کے مقابلے میں آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ظلم" اس جگہ شرک اور غیر صالح عمل کے معنی میں آیا ہے اور غیر صالح عمل دراصل شرک کے ناپاک درخت کا ایک کڑوا پھل ہے۔

ذوالقرنین نے اپنا مغرب کا سفر تمام کیا اور مشرق کی طرف جانے کا عزم کیا اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے: جو وسائل اس کے اختیار میں تھے اس نے ان سے پھر استفادہ کیا (ثم اتبع سببًا)۔

اور اپنا سفر اسی طرح جاری رکھا یہاں تک کہ سورج کے مرکز طلوع تک جا پہنچا (حتیٰ اذا بلغ مطلع الشمس)۔

وہاں اس نے دیکھا سورج ایسے لوگوں پر طلوع کر رہا ہے کہ جن کے پاس سورج کی کرنوں کے علاوہ تن ڈھانپنے کی کوئی چیز نہیں ہے (وجدھا تطلع علیٰ قوم لم نجعل لھم من دونھا سترًا)۔

یہ لوگ بہت ہی پست درجے کی زندگی گزارتے تھے یہاں تک کہ برہنہ رہتے تھے یا بہت ہی کم مقدار

---

[1] "نکر" "منکر" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے، نا معلوم یعنی نا معلوم عذاب کہ جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

Marfat.com

لباس پہنتے تھے کہ جس سے ان کا بدن سورج سے نہیں چھپتا تھا۔

بعض مفسرین نے اس احتمال کو بھی بعید قرار نہیں دیا کہ ان کے پاس رہنے کو کوئی گھر بھی نہ تھے کہ وہ سورج کی تپش سے بچ سکتے۔[1]

اس آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ وہ لوگ ایسے بیابان میں رہتے تھے کہ جس میں کوئی پہاڑ، درخت، پناہ گاہ اور کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ وہ سورج کی تپش سے بچ سکتے گویا اس بیابان میں ان کے لیے کوئی سایہ نہ تھا۔[2]

بہرحال یہ تمام تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

جی ہاں! ذوالقرنین کا معاملہ ایسا ہی ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کے اختیار میں (اپنے اہداف کے حصول کے لیے) کیا وسائل تھے (كذلك وقد احطنا بما لديه خبرًا)۔

بعض مفسرین نے آیت کی تفسیر میں یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ جملہ ذوالقرنین کے کاموں اور پروگراموں میں اللہ کی ہدایت کی طرف اشارہ ہے۔[3]

۱۔ بعض روایات اہل بیتؑ میں پہلی تفسیر بیان ہوئی ہے اور بعض میں دوسری تفسیر آئی ہے اور یہ دونوں ایک دوسری کے منافی بھی نہیں ہیں (نور الثقلین ج ۳ ص ۳۰۶ ملاحظہ فرمایئے)۔

۲۔ تفسیر "فی ظلال القرآن" اور تفسیر فخرالدین رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۳۔ المیزان، ج ۱۳ ص ۳۹۱۔

۹۲ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ○

۹۳ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا
يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ○

۹۴ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ
فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا
وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ○

۹۵ قَالَ مَا مَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِىْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ
بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ○

۹۶ اٰتُوْنِىْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ
قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِىْۤ اُفْرِغْ
عَلَيْهِ قِطْرًا ؕ ○

۹۷ فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ؕ ○

۹۸ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّىْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّىْ جَعَلَهٗ
دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّىْ حَقًّا ؕ ○

ترجمہ

۹۲ اس نے پھر ان وسائل سے استفادہ کیا (کہ جو اس کے اختیار میں تھے)۔

۹۳ (اور اسی طرح اپنا سفر جاری رکھا) یہاں تک کہ وہ دو پہاڑوں کے درمیان

Marfat.com

پہنچا اور وہاں ان دو سے مختلف ایک ایسا گروہ پایا جس کے لوگ کوئی بات نہیں سمجھ سکتے تھے۔

(۹۴) (وہ لوگ) کہنے لگے: اے ذوالقرنین! یاجوج و ماجوج اس سرزمین پر فساد برپا کرتے ہیں کیا ممکن ہے کہ اخراجات تجھے ہم فراہم کریں اور تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنا دے۔

(۹۵) (ذوالقرنین نے) کہا: اللہ نے جو میرے اختیار میں دیا ہے وہ (اس سے) بہتر ہے (کہ جس کی تم پیشکش کرتے ہو) قوت و طاقت سے میری مدد کرو تاکہ تمہارے اور ان کے درمیان دیوار بنا دوں۔

(۹۶) لوہے کی بڑی بڑی سلیں میرے پاس لے آؤ (اور انہیں ایک دوسرے پر چن دو) تاکہ دونوں پہاڑوں کے درمیان کی جگہ پوری طرح چھپ جائے۔ اس کے بعد اس نے کہا (اس کے اطراف میں آگ روشن کرو اور) آگ کو دھونکو یہاں تک کہ (دھونکتے دھونکتے انہوں نے لوہے کی سلوں کو سرخ انگارہ بنا کر پگھلا دیا اس نے کہا (اب) پگھلا ہوا تانبا میرے پاس لے آؤ تاکہ اسے اس کے اوپر ڈال دوں۔

(۹۷) (آخر کار اس نے ایسی مضبوط دیوار بنا دی کہ) اب وہ اس کے اوپر نہیں جا سکتے تھے اور نہ ہی اس میں نقب لگا سکتے تھے۔

(۹۸) اُس نے کہا: یہ میرے رب کی رحمت ہے لیکن جب میرے رب کا وعدہ آ پہنچا تو اسے درہم برہم کر دے گا اور میرے پروردگار کا وعدہ حق ہے۔

Marfat.com

تفسیر

ذوالقرنین نے دیوار کیسے بنائی ؟

زیرِ نظر آیات میں حضرت ذوالقرنین کے ایک اور سفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:
اس کے بعد اُس نے حاصل وسائل سے پھر استفادہ کیا (ثم اتبع سببًا) اور اس طرح اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا وہاں ان دو گروہوں سے مختلف ایک اور گروہ کو دیکھا۔ یہ لوگ کوئی بات نہیں سمجھتے تھے ۔(حتّٰی اذا بلغ بین السدین وجد من دونهما قومًا لا یکادون یفقهون قولًا)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ کوہستانی علاقے میں جا پہنچے ۔مشرق اور مغرب کے علاقے میں وہ جیسے لوگوں سے ملے تھے یہاں ان سے مختلف لوگ تھے۔ یہ لوگ انسانی تمدن کے اعتبار سے بہت ہی پسماندہ تھے کیونکہ انسانی تمدن کی سب سے واضح مظہر انسان کی گفتگو ہے ۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ " لا یکادون یفقهون قولًا" سے یہ مراد نہیں کہ وہ مشہور زبانوں میں سے کسی کو جانتے نہیں تھے بلکہ وہ بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکتے تھے یعنی فکری لحاظ سے وہ بہت پسماندہ تھے ۔

اُدیہ کہ وہ دو پہاڑ کہاں تھے؟ اس سلسلے میں ہم اس واقعے کے دیگر تاریخی اور جغرافیائی پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے تفسیری بحث کے آخر میں گفتگو کریں گے ۔

اس وقت یہ لوگ یاجوج ماجوج نامی خونخوار اور سخت دشمن سے بہت تنگ اور مصیبت میں تھے۔ ذوالقرنین کہ جو عظیم قدرتی وسائل کے حامل تھے ان کے پاس پہنچے تو انہیں بڑی تسلی ہوئی ۔انہوں نے ان کا دامن پکڑ لیا اور "کہنے لگے : اے ذوالقرنین ! یاجوج و ماجوج اس سرزمین پر فساد کرتے ہیں۔کیا ممکن ہے کہ خرچ آپ کو ہم دے دیں اور آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دیں (قالوا یا ذا القرنین ان یأجوج و مأجوج مفسدون فی الارض فهل نجعل لك خرجًا علٰی ان تجعل بیننا و بینهم سدًا)۔

وہ ذوالقرنین کی زبان تو نہیں سمجھتے تھے اس لیے ہو سکتا ہے یہ بات انہوں نے اشارے سے کی ہو یا پھر ٹوٹی پھوٹی زبان میں اظہارِ مدعا کیا ہو ۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ان کے درمیان مترجمین کے ذریعے بات چیت ہوئی ہو یا پھر خدائی الہام کے ذریعے حضرت ذوالقرنین نے ان کی بات سمجھی ہو جیسے حضرت ذوالقرنین بعض پرندوں سے بات کر لیا کرتے تھے ۔

Marfat.com

بہرحال اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی اقتصادی حالت اچھی تھی لیکن سوچ بچار، منصوبہ بندی اور صنعت کے لحاظ سے وہ کمزور تھے۔ لہٰذا وہ اس بات پر تیار تھے کہ اس اہم دیوار کے اخراجات اپنے ذمہ لے لیں، اس شرط کے ساتھ کہ ذوالقرنین اس کی منصوبہ بندی اور تعمیر کی ذمہ داری قبول کرلیں۔

یاجوج ماجوج کے بارے میں انشاء اللہ اس بحث کے آخر میں گفتگو کی جائے گی۔

اس پر ذوالقرنین نے انہیں جواب دیا: یہ تم نے کیا کہا؟ اللہ نے مجھے جو کچھ دے رکھا ہے، وہ اس سے بہتر ہے کہ جو تم مجھے دینا چاہتے ہو اور میں تمہاری مالی امداد کا محتاج نہیں ہوں (قال ما مکنی فیہ ربی خیر)۔

تم قوت و طاقت کے ذریعے میری مدد کرو تاکہ میں تمہارے اور ان دو مفسد قوموں کے درمیان مضبوط اور مستحکم دیوار بنا دوں (فاعینونی بقوۃ اجعل بینکم و بینھم ردمًا)۔

"ردم" (بروزن "مرد") بنیادی طور پر پتھر کے ذریعے سوراخ بھرنے کے معنی میں ہے لیکن بعدازاں یہ لفظ وسیع معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اب ہر قسم کی رکاوٹ اور دیوار کو "ردم" کہتے ہیں یہاں تک کہ اب کپڑے میں پیوند کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ "ردم" مضبوط اور مستحکم "سد" کو کہتے ہیں[1] اس تفسیر کے مطابق ذوالقرنین نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ ان کی توقع سے زیادہ مضبوط دیوار بنا دیں گے۔

ضمناً توجہ رہے کہ "سَدّ" (بروزن "قد" اور "سُدّ" (بروزن "خود") کا ایک ہی معنی ہے اور وہ ہے "دو چیزوں کے درمیان کوئی رکاوٹ" لیکن مفردات میں راغب نے لکھا ہے کہ ان دونوں لفظوں کے درمیان فرق ہے۔ "سَدّ" کو وہ انسان کی بنائی ہوئی رکاوٹ یا دیوار سمجھتے ہیں اور "سُدّ" کو فطری اور طبعی رکاوٹ خیال کرتے ہیں۔

پھر ذوالقرنین نے حکم دیا: لوہے کی بڑی بڑی سلیں میرے پاس لے آؤ (اٰتونی زبر الحدید)۔

"زبر"، "زبرۃ" (بروزن "غرفۃ") کی جمع ہے۔ یہ لوہے کے بڑے اور ضخیم ٹکڑے کے معنی میں ہے۔

جب لوہے کی سلیں آگئیں تو انہیں ایک دوسرے پر چننے کا حکم دیا، یہاں تک کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان کی جگہ پوری طرح چھپ گئی (حتّٰی اذا ساوٰی بین الصدفین)۔

"صدف" یہاں پہاڑ کے کنارے کے معنی میں ہے۔ اس لفظ سے واضح ہوتا ہے کہ پہاڑوں کے دو کناروں کے درمیان ایک کھلی جگہ تھی اور یہیں سے یاجوج و ماجوج داخل ہوتے تھے۔ ذوالقرنین نے پروگرام بنایا کہ اس خالی جگہ کو بھر دیا جائے۔

---

[1] یہ بات آلوسی نے روح المعانی میں، فیض کاشانی نے صافی میں اور فخر رازی نے تفسیر کبیر میں کہی ہے۔

Marfat.com

بہر حال تیسرا حکم ذوالقرنین نے یہ دیا کہ آگ لگانے کا مواد (ایندھن وغیرہ) لے آؤ اور اسے اس دیوار کے دونوں طرف رکھ دو اور اپنے پاس موجود وسائل سے آگ بھڑکاؤ اور اس میں دھونکو یہاں تک کہ لوہے کی سلیں انگاروں کی طرح سرخ ہو کر آخر پگھل جائیں (قال انفخوا حتّٰی اذا جعلہ نارًا)۔

درحقیقت وہ اس طرح لوہے کے ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ کر ایک کر دینا چاہتے تھے۔ یہی کام آج کل خاص مشینوں کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے۔ لوہے کی سلوں کو اتنی حرارت دی گئی کہ وہ نرم ہو کر ایک دوسرے سے مل گئیں۔

پھر ذوالقرنین نے آخری حکم دیا: کہا کہ پگھلا ہوا تانبا لے آؤ تاکہ اسے اس دیوار کے اوپر ڈال دوں (قال اٰتونی افرغ علیہ قطرًا)۔

اس طرح اس لوہے کی دیوار پر تانبے کا لیپ کر کے اسے ہوا کے اثر سے اور خراب ہونے سے محفوظ کر دیا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ موجودہ سائنس کے مطابق اگر تانبے کی کچھ مقدار لوہے میں ملا دی جائے تو اس کی مضبوطی بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ ذوالقرنین چونکہ اس حقیقت سے آگاہ تھے اس لیے انہوں نے یہ کام کیا۔

ضمناً یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ "قطر" کا مشہور معنی "پگھلا ہوا تانبا" ہی ہے لیکن بعض مفسرین نے اس کا معنی "پگھلا ہوا جست" کیا ہے جبکہ یہ خلافِ مشہور ہے۔

آخر کار یہ دیوار اتنی مضبوط ہو گئی کہ اب وہ مفسد لوگ نہ اس کے اوپر چڑھ سکتے تھے اور نہ اس میں نقب لگا سکتے تھے (فما اسطاعوا ان یظھروہ وما استطاعوا لہ نقبًا)۔

ذوالقرنین نے بہت اہم کام انجام دیا تھا۔ متکبرین کی روش تو یہ ہے کہ ایسا کام کر کے وہ بہت فخر و ناز کرتے ہیں یا احسان جتلاتے ہیں لیکن ذوالقرنین چونکہ مردِ خدا تھے لہٰذا انتہائی ادب کے ساتھ" کہنے لگے: یہ میرے رب کی رحمت ہے" (قال ھٰذا رحمۃ من ربی)۔

اگر میرے پاس ایسا اہم کام کرنے کے لیے علم و آگاہی ہے تو یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر مجھ میں کوئی طاقت ہے اور میں بات کر سکتا ہوں تو وہ بھی اس کی طرف سے ہے اور اگر یہ چیزیں اور ان کا ڈھانا میرے اختیار میں ہے تو یہ بھی پروردگار کی وسیع رحمت کی برکت ہے میرے پاس کچھ بھی میری اپنی طرف سے نہیں ہے کہ جس پر میں فخر و ناز کروں اور میں نے کوئی خاص کام بھی نہیں کیا کہ اللہ کے بندوں پر احسان جتاتا پھروں۔

اس کے بعد مزید کہنے لگے: یہ نہ سمجھنا کہ یہ کوئی دائمی دیوار ہے "جب میرے پروردگار کا حکم آیا تو یہ درہم برہم ہو جائے گی اور زمین بالکل ہموار ہو جائے گی" (فاذا جاء وعد ربی جعلہ دکّاء)۔

Marfat.com

اور میرے رب کا، وعدہ حق ہے (وکان وعد ربی حقاً)۔
یہ کہہ کر ذوالقرنین نے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ اختتامِ دنیا اور قیامت کے موقع پر یہ سب کچھ درہم برہم ہو جائے گا۔ البتہ بعض مفسرین نے وعدۂ الٰہی کو انسانی علم کی ترقی کی طرف اشارہ سمجھا ہے یعنی علمی ترقی کے بعد پھر ناقابلِ عبور دیوار کا کوئی مفہوم نہیں رہے گا مثلاً ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر کے ذریعہ ایسی رکاوٹوں کو ختم کر دیں گے لیکن یہ تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ اس داستان کے تاریخی اور تربیتی نکات: ذوالقرنین کون تھے، مشرق و مغرب کی طرف انہوں نے کس طرح سفر کیا اور ان کی بنائی ہوئی دیوار کہاں ہے؟ اس سلسلے میں ہم انشاءاللہ بعد میں بحث کریں گے۔ قطع نظر اس کی تاریخی مطابقت کے، خود یہ داستان بہت سے تربیتی اور تعمیری نکات کی حامل ہے۔ سب سے زیادہ ان نکات پر غور کیا جانا چاہیئے اور یہی درحقیقت قرآن کا اصل مقصد ہے۔

(۱) اسباب کے بغیر کوئی کام ممکن نہیں: پہلا درس کہ جو ہمیں یہ داستان سکھاتی ہے یہ ہے کہ اسباب و وسائل سے کام لیے بغیر عالم میں کچھ نہیں ہو سکتا لہٰذا اللہ تعالٰی نے حضرت ذوالقرنین کو کام کرنے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے اسباب و وسائل عطا کیے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وآتیناہ من کل شیءٍ سببًا

ہم نے اسے ہر طرح کے اسباب عطا کیے۔

نیز فرمایا:

فاتبع سببا

اُس نے بھی ان اسباب سے استفادہ کیا۔

لہٰذا جو لوگ توقع رکھیں کہ درکار اسباب و وسائل مہیا کیے بغیر کامیابی تک پہنچ جائیں وہ کہیں نہیں پہنچ سکتے، چاہے وہ ذوالقرنین ہی کیوں نہ ہوں۔

(۲) کاہے بڑی شخصیت بھی غروب ہو جاتی ہے: سورج کا کیچڑ آلود چشمے میں غروب ہو جانا اگرچہ فریبِ نظر کا پہلو رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود یوں لگتا ہے جیسے ہو سکتا ہے سورج اتنا بڑا ہونے کے باوجود کیچڑ بھرے چشمے میں چھپ سکتا ہے جیسے ایک باعظمت انسان اور ایک بلند مقام شخصیت بعض اوقات کسی ایک بڑی لغزش کی وجہ سے اپنے مقام سے گر جاتی ہے اور اس کی شخصیت نگاہوں سے غروب ہو جاتی ہے۔

(۳) تحسین اور سزا دونوں کی ضرورت ہے: کوئی حکومت اپنے اچھے لوگوں کی تحسین و تشویق

Marfat.com

کے بغیر اور خطا کاروں کو سزا دیئے اور باز پرس کیے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی۔ یہی وہ اصول ہے جس سے حضرت ذوالقرنین نے استفادہ کیا اور کہا:

جنہوں نے زیادتی اور ظلم کیا ہے انہیں ہم سزا دیں گے اور جو ایمان لائے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں انہیں ہم اچھی جزا دیں گے۔

حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر کے نام ایک فرمان جاری کیا۔ یہ فرمان نظام مملکت کا ایک جامع دستور العمل ہے۔ اس مشہور حکم میں آپؑ فرماتے ہیں:

ولا یکونن المحسن والمسیئ عندک بمنزلۃ سواء، فان فی ذٰلک تزھیدا لاھل الاحسان فی الاحسان، وتدریبا لاھل الاسائۃ علی الاسائۃ[1]

تیری نگاہ میں نیک اور بد کبھی ایک نہیں ہونے چاہئیں کیونکہ اس طرح تو نیک لوگ اپنے کام سے بددل ہوجائیں گے اور بُرے بے پرواہ۔

(۴) اتنا بوجھ ڈالنا جو قابلِ برداشت ہو: عدلِ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ کسی پر اتنا بوجھ اور ذمہ داری ڈالی جائے کہ جو اس کے لیے تکلیف دہ نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ذوالقرنین نے تصریح کی ہے ظالموں کو سزا دوں گا اور نیک لوگوں کو اچھی جزا دوں گا اور پھر فرمایا:

مَیں ان کے سامنے آسان پروگرام رکھوں گا۔

یعنی ان کے ذمہ آسان کام لگاؤں گا تاکہ وہ شوق اور رغبت سے یہ کام سرانجام دے سکیں۔

(۵) مختلف علاقے، مختلف حالات اور مختلف تقاضے: ایک وسیع اور ہمہ گیر مملکت مختلف علاقوں میں لوگوں کے مختلف حالات سے بے اعتنا نہیں رہ سکتی۔ ذوالقرنین کہ جو ایک حکومتِ الٰہی کے سربراہ تھے۔ ان کی مملکت کے مختلف خطوں میں مختلف قومیں بستی تھیں۔ ہر قوم کا اپنا رہن سہن اور تمدن تھا۔ ذوالقرنین ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کے حسبِ حال سلوک کرتے اور ان سب کو گویا اپنے پَروں کے نیچے رکھتے۔

(۶) ہر قوم کے مسائل حل کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے: ایک قوم کہ جو قرآن کے بقول:

لا یکادون یفقھون قولاً

یعنی۔ بات تک نہ سمجھتی تھی ۔ حضرت ذوالقرنین نے اسے بھی اپنی نگاہِ کرم سے دور نہیں رکھا اور جیسے بھی ممکن ہوا ان کا دردِ دل سنا اور ان کی احتیاج کو پورا کیا۔ آپ نے ان کے اور ان کے دشمن کے درمیان مضبوط دیوار بنادی۔ ظاہراً نظر نہیں آتا کہ حکومت کے لیے ایسی قوم کوئی فائدہ مند تھی اس کے باوجود

---

[1] نہج البلاغہ: خط ۵۳۔

Marfat.com

حضرت ذوالقرنین نے ان کے ساتھ یہ حُسنِ سلوک روا رکھا اور ان کے مسائل حل کیے۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

اسماع الاصم من غیر تصخر صدقة هنیئة

اتنی بلند آواز سے بات کرنا کہ بہرہ شخص بھی سُن لے، اچھے صدقے کی مانند ہے بشرطیکہ یہ بلند آواز غصے کے طور پر نہ ہو[1]

(۷) **امن صحیح معاشرے کیلئے بنیادی شرط ہے:** ایک صحیح معاشرے کی زندگی کے لیے امن اولین اور اہم ترین شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قیام امن اور مفسدین کو روکنے کے لیے حضرت ذوالقرنین نے بہت باعثِ زحمت کام اپنے ذمے لیا اور نہایت مضبوط دیوار کھڑی کر دی ۔ ایسی دیوار جو تاریخ میں ضرب المثل ہوگئی۔ جیسے کہتے ہیں "دیوارِ سکندر کی طرح" (اگرچہ ذوالقرنین سکندر نہ تھے)۔

اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے تعمیرِ کعبہ کے وقت اس سرزمین کیلئے جو چیز سب سے پہلے اللہ سے مانگی وہ نعمتِ امن وامان ہی تھی۔ آپؑ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا

بار الٰہا! اس شہر کو امن کا گہوارہ بنا دے۔ (ابراہیم۔ ۳۵)

اسی لیے فقہِ اسلام میں ان لوگوں کے لیے سخت ترین سزا مقرر کی گئی ہے جو معاشرے کے امن وامان کو خطرے میں ڈال دیں (سورہ مائدہ۔ آیہ ۳۳ کی طرف رجوع کریں)۔

(۸) **صاحبِ مسئلہ کو خود بھی شریکِ کار ہونا چاہیئے:** اس تاریخی واقعے سے ایک اور سبق یہ لیا جاسکتا ہے کہ جن کا کوئی مسئلہ ہے اور جو کسی درد میں مبتلا ہیں انہیں بھی اپنے مسئلے کے حل اور درد کے علاج میں شریک ہونا چاہیئے کیونکہ: ع

آہ صاحب درد را باشد اثر

جو خود درد میں مبتلا ہو اس کی آہ اثر رکھتی ہے۔

اسی لیے جنہوں نے وحشی قوموں کے حملے کی شکایت کی تھی سب سے پہلے حضرت ذوالقرنین نے انہیں حکم دیا کہ وہ لوہے کی سلیں لے آئیں۔ اس کے بعد آپ نے انہیں لوہے کی دیوار کے گرد آگ روشن کرنے کا حکم دیا۔ پھر پگھلا ہوا تانبا لانے کے لیے کہا تاکہ اسے لوہے پر لیپ دیا جائے۔

اصولی طور پر جنہیں کوئی مسئلہ درپیش ہو، جب کام ان کی شراکت سے انجام پاتا ہے تو ان کی صلاحیتیں بھی ابھرتی ہیں، کام کی کوئی قدر و قیمت بھی ہوتی ہے اور پھر وہ اس کی حفاظت بھی کرتے ہیں کیونکہ اس میں

---

[1] سفینۃ البحار، ج ۲، لفظ صمم۔

Marfat.com

ان کی زحمتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔
ضمنی طور پر اس سے یہ بھی اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ ایک پسماندہ قوم کو بھی جب کوئی صحیح سرپرست اور منصوبہ بندی میسر آجائے تو وہ بھی بڑے اہم اور محیر العقول کام کر سکتی ہے۔

(۹) خدائی رہبر کی مادیات سے بے اعتنائی: ایک سبق اس داستان سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ ایک خدائی رہبر کو مالِ دنیا اور مادیات سے بے پرواہ اور بے اعتنا ہونا چاہیئے اور جو کچھ اللہ نے اسے عطا کیا ہے اسی پر قناعت کرنا چاہیئے۔ بادشاہ ہر طرف سے اور ہر کسی سے عجیب عجیب ہتھکنڈے استعمال کر کے مال جمع کرنے کی لالچ کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ذوالقرنین کو جب مال کی پیشکش کی گئی تو آپ نے یہ کہہ کر قبول نہ کی کہ:

ما مکنی فیه ربی خیر

جو کچھ میرے رب نے مجھے دیا ہے وہ بہتر ہے۔

قرآن مجید میں واقعاتِ انبیاء میں ہم بارہا دیکھتے ہیں کہ ان کی یہ بات بہت بنیادی ہوتی تھی کہ ہماری دعوت تم سے کسی اجر و صلہ کے لیے نہیں اور ہم تم سے کسی اجر کی خواہش نہیں کرتے۔ یہ بات قرآن مجید میں پیغمبرِ اسلامؐ اور دیگر انبیاء کے بارے میں گیارہ مرتبہ دکھائی دیتی ہے۔ کبھی اس جملے کے ساتھ یہ فرمایا گیا ہے کہ:

ہماری جزا تو خدا کے ذمہ ہے۔

اور کبھی فرمایا گیا ہے:

قل لا اسئلکم علیه اجرًا الا المودة فی القربٰی (الشوریٰ۔ ۲۳)

مَیں تم سے اپنے اقرباء سے محبت و مودت کے علاوہ کسی چیز کا تقاضا نہیں کرتا۔

اہلِ بیتؑ سے مودت و محبت کا یہ تقاضا بھی دراصل آئندہ رہبری کی بنیاد کے طور پر ہے۔

(۱۰) کام ہر لحاظ سے ٹھوس اور مضبوط ہونا چاہیئے: کام کو ہر لحاظ سے ٹھوس اور پائیدار کرنا اس داستان کا ایک اور سبق ہے۔ ذوالقرنین نے دیوار تعمیر کرنے کے لیے لوہے کی بڑی بڑی سلیں استعمال کیں اور انہیں آپس میں ملانے اور جوڑنے کے لیے آگ میں پگھلایا۔ نیز دیوار کو ہوا، رطوبت، بارش وغیرہ کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے اس پر تانبے کا لیپ کر دیا تاکہ لوہا بوسیدہ اور زنگ زدہ نہ ہو۔

(۱۱) تکبر۔ انسان کو زیبا نہیں: انسان کتنا بھی طاقتور اور صاحب قدرت ہو اور بڑے بڑے کام کر گزرے پھر بھی اسے ہرگز اپنے اوپر غرور اور ناز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ وہ درس ہے جو حضرت ذوالقرنین نے سب کو دیا ہے۔ وہ ہر مقام پر قدرت پر بھروسہ کرتے تھے۔ جب دیوار مکمل ہوگئی تو انہوں نے کہا:

هٰذا رحمة من ربی

یہ میرے رب کی رحمت ہے۔

Marfat.com

جب انہیں مالی کمک کی پیش کش ہوئی تو کہا :

ما مکنی فیہ ربی خیر

جو کچھ اللہ نے مجھے بخشا ہے وہ اس سے بہتر ہے ۔

اور جب آپ نے اس مضبوط دیوار کے درہم برہم ہو جانے کی بات کی تو بھی پروردگار کے وعدۂ حق کا سہارا لیا ۔

(۱۲) اس جہان کی ہر چیز فنا پذیر ہے : آخرکار تمام چیزیں زائل ہو جائیں گی ۔ اس جہان کی مضبوط ترین عمارتیں بھی آخرکار تباہ ہو جائیں گی، اگرچہ وہ لوہے اور فولاد کی بنی ہوں ۔ یہ اس داستان کا آخری درس ہے ۔ یہ ان تمام لوگوں کے لیے درس ہے جو عملی طور پر دنیا کو جاودانی سمجھتے ہیں اور مال جمع کرنے، منصب و مقام حاصل کرنے کے لیے کسی قانون اور قاعدے کی پرواہ نہیں کرتے اور دنیا کے لیے ایسی حریصانہ کوشش کرتے ہیں کہ گویا موت اور فنا ہے ہی نہیں ۔ جبکہ دیوارِ ذوالقرنین تو معمولی چیز ہے ، سورج اتنا بڑا ہونے کے باوجود خاموش اور فنا ہو جائے گا ۔ پہاڑ اپنی اتنی مضبوطی کے باوجود دُھنی ہوئی روئی کی مانند اڑ جائیں گے ۔ ان سب چیزوں میں انسان تو بہت ہی کمزور سی مخلوق ہے ۔ کیا اس حقیقت کے بارے میں غور و خوض انسان کو خود غرضیوں اور خود پرستیوں سے روکنے کے لیے کافی نہیں ہے ۔

۲ ۔ ذوالقرنین کون تھا ؟ جس ذوالقرنین کا قرآن مجید میں ذکر ہے، تاریخی طور پر وہ کون شخص ہے ، تاریخ کی مشہور شخصیتوں میں سے یہ داستان کس پر منطبق ہوتی ہے ، اس سلسلے میں مفسرین کے مابین اختلاف ہے ۔ اس سلسلے میں جو بہت سے نظریات پیش کیے گئے ہیں ان میں سے یہ تین زیادہ اہم ہیں :

پہلا : بعض کا خیال ہے کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے لہٰذا وہ اسے سکندر ذوالقرنین کے نام سے پکارتے ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ اس نے اپنے باپ کی موت کے بعد روم، مغرب اور مصر پر تسلط حاصل کیا ۔ اس نے اسکندریہ شہر بنایا ۔ پھر شام اور بیت المقدس پر اقتدار قائم کیا ۔ وہاں سے ارمنستان گیا ۔ عراق و ایران کو فتح کیا ۔ پھر ہندوستان اور چین کا قصد کیا ۔ وہاں سے خراسان پلٹ آیا ۔ اس نے بہت سے نئے شہروں کی بنیاد رکھی ۔ پھر وہ عراق آ گیا ۔ اس کے بعد وہ شہر زور میں بیمار پڑا اور مر گیا ۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کی عمر چھتیس سال سے زیادہ نہ تھی ۔ اس کا جسدِ خاکی اسکندریہ لے جا کر دفن کر دیا گیا [۱]

دوسرا : مورخین میں سے بعض کا نظریہ ہے کہ ذوالقرنین یمن کا ایک بادشاہ تھا ۔ (یمن کے بادشاہ کو "تبع" کے نام سے پکارا جاتا تھا ۔ اس کی جمع "تبابعہ" ہے) ۔ اصمعی نے اپنی تاریخ عرب قبل از اسلام میں ،

---

۱ ۔ تفسیر فخر رازی، زیر بحث آیات کے ذیل میں اور کامل ، ابن اثیر ، ج ۱ ، ص ۲۸۷ ۔ بعض کہتے ہیں کہ سب سے پہلے بو علی سینا نے اپنی کتاب الشفا میں اس نظریے کا اظہار کیا ۔

Marfat.com

ابن ہشام نے اپنی مشہور تاریخ "سیرۃ" میں اور ابوریحان بیرونی نے "الآثار الباقیہ" میں یہی نظریہ پیش کیا ہے۔

یہاں تک کہ یمن کی ایک قوم "حمیری" کے شعراء اور زمانۂ جاہلیت کے بعض شعراء کے کلام میں دیکھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ذوالقرنین کے اپنے میں سے ہونے پر فخر کیا ہے [۱]

اس نظریے کی بناء پر ذوالقرنین نے جو دیوار بنائی وہ دیوار مآرب ہے۔

تیسرا: یہ جدید ترین نظریہ ہے جو ہندوستان کے مشہور عالم ابوالکلام آزاد نے پیش کیا ہے۔ ابوالکلام آزاد کسی دَور میں ہندوستان کے وزیرِ تعلیم تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے [۲] اس نظریے کے مطابق ذوالقرنین، کورش کبیر بادشاہِ ہخامنشی ہے۔

پہلے اور دوسرے نظریے کے لیے کوئی خاص تاریخی مدرک نہیں ہے۔ اس کے علاوہ قرآن نے ذوالقرنین کی جو صفات بیان کی ہیں ان کا حامل اسکندر مقدونی ہے نہ کوئی بادشاہ یمن۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسکندر مقدونی نے کوئی معروف دیوار بھی نہیں بنائی۔

رہی وہ یمن کی دیوارِ مآرب، تو اس میں ان صفات میں سے ایک بھی نہیں جو قرآن کی ذکرکردہ دیوار میں ہیں۔ کیونکہ قرآن کے مطابق دیوارِ ذوالقرنین لوہے اور تانبے سے بنائی گئی ہے اور یہ دیوار وحشی اقوام کو روکنے کے لیے بنائی گئی تھی جبکہ دیوارِ مآرب عام مصالحے سے بنائی گئی ہے اور اس کی تعمیر کا مقصد پانی کا ذخیرہ کرنا اور سیلابوں سے بچنا تھا۔ اس کی وضاحت خود قرآن نے سورہ سبا میں کی ہے۔

لہٰذا ہم اپنی بحث کو زیادہ تر تیسرے نظریے پر مرتکز کرتے ہیں۔ یہاں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ چند امور کی طرف خوب توجہ دی جائے:

(ل) پہلی بات تو یہ ہے کہ "ذوالقرنین" کا معنی ہے "دو سینگوں والا"۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہیں اس نام سے کیوں موسوم کیا گیا۔

بعض کا نظریہ ہے کہ یہ نام اس لیے پڑا کہ وہ دنیا کے مشرق و مغرب تک پہنچے کہ جسے عرب "قرنی الشمس" (سورج کے دو سینگ) سے تعبیر کرتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ نام اس لیے ہوا کہ انہوں نے دو قرن زندگی گزاری یا حکومت کی۔

پھر یہ کہ قرن کی مقدار کتنی ہے، اس میں بھی مختلف نظریات ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ ان کے سر کے دونوں طرف ایک خاص قسم کا ابھار تھا اس وجہ سے ذوالقرنین

---

[۱] المیزان، ج ۱۳ ص ۴۱۴۔

[۲] فارسی میں اس کتاب کے ترجمے کا نام "ذوالقرنین یا کورش کبیر" رکھا گیا ہے۔ بہت سے معاصر مفسرین اور مؤرخین نے اپنی کتب میں اس نظریے کی موافقت کی ہے اور اس پر اپنے خیالات کا تفصیل سے اظہار کیا ہے۔

Marfat.com

مشہور ہو گئے۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ ان کا خاص تاج دو شاخوں والا تھا۔

اس کے علاوہ بھی نظریات ہیں، جن کا ذکر بات کو طویل کرے گا۔ بہرحال ہم دیکھیں گے کہ ذوالقرنین کی شخصیت کے بارے میں تیسرا نظریہ پیش کرنے والے یعنی ابوالکلام آزاد نے اپنے نظریے کے اثبات کے لیے اس لقب "ذوالقرنین" سے بہت استفادہ کیا ہے۔

(ب) قرآن مجید سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین ممتاز صفات کے حامل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اسباب ان کے اختیار میں دیئے تھے۔ انہوں نے تین اہم لشکر کشیاں کیں۔ پہلے مغرب کی طرف، پھر مشرق کی طرف اور آخر میں ایک ایسے علاقے کی طرف کہ جہاں ایک کستانی درّہ موجود تھا۔ ان مسافرت میں وہ مختلف اقوام سے ملے۔ ان کی تفصیل آیات کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

وہ ایک مرد مومن، موحد اور مہربان شخص تھے۔ وہ عدل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ اسی بنا پر اللہ کا لطف خاص ان کے شامل حال تھا۔ وہ نیکوں کے دوست اور ظالموں کے دشمن تھے۔ انہیں دنیا کے مال و دولت سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ اللہ پر بھی ایمان رکھتے تھے اور روز جزاء پر بھی۔ انہوں نے ایک نہایت مضبوط دیوار بنائی۔ یہ دیوار انہوں نے اینٹ اور پتھر کی بجائے لوہے اور تانبے سے بنائی (اور اگر دوسرے مصالحے بھی استعمال ہوئے ہوں تو ان کی بنیادی حیثیت نہ تھی)۔ اس دیوار بنانے سے ان کا مقصد مستضعف اور ستم رسیدہ لوگوں کی یاجوج و ماجوج کے ظلم و ستم کے مقابلے میں مدد کرنا تھا۔

وہ ایسے شخص تھے کہ نزول قرآن سے قبل ان کا نام لوگوں میں مشہور تھا۔ لہٰذا قریش اور یہودیوں نے ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا تھا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

یسئلونك عن ذی القرنین

تجھ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

البتہ قرآن سے کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو صراحت سے ان کے نبی ہونے پر دلالت کرے اگرچہ ایسی تعبیرات قرآن میں موجود ہیں کہ جو اس مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہیں، جیسا کہ آیات کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے بہت سی ایسی روایات منقول ہیں جن میں ہے کہ:

وہ نبی نہ تھے بلکہ اللہ کے ایک صالح بندے تھے [1]

(ج) یہ نظریہ کہ ذوالقرنین — کورش کبیر — کو کہتے ہیں، اس کی دو بنیادیں ہیں:

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۹۳ و ص ۲۹۵ کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

پہلی: یہ کہ اس کے بارے میں رسولِ اسلامؐ سے سوال کرنے والے یہودی تھے یا یہودیوں کی تحریک پر قریش تھے۔ جیسا کہ ان آیات کی شانِ نزول کے بارے میں منقول روایات سے ظاہر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں کتبِ یہود کو دیکھا جانا چاہیئے۔

یہودیوں کی مشہور کتابوں میں سے کتاب دانیال کی آٹھویں فصل میں ہے:

"بل شقر" کی سلطنت کے سال مجھ دانیال کو خواب دکھایا گیا۔ جو خواب مجھے دکھایا گیا اس کے بعد اور خواب میں، مَیں نے دیکھا کہ مَیں ملک "عیلام" کے "قصرِ شوشان" میں ہوں۔ مَیں نے خواب میں دیکھا کہ مَیں "دریائے ولادی" کے پاس ہوں۔ مَیں نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا کہ ایک مینڈھا دریا کے کنارے کھڑا ہو گیا ہے۔ اس کے دو سینگ تھے۔ اور یہ بلند سینگ تھے ___ اور اس مینڈھے کو مَیں نے مغرب، مشرق اور جنوب کی سمت سینگ مارتے ہوئے دیکھا۔ کوئی جانور اس کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتا تھا اور کوئی اس کے ہاتھ سے بچانے والا نہ تھا۔ وہ اپنی رائے پر ہی عمل کرتا تھا اور وہ بڑا ہوتا جاتا تھا۔۔۔[1]

اس کے بعد اسی کتاب میں دانیال کے بارے میں ہے:

جبریل اس پر ظاہر ہوا اور اس کے خواب کی یوں تعبیر کی:

دو شاخوں والا مینڈھا جو تُو نے دیکھا ہے وہ مدائن اور فارس (یا ماد اور فارس) کے بادشاہ ہیں۔

یہودیوں نے دانیال کے خواب کو بشارت قرار دیا۔ وہ سمجھے کہ ماد و فارس کے کسی بادشاہ کے قیام اور بابل کے حکمرانوں پر ان کی کامیابی سے یہودیوں کی غلامی اور قید کا دَور ختم ہوگا اور وہ اہلِ بابل کے چنگل سے آزاد ہوں گے۔

زیادہ دیر نہ گزری کہ "کورش" نے ایران کی حکومت پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ اس نے ماد اور فارس کو ایک ملک کر کے دونوں کو ایک عظیم سلطنت بنا دیا۔ جیسے دانیال کے خواب میں بتایا گیا تھا کہ وہ اپنے سینگ مغرب، مشرق اور جنوب کی طرف مارے گا، کورش نے تینوں سمتوں میں عظیم فتوحات حاصل کیں۔

اس نے یہودیوں کو آزاد کیا اور فلسطین جانے کی اجازت دی۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ تورات کی کتاب اشعیا، فصل ۴۴، شمارہ ۲۸ میں ہے:

اس وقت خصوصیت سے کورش کے بارے میں فرماتا ہے کہ میرا چرواہا وہی ہے میری مشیت کو اس نے پورا کیا ہے۔ اور شلیم سے کہے گا کہ تو تعمیر ہوگا۔

---

[1] کتاب دانیال، فصل ہشتم، پہلے سے چوتھے جملے تک۔

Marfat.com

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ تورات کی بعض تعبیرات میں "کورش" کے بارے میں ہے کہ:

عقاب مشرق اور مردِ تدبیر کہ جو بڑی دُور سے بلایا جائے گا[1]

دوسری بنیاد یہ ہے کہ انیسویں عیسوی صدی میں استخر کے قریب دریائے مرغاب کے کنارے کورش کا مجسمہ دریافت ہوا ہے۔ یہ ایک انسان کے قدو قامت کے برابر ہے۔ اس میں کورش کے عقاب کی طرح کے دو پَر بنائے گئے ہیں اور اس کے سر پہ ایک تاج ہے۔ اس میں مینڈھے کے سینگوں کی طرح کے دو سینگ نظر آتے ہیں۔

یہ مجسمہ بہت قیمتی ہے اور قدیم فن سنگ سازی کا نمونہ ہے۔ اس نے ماہرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی ہے۔ جرمنی کے ماہرین کی ایک جماعت نے صرف اسے دیکھنے کے لیے ایران کا سفر کیا۔

تورات کے مندرجات کو جب اس مجسمے کی تفصیلات کے ساتھ ملا کر دیکھا تو ابوالکلام آزاد کو مزید یقین ہوا کہ کورش کو ذوالقرنین (دو سینگوں والا) کہنے کی وجہ کیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی واضح ہوگیا کہ کورش کے مجسمے میں عقاب کے دو پر کیوں لگائے گئے ہیں۔ اس سے علماء کے ایک گروہ کے لیے ذوالقرنین کی تاریخی شخصیت پوری طرح واضح ہوگئی۔

ایک چیز کہ جو اس نظریے کی تائید کرتی ہے وہ کورش کے تاریخ میں لکھے گئے اخلاقی اوصاف ہیں۔

یونانی مؤرخ ہرودوت لکھتا ہے:

کوروش نے حکم جاری کیا کہ اس کے سپاہی سوائے جنگ کرنے والوں کے کسی کے سامنے تلوار نہ نکالیں اور دشمن کا جو سپاہی اپنا نیزہ خم کردے اسے قتل نہ کریں۔ کوُرش کے لشکر نے اس کے حکم کی اطاعت کی۔ اس طرح سے کہ ملت کے عام لوگوں کو مصائبِ جنگ کا احساس تک نہ ہوا۔

ہرودوت اس کے بارے میں مزید لکھتا ہے:

کوُرش کریم، سخی، بہت نرم دل اور مہربان بادشاہ تھا۔ اسے دوسرے بادشاہوں کی طرح مال جمع کرنے کی حرص نہ تھی بلکہ اسے یہ لالچ تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کرم و عطا کرے۔ وہ ستم رسیدہ لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف کرتا تھا اور جس چیز سے زیادہ خیر اور بھلائی ہوتی اسے پسند کرتا تھا۔

ایک اور مؤرخ ذی نوفن لکھتا ہے:

کوروش عاقل اور مہربان بادشاہ تھا۔ اس میں بادشاہوں کی عظمت، حکماء کے فضائل

---

[1] کتاب اشعیا، فصل ۴۶، شمارہ ۱۱۔

Marfat.com

کے ساتھ ساتھ تھی۔ اُس کی ہمت بلند تھی اور اُس کا جود و کرم زیادہ تھا۔ اس کا شعار انسانیت کی خدمت تھا اور عدالت اس کی عادت تھی۔ وہ تکبر کی بجائے انکساری کا مرقع تھا۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ کورش کی اس قدر تعریف و توصیف کرنے والے مؤرخین غیر ہیں، کورش کی قوم اور وطن سے ان کا تعلق نہیں ہے بلکہ اہلِ یونان ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ یونان کے لوگ کورش کی طرف دوستی اور محبت کی نظر سے نہ دیکھتے تھے کیونکہ کورش نے لیدیا کو فتح کر کے اہلِ یونان کو بہت بڑی شکست دی تھی۔

اس نظریے کے حامی کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ذوالقرنین کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں وہ کورش کے اوصاف سے مطابقت رکھتے ہیں۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر کورش نے مشرق، مغرب اور شمال کی طرف سفر بھی کیے ہیں۔ ان سفروں کا حال اس کی تاریخ میں تفصیلی طور پر مذکور ہے۔ یہ سفر قرآن میں ذکر کیے گئے ذوالقرنین کے سفروں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ کورش نے پہلی لشکرکشی لیدیا پر کی۔ یہ ایشیائے کوچک کا شمالی حصہ ہے۔ یہ ملک کورش کے مرکزِ حکومت سے مغرب کی طرف تھا۔

ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کا نقشہ سامنے رکھیں تو ہم دیکھیں گے کہ ساحل کے زیادہ تر حصے چھوٹی چھوٹی خلیجوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً ازمیر کے قریب کہ جہاں خلیج ایک چشمے کی صورت دھار لیتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین نے اپنے مغرب کے سفر میں محسوس کیا کہ جیسے سورج کیچڑ آلود چشمے میں ڈوب رہا ہے۔ یہ وہی منظر ہے جو کورش نے غروبِ آفتاب کے وقت ساحلی خلیجوں میں دیکھا تھا۔

کورش کی دوسری لشکرکشی مشرق کی طرف تھی۔ جیسا کہ ہرودوت نے کہا ہے کہ کورش کا یہ مشرقی حملہ لیدیا کی فتح کے بعد ہوا خصوصاً بعض بیابانی وحشی قبائل کی سرکشی نے کورش کو اس حملے پر اکسایا۔

قرآن کے الفاظ ہیں:

حتّٰی اذا بلغ مطلع الشمس وجدھا تطلع علٰی قوم لم نجعل لھم من دونھا سترًا

پھر وہ سورج کے مرکزِ طلوع تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایسے لوگوں پر طلوع کر رہا ہے کہ جن کے پاس سورج کی کرنوں سے بچنے کیلئے کوئی سایہ نہ تھا۔

یہ الفاظ کورش کے سفرِ مشرق کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ جہاں اس نے دیکھا کہ سورج ایسی قوم پر طلوع کر رہا ہے کہ جن کے پاس اس کی تپش سے بچنے کیلئے کوئی سایہ نہ تھا۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ قوم صحرا نورد تھی اور بیابانوں میں رہتی تھی۔

کورش نے تیسری چڑھائی شمال کی طرف قفقاز کے پہاڑوں کی جانب کی۔ یہاں تک کہ وہ دو پہاڑوں

Marfat.com

کے درمیان ایک درّے میں پہنچا۔ یہاں کے رہنے والوں نے وحشی اقوام کے حملوں اور غارتگری کو روکنے کی درخواست کی۔ اس پر کورش نے اس تنگ درّے میں ایک مضبوط دیوار تعمیر کر دی۔

اس درّے کو آج کل درّہ داریال کہتے ہیں۔ موجودہ نقشوں میں یہ "ولادی کیوکز" اور "تفلیس" کے درمیان دکھایا جاتا ہے۔ وہاں اب تک ایک آہنی دیوار موجود ہے۔ یہ وہی دیوار ہے جو کورش نے تعمیر کی تھی۔ قرآن نے ذوالقرنین کی دیوار کے جو اوصاف بتائے ہیں وہ پوری طرح اس دیوار پر منطبق ہوتے ہیں۔

تیسرے نظریے کی تقویت کے لیے ہم نے خلاصے کے طور پر یہ کچھ بیان کیا ہے[1]

یہ ٹھیک ہے کہ اس نظریے میں بھی ابہام کے ابھی بہت سے پہلو موجود ہیں لیکن عملاً ذوالقرنین کی تاریخ کے بارے میں ابھی تک جتنے نظریے پیش کیے گئے ہیں اسے ان میں سے بہترین کہا جاسکتا ہے۔

۳۔ دیوارِ ذوالقرنین کہاں ہے؟ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ اسے مشہور دیوارِ چین پر منطبق کریں کہ جو اس وقت موجود ہے اور کئی سو کلو میٹر لمبی ہے لیکن واضح ہے کہ دیوارِ چین لوہے اور تانبے سے نہیں بنی ہوئی اور نہ وہ کسی چھوٹے کوہستانی درّے میں ہے۔ وہ تو ایک عام مصالحے سے بنی ہوئی دیوار ہے۔ اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے کئی سو کلو میٹر لمبی ہے اور اب بھی موجود ہے۔

بعض کا اصرار ہے کہ یہ وہی دیوارِ مآرب ہے کہ جو یمن میں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دیوارِ مآرب ایک کوہستانی درّے میں بنائی گئی ہے لیکن وہ سیلاب کو روکنے کے لیے اور پانی ذخیرہ کرنے کے مقصد سے بنائی گئی ہے اور ویسے بھی وہ لوہے اور تانبے سے بنی ہوئی نہیں ہے۔

جبکہ علماء و محققین کی گواہی کے مطابق سرزمین قفقاز میں دریائے خزر اور دریائے سیاہ کے درمیان پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے کہ جو ایک دیوار کی طرح شمال اور جنوب کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے اس میں ایک ہی دیوار کی طرح کا درّہ موجود ہے جو مشہور درّہ داریال ہے۔ یہاں اب تک ایک قدیم تاریخی لوہے کی دیوار نظر آتی ہے۔ اسی بناء پر بہت سے لوگوں کا نظریہ ہے کہ دیوارِ ذوالقرنین یہی ہے۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ وہیں قریب ہی "سائرس" نامی ایک نہر موجود ہے اور "سائرس" کا معنی "کورش" ہی ہے (کیونکہ یونانی "کورش" کو "سائرس" کہتے تھے)۔

ارمنی کے قدیم آثار میں اس دیوار کو "بھاگ گورائی" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس لفظ کا معنی ہے "درہ کورش" یا "معبر کورش" (کورش کے عبور کرنے کی جگہ)۔ یہ سند نشاندہی کرتی ہے کہ اس دیوار کا بانی کورش ہی تھا[2]

۴۔ یاجوج ماجوج کون ہیں؟ قرآن مجید کی دو سورتوں میں یاجوج ماجوج کا ذکر آیا ہے ایک

---

[1] و [2] مزید وضاحت کے لیے کتاب "ذوالقرنین یا کورش کبیر" اور "فرہنگ قصص قرآن" کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

زیرِ بحث آیات میں اور دوسرا سورہ انبیاء کی آیت ۹۶ میں۔

آیاتِ قرآن واضح طور پر گواہی دیتی ہیں کہ یہ دو وحشی خونخوار قبیلوں کے نام تھے۔ وہ لوگ اپنے اردگرد رہنے والے پر بہت زیادتیاں اور ظلم کرتے تھے۔

تورات کی کتاب حزقیل فصل ۳۸ اور ۳۹ میں نیز کتاب "رؤیائے یوحنا" کی بیسویں فصل میں انہیں "گوگ" اور "ماگوگ" کہا گیا ہے کہ عربی میں جنہیں "یاجوج ماجوج" ہی کہا جائے گا۔

عظیم مفسر علامہ طباطبائی نے المیزان میں لکھا ہے کہ تورات کی ساری باتوں سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ماَجوج یا یاَجوج و ماَجوج ایک یا کئی ایک بڑے بڑے قبیلے تھے۔ یہ شمالی ایشیا کے دور دراز علاقے میں رہتے تھے۔ یہ جنگجو، غارت گر اور ڈاکو قسم کے لوگ تھے [1]

بعض کا نظریہ ہے کہ یہ عبرانی زبان کے الفاظ ہیں لیکن در اصل یونانی زبان سے عبرانی میں منتقل ہوئے ہیں۔ یونانی میں ان کا تلفظ "گاگ" اور "ماگاگ" تھا۔ دیگر یورپی زبانوں میں بھی یہ الفاظ اسی شکل میں منتقل ہوئے ہیں۔

تاریخ کے بہت سے دلائل کے مطابق زمین کے شمال مشرق مغولستان کے اطراف میں گزشتہ زمانوں میں انسانوں کا گویا جوش مارتا ہوا چشمہ تھا۔ یہاں کے لوگوں کی آبادی بڑی تیزی سے بڑھتی اور پھولتی تھی۔ آبادی زیادہ ہونے پر یہ لوگ مشرق کی سمت یا نیچے جنوب کی طرف چلے جاتے تھے اور سیلِ رواں کی طرح ان علاقوں میں پھیل جاتے تھے اور پھر تدریجاً وہاں سکونت اختیار کر لیتے تھے۔ تاریخ کے مطابق سیلاب کی مانند ان قوموں کے اٹھنے کے مختلف دَور گزرے ہیں۔ ان میں ایک حملہ ان وحشی قبائل نے چوتھی صدی عیسوی میں آتیلا کی کمان میں کیا۔ اس حملے میں روم کا شاہی تمدن خاک میں مل گیا۔

ایک اور دَور کہ جو ان کے حملوں کا تقریباً آخری دَور شمار ہوتا ہے، وہ بارہویں صدی ہجری میں چنگیز خاں کی سرپرستی میں ہوا۔ انہوں نے مسلمان اور عرب ممالک پر حملہ کیا۔ اس حملے میں بغداد سمیت بہت سے شہر تباہ و برباد ہو گئے۔

کورش کے زمانے میں بھی ان کی طرف سے ایک حملہ ہوا۔ یہ تقریباً پانچ سو سال قبل مسیح کی بات ہے لیکن اس زمانے میں ماد اور فارس کی متحدہ حکومت معرضِ وجود میں آچکی تھی لہٰذا حالات بدل گئے اور مغربی ایشیا ان قبائل کے حملوں سے آسودہ خاطر ہو گیا۔

لہٰذا یہ زیادہ صحیح لگتا ہے کہ یاجوج اور ماجوج انہی وحشی قبائل میں سے تھے۔ جب کورش ان علاقوں کی طرف گئے تو قفقاز کے لوگوں نے درخواست کی کہ انہیں ان قبائل کے حملوں سے بچایا جائے۔ لہٰذا اس نے وہ مشہور دیوار تعمیر کی ہے جسے "دیوارِ ذوالقرنین" کہتے ہیں [2]

---

[1] المیزان، ج ۱۳ ص ۴۱۱۔

[2] تفصیل کے لیے مذکورہ کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

(۹۹) وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ
فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ۙ
(۱۰۰) وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا ۙ
(۱۰۱) الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا
يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ۙ
(۱۰۲) اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ
اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ۝

ترجمہ

(۹۹) اس دن (کہ جب یہ دنیا ختم ہو جائے گی) ہم انہیں اس طرح سے چھوڑ دیں گے کہ وہ باہم موجزن ہوں گے۔ اس روز صور پھونکا جائے گا اور ہم انہیں نئی زندگی عطا کر کے سب کو جمع کریں گے۔

(۱۰۰) اس روز ہم جہنم کو کافروں کے سامنے پیش کریں گے۔

(۱۰۱) وہی کہ جن کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا، جو مجھے یاد نہیں کرتے تھے اور جو کچھ نہ سُن سکتے تھے۔

(۱۰۲) کیا کافروں کو یہ گمان ہے کہ وہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا سرپرست بنا سکتے ہیں اور ہم نے جہنم کو کافروں کی منزل قرار دے رکھا ہے۔

Marfat.com

تفسیر

بے ایمانوں کا ٹھکانا

گزشتہ آیات میں بتایا گیا تھا کہ یاجوج و ماجوج کو روکنے کے لیے ایک دیوار بنائی گئی تھی اور یہ دیوار قیامت کے موقع پر درہم برہم ہو جائے گی۔ اسی مناسبت سے زیر بحث آیات میں قیامت کے بارے میں گفتگو جاری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس روز کہ جب یہ دنیا ختم ہو جائے گی تو ہم انہیں چھوڑ دیں گے اور وہ باہم موجزن ہوں گے (و ترکنا بعضھم یومئذ یموج فی بعض)۔

"یموج" اس موقع پر لوگوں کی کثرت کی وجہ سے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ ہم عام طور پر کہتے ہیں کہ فلاں موقع پر لوگوں کا دریا موجزن تھا یا پھر یہ لفظ اضطراب اور لرزنے کی طرف اشارہ ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ اس دن لوگوں کے بدن پر کپکپی طاری ہو گی گویا اُن کے جسم پانی کی لہروں کی طرح لرز رہے ہوں گے۔

البتہ ان دونوں تفسیروں میں کوئی باہمی تضاد نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے اس تعبیر سے یہ دونوں پہلو مراد ہوں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اس دن صور پھونکا جائے گا۔ ہم انہیں نئی زندگی بخشیں گے اور ان سب کو جمع کریں گے (و نفخ فی الصور فجمعناھم جمعًا)۔

اس میں شک نہیں کہ تمام انسان اس میدان میں جمع ہوں گے اور کوئی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہوگا۔

"جمعناھم جمعًا" کی تعبیر بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

آیاتِ قرآن سے مجموعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کے اختتام اور دوسرے جہان کے آغاز میں دو بڑی عظیم تبدیلیاں عالم میں رونما ہوں گی۔

پہلی عظیم تبدیلی یہ ہو گی کہ تمام موجودات اور انسان فنا ہو جائیں گے۔ یہ ایک ضرب کا پروگرام ہے۔

دوسری عظیم تبدیلی معلوم نہیں کہ پہلے تحوّل و تغیر سے کتنی دیر بعد ہو گی۔ اور وہ ہے مُردوں کا قبروں سے اٹھنا۔ یہ بھی ایک ضرب کا پروگرام ہے۔

قرآن نے "نفخ فی الصور" کہہ کر ان پروگراموں کی طرف اشارہ کیا ہے —— انشاء اللہ ہم سورہ زمر کی آیت ۶۸ کے ذیل میں اس کی تفصیل بیان کریں گے۔

اس مقام پر ایک روایت ہے کہ جو اصبغ بن نباتہ نے حضرت علی علیہ السلام سے نقل کی ہے۔ امامؑ نے "ترکنا بعضھم یومئذ یموج فی بعض" کی تفسیر میں فرمایا:

Marfat.com

اس سے مراد قیامت ہے [1]

ہوسکتا ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ ہم نے جو کچھ کہا ہے یہ روایت اس کے منافی ہو کیونکہ ہم نے اسے فنا‌ء دنیا کا ایک مرحلہ قرار دیا ہے (جیسا کہ قبل اور بعد کی آیات کا ظاہری مفہوم نکلتا ہے) لیکن ایک نکتے کی طرف توجہ سے یہ اشکال ختم ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ بعض اوقات "یوم قیامت" وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ جس میں قیامت کے مقدمات بھی شامل ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ اس کے مقدمات میں فنا‌ء دنیا کے مرحلے بھی شامل ہیں۔

اس کے بعد کفار کے حالات کے بارے میں بات شروع ہوتی ہے۔ ان کی صفات جو ان کے انجام کی موجب ہیں، وہ بھی بیان کی گئی ہیں اور ان کے اعمال کا انجام بھی۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم اس روز جہنم ان کے سامنے پیش کر دیں گے (وعرضنا جهنم یومئذ للکافرین عرضا)۔

جہنم اپنے طرح طرح کے عذاب اور مختلف دردناک سزاؤں کے ساتھ ان کے سامنے پوری طرح آشکار ہوگی۔ اسے دیکھنا بھی ان کے لیے ایک دردناک اور جانکاہ عذاب ہے چہ جائیکہ گرفتار‌ِ عذاب جہنم ہونا۔

یہ کون سے کافروں کا ذکر ہے اور وہ اس انجام کو کیوں پہنچیں گے، اس سلسلے میں قرآن ان کا یوں تعارف کرواتا ہے: وہی کہ جن کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا اور جو حق کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ انہیں میری یاد آتی (الذین کانت اعینهم فی غطاءٍ عن ذکری)۔

وہی کہ جن کے کان تو تھے لیکن تاب‌ِ سماعت نہ تھی (وکانوا لا یستطیعون سمعًا)۔

دراصل وہ لوگ تلاش‌ِ حق اور ادراک‌ِ حقائق کا نہایت اہم وسیلہ کہ جو خوش بختی و بدبختی کا عامل ہے، بے کار کر چکے ہیں یعنی ان کی دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان بیکار ہو چکے ہیں۔ غلط افکار، تعصب، کینہ پروری اور بری صفات کی وجہ سے ان کی بصارت اور سماعت گویا بے کار ہو چکی ہے۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ آنکھ کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا لہٰذا انہیں میری یاد سجھائی نہیں دیتی تھی۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ چونکہ وہ غفلت کے پردے میں تھے اس لیے انہوں نے آثار‌ِ الٰہی نہیں دیکھے اس لیے حقیقت کو افسانہ سمجھ کر اللہ کو بھول چکے ہیں۔

جی ہاں! حق کا چہرہ آشکار ہے اور اس جہان کی ہر چیز انسان کے ساتھ بات کرتی ہے۔ صرف چشم‌ِ بینا اور گوش‌ِ شنوا کی ضرورت ہے۔

دوسرے لفظوں میں یاد‌ِ خدا کوئی ایسی چیز نہیں کہ جو آنکھ سے دیکھی جائے۔ جو کچھ دیکھا جاتا ہے وہ

---

[1] تفسیر المیزان، زیر بحث آیت کے ذیل میں، بحوالہ تفسیر عیاشی۔

Marfat.com

اس کے آثار ہیں اور یہی آثار اس کی یاد کا سبب ہیں ۔

اگلی آیت میں ان کے انحراف کی بنیادی وجہ بتائی گئی ہے ۔یہی وہ انحراف ہے جو دیگر انحرافات کا باعث ہے ۔ارشاد ہوتا ہے : کیا کافروں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ میری بجائے میرے بندوں کو اپنا ولی وسرپرست بنا سکتے ہیں (افحسب الذین کفروا ان یتخذوا عبادی من دونی اولیاء) ۔

یہ بندے کہ جنہیں معبود بنایا گیا ہے مثلاً حضرت عیسیٰؑ اور فرشتے ، ان کا مقام جس قدر بھی بلند ہو ، کیا ان کے پاس کوئی چیز خود اپنی طرف سے بھی ہے کہ وہ کسی کی خدا کی بجائے سرپرستی کر سکیں یا اس کے برعکس جو کچھ بھی ان کے پاس ہے وہ بھی خدا کی طرف سے ہے ۔یہاں تک کہ وہ خود بھی اس کی ہدایت کے محتاج ہیں ۔

یہ ایسی حقیقت ہے جو کافروں نے بھلا رکھی ہے اور شرک میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے : جہنم کو ہم نے کافروں کی منزل کے طور پر تیار کیا ہے اور اسی منزل پر ان کا استقبال ہوگا (انا اعتدنا جھنم للکافرین نزلاً) ۔

"نزل" (بروزن "رُسُل") منزل کے معنی میں بھی آیا ہے اور اس چیز کے لیے بھی جو مہمان کی پذیرائی کے لیے تیار کی جائے ۔بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پہلی چیز ہے کہ جو مہمان کو پیش کی جاتی ہے مثلاً شربت یا پھل وغیرہ کہ جو مہمان کو آنے سے پہلے پیش کرتے ہیں ۔

⁂ ⁂ ⁂

Marfat.com

(۱۰۳) قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝

(۱۰۴) اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ
اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝

(۱۰۵) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ
اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝

(۱۰۶) ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِىْ
وَرُسُلِىْ هُزُوًا ۝

(۱۰۷) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ
الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝

(۱۰۸) خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ۝

ترجمہ

(۱۰۳) کہہ دو : کیا ہم تمہیں خبر دیں کہ زیادہ خسارے میں کون لوگ ہیں ؟

(۱۰۴) وہ کہ جن کی ساری کوششیں دنیاوی زندگی میں بھٹک کے رہ گئی ہیں اور
اس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے کام انجام دے رہے ہیں۔

(۱۰۵) وہ ایسے لوگ ہیں کہ جنہوں نے آیاتِ ربانی اور اللہ کی ملاقات کا انکار
کیا ہے۔ اسی بنا پر ان کے سارے اعمال اکارت ہو گئے ہیں لہٰذا قیامت کے
دن ان کے لیے ہم میزانِ حساب قائم نہیں کریں گے۔

Marfat.com

(۱۰۶) ان کی سزا جہنم ہے کیونکہ انہوں نے کفر اختیار کیا اور یہ لوگ میری آیتوں اور میرے رسولوں کا مذاق اڑاتے تھے۔

(۱۰۷) رہے وہ لوگ کہ جو ایمان لائے اور نیک کام کیے تو باغاتِ فردوس ان کی منزل ہے۔

(۱۰۸) اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور کبھی یہاں سے کہیں اور جانے کی خواہش نہیں کریں گے۔

تفسیر

سب سے زیادہ خسارے میں کون لوگ ہیں؟

ان آیات میں اور ان کے بعد سورہ کے آخر تک بے ایمان لوگوں کی صفات بیان کی گئی ہیں ان آیات میں بلکہ اس پوری سورت میں مختلف جگہوں پر جو بحثیں آئی ہیں انہیں جمع کر دیا گیا ہے۔ خصوصاً اصحابِ کہف، موسیٰ و خضرؑ اور ذوالقرنین کی جدوجہد اور مخالفین کے مقابلے میں ان کے طرزِ عمل سے مربوط مباحث کا ان آیات میں ایک طرح سے نچوڑ آگیا ہے۔

سب سے پہلے تو ان لوگوں کا ذکر ہے کہ جو زیادہ خسارے میں ہیں اور انسانوں میں سب سے زیادہ بدبخت ہیں لیکن سننے والوں کے احساسِ جستجو کو تحریک دینے کے لیے اس اہم مسئلے پر گفتگو سوالیہ انداز میں کی گئی ہے۔ رسول اللہ کو حکم دیا گیا ہے کہ کہہ دو: کیا تمہیں ان لوگوں کے بارے میں خبر نہ دوں کہ جو لوگوں میں سب سے زیادہ خسارے میں ہیں (قل ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالاً)۔

فوراً ہی خود جواب دیا گیا ہے تاکہ سننے والا زیادہ دیر تک متحیر نہ رہے۔ زیادہ خسارے میں وہ لوگ ہیں جن کی ساری کوششیں حیاتِ دنیا میں بھٹک کے رہ گئی ہیں مگر پھر بھی ان کا خیال ہے کہ وہ اچھے کام انجام دے رہے ہیں (الذین ضل سعیھم فی الحیٰوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعًا)۔

یقیناً نقصان صرف یہ نہیں ہے کہ انسان مادی مفادات گنوا بیٹھے بلکہ حقیقی نقصان تو یہ ہے کہ انسان اصل سرمایہ ہی کھو دے — عقل و ہوش، خدا داد صلاحیتیں، عمر، جوانی اور صحت و سلامتی سے بڑھ کر کون سا سرمایہ ہو سکتا ہے۔ یہی چیزیں ہیں کہ جن کا ماحصل انسانی اعمال ہیں اور ہمارے عمل ہماری استعداد اور طاقت کی ایک مجسم شکل کے ہوتے ہیں۔

Marfat.com

جب یہ قوتیں اور صلاحیتیں بے ہودہ اعمال کی شکل اختیار کرلیں تو گویا یہ سب ضائع ہوگئیں اور راہ گم کردہ ہوگئیں۔ یہ بالکل ایسے ہے کہ انسان بہت زیادہ دولت لے کر بازار کو نکلے لیکن اسے راستے میں گنوا دے اور خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ البتہ جب انسان سمجھ جائے کہ میں اپنا سرمایہ گنوا بیٹھا ہوں تو یہ نقصان زیادہ خطرناک نہیں کیونکہ یہ نقصان اس کے لیے آئندہ سبق بن جائے گا۔ یہ درس بعض اوقات اس کھو جانے والے سرمائے کے برابر ہوتا ہے اور کبھی اس سے بھی زیادہ قیمتی۔ ایسا کہ گویا اس نے کچھ نہیں گنوایا۔

لیکن حقیقی اور کئی گنا نقصان اس صورت میں ہے کہ انسان اپنا مادی اور روحانی سرمایہ کسی غلط اور کج راستے پر گنوا دے اور خیال کرے کہ اس نے اچھا کام کیا ہے، وہ اپنے کاموں سے کوئی نتیجہ حاصل کرے، نہ اس نقصان سے کوئی سبق اور نہ ایسے کاموں کے تکرار سے بچے۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ یہاں "اخسرین اعمالاً" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں حالانکہ "اخسرین عملاً" ہونا چاہیے تھا (کیونکہ تمیز عام طور پر مفرد ہوتی ہے)۔

ہوسکتا ہے یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ وہ ایک ہی بازارِ عمل میں نقصان کا شکار ہوئے بلکہ ان کا جہل مرکب زندگی کے تمام پہلوؤں اور تمام اعمال میں نقصان کا سبب بنا ہے۔

دوسرے لفظوں میں انسان کسی ایک تجارت میں نقصان کر بیٹھتا ہے اور دوسرے کاروبار میں فائدہ حاصل کرلیتا ہے۔ سال کے آخر میں حساب کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا لیکن بدبختی یہ ہے کہ انسان جہاں بھی سرمایہ کاری کرتا ہے تمام شعبوں میں نقصان اٹھاتا ہے۔

ضمناً "ضل" ــ یعنی گم کر بیٹھنا اور بھٹک جانا کی تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کے اعمال بالکل ختم اور نابود نہیں ہوجاتے۔ جیسے مادہ اور توانائی ہمیشہ شکل بدلتے رہتے ہیں ختم نہیں ہوتے لیکن کبھی گم ہوجاتے ہیں۔ ان اعمال کے آثار چونکہ دکھائی نہیں دیتے اور ان سے کسی قسم کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا تو یہ گویا گمشدہ سرمایہ ہیں جو ہماری دسترس میں نہیں ہے اور نہ ہمارے کسی کام کا ہے۔

اس سلسلے میں کہ انسان کی نفسیاتی طور پر یہ کیفیت کیوں ہوتی ہے ہم "چند اہم نکات" کے ذیل میں بات کریں گے۔

اگلی آیات میں اس نقصان اٹھانے والے گروہ کی صفات اور عقائد و نظریات بیان کیے گئے ہیں اور چند ایسی صفات بیان کی گئی ہیں جو تمام بدبختیوں کی جڑ ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی آیات کو للکارتے ہیں (اولئٹ الذین کفروا بأیات ربھم)۔

وہ ان آیات سے کفر کرتے ہیں کہ جو آنکھ کو بصارت اور کان کو شنوائی عطا کرتی ہیں، وہ آیات کہ جو غرور کے پردوں کو چاک کرکے حقیقت کا چہرہ انسان کے سامنے نمایاں کر دیتی ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ آیات جو نور اور روشنی ہیں اور جو انسان کو اوہام کے ظلمات سے باہر نکال دیتی ہیں اور سرزمین حقائق کی طرف ہدایت کرتی ہیں آیاتِ الٰہی سے کفر اختیار کرنے اور خدا کو فراموش کرنے کے بعد وہ لقائے الٰہی کے بھی منکر ہوگئے

Marfat.com

ہیں (ولقائہ)۔

جی ہاں! جب تک معاد پر ایمان مبدا پر ایمان کے ساتھ نہ ہو اور انسان یہ احساس نہ کرے کہ کوئی طاقت اس کے اعمال کی نگران ہے اور سب اس کی عظیم، دقیق اور سخت عدالت میں پیش ہوں گے، وہ اپنے اعمال کی صحیح جانچ پرکھ نہیں کرے گا اور اس کی اصلاح نہیں ہو سکے گی۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: مبدا و معاد سے اسی انکار اور کفر کی وجہ سے ان کے اعمال اکارت ہو گئے ہیں (فحبطت اعمالھم)۔ جیسے ایک تیز رفتار آندھی تھوڑی سی خاکستر کو نابود کر دیتی ہے۔

اور چونکہ ان کا کوئی ایسا عمل نہیں کہ جو ناپ تول کے لائق ہو یا جس کی کوئی اہمیت ہو لہٰذا ان کیلئے روزِ قیامت کوئی میزان قائم نہیں کی جائے گی (فلا نقیم لھم یوم القیامۃ وزنًا)۔

کیونکہ وزن اور ناپ تول تو وہاں ہوتا ہے جہاں بساط میں کچھ ہو۔ جن کی بساط میں کچھ بھی نہیں ان کیلئے میزان اور ناپ تول کی کیا ضرورت ہے۔

اس کے بعد ان کے انحراف، بدبختی اور نقصان کا تیسرا عامل بیان کیا گیا ہے نیز ان کا کیفرِ کردار بھی بتایا گیا ہے: ارشاد ہوتا ہے: ان کی سزا جہنم ہے، اس لیے کہ وہ کافر ہو گئے ہیں اور میری آیتوں اور میرے رسولوں کا مذاق اڑاتے ہیں (ذٰلک جزاؤھم جھنم بما کفروا واتخذوا اٰیاتی ورسلی ھزوًا) [۱]

اس طرح انہوں نے نہ صرف عقائد کے تین بنیادی اصولوں، توحید، نبوت اور قیامت سے کفر اختیار کیا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ان کا مذاق اڑایا ہے۔

ان آیات سے کفار اور ان لوگوں کا کردار و انجام واضح ہو گیا کہ جو زیادہ خسارے میں ہیں۔ اب مومنین اور ان کے انجام کی باری ہے تاکہ دونوں کا موازنہ ہو جائے اور اس طرح صورتِ حال بالکل واضح ہو جائے۔ قرآن کہتا ہے: وہ لوگ کہ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے باغاتِ فردوس ان کی منزل ہے (ان الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات کانت لھم جنّات الفردوس نزلًا)۔

---

[۱] "ذٰلک جزاء ھم جھنم" کی ترکیب اور جمع بندی کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے بعض "ذٰلک" کو مبتدا اور "جزاؤھم" کو خبر اور "جھنم" کو "ذٰلک" کا بدل سمجھتے ہیں۔

جبکہ بعض دوسرے علماء مبتدا کو محذوف اور "ذٰلک" کو اس کی خبر جانتے ہیں اور "جزاؤھم جھنم" کو بھی وہ دوسرا مبتدا، خبر سمجھتے ہیں۔ ان کے لحاظ سے تقدیر یوں ہوگا۔

الامر ذٰلک جزاؤھم جھنم

معاملہ کچھ یوں ہے کہ ان کی جزا جہنم ہے۔

لیکن واضح ہے کہ پہلا بیان زیادہ مناسب ہے۔

Marfat.com

جیسا کہ بعض بزرگ مفسرین نے کہا ہے " فردوس" ایک ایسا باغ ہے جس میں تمام ضروری نعمتیں جمع ہیں اور اس طرح سے " فردوس "جنت کے بہترین باغوں میں سے ہے ،اور کسی نعمت کا کمال تبھی ہوگا جب اسے زوال نہ ہو لہٰذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے : وہ ان باغات بہشت میں سدا رہیں گے (خالدین فیھا) ۔

انسان کی طبیعت اگرچہ جدت پسند اور وہ ہمیشہ تنوع ،تغیر اور تبدل چاہتا ہے لیکن فردوس کے باسی کبھی بھی نقل مکانی اور تبدیلی کی خواہش نہیں کریں گے ۔(لا یبغون عنھا حولاً) ۔

اس بنا پر کہ وہ جو کچھ چاہیں گے وہاں موجود ہے یہاں تک کہ تنوع اور تکامل بھی ۔جیسا کہ "چند اہم نکات" کے ذیل میں ہم وضاحت کریں گے ۔

چند اہم نکات

۱۔ "اخسرین اعمالا" کون لوگ ہیں؟ ہم نے اپنی اور دوسروں کی زندگی میں بہت دیکھا ہے کہ کبھی انسان غلط کام انجام دیتا ہے جبکہ وہ سمجھتا رہتا ہے کہ اس نے اچھا اور اہم کام انجام دیا ہے۔ ایسا جہل مرکب لحظہ بھر کے لیے بھی ہوسکتا ہے ،سال بھر کے لیے بھی اور عمر بھر کے لیے بھی اور واقعاً اس سے بڑی بدبختی کا تصور بھی نہیں ہوسکتا ۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ نقصان میں ہیں تو اس کی وجہ واضح ہے ۔جو لوگ گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن یہ جانتے ہیں کہ ہم غلط کام کر رہے ہیں اکثر وہ اپنے غلط کام کی ایک حد مقرر کرلیتے ہیں اور بسا یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ حق کی طرف پلٹ آتے ہیں اور اس کی تلافی کے لیے توبہ کرتے ہیں اور نیک اعمال انجام دیتے ہیں ۔

لیکن وہ گنہ گار کہ جو اپنے گناہ کو عبادت اور بُرے اعمال کو صالحات اور کجی کو درستی خیال کرتے ہیں وہ نہ صرف تلافی کے لیے کوشش نہیں کرتے بلکہ شدت کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھنے کی سعی کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنا تمام تر سرمایۂ وجود اس راستے پر صرف کرنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ قرآن نے ان لوگوں کے بارے میں کیا عمدہ الفاظ کہے ہیں :

اخسرین اعمالاً

جو اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ خسارے میں ہیں ۔

اسلامی روایات میں "اخسرین اعمالاً" کی مختلف تفسیریں آئی ہیں ان میں سے ہر ایک اس وسیع مفہوم کے کسی واضح مصداق کی طرف اشارہ ہے اور یہ تفسیریں اس کے وسیع مفہوم کو محدود نہیں کر دیتیں۔

اصبغ بن نباتہ نے ایک حدیث امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے روایت کی ہے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا گیا تو امامؑ نے فرمایا :

Marfat.com

اس سے مراد یہودی اور عیسائی ہیں۔ پہلے یہ لوگ حق پر تھے بعد میں انہوں نے اپنے دین میں بدعتیں ایجاد کرلیں۔ یہ بدعتیں انہیں انحرافی راستے کی طرف لے جاتی ہیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نیک کام انجام دے رہے ہیں[1]

ایک اور حدیث امام امیرالمؤمنینؑ ہی سے منقول ہے کہ مذکورہ بالا گفتگو کے بعد فرمایا:

خوارج نہروان بھی ان سے کوئی زیادہ دور نہیں ہیں[2]

ایک اور حدیث میں خاص طور پر رہبانوں (تارک الدنیا مردوں اور عورتوں) اور مسلمانوں میں سے بدعتی گروہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے[3]

بعض روایات میں بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں سے مراد امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے منکر ہیں[4]

راہب ایک عمر گرجے میں طرح طرح کی محرومیوں کے ساتھ گزار دیتے ہیں، شادی نہیں کرتے، اچھا لباس اور اچھی غذا ترک کر دیتے ہیں، گرجے میں بیٹھے رہنے کو ہر کام پر ترجیح دیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان کی یہ محرومیاں قرب خدا کا باعث ہیں — کیا یہ لوگ "اخسرین اعمالاً" کا مصداق نہیں ہیں۔ کیا ممکن ہے کہ کوئی الٰہی دین عقل و فطرت کے قانون کے برخلاف انسان کو معاشرتی زندگی سے نکال کر گوشہ نشینی کی دعوت دے اور اس کام کو قربِ الٰہی کا سرچشمہ قرار دے۔

اسی طرح وہ لوگ کہ جنہوں نے اللہ کے دین میں کسی بدعت کی بنیاد رکھی ہے۔ توحید کی جگہ تثلیث کے عقیدے کو دے دی ہے اور اللہ کے بندے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا قرار دے دیا ہے اور اللہ کے پاک دین میں اسی طرح کی اور بدعتیں داخل کر دیں، اس گمان سے کہ وہ ایک خدمت انجام دے رہے ہیں۔ کیا ایسے لوگ دنیا کے سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے نہیں ہیں۔

نہروان کے تہی مغز اور عقل دشمن جو سب سے بڑے گناہ (مثلاً حضرت علیؑ اور مسلمانوں کے نیک افراد کو شہید کرنے کو) موجبِ تقربِ خدا سمجھتے تھے، یہاں تک کہ جنت کو صرف اپنے لیے مختص سمجھتے تھے، کیا یہ سب سے زیادہ خسارے والے لوگ نہیں ہیں۔

خلاصہ یہ کہ آیت ایسا وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ بہت سی گزشتہ، موجودہ اور آئندہ اقوام اس میں شامل ہیں۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس خطرناک حالت کا سرچشمہ کیا ہے؟

---

[1] تا [3] تفسیر نورالثقلین، ج ۳ صـ ۳۱۲۔

[4] تفسیر نورالثقلین، ج ۳، صـ ۳۱۱۔

Marfat.com

یقیناً ان غلط خیالات کے اہم ترین عوامل میں شدید تعصب، غرور، ہٹ دھرمی، خود پرستی اور حب ذات شامل ہے۔

کبھی دوسروں کی چاپلوسی، گوشہ نشینی اور اکیلے ہی خود سے فیصلہ کرنا بھی اس منزلت کے پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے۔ اس حالت میں انسان کو اپنے تمام انحرافی اور بُرے اعمال و افکار اچھے لگتے ہیں اور وہ ان پر احساس ندامت کی بجائے احساس تفخر کرنے لگتا ہے جیسا کہ ایک اور جگہ قرآن فرماتا ہے:

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا

کیا وہ شخص کہ جسے اپنے بُرے عمل بھلے لگتے ہیں اور وہ انہیں اچھا سمجھتا ہے (فاطر۔ ۸)۔

قرآن حکیم کی بعض دیگر آیتوں میں ان برائیوں کی تزئین کا عامل شیطان کو قرار دیا گیا ہے اور مسلّم ہے کہ انسانی وجود میں شیطان کا ظہور بُرے اخلاق اور غلط عادات ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَ اِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ

وہ وقت یاد کرو جب شیطان نے مشرکین کے اعمال کو ان کی نظر میں زینت دی اور (جنگ بدر کے) میدان میں ان سے کہا کہ کوئی شخص تم پر فتح حاصل نہیں کرسکتا اور میں خود اس میدان میں تمہارے ساتھ شریک ہوں۔ (انفال - ۴۸)

قرآن مجید فرعون کے مشہور برج کا واقعہ بیان کرکے کہتا ہے:

وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ

اس طرح فرعون کو اس کا بُرا عمل اچھا لگا (کہ وہ ایسے احمقانہ اور مضحکہ خیز کاموں کے ذریعے اللہ کا مقابلہ کرتا اور گمان کرتا کہ وہ کوئی اہم کام انجام دے رہا ہے)۔ (مومن - ۳۷)

۲۔ لقاء اللہ کیا ہے؟ بعض عالم نما بیہودہ افراد نے اس قسم کی آیات سے یہ مطلب نکالا ہے کہ اللہ کو دوسرے جہان میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان لوگوں نے یہاں لقائے الٰہی سے حسّی ملاقات مراد لی ہے۔ لیکن واضح ہے کہ حسّی ملاقات کے لیے جسم ضروری ہے اور جسم کے لیے محدود ہونا، محتاج ہونا اور فنا پذیر ہونا ضروری ہے اور ہر عقلمند جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان صفات کا حامل نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا اس میں شک نہیں کہ قرآن حکیم میں جہاں جہاں "ملاقات" اور "رؤیت" کی نسبت اللہ کی طرف دی گئی ہے وہاں ملاقات حسّی مراد نہیں ہے بلکہ شہود باطنی مراد ہے یعنی قیامت میں انسان آثار خداوندی کو ہر زمانے سے زیادہ بہتر طور پر دیکھ سکے گا، اسے دل کی آنکھ سے دیکھ سکے گا اور وہاں اللہ پر اس کا ایمان شہودی ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ آیات قرآن کے مطابق ہٹ دھرم ترین منکرین خدا قیامت میں اعتراف کریں گے

Marfat.com

کیونکہ انہیں انکار کی کوئی راہ سجھائی نہ دے گی۔[1]

بعض مفسرین نے اس تعبیر کا یہ مفہوم سمجھا ہے کہ وہاں انسان نعمتیں اور جزا و ثواب دیکھے گا اور اسی طرح اللہ کے عذاب و سزا کا مشاہدہ کرے گا۔ انہوں نے درحقیقت نعمت و ثواب وجزا کو مقدر سمجھا ہے یہ دو تفاسیر اگرچہ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں تاہم پہلی زیادہ واضح معلوم ہوتی ہے۔

۲۔ اعمال کا وزن: اس امر کی ضرورت نہیں کہ اعمال کے وزن کے مسئلے کی قیامت میں تجسم اعمال کے حوالے سے تفسیر کی جائے اور یہ کہیں کہ قیامت میں انسانی اعمال وزن والے جسم کی صورت اختیار کرلیں گے کیونکہ "وزن کرنا" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے اور اس میں ہر قسم کا اندازہ لگانا اور وزن کرنا شامل ہے مثلاً جن افراد کی کوئی حیثیت نہ ہو انہیں بے وزن یا ہلکے لوگ کہتے ہیں حالانکہ مراد ان کی حیثیت کی نفی ہے نہ کہ ان کے وزن کی۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ زیر بحث آیات میں "اخسرین اعمالاً" کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

روزِ قیامت ان کے لیے میزان و ترازو قائم نہیں کیا جائے گا۔

جبکہ ایسی آیات بھی ہیں جو کہتی ہیں:

وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ ِۣ الْحَقُّ

اس روز وزن حق ہے۔ (اعراف - ۸)

کیا یہ آیات ایک دوسرے کے منافی ہیں؟ یقیناً نہیں۔ کیونکہ وزن تو ان کے اعمال کا ہوگا جنہوں نے ایسے اعمال کیے ہیں جو وزن کرنے کے قابل ہیں لیکن وہ شخص کہ جس کا سارا وجود اور جس کے افکار و اعمال ایک مکھی کے پَر کے برابر بھی وزن نہیں رکھتے۔ اس کے لیے وزن کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

اسی لیے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک مشہور روایت ہے:

انه لیاتی الرجل العظیم السمین یوم القیامة لا یزن جناح بعوضة

روزِ قیامت کچھ موٹے تازے افراد لائے جائیں گے جن کا وزن عدالت میں مچھر کے پَر کے برابر بھی نہیں ہوگا۔[2]

کیونکہ اس جہان میں ان کی شخصیت، اعمال اور افکار سب کھوکھلے ہوں گے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہاں مختلف قسم کے لوگ ہوں گے:

(ا) وہ افراد کہ جن کی نیکیاں اتنی وزنی ہوں گی کہ ان کے وزن اور حساب کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ

---

[1] سورہ مومنون کی آیت ۱۰۶ کی طرف رجوع کریں۔

[2] تفسیر مجمع البیان، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

لوگ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔

(ii) وہ افراد کہ جن کے اعمال بالکل حبط اور باطل ہو جائیں گے یا پھر جن کے لیے کوئی نیکی ہوگی ہی نہیں کہ جس کے لیے میزان کی ضرورت پڑے۔ یہ لوگ بھی بغیر حساب کے جہنم میں داخل ہو جائیں گے۔

(iii) تیسرا گروہ ان افراد کا ہوگا جن کی کچھ نیکیاں ہوں گی اور کچھ بدیاں۔ میزان اور ترازو کی ضرورت ان کے لیے ہوگی اور شاید بیشتر لوگ اسی تیسری قسم میں شامل ہوں گے۔

۴۔ "لا یبغون عنها حولا" کی تفسیر: "حِوَل" (بروزن "مِلَل") مصدری معنی رکھتا ہے اس کا معنی ہے "تحول" اور نقل مکانی۔ جیسا کہ ہم نے آیات کی تفسیر میں کہا ہے کہ "فردوس" جنت کا ایسا باغ ہے جس میں سب نعمات الٰہی موجود ہیں اسی بنا پر فردوس اس جہان کی بہترین جگہ ہوگی۔ لہٰذا اس کے ساکنین وہاں سے نقل مکانی کی ہرگز تمنا نہ کریں گے۔

ہو سکتا ہے سوال کیا جائے کہ پھر تو وہاں کی زندگی یکسانیت اور جمود کا شکار ہوگی اور یہ خود ایک بہت بڑا عیب ہے۔

ہم جواب میں کہیں گے کہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ تحول و تکامل کا عمل اسی مقام دائمی پر جاری رہے۔ یعنی تکامل و ارتقار کے اسباب وہاں موجود ہوں گے اور انسان نے اس جہان میں جو اعمال انجام دیئے ہیں اور اللہ نے اسے جو اس جہان میں نعمتیں عطا کی ہیں سب ہمیشہ تکامل پذیر رہیں گی۔

متعلقہ آیات کے ذیل میں انشاء اللہ تکامل انسان کے بارے میں ہم تفصیل سے بحث کریں گے نیز بہشت میں تکامل کا یہ عمل جاری رہنے سے متعلق گفتگو کریں گے۔

۵۔ فردوس کن کا مقام ہے؟ جیسا کہ کہا گیا ہے فردوس[1] جنت میں بہترین اور افضل ترین مقام ہے۔ زیر بحث آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ فردوس با ایمان اور اعمال صالح انجام دینے والے لوگوں کا ٹھکانا ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ کیا جنت کے دوسرے علاقوں میں رہنے والا کوئی نہیں ہوگا کیونکہ غیر مومن تو جنت میں جا ہی نہیں سکتا۔

اس سوال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ زیر نظر آیات ہر اس شخص کی طرف اشارہ نہیں کر رہیں کہ جو با ایمان ہے اور نیک کام کرتا ہے بلکہ ایمان اور عمل صالح کے لحاظ سے جو افراد بلند درجے پر فائز ہوں گے وہی فردوس میں داخل ہو سکیں گے۔ ظاہر آیت اگرچہ مطلق ہے لیکن فردوس کے مفہوم کی طرف توجہ کی جائے تو آیت کا مفہوم مقید و محدود ہو جاتا ہے۔

---

[1] بعض کہتے ہیں کہ اصل میں یہ لفظ رومی زبان سے لیا گیا ہے اور بعض سمجھے ہیں کہ یہ حبشہ کی زبان سے عربی میں منتقل ہوا ہے (تفسیر فخر رازی اور تفسیر مجمع البیان)۔

Marfat.com

اسی لیے سورۂ مومنین میں جہاں فردوس کے وارثوں کی صفات بیان کی گئی ہیں وہاں مومنین کی نہایت اعلیٰ صفات کا ذکر ہے اور یہ صفات سب میں نہیں ہوتیں۔ یہ امر خود اس بات کے لیے قرینہ ہے کہ فردوس میں رہنے والے افراد ایمان اور عمل صالح کے علاوہ ممتاز صفات کے حامل ہوں گے۔

اسی بنا پر ایک حدیث کہ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہم پہلے نقل کر چکے ہیں، اُس میں ہم نے پڑھا ہے کہ آپؐ فرماتے ہیں:

جب اللہ سے جنت کا تقاضا کرو تو خصوصیت سے فردوس کا تقاضا کرو کہ جو جنت کی جامع ترین اور اکمل ترین منزلوں میں سے ہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ باایمان افراد کی ہمت ہر چیز کے بارے میں اور ہر حالت میں عالی ہونا چاہیئے یہاں تک کہ بہشت کی تمنا میں بھی نچلے مراحل پر قناعت نہیں کرنا چاہیئے اگرچہ نچلے مرحلے بھی نعمات الٰہی سے معمور ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے اس قسم کا تقاضا کرتا ہے تو ضروری ہے کہ اپنے آپ کو ایسے مقام تک پہنچانے کے لیے تیار بھی کرے، بہترین انسانی صفات اپنائے اور صالح ترین اعمال سرانجام دے۔

لہٰذا جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کرے ہمیں جنت میں ٹھکانا مل جائے چاہے نچلے درجے میں ہی ہو، وہ سچے مومنین کی اعلیٰ ہمت سے پوری طرح بہرہ ور نہیں ہیں۔

Marfat.com

(۱۰۹) قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ
اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ○
(۱۱۰) قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ
وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا
وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ○ ع

ترجمہ

(۱۰۹) کہہ دو: سمندر میرے پروردگار کے کلمات (لکھنے کے لیے) سیاہی بن جائیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے میرے پروردگار کے کلمات ختم نہیں ہوں گے اگرچہ ایسے ہی (سمندر) ان کے ساتھ اور بڑھا دیئے جائیں۔

(۱۱۰) کہہ دو: مَیں تو تم جیسا بشر ہوں (البتہ میری خصوصیت یہ ہے کہ) مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ پس جو شخص اپنے ربّ سے ملاقات کی امید رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ عملِ صالح انجام دے اور کسی کو اپنے رب کی عبادت میں شریک نہ کرے۔

شانِ نزول

اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں ابن عباس سے منقول ہے:

یہودیوں نے جب پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ آیت سُنی:

ما اوتیتم من العلم الا قلیلا

تمہیں تو تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔

Marfat.com

تو انہوں نے کہا یہ بات کیونکر صحیح ہو سکتی ہے جبکہ ہمیں تورات دی گئی ہے اور جسے تورات دی گئی ہے اس کے پاس خیر کثیر ہے اس وقت یہ (مندرجہ بالا پہلی) آیت نازل ہوئی (اور بتایا کہ ہمارے پاس جو علم ہے وہ اللہ کے لامتناہی علم کے مقابلے میں ناچیز ہے)۔

بعض کہتے ہیں کہ یہودیوں نے پیغمبر اسلامؐ سے کہا:

خدا نے تجھے حکمت دی ہے۔ ومن یؤت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا (اور جسے حکمت دی گئی ہے اُسے تو خیر کثیر مل گیا) لیکن جب ہم تجھ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں تو تُو مبہم سا جواب دیتا ہے۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی (اور اس نے نشاندہی کی ہے کہ انسان کے پاس جتنا بھی علم ہو اللہ کے ناپیدا کنار علم کے مقابلے میں ناچیز ہے)۔[1]

تفسیر

جو لقائے الٰہی کی امید رکھتے ہیں

یہ آیات مستقل اور جاری بحث کا حصہ ہیں اور ان کا تعلق اس سورت کے تمام مباحث سے ہے۔ کیونکہ اس سورہ میں مذکورہ تینوں اہم واقعات نئے اور عجیب وغریب مطالب سے پردہ ہٹاتے ہیں۔ گویا قرآن ان آیات میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ خدا کے علم کے مقابلے میں اصحاب کہف، موسٰی وخضر اور ذوالقرنین کے واقعات سے آگاہی کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ تمام کائنات اور عالم ہستی کا ماضی، حال اور مستقبل اس کے علم کا حصّہ ہیں۔

بہرحال قرآن زیر بحث پہلی آیت میں رسول اکرمؐ سے کہتا ہے: کہہ دو: اگر سمندر میرے رب کے کلمات لکھنے کے لیے سیاہی بن جائیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے میرے رب کے کلمات ختم نہیں ہوں گے اگرچہ ہم ان جیسے سمندروں کا اضافہ بھی کر دیں (قل لو کان البحر مدادا لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مددا)۔

"مداد" سیاہی کے معنی میں ہے یا پھر اس کا معنی ہے وہ رنگین مادہ جس کے ساتھ لکھا جائے۔ دراصل یہ لفظ "مد" بمعنی "کشش" سے لیا گیا ہے کیونکہ اس کی کشش سے خطوط آشکار اور واضح ہوتے ہیں۔[2]

---

[1] تفسیر قرطبی ج ۶ ص ۴۱۰۲ اور ص ۴۱۰۱، زیر بحث آیت کے ذیل میں اور تفسیر صافی سورہ بنی اسرائیل آیہ ۸۵ کے ذیل میں۔

[2] فخرالدین رازی نے "مداد" کے مفہوم کے بارے میں ایک اور معنی بھی نقل کیا ہے اور وہ ہے "ایسا تیل جو چراغ میں ڈالتے ہیں اور جو روشنی کا سبب بنتا ہے" غور سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں معانی کی بنیاد ایک ہی ہے۔

Marfat.com

"کلمات" (کلمہ کی جمع) ان الفاظ کے معنی میں ہے کہ جن کے ذریعے بات کی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ وہ لفظ ہے جو معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اس جہان کی ہر چیز کیونکہ پروردگار کے علم و قدرت پر دلالت کرتی ہے لہٰذا بعض اوقات ہر موجود پر "کلمۃ اللہ" کا اطلاق ہوتا ہے۔ زیادہ تر یہ تعبیر اہم اور باعظمت موجودات کے لیے استعمال ہوئی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن حکیم کہتا ہے:

اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْیَمَ

عیسیٰ اللہ کا کلمہ تھا کہ جو مریم کی طرف القا کیا گیا۔ (نساء - ۱۷۱)

زیر بحث آیت میں بھی "کلمہ" اسی معنی میں ہے یعنی جہانِ ہستی کے موجودات کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں سے ہر ایک پروردگار کی گوناگوں صفات کی حکایت کرتا ہے۔

دراصل اس آیت میں قرآن اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ یہ گمان نہ کرو کہ عالمِ ہستی یہی کچھ ہے جو تم دیکھ رہے ہو یا جانتے ہو یا محسوس کرتے ہو بلکہ یہ کائنات اس قدر وسیع و عظیم ہے کہ اگر تمام سمندر سیاہی بن جائیں اور اس سے ان موجودات کے نام، صفات اور خصوصیات لکھیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے لیکن جہانِ ہستی کے موجودات کا احصاء و شمار نہیں ہو پائے گا۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ "البحر" یہاں جنس کا مفہوم رکھتا ہے۔ اسی طرح "ولو جئنا بمثلہ مددا" میں لفظ "مثل" بھی جنس کا معنی دیتا ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر سمندروں کی مثل و مانند کا اضافہ بھی کر دیا جائے تو بھی کلماتِ الٰہی ختم نہیں ہوں گے۔ اسی بنا پر زیرِ بحث آیت سورہ لقمان کی اس سے ملتی جلتی آیت سے کوئی تضاد نہیں رکھتی۔ سورہ لقمان کی وہ آیت یہ ہے:

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ

روئے زمین کے سب درخت قلمیں بن جائیں اور سمندر اور ان کے علاوہ سات سمندر اور سیاہی بن جائیں (تاکہ کلماتِ الٰہی کو لکھ سکیں) تو اس کے کلمات ہرگز ختم نہیں ہوں گے (لقمان - ۲۷)۔

یعنی یہ قلمیں گھس جائیں گی اور ان سیاہیوں کا آخری قطرہ تک ختم ہو جائے گا لیکن جہانِ ہستی کے اسرار و حقائق ابھی باقی ہوں گے۔

ایک اہم بات کہ جس کی طرف اس مقام پر توجہ ضروری ہے یہ ہے کہ زیرِ بحث آیت ماضی و حال اور مستقبل کے لحاظ سے جہانِ ہستی کی وسعت کی غماز ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے لامحدود علم کی بھی ترجمان ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ تمام چیزیں جو عالمِ ہستی کی وسعت میں تھیں، یا اس وقت

Marfat.com

ہیں، اللہ تعالیٰ ان کا علمی احاطہ رکھتا ہے بلکہ اس کا علم چونکہ حضوری علم ہے اس لیے ان موجودات سے جدا نہیں ہو سکتا (غور کیجئے گا)۔

دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ اگر زمین کے تمام سمندر سیاہی بن جائیں اور تمام درخت قلمیں بن جائیں تو ہرگز اس پر قادر نہیں کہ جو کچھ اللہ کے علم میں ہے اسے رقم کر سکیں۔

لامتناہی کی تصویر کشی

اس مقام پر قرآن مجید نے لامتناہی تعداد کا تصور، اللہ کے علم بے پایاں کا مفہوم اور جہانِ ہستی کی وسعت کو ہمارے افکار و اذہان سے قریب کرنے کے لیے بہت ہی فصیح و بلیغ انداز اختیار کیا ہے اور زندہ و جاندار اعداد سے استفادہ کیا ہے۔

لیکن کیا اعداد بھی زندہ اور مُردہ ہوتے ہیں؟

جی ہاں! وہ اعداد جو ریاضیات میں استعمال ہوتے ہیں۔صحیح اعداد کی دائیں طرف بہت سارے صفر لگا کر جو اعداد بنتے ہیں درحقیقت مردہ اعداد ہیں۔ وہ ہرگز کسی چیز کی عظمت مجسم نہیں کرتے۔

جن لوگوں کا ریاضیات سے تعلق ہے وہ جانتے ہیں اگر ایک کے دائیں طرف ایک کلومیٹر تک صفر لگا دیئے جائیں تو یہ بہت بڑا اور پریشان کن عدد بن جائے گا اور واقعاً اس کی بڑائی کا تصور مشکل ہے لیکن کن اشخاص کے لیے؟ — ریاضی دانوں کے لیے — جبکہ عام لوگوں کے لیے اس سے کوئی عظمت مجسم نہیں ہوتی۔

زندہ عدد وہ ہے جو جہاں تک خود آگے بڑھے ہماری فکر کو بھی اپنے ساتھ لے جائے اور جس طرح کی حقیقت ہے اسے اسی طرح نظروں کے سامنے مجسم کر دے۔ ایسا عدد زندہ ہے جو روح رکھتا ہو، عظمت رکھتا ہو اور زبان رکھتا ہو۔

قرآن یہ نہیں کہتا کہ عالم ہستی کی وسعت میں خدا کی مخلوقات اس عدد سے بھی زیادہ ہیں کہ جس کی دائیں طرف ایک سو کلومیٹر تک صفر لکھے ہوں بلکہ قرآن کہتا ہے کہ اگر روئے زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور تمام سمندر سیاہی بن جائیں تو قلمیں ختم ہو جائیں گی اور سیاہی تمام ہو جائے گی لیکن عالم ہستی کے حقائق و اسرار، موجوداتِ عالم اور معلوماتِ الٰہی ختم نہیں ہوں گی۔

خوب غور کیجئے — ایک قلم لکھنے کی کس قدر طاقت رکھتا ہے۔ پھر غور کیجئے — ایک درخت کی ایک چھوٹی سی شاخ سے کتنے قلم بنتے ہیں۔ پھر ایک تنومند بہت بڑے درخت سے کتنے ہزار یا کتنے لاکھ قلم بنیں گے۔ پھر روئے زمین پر باغوں اور جنگلوں میں موجود سارے درختوں پر ایک نظر ڈالیے اور ان سے جو قلم تیار ہو سکتے ہیں — ان کا اندازہ کیجئے۔

Marfat.com

اب سوچیے ـــ سیاہی کے ایک قطرے سے کتنے لفظ لکھے جا سکتے ہیں پھر اس عدد کو ایک تالاب کے قطروں سے ضرب دیجئے ـــ اسی طرح ایک دریا، ایک سمندر کا حساب کیجئے اور آخرکار روئے زمین کے تمام دریاؤں اور سمندروں کے قطروں کا اندازہ کیجئے ـــ اب دیکھئے کیسا عجیب و غریب عدد بنتا ہے۔

اس بات کی عظمت اور بھی واضح ہو گی جب ہم اس حقیقت کی طرف توجہ دیں کہ "سبع" (سات) کا عدد یہاں تعداد کے لیے نہیں بلکہ تکثیر کے مفہوم میں آیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ـــ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے دریا اور سمندر اور بھی آملیں اور سیاہی بن جائیں تو بھی کلمات الٰہی ختم نہیں ہوں گے۔

غور کیجئے کہ یہ عدد کس قدر زندہ اور جاندار ہے۔ یہ وہ عدد ہے جو فکرِ انسانی کو اپنے ساتھ ساتھ لیے چلتا ہے اور لامتناہی عدد کی طرف آگے لے جاتا ہے۔

یہ ایسا عدد ہے کہ ریاضی دان ہو یا کوئی اَن پڑھ ـــ اس کی عظمت کا ادراک کر سکتا ہے اور اس کی وسعت اور بڑائی سے آشنا ہو سکتا ہے۔

جی ہاں! علمِ خدا اس عدد سے بھی بالاتر ہے۔

اس کا علم ـــ لامحدود اور بے انتہا ہے۔

ایسا علم کہ جس کی قلمرو ـــ تمام عالمِ ہستی ہے۔ اس میں تاریخِ عالم کا ماضی بھی ہے اور مستقبل بھی اور اس میں تمام اسرار و حقائق موجود ہیں۔

زیرِ نظر دوسری آیت سورہ کہف کی آخری آیت ہے۔ یہ دینی عقائد کے بنیادی اصولوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں توحید، رسالتِ پیغمبرؐ اور معاد سب کا ذکر موجود ہے۔ درحقیقت سورہ کہف کی ابتدا بھی اسی سے ہوئی تھی۔ ابتدا میں بھی اللہ، وحی، عمل کی جزاء اور قیامت کے بارے میں گفتگو تھی۔ اس سورت کا اہم حصہ چونکہ انہی تین موضوعات پر مشتمل ہے اس لحاظ سے یہ آخری آیت اس سورت کا خلاصہ ہے۔

نبوت کے بارے میں پوری تاریخِ انسانی میں بہت غلو اور مبالغہ ہوا ہے اس لیے قرآن کہتا ہے: کہہ دو، مَیں تو تم جیسا ایک بشر ہوں۔ میرا امتیاز اور خصوصیت صرف یہ ہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے (قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ)۔

یہ کہہ کر قرآن نے ان تمام مشرکانہ خیالی امتیازات پر خطِ بطلان کھینچ دیا ہے کہ جو انبیا کو مرحلۂ بشریت سے مرحلۂ الوہیت کی طرف لے جاتے ہیں۔

اس کے بعد جن مسائل کی انبیاء پر وحی ہوتی ہے ان میں سے مسئلہ توحید کی نشاندہی کی گئی ہے: مجھ پر وحی ہوتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک ہے (انما الٰھکم اللہ واحد)۔

صرف اسی مسئلہ کی طرف اشارہ کیوں کیا گیا ہے ـــ اس لیے کہ توحید تمام عقائد اور انسانوں کے لیے تمام سعادت بخش انفرادی و اجتماعی پروگراموں کا نچوڑ ہے۔

Marfat.com

ہم نے ایک اور جگہ بھی کہا ہے کہ توحید فقط اصولِ دین میں سے ایک اصل ہی نہیں بلکہ اسلام کے تمام اصول و فروع کی روح ہے۔

اگر دینی تعلیمات کو موتیوں کی لڑی کہا جائے تو توحید کو وہ دھاگا کہیں گے جو ان موتیوں کو باہم ملائے رکھتا ہے۔ لہٰذا کہنا چاہیئے کہ توحید وہ روح ہے جو اس پیکرِ اسلام میں پھونکی گئی ہے۔

معاد و نبوت کی بحثوں میں یہ حقیقت ثابت ہوچکی ہے کہ یہ مسائل توحید سے جدا نہیں ہیں یعنی اگر اللہ کو ہم اس کی صفات کے ساتھ پہچان لیں تو پھر ہم جان لیتے ہیں کہ ایسے خدا کو نبی بھیجنے چاہئیں نیز اس کی حکمت و عدالت کا تقاضا ہے کہ کوئی عدالت برپا ہو اور قیامت وجود پذیر ہو۔

اجتماعی مسائل، پورا انسانی معاشرہ اور جو کچھ اس سے مربوط ہے اسے توحید و وحدت کے سائے میں ہونا چاہیئے تاکہ وہ اپنے لوازمات سے آراستہ ہو سکے۔

یہی وجہ ہے کہ احادیث میں ہے کہ:

"لا الٰہ الّا اللہ" پروردگار کا محکم قلعہ ہے جو شخص اس میں داخل ہوگیا وہ عذابِ الٰہی سے مامون ہوگیا۔

نیز ہم سب نے سُن رکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابتدائے اسلام میں فرماتے تھے:

قولوا لا الٰہ الّا اللہ تفلحوا

اگر فلاح کے طالب ہو تو پرچمِ توحید کے تلے جمع ہو جاؤ۔

اس آیت کا تیسرا جملہ مسئلہ قیامت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور "فاءِ تفریع" کے ذریعے اسے مسئلہ توحید سے منسلک کر دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: لہٰذا جو شخص بھی اپنے رب کی لقاء کا امیدوار ہے اسے چاہیئے کہ عملِ صالح انجام دے (فمن کان یرجوا لقاء ربہ فلیعمل عملاً صالحًا)۔

لقائے پروردگار دراصل اس کی ذاتِ پاک کا باطنی مشاہدہ ہے۔ یہ دل کی آنکھ اور داخلی بصیرت سے ہوتا ہے۔ اگرچہ اس دنیا میں بھی حقیقی مومنین کے لیے یہ ممکن ہے لیکن یہ معاملہ چونکہ بہت روشن، زیادہ واضح ہو کر عمومیت اختیار کرے گا لہٰذا قرآن میں یہ تعبیر زیادہ تر روزِ قیامت کے بارے میں استعمال ہوئی ہے۔

دوسری طرف یہ امر فطری ہے کہ اگر انسان کسی کے انتظار میں ہے اور اسے اس کی امید ہو تو وہ اس کے استقبال کے لیے اپنے آپ کو تیار کرے گا۔

جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں فلاں چیز کے انتظار میں ہوں لیکن اس کے عمل میں اس کا اثر نہ ہو تو اس کا دعویٰ غلط ہے۔ اسی لیے "فلیعمل عملاً صالحًا"

یہاں صیغۂ امر آیا ہے۔ وہ امر کہ جو لقائے الٰہی کی امید اور انتظار کا لازمہ ہے۔

آخری جملے میں عملِ صالح کی حقیقت کو مختصر طور پر اس طرح واضح کیا گیا ہے: کسی کو پروردگار کی عبادت

Marfat.com

میں شریک نہیں کرنا چاہیئے (ولا یشرك بعبادة ربه احدًا)۔
زیادہ واضح لفظوں میں ـــ جب تک عمل میں خلوص پیدا نہ ہو وہ صالح نہیں ہو سکتا اور الٰہی اور خدائی رنگ اختیار نہیں کر سکتا۔ خلوص انسانی عمل کو گہرائی بخشتا ہے، نورانیت عطا کرتا ہے اور صحیح سمت دیتا ہے اور خلوص ختم ہو جائے تو عمل زیادہ تر ظاہری پہلو اختیار کر لیتا ہے اور اس کا جھکاؤ ذاتی مفاد کی طرف ہو جاتا ہے۔ ایسا عمل گہرائی اور صحیح سمت کھو بیٹھتا ہے۔
در حقیقت وہ عمل صالح جس کا سرچشمہ رضائے الٰہی ہو اور جو اخلاص گوندھا ہوا ہو وہ لقائے الٰہی کا پاسپورٹ ہے۔
جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ عمل صالح وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس میں تمام انفرادی و اجتماعی مفید، اصلاحی اور تعمیری کام شامل ہیں چاہے وہ زندگی کے کسی پہلو سے متعلق ہوں۔

اخلاص یا عملِ صالح کی رُوح

اسلامی روایات میں "نیت" کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اسلام کا یہ بنیادی اصول ہے کہ وہ ہر عمل کو اس کی نیت اور مقصد کے ساتھ قبول کرتا ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مشہور حدیث ہے:

لا عمل الّا بالنيّة

نیت کے بغیر کوئی عمل نہیں۔

یہ حدیث اسی حقیقت کی ترجمان ہے۔
نیت کے بعد اخلاص کی باری آتی ہے۔ اگر وہ ہو تو عمل بہت اہمیت اور قیمت رکھتا ہے ورنہ اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی۔
اخلاص یہ ہے کہ محرک انسان ہر قسم کے غیر الٰہی شائبہ سے پاک ہو اور اسے "توحید نیت" کہتے ہیں یعنی ہر کام میں صرف رضائے الٰہی کو ملحوظ رکھا جائے۔
یہ بات لائق توجہ ہے کہ زیر بحث آیت کی شان نزول کے بارے میں منقول ہے:
ایک شخص رسول اللہ (ص) کی خدمت میں آیا۔ اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! میں راہِ خدا میں خرچ کرتا ہوں، صلۂ رحمی کرتا ہوں اور یہ اعمال صرف اللہ کے لیے بجا لاتا ہوں لیکن جب لوگ میرے ان اعمال کے بارے میں بات کرتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہیں تو مجھے خوشی ہوتی ہے ـــ میرے یہ اعمال کیسے ہیں؟
رسول اللہؐ خاموش رہے اور کچھ نہ کہا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی جس میں اس

Marfat.com

شخص کے سوال کا جواب دیا گیا (کہ صرف وہ عمل مقبول بارگاہِ الٰہی ہو گا کہ جو اخلاص کامل کے ساتھ بجا لایا جائے گا)۔[1]

اس میں شک نہیں کہ یہ روایت غیر اختیاری مسرت کی نفی نہیں کرتی بلکہ اس کا تقاضا ہے کہ لوگوں کی طرف سے کسی کام کی تعریف، اس کے کرنے کا سبب نہ ہو۔

اسلام میں اخلاص، عملِ خالص اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

من اخلص لله اربعین یوماً فجر الله ینابیع الحکمة من قلبه علی لسانه

جو شخص چالیس دن اپنے اعمال خالص اللہ کے لیے انجام دے تو اللہ اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت و دانش کے چشمے جاری کر دے گا۔[2]

⁂ ⁂ ⁂

پروردگارا! تمام اعمال میں ہماری نیت کو اس طرح سے خالص کر دے کہ ہم تیرے علاوہ کسی کے لیے نہ سوچیں اور تیرے علاوہ کسی کے لیے قدم نہ اٹھائیں۔

اور اگر تیرے علاوہ کسی کو چاہیں تو وہ بھی تیری رضا کے لیے ہو اور اس لیے ہو کہ اس کا تجھ سے تعلق ہے۔

آمین یارب العالمین

✻ - ✻ - ✻

---

[1] مجمع البیان، مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں، نیز تفسیر قرطبی، اسی آیت کے ذیل میں۔

[2] سفینۃ البحار، ج ۱ ص ۴۰۸۔

Marfat.com

سورہ کہف کی تفسیر

اور

تفسیر نمونہ کی بارہویں جلد

اختتام کو پہنچی

یکم جمادی الثانی ۱۴۰۲ ہجری قمری

بمطابق ۷، فروردین ۱۳۶۱ ہجری شمسی

Marfat.com

تفسیر نمونہ کی بارہویں جلد کا ترجمہ

بعد از دوپہر دو بج کر تینتیس منٹ پر

۲۴ ذی قعد ۱۴۰۴ ہجری

بمطابق ۲۲ اگست ۱۹۸۴ء

بر مکان شیخ پرویز انور — مانچسٹر یو کے [1]

اس حقیر پُر تقصیر — سید صفدر حسین نجفی ولد سید غلام سرور نقوی مرحوم کے قلم سے اختتام پذیر ہوا

الحمد للّٰہ اولاً و آخراً وصلّی اللّٰہ علی محمد و آلہ سرمداً ابداً

الاحقر
صفدر حسین نجفی

---

[1] حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر برطانیہ کی تاسیس کے سلسلے میں سیٹھ نوازش علی اور راقم ان دنوں انگلستان میں ہیں۔ امید ہے کہ انشاء اللہ بتوفیق خداوندی بتصدق محمدؐ و آلِ محمد یہ جامعہ جلد شروع ہو جائے گا اور دنیائے مغرب کے لیے یہ مرکزِ علوم دینی اور مینارِ ہدایت ثابت ہوگا۔ (مترجم)

Marfat.com

مکتبہ جامعہ مجددیہ
دربار ... سیالکوٹ

ادارہ امامیہ قرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآن پاک (تفسیر نمونہ جلد ۱۲)
کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا میں
تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی
یا لفظی غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

حافظ محمد طفیل (سلطان الافاضل)
مدرس / منیجر
امامیہ قرآت کالج
اندرون موچی دروازہ۔ لاہور

Marfat.com